اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ

اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء

جلد ۱ نمبر ۱

ذخیرہ

مرتبہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

شبیہ

اعلیٰحضرت حضور پرنور ہز ہائینس نواب سر میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ

فہرست مضامین

نثر

نظم

قیمت سالانہ للعہ

دفتر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

فی پرچہ ۶ر

قواعد ذخیرہ

(۱) یہ رسالہ انگریزی مہینے کے آخر میں حتی الامکان پوری پابندی کیساتھ شائع ہوا کریگا اسکا حجم فی الحال ۴۸ صفحہ کا ہوگا اور ہر صفحہ میں دو کالم ہونیکی وجہ سے معمولی رسالوں کی تقطیع کے ایک سو صفحات کے قریب عبارت ہوگی۔

(۲) رسالہ ہذا میں نظم و نثر کے بہترین علمی و اخلاقی مضامین اس غرض سے شائع کئے جائینگے کہ ملک میں علم کا صحیح مذاق پھیلے اور اردو زبان کو ترقی ہو۔ اس امر کی کوشش کیجائیگی کہ انگریزی زبان کے بہترین مضامین کا اقتباس بھی درج کیا جائے اور ان قصص و حکایات کو بھی جگہ دیجائیگی جو دلچسپ اور پر لطف ہونیکے ساتھ مہذب و نتیجہ خیز ہوں۔ مگر سیاسیات سے اسکو مطلق تعلق نہ ہوگا نہ مذہبی مضامین اس رسالے میں شائع کئے جائینگے اسکے مضامین جسطرح علم دوست اصحاب کیلئے مفید ہیں اسیطرح تعلیم یافتہ خواتین کے لئے بھی اسکا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۳) رسالہ باتصویر اور اعلیٰ درجہ کے ایوری فنش کاغذ پر شائع ہوا کریگا۔ سالانہ قیمت بلا امتیاز مبلغ للعہ مع محصول ڈاک کے پیشگی مقرر ہے

(۴) نمونہ کا پرچہ ۶ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جائیگا۔

(۵) جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

(۶) اگر کوئی نمبر وقت پر نہ پہنچے تو دوسرا پرچہ پہنچنے کے قبل اطلاع دینے پر مفت ورنہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

(۷) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور درج ہوا کرے اور سکونت تبدیل کرنیکی صورت میں مفصل پتہ سے اطلاع دیں۔ جملہ خط و کتابت واضح طور پر کیجانی چاہئے۔

(۸) اشتہارات کی چھپائی بذریعہ تحریر طے ہوسکتی ہے۔

(۹) تا اطلاع ثانی ذخیرہ کے متعلق تمام خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہئے۔

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

مالک و ایڈیٹر رسالہ "ذخیرہ"

اندرون دروازہ چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

اعلیٰ حضرت حضور پرنور بندگانعالی متعالی نواب میر عثمان علیخان بہادر شہریار دکن خلد اللہ ملکہ

Chitrashala Press, Poona.

اکتوبر ۱۵ سنہ ۱۹ء

شاہِ دکن

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے ہمایوں مرتبت فرمانروا اعلیحضرت مظفر الممالک نظام الدولہ نظام الملک نواب میر عثمان علیخاں بہادر فتح جنگ آصفجاہ سابع کی سریر آرائی سلطنت کے بعد یہ چوتھی سالگرہ مبارک ہے جسکی ہمایوں تقریب نہایت جوش عقیدت کیساتھ ان دنوں اس مملکت ابد مدت کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ میں منائی جارہی ہے۔ یہ وہ مبارک تقریب ہے جسکی بدولت قلمروِ آصفیہ کے ۸۲،۶۹۸ مربع میل رقبہ میں ۱،۳۳،۷۴،۶۲۶ نفوس ہی کو نہیں بلکہ دولتِ آصفیہ کے باہر بھی اکثر بہی خواہان دولت کو اپنی وفادارانہ اور عقیدت مندانہ جوش مسرت کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اس اظہار مسرت اور جوشِ عقیدت سے یہ بات ثابت ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام صرف حیدرآباد پر ہی حکومت نہیں فرماتے ہیں بلکہ اپنی عقیدت کیش رعایا کے دلوں پر بھی حکمراں ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے باشندے اعلیحضرت سے

ے یہ مضمون گذشتہ مہینے میں لکھا گیا تھا ۱۲

عقیدتمندانہ دلی تعلق رکہنا اپنے لئے موجب فخر اور باعث ناز سمجھتے ہیں۔ اعلیحضرت کے ذاتی جوہر اور حمیدہ اوصاف بیشک اِس بات کے مقتضی ہیں کہ یگانہ و بیگانہ ہر شخص کا دل وفورِ عقیدت سے معمور ہے۔ اعلیحضرت کی بے تعصبی۔ رحم دلی اور رعایا پروری کو سارا زمانہ جانتا ہے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ امرِ واقعی ہے کہ حضور پرنور کی ذات ستودہ صفات اُن تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کا مرکز ہے جو بہت کم کسی ایک فرمانروا میں جمع ہوتی ہیں۔ کسی بادشاہ کے لئے بے تعصبی سے بڑہکر کوئی جوہر نہیں ہوسکتا۔

سمجھنا ہر اِک قوم و ملت کو یکساں
کہ خصلت ہی یہ زیور شہریاری (حالی)

اعلیحضرت کی صُلح کل اور غیر متعصب طبیعت کی زمانہ بہر میں دہوم ہے۔ تعصب کا دیو جسطرح دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ سلطنتوں تک پر مسلّط ہے اسکو سب جانتے ہیں۔ بڑے بڑے مدعیان تہذیب و شائستگی بہی اِس متعدی مرض سے خالی نہیں ہیں۔ لہذا ہم سب کو اِس بات پر فخر و ناز کرنا چاہئے اور خدا کا شکر بجا لانا چاہئے کہ اعلیحضرت بے تعصبی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ خاندانِ آصفیہ کے عالی منزلت سلاطین یوں تو بالطبع بے تعصبی کی صفت میں مشہور ہیں۔ خصوصاً حضرت غفرانمکاں نواب میر محبوب علیخاں آصف جاہ سادس کی بے تعصبی کا زمانہ قائل تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ حضور پرنور نے اپنے محترم والد کی اس خصوصیت کو اپنے برگزیدہ طرزِ عمل سے چار چاند لگا دئیے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر شمس العلما مولانا حالی مرحوم نے نامور باپ کی اس اعلیٰ صفت کو کئی سال ہوئے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اِن جامع الفاظ میں بیان کیا تھا کہ۔

ہر اک مذہب ہر اِک ملت سے ہے یکساں سلوک اسکا — کوئی گر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
تعصب، اجنبیت، اختلاف مذہب و ملت — نہیں کوئی مزاحم اِسکی دریا کی روانی کا

رعیت شاد ملک آباد اور آزاد ہر ملت ادا حق کر دیا شاہ دکن نے حکمرانی کا

لیکن آج یہ اشعار حرف بحرف اولوالعزم بیٹے پر بالکل اسیطرح صادق آتے ہیں جیسے کہ اِن ہی کے لئے کہے گئے ہوں اِس قابل توصیف بے تعصبی کے متعدد واقعات اِس وقت تک پیش آچکے ہیں اِن میں سے ایک آدھ واقعہ کا اظہار اس موقع پر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اعلیٰحضرت نے جسوقت تخت شاہی پر قدم رکھا ہے تو اِس جلوس میمنت مانوس کی مبارک یادگار میں قدیم قاعدے کے مطابق چند یومیے جاری فرمائے گئے۔ اِس موقع پر اعلیٰحضرت نے جس کریم النفسی نصفت پسندی اور مدبرانہ فراست سے کام لیا وہ ہمیشہ مبارک دورِ عثمانی کی تاریخ میں زرّیں حروف میں منقوش رہیگی۔

قاعدہ ہے کہ بادشاہ ہونیکے بعد پہلی دستخط بطور نیک شگون کے جدید یومیوں کی اجرائی کے احکام پر فرمائی جاتی ہے۔ اعلیٰحضرت حضور نواب میر عثمان علیخاں بہادر نے پہلی شاہی دستخط فرماکر جن یومیوں کو جاری فرمایا۔ ان میں ہر قوم اور ہر مذہب کے حقوق کو پوری طرح ملحوظ رکھ کے کسی فرقہ کو جلوسی فیضان سے محروم نہ رکھا۔ مسلمان متوکلین اور ہندو فقرا سے لیکر پارسی آتش کدہ اور عیسائی دار المعذورین تک کے نام متعدد معقول یومیے جاری فرمائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی عزیز رعایا کے تمام فرقوں مسلمانوں ہندوؤں، پارسیوں، اور عیسائیوں کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ بلا امتیاز مذہب و قوم آپ کو سب کا پاس ہے اور سب آپ پاس ایک ہیں۔

آپ کو تعلیمی معاملات سے جو دلچسپی ہے اسکے بھی متعدد ثبوت ابتک مل چکے ہیں۔ اِس معاملہ میں تو آپ کے دست کرم نے ابتداہی میں مسلم یونیورسٹی کی جو شاہانہ امداد فرمائی اس پر خوشی کے نعروں سے سارا ہندوستان گونج اُٹھا تھا۔ حیدرآباد کے سررشتۂ تعلیم میں اسوقت اصلاح و ترقی کی جو روح افزا حرکت پیدا ہوگئی ہے وہ حضور بندگانعالی کی شاہانہ توجہ ہی کا نتیجہ ہے۔ سررشتۂ تعلیم کی تنظیم جدید جس پیمانہ پر کیگئی ہے

وہ ہر طرح موجب اطمینان اور امید افزا ہے۔

یہ بھی اعلحضرت کے مبارک عہد کی عظیم الشان برکت ہے کہ ترقی کا قدم بسرعت تمام گھروں کے اندر پہنچ رہا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ عورتیں ترقی کا اعلیٰ ذریعہ اور اصلی جزو ہیں۔ کیونکہ وہ خاندان، سوسائٹی قوم اور ملک کی تہذیب و ترقی کی خلاق ہوتی ہیں اور ہر ملک ہر قوم اور ہر مذہب میں انسان ویسا ہی بنتا ہے جیسا کہ اسکی ماں اسکو بناتی ہے۔ کوئی قوم اور کوئی ملک سطح ترقی پر اس سے زیادہ بلند نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک اسکی مائیں اپنی دماغی طاقت سے اسکو ابھار سکتی ہوں۔ لیکن اگر مائیں دماغی طاقت سے معرّا ہونگی تو بچے بھی ویسے ہی ہونگے۔ مائیں بہت بڑی قوی ذمہ داری رکھتی ہیں اسلئے ملک کا یہ اولیں فرض ہے کہ قدرت نے جن افراد انسانی کے ذمہ یہ مہتم بالشان فرایض کئے ہیں انہیں ان فرایض کی انجام دہی کے قابل بنائے اور یہ مقصد صرف عورتوں کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم تربیت اور انکے غصب شدہ حقوق ان کو واپس دینے سے حاصل ہوسکتا ہی اس بارۂ خاص میں اس مبارک عہد کے اندر بہت بڑی توجہ کیگئی ہے۔ اور یہ اسی عہد ہمایوں کی برکت ہے کہ ملک میں تعلیم نسواں کے رواج کی خاص اور موثر تدابیر اختیار کرنے کی کوششیں کیجارہی ہیں۔

بالمختصر یہ کہ اعلحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کے خصائل حمیدہ بیشمار اور آپکے عہد مبارک کی برکتیں کثیر التعداد ہیں۔ ان سب کو تفصیل کیساتھ ایک ایک کرکے بیان کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے (غالب)

ان ہی خوبیوں اور ان ہی برکتوں کا اثر ہے جو یگانہ و بیگانہ۔ اپنے اور پرائے۔ ہر کہ و مہ کے قلوب مسخر ہیں اور ہر شخص اپنے محبوب خلایق ہردلعزیز جواں سال بادشاہ کی سالگرۂ مبارک کی مسعود و ہمایوں تاریخ کا بڑے ہی شوق کیساتھ منتظر رہتا ہے۔ اور اس مبارک موقع پر خوب جی کھولکر خوشی مناتا ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے توفیق دی ہے وہ اپنے آقائے ولی نعم کی سالگرۂ مبارک کی مسعود تقریب کی یادگاریں قائم کرکے اپنی عقیدت کا عملی ثبوت دیتے ہیں

ذخیرہ کے عقیدت کیش وفا شعار مدیر نے بھی اسی کی ہمت کی ہے۔ اور ان کی یہ ہمت و کوشش ہر طرح لایق داد اور قابل تحسین ہے۔ ہمارے علم پرور بادشاہ کی شاہانہ سرپرستی علوم و فنون سے ایک علمی رسالہ کی اجرائی کو جو مناسبت ہو سکتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس مبارک علمی یادگار سے ابنائے ملک کو جو فواید حاصل ہونگے وہ بھی محتاج تشریح نہیں۔ لہذا اپنے بادشاہ جم جاہ کی سالگرہ ہمایوں کی اس مسعود علمی یادگار کو بھی اس مبارک عہد کی ایک برکت سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔ "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے"

سید خورشید علی

کلامِ شاد

(ہز اکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی۔ ای شاد بالقابہم)

جب ہوا شوق مجھے اپنی خود آرائی کا — حوصلہ بڑھنے لگا چشم تماشائی کا

زور پر جوش جنوں ہے دلِ سودائی کا — کہیں جھنڈے پہ چڑھے نام نہ رسوائی کا

بند رہتی ہیں مری آنکھیں تصور میں ترے — لطف اب آنے لگا عالمِ تنہائی کا

وصل ہے کس کا بھلا اور جدائی کس کی — کس کا ڈر اور کسے شوق جبیں سائی کا

کعبہ و دیر میں چھایا ہے گھٹا ٹوپ اندھیر — جلوہ جب سے ہے عیاں آپ کی یکتائی کا

نہیں آتا نظر اب کچھ ترے جلوے کے سوا — ایسا روشن ہے ستارہ مری بینائی کا

زینت گلشن عالم کا ترے سر سہرا — ہر طرف شہرہ مچا ہے چمن آرائی کا

یار و اغیار پر اس گوشہ نشینی کے سبب — کھل گیا راز مری عالمِ تنہائی کا

کیا دلیل اور کوئی لائیگا وحدت کی شاد — یہ جو کثرت ہے ثبوت اس میں ہے یکتائی کا

اقبال و ادبار

بزرگ قوم نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی سی۔ ایس۔ آئی کی ہفتاد و دو سالہ زندگی کا سب سے روشن وقت نیا یاں وسیع عالمانہ مطالعہ ہے۔ اور آپ کے موجودہ مشاغل کو بھی تحصیل علم اور مذاکرۂ علمیہ سے اختصاص حاصل ہے' اپنی خاندانی شرافت ذاتی لیاقت اور بے داغ کیرکٹر کے لحاظ سے آپکی شخصیت ضرب المثل ہے۔

چنانچہ مضمون ذیل آپ کی وسیع النظری اور علمی تبحر کا نمونہ ہے۔ گو زبان اُردو میں آپ کی مضمون نگاری کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں مگر اکثر اصحاب یہ معلوم کرکے متعجب ہوں گے کہ آپ کی انگریزی و فارسی نظمیں قابل دید ہوا کرتی ہیں اور فی زمانا تو آپ کی فرصت کا پورا وقت قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کی مصروفیت میں بسر ہوتا ہے۔ باوجود اس انہماک کے یہ اس رسالہ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ نے " اقبال و ادبار" کا سبق آموز مضمون اس رسالہ میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا ہے اور ہم ناظرین کو خوشخبری دیتے ہیں کہ رسالہ ذخیرہ کے اوراق آپ کے پر مغز مضامین سے آئندہ بھی مزین ہوا کریں گے۔

ایڈیٹر

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الْاُمُوْرِ
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

بے عزم درست و سعی کامل کس را نشود مراد حاصل

اقبال و ادبار دو ایسے لفظ ہیں کہ ہر وقت خلق اللہ کی زبان پر جاری ہیں۔ ایک موہوم سے معنی ان لفظوں کے تو البتہ ہر شخص کے ذہن میں ہیں مگر انکی اصل حقیقت کیا ہے اسپر کم کوئی غور کرتا ہے۔ روزمرہ کے محاورہ میں ان کا صرف اسطور پر ہے کہ گویا یہ دونوں خارج میں موجود اور بعض صفات واجب سے متصف ذاتی ہیں اور ساتھی اسکے لوگ فعل وانفعال کو بھی ان سے نسبت دیتے ہیں۔ ایاب و ذہاب کا ان پر اطلاق کرتے ہیں خواب و بیداری کی حالتیں ان میں بتاتے ہیں' اور یہ غرہ و نازش یا حسرت و افسوس انہیں یاد کرتے ہیں' کوئی جو ذرا وقیق بین یا معنی رس ہوتا ہے وہ تو البتہ اتنا سمجھتا ہے کہ قسمت تقدیر وغیرہ کی مثل یہ بھی مشیات ایزدی کے نام ہیں ورنہ جہلا تو گو زبان سے نہ کہیں مگر ان کو شریک باری بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے اور جسطرح ہنود لچھمی اور سرستی کی پوجا کرتے ہیں اوسی کے قریب قریب بعض مسلمان بھی ان آلہ فرضی کو مانتے ہیں۔

بہتیرے لغات ہماری زبان پر ایسے جاری ہیں کہ اون کے مدلولات محض ذہنی ہیں' خارج میں ان کا وجود نہیں ہے اور ایک ضرورت ذہنی کے سبب سے انسان نے انہیں وضع کر لیا ہے جیسے لفظ انسان کہ اوسکا مفہوم کلی کہیں خارج میں موجود نہیں ہے بلکہ چند افراد کو

منحصر الماہیت پاکر آدمی نے ایک لفظ وضع کر لیا ہے جسکا اطلاق ہر فرد پر ہو سکتا ہے اور ساتھ اسکے کسی فرد خاص کا نام نہیں ہے' یا مثلاً لفظ جزیرہ کہ جو کوئی ٹکڑا زمین کا پانی سے بالکل گھرا ہوا ہو اُسکا نام ہے اعم ازینکہ سنگلدیپ ہو یا جزائر واق ہوں یا کوئی اور سرزمین موصوف بصفات مذکورہ کہیں۔ سمجھنے میں آئے۔ اِن کے سوا ایک قسم کے اور لغات ہیں جو بہت سی صفات مجتمعہ یا حالت مجموعی کے نام ہیں مگر آدمی نے بوجہ جہل اِن نامونکو ان صفات یا حالت کا سبب اور پیدا کرنیوالا قرار دے لیا ہے اقبال و ادبار' اور قسمت اور تقدیر اسکی نظیریں ہیں۔ سب کہا کرتے ہیں کہ انگریزوں کا اقبال آجکل یاور ہے ہندو مسلمانوں پر ادبار ہے اگر سرکار انگریزی کوئی لڑائی فتح کرے' کسی تدبیر ملکی میں سرسبز ہو کوئی نہر عمدہ بنائے۔ کوئی آلہ نیا ایجاد کرے تو بہرحال تعریف اُن کے اقبال کی ہوتی ہے۔ اگر ہماری قوم کے لوگ کسی قسم کی تکلیف اُٹھائیں کسی امر میں ناقص نکلیں۔ کوئی تدبیر اُنکی اُلٹی پڑے' علم کی تحصیل میں کوتاہی کریں' حصول دولت میں ہمت ہار جائیں' اخلاق ذمیمہ سیکھیں' بزرگوں کا وتیرہ چھوڑ دیں تو بہرصورت قصور وار ادبار ٹھہرایا جاتا ہے یعنے گویا یہ امور معلول علل اور مسبب باسباب نہیں ہیں بلکہ ایک ہرمز یعنے اقبال آسمان زمین کے کسی پردے پر بیٹھا ہوا کسی قوم کو نفع پہونچایا کرتا ہے اور اسکے مقابل میں ایک اہرمن یعنے ادبار بیٹھا ہوا دوسری قوم کو نقصان پہونچایا کرتا ہے۔ عقل و رائے کوئی چیز نہیں ہے یہ دونوں فاعل مختار اور جبّار جو چاہتے ہیں کرتے ہیں' کوئی اُنپر حاکم نہیں اور یہ کسی کے محکوم اور فرما بردار نہیں' آدمی کے کچھ بنائے نہیں بنتی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور اسپر طرّہ یہ کہ انسان ہی بیچارے کے معاملات میں اقبال و ادبار کا ہڑبونگ ہے' ایسی بدعملی عموماً حیوان نبات جماد کے نظم و نسق میں نہیں سمجھی جاتی' گویا خداوند عالم و عالمیان اشرف المخلوقات سے اونپر زیادہ مہربان ہے اور ہرمز اقبال اور اہرمن ادبار کے گیر و دار سے اونہیں محفوظ رکھا ہے۔

ہر صاحب عقل اس بات کو تسلیم کریگا کہ یہ آثار و آیات بیوجہ نہیں ہیں' انتظام عالم میں ہر نتیجہ کسی مقدمہ پر مترتب ہوتا ہے' ہر معلول کسی علت کے وسیلے سے ظہور میں آتا ہے' کارخانۂ قدرت سلسلۂ علل و اسباب سے ایسا جکڑا ہوا ہے کہ اوسمیں کسی خود سر دیو یا اہرمن کا گذر نہیں ہے کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ یہ سلسلہ توڑ دے یا ایک معلول کو بھی اپنی علت سے جدا کر دے' حکیم اور فلسفی کا کام یہ ہے کہ ہر شے کی حقیقت اور ماہیت کی تجسس میں سبب اول تک پہونچ جائے جس سے بالاتر مسبب حقیقی اور حکیم مطلق کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اقبال و ادبار کا نام لینا ایک خاص حالت مجموعی کے وجوہ اور علل تک نہ پہنچنے کا بہانہ ہے۔ تلاش و تفتیش علل بڑی ریاضت کا کام ہے۔ اسکی محنت کو حکیم ہی گوارا کر سکتا ہے' عوام الناس آسانی سے دو لفظ گھڑ کے اپنی مشقت بچا لیتے ہیں اور انہیں الفاظ کو علت بلا واسطہ ٹھہرا کر اپنے دلوں کو تسکین دے لیتے ہیں۔ انہیں اونہیں اپنی کاہلی اور قصور کا بھی عذر اچھا ہاتھ لگ جاتا ہے اور کہنے کو ہوتا ہے کہ ہم کیا کریں ہمارا اقبال یاور نہیں مجبور ہیں۔

ذرا غور کرنیکا مقام ہے کہ ہماری قومی ہمدردی کا تو یہ حال ہو کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی ابنائے جنس کی فلاح اور بہبودی میں کوشش نہ کرے اور ہر شخص اپنے ذہن میں ٹھان لے کہ ہمیں ایسے کاموں میں روپیہ صرف کرنے سے کیا فائدہ' وقت ضائع کرنیسے کیا حاصل' آخر کوئی نہ کوئی کر ہی لیگا' یکدلی اور اتحاد کی یہ نوبت ہو کہ جو کوئی بھولا بھٹکا بھائی ہمارا جان بھی لڑائے اور درد دل سے ہماری بھلائی کی فکر بھی کرے تو ہم کو یہ جستجو پیدا ہو کہ اسے کیونکر بدنام کیجئے' اسکی نیت کو کسطرح فاسد ٹھہرائیے' کیا گرفت کیجئے کہ لوگ اسے ملحد اور زندیق جانیں' غرض اس کے بگاڑنے میں قرار واقعی

دواودوش کیجائے، جہان کی خاک چہانی جائے۔ تربیت اور تعلیم کا یہ نقشہ ہو کہ اپنا علم بھی چوپٹ ہو، تحصیل معاش کا وسیلہ نہ سکھیں، مشقت کو ذلت سمجھیں، مفت خواری میں شرم وحیا نہ کریں۔ اور پھر جب تنگی رزق عاجز کرے تو خدا کی ناشکری کے سوا کچھ نہ کریں مآل اندیشی اور حسن تدبیر ایسی کہ عمر فکر محال اور شیخ چلی کے سے خیال پکانے میں صرف ہو جائے، گذشتہ حالات پر حسرت و افسوس کیا کریں آئندہ کی نسبت بیہودہ اور بیجا امیدوں میں اوقات ضایع کریں ہمیشہ یہ سوچتے رہیں کہ میں فلاں امیر کے مثل متمول، فلاں حاکم کو مانند صاحب اقتدار ہوتا تو کیا ہوتا، اور ہو جاؤں تو کیا ہو، یہاں تک کہ ان وسوسوں میں واقعی اور ممکن الحصول مواقع تمتع کے بھی ہاتھ سے نکل جائیں حمیت اور غیرت اس درجہ کہ اگر دنیا میں جاہل اور نالایق ٹھہرائے جائیں تو یہ کہکے اپنی بات بنالیں کہ دادا جان بڑے عالم تھے سیکڑوں شاگردوں کو پگڑی بند ہوا دیں، نانا جان بڑے مہندس تھے اونکے زیچ آجتک مشہور ہیں کسی قابل نہیں ہوا تو کیا ہوا اور اسپر یہ توقع کہ لوگ اپنی بھی اتنی ہی قدردانی اور تواضع تعظیم کریں، جتنی کسی صاحب علم وکمال کی کرتے ہیں، امیروں کا یہ وتیرہ ہو کہ امارت کو مقصود بالذات جانیں اور مخزن ہر فضل وکمال تصور کریں، تحشم کو عزت سمجھیں اپنے خوشامدی اور دست نگر لوگوں کی ستایش کو سچ جانیں اور اس گروہ کی واہ واہ سے پہولے نہ سمائیں۔ مال و وقت عزیز صرف لہو ولعب کریں، اپنی قوم اور اپنے ملک کی بھلائی میں کوشش نہ کریں اور اس کا رخیر میں پیسہ نہ اٹھائیں، شریفوں کا یہ نقشہ ہو کہ گو کھانے کو پاس نہ ہو مگر محنت اور مزدوری سے ان کی شرافت میں بٹہ لگے، سوال سے عار نہ ہو مگر پیشہ اور حرفہ سے جی شرمائے، عابد وزاہد ایسے ہوں کہ مذہب وملت کو پیشہ بنائیں اور نماز وروزہ کی روٹیاں کھائیں حج وزیارت کیواسطے سرمایہ تحصیلتے پھریں اور اس فعل کو جسے خداوند عالم اور ہمارے شارع علیہ التحیۃ والسلام نے حرام کیا ہے بظاہر ذریعہ جذب ثواب اور بباطن وسیلۂ حصول معاش بنائیں۔ عمال وحکام ایسے کہ انکو پیٹ بھرنے سے کام، ملک خدا چاہے بگڑے اور چاہے سدہرے انکی بلا جانے حیف صد حیف کہ ہمارا اور ہماری قوم کا یہ حال ہے اور اس پر ہم ادبار ہی کو الزام دیں اپنے قصور پر معترف نہ ہوں اور اپنے ملک کی بہبودی میں سعی وکوشش کرنیکے عوض بیٹھے ہوئے ہائے قسمت وائے نصیب کیا کریں۔

اصل میں ادبار اسی حالت مجموعی کا نام ہے جسکا ایک شمہ بطور مشتے نمونہ از خروارے اوپر بیان کیا گیا۔ اقبال کو بالکل اس کا ضد تصور کرلینا چاہیئے، زیادہ اس سے سمجھنا اور ادبار یا اقبال کو ان حالات کا خالق اور سبب قرار دینا عقل سلیم کے نزدیک مشابہ بشرک معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ مقدمہ تسلیم کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مثل امراض جسمانی یہ بھی عوارض ہیں اور ہم برآں قیاس علاج پذیر اور جس طرح طبیب حاذق پہلے اسباب وعلامات مرض کو بصورت مشخص اور محقق کرکے اسکے مناسب نسخہ لکھتا ہے اسیطرح ہمارے ملک کے عقلا اور حکما کو چاہیئے کہ پہلے اپنی قومی امراض کے اسباب وعلامات بخوبی دریافت کرلیں اور پھر ہر سبب رنجی کے واسطے علحدہ علحدہ دوائیں تجویز کریں۔ اگر صدق دل اور خلوص نیت سے علاج میں کوشش کیجائے اور قُرْبَةً اِلَی اللّٰہ اس امر میں اہل توفیق جد وجہد کو کام فرمائیں تو عجب نہیں کہ اس کا ثمرہ بہت جلد ظہور میں آئے۔ اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

من طریق سعی می آرم بجا　　لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
دامن مقصود اگر آرم بکف　　از غم و اندوہ مانم برطرف
ورنہ شد از جہد من کارم بکام　　من دران معذور باشم والسلام

عماد الملک

وحدتِ وجود

عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ برگیرد
دل خلقے بجاں آمد زصد تعبیر و یک خوابش

معدوم کا موجود ہونا یا موجود کا معدوم ہوجانا دونوں باتیں خلاف عقل ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے وجود کا علم ہے اور یہ علم وجدانیات میں سے ہے ہر شخص کو یقین ہے کہ میں موجود ہوں۔ لیکن میں تو صریحًا فانی و ہیچ ہوں اس سبب سے میں موجود نہیں ہوں۔ جسے میں کہتا ہوں وہ کوئی اور ہے

دوسرے ادراک و شعور کا مادّہ میں ہونا عقلًا محال ہے۔ اور ہم میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم مادّہ سے منزّہ ہیں۔ لیکن ہم تو جسم رکھتے ہیں اور جسم کے لئے مادّہ ضرور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم کو مدرک حقیقی سے کسی نوع کا اتحاد ہے۔

کیا یہ اتحاد اس نوع کا ہے۔ جیسا اتحاد کہ علم و معلوم میں ہوتا ہے کیا ذات واجب کو کائنات کیساتھ اسطرح کا اتحاد ہے جیسا خواب میں اپنے پیدا کئے ہوئے خیالی عالم کے ساتھ ہم کو اتحاد ہے۔ جسطرح ہمارا خیال چشم زدن میں ایک عالم پیدا کر لیتا ہے جسمیں آفتاب اور آسمان اور زمین اور دریا و کوہستان سبھی کچھ ہوتے ہیں۔ اور اُن سب کو ہمارے ساتھ اتحاد ہوتا ہے۔ کیا اسیطرح واجب تعالیٰ نے بلا مادہ و بغیر مدت محض اپنی مشیت سے کائنات کو پیدا کیا اور اسکی مشیت کو اسکی ذات کے ساتھ اتحاد ہے۔ اور کائنات کو مشیت کے ساتھ اتحاد ہے یعنے تمام کائنات کو ذات واجب سے اتحاد ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عالم عین مشیت ہے اور مشیت عین ذات ہے۔ برکلے کا یہ قول کہ جسے لوگ مادّہ سمجھے ہوئے ہیں یہ مشیت الٰہی کی ایک صورت ہے جو ہمارے مشاعر و مدارک میں پائی جاتی ہے اسی مذہب کی تائید کرتا ہے

لوک مشاہیر فلاسفہ میں ہے۔ اوسکا قول ہے کہ میں دیکھتا ہوں یا سمجھتا ہوں یا خیال کرتا ہوں یہ جب خدا کو منظور ہوتا ہے مگر یہ کیونکر ہوتا ہے یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ پروفیسر ہکسلی جو وجود باری کے ثبوت میں توقف کرتا ہے اسکی تصریح کرتا ہے کہ انکشافات علوم طبیعیہ جو اس زمانہ میں ہوئے ہیں اس سے وجود مادہ یا مذہب مادیین پر بھی کوئی استدلال نہیں قایم ہوتا۔ اس حکیم فیلسوف کو اسکے معاصرین مذہب مادیین کے ساتھ منسوب کرتے ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ مادہ کا وجود بھی بدلیل ثابت نہیں ہم اُسکے اس قول سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جب مادّہ کا ثبوت نہیں۔ تو شیخ مقتول کی یہ رائے صحیح ہو سکتی ہے کہ مجرّد عن المادّہ پر طریان اعراض ہوا کرتا ہے۔ برکلے کے قول سے شیخ مقتول کی رائے کو مقابلہ کرو تو یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ شیخ جسے طریان اعراض کہتا ہے وہ ایک صورت ہے جو ہمارے ہی مشاعر و مدارک پر طاری ہوتی ہے۔ اور لوک کی تقریر سے معلوم ہوا کہ ہمارے مشاعر و مدارک پر بس وہی صورت طاری ہوتی ہے جو خدا کو منظور ہو نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ جسے طریان اعراض کہتا ہے وہ ایک صورت ہے مشیت الٰہی کی جو ہمارے مشاعر و مدارک میں پائی جاتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ خارج میں موجود ہے۔ انگریزی کے تواریخ فلسفہ میں مذکور ہے کہ پیغمبر اہل ہند بوذاسف یا بدھا کے بعض متبعین نے اپنے وجود کے سوا تمام عالم کی ہستی کا انکار کیا ہے۔ اور اتحاد کی صورت میں یہ انکار بے معنی نہیں ہو سکتا۔ مگر ویدوں میں جو ہندوؤں کے کتب مقدسہ ہیں اسکی تصریح ہے کہ موجود خدا ہی ہے اور تمام ماسوا دھوکا ہے۔ انہیں تواریخ میں مذکور ہے کہ ساتویں یا آٹھویں صدی میں ہندوستان میں سنکرا ایک عارف کامل گذرا ہے اُس نے ویدانت و تصوف میں مفصل کتاب

لکھی ہے اور یورپ کے علما معترف ہیں کہ وحدت وجود کا جیسا بیان واضح ویدانت میں ہے اس سے واضح تر پھر کوئی نہ لکھ سکا۔ ویدانت میں عالم اجسام و جمیع تشخصات کے وجود کا قطعاً انکار ہے۔ موجود کی تقسیم واجب و ممکن کیطرف اس مذہب کی رو سے غلط ہے یہاں وجود ممکن کا انکار محض ہے۔ قریب قریب اسی کے محقق طوسی کی رباعی کا ایک شعر مجھے یاد آیا ہے

موجود بحق وجود اول باشد　　باقی ہمہ موہوم و مخیل باشد

گر محقق تو متکلمین میں ہیں اور وجود ممکن کے قایل ہیں۔ متکلمین کے مذہب میں ممکن کے ذاتیات میں نہ وجود ہے نہ عدم۔ اوسکے وجود کے لئے علت کی ضرورت ہے اور عدم کے لئے عدم علت کی۔ عدم علت گویا کہ علت عدم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ذات واجب اگر نہ ہوتی تو ممکن معدوم ہی رہتا۔ اس تقریر پر فلسفی کہتا ہے کہ معدوم جو پردہ عدم میں ہے علت کا اثر اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور صوفی کا اعتراض یہ ہے کہ ممکنات اگر ہیں تو لا تعد و لا تحصیٰ ہیں کیا یہ سب وجود میں ذات باری کے ساتھ شریک ہیں نعوذ باللہ من ذالک

کپیلا جسے ہندو وشنو یا اگنی کا اوتار جانتے ہیں مذہب سنکھیا کا موجد ہے اسے ہستی واجب کا انکار ہے وہ طبیعت مادی اور روح مجرد کو اصل عالم قرار دیتا ہے اور روح کی نجات اکتساب علم فلسفہ میں منحصر سمجھتا ہے۔ برخلاف اسکے پتن جلی جس نے جوگ شاستر کو تصنیف کیا مراقبہ اور دھیان کو سبب نجات اور روح کے خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور خدا کو خالق و مدبر ازلی و ابدی اور تمام مجردات سے بالاتر کہتا ہے اور اس کا نام ایشر رکھتا ہے۔ اس حکیم الٰہی کا قول نمازوں میں حضور قلب کی تائید کرتا ہے۔ مگر تاریخ سے اس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ اہل اسلام میں ذکر و فکر کا مسئلہ پتن جلی کے اقوال سے ماخوذ ہے خدا امور دنیا سے اگر فرصت دے تو مراقبہ اور دھیان سے بہتر کوئی شغل نہیں ہے لئے حیات ابدی سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں اور حیات ابدی کے منبع فیض تک دھیان کے سوا اور کسی راہ سے رسائی نہیں اگر دریا تک اس راہ سے رسائی ہوگئی تو امید ہے کہ پیاسے نہیں رہینگے۔ لیکن طلب شرط ہے سید سجاد زبور آل محمدؐ میں ارشاد فرماتے ہیں اور حق تعالےٰ سے عرض کرتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُكَ بِیْ سُلُوْكَ الْمَجْدِ بَیْنِیْ وَ اِلَیْكَ غرض مسئلہ توحید ہندوؤں اور مسلمانوں کے کتب مقدسہ میں موجود ہے اور مراقبہ اور دھیان اور حضور قلب سے نماز و دعا باعث نجات و ذریعہ حصول حیات ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ میرے ایک کرمفرما ڈاکٹر اگھور ناتھ صاحب چٹو پدھیا جو ہندوؤں میں بہت بڑے عالم تھے اور پہلے نظام کالج میں سائنس کے اعلیٰ پروفیسر تھے اس بات کا انکار کرتے تھے کہ ویدوں میں خدا کا ذکر ہے۔ انہوں نے مجمع عام میں ایک تقریر کی کہ ہندوستان میں عرب اللہ اللہ کرتے ہوئے آئے۔ ایران و ترکستان والے خدا خدا پکارتے ہوئے آئے۔ یوروپ کے لوگ گاڈ گاڈ کہتے ہوئے داخل ہوئے اسکا اثر ہندوؤں پر پڑا کہ وہ بھی خدا خدا کہنے لگے ورنہ ہندوؤں کے مذہب میں گاڈ اور خدا وغیرہ وہ الفاظ ہیں جن کے لئے معنی نہیں۔ ان الفاظ بے معنی کو جزو مذہب سمجھنے سے ہندوؤنکو احتیاط چاہئے۔ میں نے اس باب میں جو مناظرے اون سے کئے اس کا جواب شافی نہیں پایا۔

علت و معلول کے مسئلہ کو بعض علما نے ایک تمثیل سے سمجہایا ہے کہ جسطرح سورج کی شعاعیں ہر جسم پر یکساں نہیں پڑتیں کوئی جسم سرخ کوئی سبز کوئی زرد نظر آتا ہے کوئی سفید اور کوئی سیاہ دکھائی دیتا ہے اور آئینہ میں پورا آفتاب نظر آتا ہے۔ اسی طرح وجود واجب کا فیض ممکنات کو حسب استعداد پہنچتا ہے اور قلوب صافیہ میں اس کا جلوہ پورا نظر آتا ہے۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

اینچہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست　　ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

اگر واجب الوجود کا یہ فیض ذرا بھی موقوف ہو تو ساری کائنات وجود سے

عاری ہوجائے جسطرح آفتاب کے نہ ہونے سے تمام الوان فنا ہوجاتے ہیں۔

غرض فلسفیانہ نظر سے اگر دیکھئے تو وحدتِ وجود کا مسئلہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اسلام میں جزو مذہب اس عقیدہ کو نہ سمجھنا چاہئے اسلئے کہ اسلام مذہب عام ہے اور عوام الناس کو مسایل فلسفیہ کے سمجھنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ ان عقاید کا انہیں پابند کرنا تکلیف مالایطاق ہے اور شریعت اسلام سہلہ سمحا رہی ہے۔ اس کے جزو مذہب ہونے پر کوئی نص بھی نہیں پائی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحدت وجود فلسفہ کا ایک مسئلہ ہے اسلام کے لیے عقیدۂ توحید کافی ہے۔

علی حیدر طباطبائی

محاسن ممکنات

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

کوئی چیز جو ممکنات میں سے ہے دنیا میں یا اُس سے باہر ایسی تصور نہیں کیجاسکتی جسے ہم بلاتعین قیود اور حدود اچھا کہہ سکیں باستثناء ارادۂ نیک کے ذہانت، احساس، ادراک، قوت فاعلی اور ضمیر کی دوسری استعدادیں اور عملیات و تصرفات عام اس سے کہ اُنکا نام کچھ ہی ہو۔ مثلاً جرأت عزم، استقلال وغیرہ وغیرہ من حیث صفات طبعیہ اکثر صورتوں اور بہت سی حالتوں میں اچھی اور مفید ہیں لیکن ایک صحیح امعان کے بعد معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ قدرتی امتیازات اور قوتیں اُس حالت میں نہایت ہی مضر، تکلیف دہ اور نقصان رساں بن جاتی ہیں جب کہ وہ کسی ایسے ارادے کے ماتحت استعمال پائیں جو نیک اور اچھا نہو یہی حالت بعینہٖ اُن امتیازات مثل اقبال، ثروت، برکت، دولت حکومت وغیرہ کی بھی ہے۔ جو عطایائے قدرت یا محصلات زندگی کے ماتحت ہمیں حاصل ہوتے ہیں اور جنہیں کبھی کبھی ہی نہیں بلکہ اکثر خوشی اور فرحت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حالتیں بعض وقت انسان کے دل و دماغ میں اس قسم کا خوفناک فخر، مشیخت اور انانیت پیدا کرتی ہیں کہ انکی وجہ سے آسایش عامہ میں ایک معتدبہ فرق پڑ جاتا ہے اور یہ کیفیت اسی وقت وجود پذیر ہوتی ہے جب ان کے ساتھ نیک ارادہ شامل نہ ہو۔

ایک ایسا عمل اور ایک ایسی روش جو خالص اور نیک ارادہ کے خوش آئند خط و خال سے آراستہ اور مزین نہ ہو خواہ کیسی ہی برتری اور عظمت رکھتی ہو کسی عاقبت بیں اور سمجھدار مبصر کی نگاہوں میں جو ہمیشہ کامیاب نتیجہ کی فکر میں رہتی ہیں کوئی لطف افزا اور تسکین دہ کیفیت نہیں رکھتی اسمیں کچھ شک نہیں کہ ہماری قوتیں اور ہمارے جذبات فطرتاً نیک اور مفید ہیں۔ لیکن انکی خوبیاں اور عمدگیاں اُسی صورت میں وجود پذیر ہوسکتی ہیں جب انکی رفتار حسن روش سے آراستہ ہو۔ حسن روش بلا اسکے مشکل ہے کہ ارادہ نیک ہو چاندی اور سونا بجائے خود قیمتی دھاتیں ہیں اگر وہ مٹی میں بھی دبی رہیں اور انہیں معادن سے بھی باہر نہ نکالا جائے تب بھی اُن کی اصلی خوبی میں کوئی فرق اور کوئی کمی نہیں آسکتی لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سوائے صاف کرنے اور گلانے کے ان دھاتوں کی اصلی خوبی مشاہدہ میں آسکتی ہے یہ صاف

کرنا اور گلانا ان دھاتوں کے واسطے ایک نیک تجویز یا نیک ارادہ ہے
اگر اس سے کام نہ لیا جاتا تو انکی وہ خوبیاں ظاہر نہ ہوتیں جو اسوقت
بازار کائنات میں ظہور پذیر ہیں۔ قدرت کیجانب سے انسان خاکی بنیان
کو جسقدر خوبیاں اور عمدگیاں بخشی گئی ہیں انکی قیمت اور حرمت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اصلی خوبی یا محاسن کا اظہار اُس صورت
میں ہو سکتا ہے جب اُن سے نیک ارادہ کے ماتحت کام لیا جاتا۔

رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے دو چار لفظوں ہی میں اس
بیش بہا فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

کیسا گہرا صاف جامع مانع جملہ ہے تمام افعال تمام اعمال اور تمام تصرفات
کی اچھائی کا مدار صرف ایک نیک ارادہ پر ہی ہے۔ ایک ایسا سخی
جو روز اپنے مال و دولت سے صدہا ہی نہیں بلکہ ہزاروں روپیہ
سخاوت کرتا ہے اور کسی حالت میں بھی جبکا اس داد و دہش سے ہاتھ
نہیں رکتا اگر اس فیاضی اور جود و کرم کے ساتھ اوباشانہ شہرت
اور بزدلانہ ناموری کا بھی طالب ہے تو اس کی ساری سخاوت اور
زرپاشی وہ قیمت نہیں رکھتی اور نہ اسکی وہ عظمت اور وقعت ہو سکتی
ہے جو صحیح معنوں میں ایک خوبی کی قیمت ہو سکتی ہے۔

یہ تو ممکن ہے کہ ظاہر پرست اور کشتگان نمود و نمایش کے نزدیک
اُسکی کوئی قیمت ہو لیکن باعتبار اصول خلوص نیت ایسی سخاوت
اور ایسا جود و کرم نقطہ تنقید سے ہمیشہ خارج رہیگا۔ قبل اس کے کہ ہم
انسانی نقطہ خیال کی تقلید سے کسی اپنی حرکت، فعل، جرأت، تصرف
فیاضی، داد و دہش، جود و کرم، تجویز اور تدبیر کی واجبی قیمت کے متلاشی
اور خواہاں ہوں لازمی ہے کہ اُس کی تکمیل کے سلسلے میں ہماری
نیت اور ہمارا ارادہ ایک بے لاگ اور بیداغ مسلک کا سالک ہو۔

بیشک انسان چند ایسے صفات بھی رکھتا ہے جو باعتبار اپنی
وسعت دائرہ تصرف کے خود ارادہ نیک کے واسطے بھی ایک بڑی حد تک
کار آمد اور ممد ہوتی ہیں اور اپنی معیت سے ارادہ نیک کی پرخطر راہوں
میں ایک قسم کی خوش آئند سہولت پیدا کرتی ہیں لیکن اگر اُن کے ساتھ
نیک ارادہ شامل نہ ہو اور اُس کی ماتحتی میں وہ انصرام نہ پائیں تو
سونے اور چاندی کیطرح اُن کی خوبیاں بھی سطح پر نہیں آسکتیں اور
نہ بازار تمدن میں انکی کوئی قیمت پڑ سکتی ہے۔

یا یہ کہ وہ صرف اپنے ہی دائرہ میں محدود رہ کر بازار معاشرت
میں کوئی غیر مشروط قیمت نہیں پا سکتی ہیں۔

بعض وقت ہم ایسی صفات حسنہ کے متعلق عمل سے پہلے ہی نیک نیتی
کا فرض کر لیتے۔ حالانکہ یہ کام ارادہ کا ہے ہمارا ایسا عمل اُس وقعت
اور اس توقیر کو ایک بڑی حد تک محدود کر دیتا ہے جسکی ہمیں صحیح طور
پر اُن کے متعلق امید دلائی گئی ہے ایسی تحدید ہمیں یہ اجازت نہیں
دیتی کہ ہم مطلقاً ایسا خیال کریں کہ اون کے واسطے کسی نیک ارادہ
کی ضرورت ہی نہیں دیکھو چاندی اور سونا بذاتہ ایک قیمت اور ایک
خوبی رکھتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کی ایسی قیمت اور خوبی کے
سطح پر لانے کے لئے ایک تجویز اور ایک ارادہ بھی عملی رنگ میں موجود ہو

انسانی خواہشات اور جذبات کے سلسلہ میں اعتدال، خودداری
خود ضبطی، خود فراموشی، تحمل اور باوقار تفکر نہ صرف باعتبار تصرفات
اور آثار کے ہی اچھے ہیں بلکہ اُن کی ذاتی قدر و قیمت کا بھی وہ ایک
حصہ اور ایک جزو معلوم ہوتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ اس قابل
ہرگز نہیں ہیں کہ انہیں بلا تعین حدود اچھا کہا جائے یا اُن سے
اس کائنات میں بلا شرائط کام لیا جا سکے کیونکہ بلا تعین حدود اور
قیود کے ان کا وہ احترام اور وہ وقعت باقی نہیں رہتی جو ان سے
منسوب ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک اُن کے ساتھ یا اُنکے
پہلو میں نیک ارادہ نہ ہو تب تک انکی وہ خوبی اور عمدگی ظاہر نہیں ہوتی

ہوتی جو کائنات کی نظروں میں قبولیت حاصل کرتی ہے یا جبتک قانون عامہ کے رو سے کائنات کو ضرورت ہے۔ ایک بدرویہ شخص کا تحمل اور سکون جو کسی نیک ارادہ کے ماتحت انضباط اور پرورش نہیں پاتا نہ صرف ہماری نگاہوں میں اسے خطرناک بنا دیتا ہے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی کہ وہ ہماری نظروں میں بہت کچھ قابل نفرت بھی ہو جاتا ہے۔

ارادہ نیک اور تعین حدود سے کیا مراد ہے۔

یہ دونوں ایسے سوالات ہیں جنکا جواب ایک درجہ تک دلچسپی رکھتا ہے ہم اپنے اردگرد تین قسم کا کائنات پاتے ہیں۔

صاحب ارادہ۔

" بے ارادہ۔

" تابع صاحب ارادہ۔

پہلی قسم میں وہ تمام علوی اور سفلی اجسام اور طاقتیں شامل ہیں جو ارادہ رکھتی یا صاحب ارادہ ہیں جن میں خالق کائنات سے لیکر انسان و حیوان تک شامل ہیں لیکن ہماری مراد اس بحث میں صرف انسان ہی تک رہ جاتی ہے۔

بے ارادہ کائنات سے وہ کائنات مراد ہے جو خود کوئی ارادہ نہیں رکھتی یا ہم اس میں اس قسم کے ارادہ کا احساس نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے جس قسم کا ارادہ ہم نوع انسان میں پاتے ہیں۔

تابع صاحب ارادہ سے وہ اجسام وہ اجرام وہ طاقتیں مراد ہیں جو ایک ایسی اعلیٰ طاقت کے احکام اور تصرفات کے تابع ہیں جسکے حکم و ارادت کے حدود میں فقط انسان ہی شامل ہے یا وہ اجسام اور وہ مخلوق جو اعلیٰ طاقت کے تابع ہوکر انسان کے تابع احکام یا تابع تصرفات ہے جیسے انسان کے مقابلہ میں دوسری تمام ہستیاں۔

ارادہ کیا چیز ہے

انسان ہی صاحب ارادہ نہیں اوسکے اردگرد جو اور حیوانات پائے جاتے ہیں وہ بھی صاحب ارادہ ہیں اگرچہ انکا ارادہ انسانی ارادہ سے کمی اور صورت اور روش ہی رکھتا ہو۔

ہم اپنے اندرونہ میں جسقدر قوتیں پاتے ہیں یا انکا مختلف رنگوں اور صورتوں میں ادراک اور احساس کرتے ہیں اُن کے سوائے ہم ساتھ کے ساتھ ہی ایک ایسی قوت کا بھی احساس کرتے ہیں جو انکی نوعیت سے بہت کچھ الگ اور ممتاز ہوتی ہے اور جسے ہم اپنے دوسرے الفاظ میں ارادہ سے موسوم کرتے ہیں۔

اگر ہم اپنی اندرونی قوتوں اور ارادی جذبوں پر غور کرنے کے عادی ہونگے تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ قوت ارادی یا ارادہ دوسری قوتوں اور دوسرے جذبات سے بالکل ایک جداگانہ عمل ہوتا ہے۔ یا یہ کہ۔

جب ارادہ عامل اور فاعل ہوتا ہے تو اس وقت کل دوسری قوتیں اور دوسرے جذبات اوسکے ماتحت ہوکر کام کرتے ہیں یا یہ کہ ارادہ اُن سب پر حاوی اور غالب ہو جاتا ہے اور تمام قوتیں اور تمام جذبات اُس میں اسطرح ملجاتے ہیں کہ گویا اُسوقت ارادہ کے سوائے کوئی دوسری قوت ہوتی ہی نہیں۔

کبھی اس قوت ارادہ کا احساس اور عمل کسی دوسری قوت کے ہیجان کے بعد ہوتا ہے اور کبھی اس سے پہلے دوسرے الفاظ میں یہ کہ کبھی کوئی دوسری قوت ہیجان ارادہ کا باعث ہو جاتی ہے اور کبھی ارادہ دوسری قوت کے انتعاش کا موجب بن جاتا ہے۔ دیکھو جب کبھی ہم اپنے اندرونہ میں اشتعال اشتہا پاتے ہیں تو فوراً ہی ایک ارادہ آموجود ہوتا ہے اور کبھی اسکے خلاف خود ارادہ ہی اشتہا کی یاد دلاتا ہے کبھی ہم کسی فلاکت زدہ انسان اور حیوان کو دیکھکر اسکی امداد پر متوجہ ہوتے ہیں اور کبھی بلا مشاہدہ ہی کے ہماری قوت ارادی اس ضرورت کا احساس کرتی ہو گویا کبھی کوئی دوسری قوت علت ہوتی ہے اور ارادہ معلول اور کبھی ارادہ علت ہوتا ہے اور کوئی دوسری قوت معلول۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کوئی بیرونی محرک شئے ہمارے سامنے نہیں ہوتی لیکن ہمارے ضمیر اور دماغ میں یکایک ایک تحریک مرتسم اور متموج ہوکر ہمیں ایک کام پر آمادہ کرتی ہے اور کبھی خلاف اسکے ایک سماں ہماری اس قسم کی تحریک کا باعث ہوتا ہے دیکھو ایک صغیر سن بچہ پیاس کی حالت میں دور سے پانی دیکھتا ہے اور بوجہ بیطاقت ہونیکے خود وہاں تک پہنچ نہیں سکتا لیکن اوسکے بشرے اور اسکے حرکات اور اسکی بے چینی اور اضطراب سے ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اسکے دل و دماغ میں ایک انوکھا خیال موجزن ہے اور وہ اسکی وجہ سے بے چین ہوتا اور ہاتھ پاؤں مار رہا ہے یہ کیا چیز ہے جو بچہ کے اس اضطراب کا باعث ہے وہی ارادہ جو ہمیں قدرت کیجانب سے بخشا گیا ہے اور جسکی وجہ سے ہماری تمام قوتیں صحیح رنگ میں استعمال پاتی ہیں۔

پانچ صورتوں میں بظاہر ایک قسم کا مترادف پایا جاتا ہے۔

" ارادہ۔

" خواہش۔

" شوق۔

" ہمت۔

" جوش اور تردد میں۔

گو ان میں کبھی کبھی عملی رنگ میں برائے نام تو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے لیکن کوئی صحیح مترادف نہیں پایا جاتا۔ ارادہ خواہش نہیں ہے اور خواہش ارادہ نہیں ہے۔ شوق اور خواہش میں بھی فرق ہے۔ ہمت اور تردد میں بھی فرق ہے تردد ہمت کے تابع یا ہمت کی ایک عملی صورت ہے۔ شوق، تردد اور جوش بھی مرادف نہیں ہیں برائے نام ان میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہمت ارادہ کی موید رہتی ہے یا یہ کہ اسکا پہلو لیتی ہے۔ خواہش ارادہ ہی میں پائی جاتی ہے یا یہ کہ ارادہ کے ساتھ خواہش بھی شامل ہوتی ہے۔ ارادہ بغیر خواہش کے نہیں ہوسکتا لیکن خواہش کے واسطے ضروری نہیں کہ اوس کے ساتھ ارادہ بھی شامل ہو۔ بہت سی خواہشات ایسی ہیں کہ اخیر تک وہ شان ارادہ سے محروم رہتی ہیں۔

ارادہ کی اقسام

جب ہم یہ شرط لگاتے ہیں کہ ارادہ کا نیک ہونا ضروری ہے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ارادہ کبھی برا بھی ہوتا ہے اگرچہ فطرتی پہلو سے یا جبکہ ہم فطرت کو ہر طرح سے نیک اور صائب مان لیں اور وہ نیک ہی ہونا چاہئے یا نیک ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں عملی تسلسل میں آکر یہ دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ ارادہ کبھی نیک ہوتا ہے اور کبھی برا یا یہ کبھی ارادہ بھی اوس راہ پر لگ جاتا ہے جدہر کسی قوت کا رجحان ہوتا ہے جدہر دوسری قوت باگ موڑتی ہے اودہر ہی اشہب ارادہ بھی مڑ جاتا ہے گو ہم یہ کہیں گے کہ فطرت انسانی کی پاکیزگی کا اقتضا۔ اور میلان ارادۂ نیک ہی کا متقاضی ہے۔ لیکن بعض بیرونی بواعث اور خارجی مواد کیوجہ اور شرکت سے ارادۂ نیک بھی بدبیں یا بدروش ہوجاتا ہے اور اس جہت سے مجبوراً ہمیں اوسکا نام ارادۂ بد رکھنا پڑتا ہے۔ ارادہ نیک اور بد کی تمیز صرف اقتضائے فطرت ہی سے ہوسکتی ہے۔ جس ارادہ کا ساتھ فطرت دیتی ہے وہ نیک اور سعید ہے۔ اور جس سے فطرت خوف کہاتی اور گھبراتی ہے وہ بد ہے دیکھو ایک نامی اور عادی چور یا ڈاکو عادتاً چوری کرتا اور ڈاکہ مارتا ہے لیکن وہ خود ہی اُسے باقتضائے فطرت پسند نہیں کرتا۔ اگر کوئی دوسرا شخص اُس سے اوسی قسم کا سلوک بد کرتا ہے تو وہ گھبراتا اور برا مانتا ہے۔ کیا یہ دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ باوجود خود ایک فعل کو عملی رنگ میں پسند کرنیکے فطرتاً وہ خود ہی اُسے برا جانتا ہے ہماری رائے میں صرف یہی ایک معیار ہے جس سے ارادۂ نیک اور بد میں تمیز کیجا سکتی ہے شاید بعض لوگ اس طبعی شہادت کے

شاہد نہ ہوں۔ لیکن اونہیں مزید غور کے بعد معلوم ہوجاوے گا کہ بیشک بعض امور دنیا کی منڈی میں ایسے بھی پائے جاتے ہیں جنہیں لوگ باوجود واقعی مقبوح ۔ تکلیف دہ اور برا ہونیکے بھی پسند کرتے یا عمل میں لاتے ہیں۔ لیکن اس عمل سے یہ نہیں ثابت کیا جاسکتا کہ خود انکی فطرت ہی اونکے خلاف فیصلہ نہیں دیتی۔ دنیا میں جسقدر جرایم سرزد ہوتے ہیں اون سب کی ایک فہرست بنا کر دیکھو کہ کون کون شخص انکا ارتکاب خود اپنی ذات پر روا رکھتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مجرم بھی کسی بڑے سے بڑے اور عادی مجرم کو بھی ایسی اجازت نہیں دیگا کہ خود اسکی ذات پر بھی اوس کا وار کیا جائے یا اوسی ہی اس کا تختۂ مشق بنایا جائے۔

دیکھو جو قصی القلب، بے رحم دن رات دوسرے لوگوں پر ظلم و ستم کرتا ہے جب خود اوسپر کبھی ظلم اور ستم ہوتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتے اور واویلا کرنے لگتا ہے فاحشہ عورتیں اگرچہ متاجرات کی حالت میں افعال شنیعہ پر رضامند ہوتی ہیں لیکن جب کوئی اُن کے ساتھ انکی مرضی کے خلاف سلوک کرتا ہے تو وہ بھی برا مانتی ہیں۔ باوجود سالہا سال کے ارتکابات شنیعہ کے اونکا دل اور اونکا ضمیر اونہیں آخر شرمندہ کرتا اور انکی غبار آلود فطرت پر روشنی ڈالتا ہے۔

اگر کبھی کوئی بوسیدہ متعفن فطرت انسان کسی گناہ اور لغزش کو گناہ اور لغزش نہیں سمجھتا تو یہ اسکی فطرت کا قصور نہیں۔ یہ ان بیرونی اسباب کا قصور ہے جو بدقسمتی سے اوسپر غالب اور حاوی ہوچکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ رفتہ رفتہ بے حس ہوچکا ہے۔

تعین حدود

جب کبھی انسانی جذبات اور انسانی صفات کے مقابلہ میں تعین حدود یا تعین قیود کا جملہ اطلاق پاتا ہے تو ان حدود اور قیود سے مراد ایسے حدود اور ایسے قیود ہوتے ہیں جن سے کوئی صفت کوئی قوت اور کوئی جذبہ ایسے طور پر کام میں لایا جاسکے جو بداکثر پہلو مفید ثابت ہو اور قانون عامہ کے خلاف نہ جائے ان ہی اعتراض کے ماتحت قوانین اخلاقیہ، شرعیہ، اور سیاسیہ کی وقتاً فوقتاً دنیا میں تدوین ہوتی رہتی ہے۔ دیکھو رحم، کرم، بردباری، درگذر، انکسار، تحمل وغیرہ وغیرہ صفات کیسے نیک صفات ہیں۔ اور بمقابل ان کے غصہ، بغض، ظلم و ستم، انتقام وغیرہ وغیرہ کیسے تکلیف دہ اور امن کش اوصاف ہیں۔ اگر یہ دونوں قسم کے صفات حدود اور قیود جائز سے محدود اور مشروط نہ ہوں تو خوبیوں اور عمدگیوں کے مقابلہ میں شاید برائیوں کا نمبر بہت ہی بڑھ جائے۔ رحم، کرم، اور بردباری و انکسار و تحمل بہت اچھے صفات ہیں۔ منازل تمدنی میں ان کی بہت کچھ ضرورت ہے لیکن انکی اصلی حالت میں ان سے ہر موقعہ اور ہر حالت میں کام نہیں لیا جاسکتا ہے۔ مجرموں کے مقابلہ میں کبھی کبھی ججوں کے دلو نمیں رحم کی لہریں بھی اٹھا کرتی ہیں۔ لیکن جرایم کے ثابت ہونے پر اگر رحم دلی ہی سے کام لیا جائے تو کیا اُس امن امان و آسایش عامہ کی ضمانت فسخ نہیں ہوجاویگی جسکی دنیا خواہشمند ہے اور جسکی کفیل علاوہ لیتیں اور قوانین شرعی اور ضوابط سیاسیہ ہیں۔ اب اس کا دوسرا رخ دیکھو۔ غصہ، جوش، اور انتقام بُری صفات تو ہیں لیکن کیا کبھی کبھی انکی بھی ضرورت نہیں پڑتی کو کہ انتقام کی بہت سی برائیاں بیان کیجاتی ہیں مگر کبھی اُسے بھی مناسب حدود کے اندر اور مناسب شرایط کے ساتھ کام میں لانا ہی پڑتا ہے کیا عدالتوں میں مجرموں کو ثبوت پر سزائیں دینا ایک سیاسی انتقام نہیں ہے؟ اور کیا ہمارا تمدن اور ہمارے تمدن کی ضروریات ہمیں اس سے روک سکتی ہیں۔

ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ سب انسانی صفات جذبات اور قوتوں کی اچھائی اور نیکی اُس صورت میں متصور ہے کہ جب انکا استعمال اور برتاؤ شرایط اور

حدود مجوزہ کے ماتحت یا مطابق کیا جائے۔ جب تک کوئی قوت کوئی جذبہ کوئی صفت بہ تعین حدود استعمال میں نہ لائی جائے تب تک وہ فائدہ مند اور اچھی ثابت نہیں ہو سکتی بایں حالات سب سے اعلیٰ شرط کیا ہے یا ان حدود اور ان شرایط کے تعین اور تنقید کے واسطے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ ارادۂ نیک کی۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

سُلطان احمد (بہاولپور)

محاسن اخلاق

عادت کی خوشنمائی، اور خصلت کی تہذیب، یہ ایسی باتیں ہیں جو زندگی کو خوشگوار اور دلکش بنا دیتی ہیں، وہ شئے جس سے شایستہ عادات اور اعلیٰ مذاق پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے، جو مسرت اور دولت سے بالاتر ہے وہ خصایل اور عادات کی خوبی اور پاکیزگی ہے۔ اگر کوئی شخص بذاتہ نیک نہیں تو اوسکی ساری دلفریبی، نزاکت اور عقل بیکار ہے وہ شئے جو انسان کو شاہراہ ترقی پر لگا دیتی ہے، جو اوسکی بنیاد کو مستحکم و استوار کر دیتی ہے اور اُسے اقران و امثال میں معزز و ممتاز بناتی ہے، وہ شئے جو کسی کے زور و اثر کے دائرہ کو وسیع کرتی اور اُس میں اخلاقی جذبہ پیدا کرتی ہے، جو اسکی شان کو بڑھاتی اور اسکی شوکت کو تسلیم کراتی ہے، جو کروڑہا لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی اور اقوام عالم کی مغرور گردنوں کو اپنے آستانہ پر خم کراتی ہے، جو مطیع کرنیکا عمل اور اوج و عروج حاصل کرنیکا ذریعہ ہے، جو کسی مہذب قوم کا حقیقی تخت و تاج کہا جا سکتا ہے وہ رسم و رواج کی پابندی، دستار فضیلت یا شرافت خاندانی نہیں ہے بلکہ وہ شئے خصلت کی خوبی اور پاکیزگی ہے۔ اخلاق اور کیرکٹر کی صفائی اور عمدگی ہے۔

اخلاق، زندگی کے تاج وقار و امتیاز کا ایک بیش بہا جواہر ہے۔ سوسائٹی کا اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ اسکی جلو میں رہتا ہے، اسکے حدود ارضی دولت کی حکومت سے کہیں زیادہ وسیع ہیں، تمام عزت و شہرت و حکومت جو اخلاق کے توسط سے نصیب ہوتی ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ رشک و حسد کے شایبہ سے معرّا ہوتی ہے۔ خوش خصال اور نیک سیرت لوگ سوسائٹی کی صرف جان ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ با اصول حکومت کے شیرازہ اور روح رواں ہوتے ہیں، اخلاقی خوبیاں ہفت اقلیم پر فرمانروائی کرتی ہیں۔ نپولین کا قول تھا کہ جنگ و جدال کے زمانہ میں بھی جسمانی قوتوں سے اخلاقی خوبیاں بالاتر پائی جاتی ہیں، دنیا میں جسقدر بڑے لوگ گذرے ہیں وہ صرف اسیوجہ سے بڑے نہیں کہلائے کہ جسمانی قوتوں میں پورے تھے بلکہ روحانی صفات میں بھی وہ کامل و عالم لوگوں سے ممتاز درجہ رکھتے تھے، قوموں کی طاقت، صنعت و حرفت، اون کے تہذیب و تمدن اور فضایل کا اصلی معیار ہر فرد قوم کا چال چلن ہے۔ صرف علم سے چال چلن کو تقویت نہیں ہو سکتی، بلکہ علم کے مقابلہ میں کیرکٹر زیادہ طاقتور شئے ہے، نیکی کی جگہ دل ہے نہ کہ دماغ اسلئے کہ صرف دماغی تربیت کا اثر چال چلن پر شاذ و نادر ہی پڑتا ہے، علم سے عمل نہیں آجاتا اور نہ علم کو نیکی سے کچھ واسطہ ہے،

البتہ اس سے یہ ہوسکتا ہے کہ انکسار کو زایل کر دے، اور بجائے اوسکے غرور کو قایم کردے، دل بغیر نیکی کے اور خیال کی بلندی بغیر اخلاقی عمل کی خوبی کے بجائے خود قوتیں تو ہیں، مگر شرارت آمیز، ممکن ہے کہ یہ طاقتیں ہمارے حق میں فائدہ بخش ثابت ہوں مگر ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنا ویسا ہی مشکل ہے، جیسا گرہ کٹ کی چابکدستی، یا عرب[1] نیزہ کی شہسواری کا۔

دولت کی تعریف میں بہت کچھ مبالغہ کیا جاتا ہے۔ ہمارا یہ مقصود نہیں ہے کہ قوم میں معزز ہونے کی کوشش فضول ہے، لیکن بدچلن امیر سے نیک چلن غریب زیادہ معزز ہے، ایک شخص کے پاس سب کچھ ہے مگر کچھ نہیں، اور دوسرے کے پاس کچھ نہیں مگر سب کچھ ہے، لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی قوت، دولت ہی سے نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ یہ فخر، خوش خوئی، نیک نفسی، رفاہ خلایق اور عملی زندگی گذارنے سے میسر ہوتا ہے، سویڈنبرگ کہتا ہے "وہ زندگی جو بہشت کی طرف لیجاتی ہے، تارک الدنیا ہونے میں نہیں بلکہ دنیا میں نیک کام کرنے میں یعنے عملی زندگی گذارنے میں مضمر ہے" شخصی چال چلن میں وہ اثر ہے کہ دوسروں کی زندگی پر، بلاجبر و تشدد مفید و موثر ثابت ہوتا ہے۔

راست بازی، دیانت داری اور پرہیزگاری، یہ ایسے صفات نہیں ہیں جو انسان کو بے منت حاصل ہو جائیں۔ اسلئے کہ کوئی قانون ایسا موجود نہیں ہے، جو کاہل کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار، اور رند کو پرہیزگار بنا سکتا ہے، یہ صفتیں انسان میں صرف دلی کوشش اور ذاتی توجہ سے نشو و نما پاتی ہیں، جس ذات میں یہ برگزیدہ صفات ارادہ اور مرضی کی پختگی کے ساتھ جمع ہو جائیں۔ وہ ایک ایسی قوت کا مالک ہوجاتا ہے، جو نا قابل دباؤ ہے، اور اسکا زور و اثر برابر تسلیم کیا جائیگا

دنیا میں ہر فرد بشر کو عمدہ اور اعلی کیرکٹر حاصل کرنے میں سعی بلیغ کرنی چاہیئے، یہ زندگی کے اعلی ترین مقاصد میں شمار کرنے کے لائق ہیں، دیانتدار اور راستباز آدمی کی ہر زمانہ میں مانگ ہے، وہ بغیر کامیاب ہوئے رہ نہیں سکتا، اسلئے کہ سچائی، انسانیت کی جان، اور دیانتداری اوسکا جوہر ہے، دنیا میں بہترین مواقع، کل علم و ہنر، اور تمام فضیلتیں اسی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

انسان کا چال چلن مختلف اثرات سے موثر ہوتا ہے، کبھی وہ دوسروں کے نمونہ و مثال سے اثر پذیر ہوتا ہے، کبھی کتابوں سے ہدایت پاتا ہے، کبھی وہ اپنے ہم جلیسوں سے فیضیاب ہوتا ہے، کبھی خاندانی روایات، اوسکے کیرکٹر پر اثر ڈالتے ہیں، مگر آخر کار اوسکو اپنے لئے خود بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے، اور ذاتی توجہ، اور دلی کوشش اوسکی اصلی معین و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ہر شخص اپنی برائیوں، اور نیکیوں ہی سے دنیا کی برائیوں اور نیکیوں کی تعداد بڑھاتا یا گھٹاتا رہتا ہے جس طرح اگلوں کے افعال کا اثر ہم پر ہے اوسیطرح ہمارے اعمال کا اثر آئندہ زمانہ میں ہونے والا ہے۔ ہمارا جسم خاک ہو کر خاک میں ملجائے مگر ہمارے اچھے اور برے کام ہمیشہ اپنا اثر پیدا کرتے رہینگے۔ اسمایلز کہتا ہے کہ "جو کام ہم کرتے ہیں، جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں، جس حرکت کو ہم دیکھتے ہیں، جس بات کو ہم سنتے ہیں، سب میں اثر ہے، اور یہ سب باتیں برابر اپنا حلقۂ اثر وسیع کرتی رہتی ہیں، اور وہ صرف ہم پر ہی اپنا اثر نہیں پیدا کرتیں بلکہ ساری قوم کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اوسکے طریقہ تاثیر سے واقف نہوں، اسلئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے وجود سے دنیا کو عمدہ نمونے دکھلائیں، ہمیشہ راستی ہی کے خیال کو دل میں جگہ دیں، وہی الفاظ زبان سے نکالیں، جو مفید خلایق ہوں، اور وہی کام کریں جو کرنے کے لایق ہوں"۔

نیک چلن انسان خواہ دنیا میں مشہور و معروف ہو، یا قعر گمنامی میں پڑا رہے، اوسکی نیک چلنی کا اثر، بنی نوع انسان پر ضرور ہو کر رہیگا عمدہ اخلاق کا پرتو، سوسائٹی پر ویسا ہی پڑتا ہے، جیسا شمع کا بزم پر۔

[1] قزاق عرب

اگر ٹامس رائٹ صرف یہی کرتا پھرتا کہ مجرمین ایک بار سزایاب ہونے کے بعد کسی کام کے نہیں رہتے تو گورنمنٹ مجرمین کی تہذیب و اصلاح کی فکر نہ کرتی۔ مگر اس نے گلے شکوے کرنیکے بجائے خود کمر ہمت باندھی اور رہا شدہ قیدیوں کو نیک چلنی اور راستبازی کی تعلیم دینا شروع کی۔ اسکی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہزاروں مجرم ایسے نیک کردار بنگئے کہ پھر قیدخانہ جانے کی اونہیں نوبت نہ آئی۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی افراط ہے جنکی مرضی کمزور اور جن میں اخلاق مفقود ہیں، ان لوگوں کا کوئی کیرکٹر نہیں، ان کے پاس برائیوں سے مقابلہ کرنیکی کوئی قوت نہیں، تو نیکی اختیار کرنے کی صلاحیت بھی مفقود ہے، یہ لوگ دوسروں کے مقلد ہیں، مگر انکی عادتیں ان میں جاگزین نہیں ہونے پاتیں، یہ لوگ نہ تو آگے بڑھتے ہیں، نہ پیچھے ہٹتے ہیں، بلکہ جدہر کی ہوا چلی، ادسی طرف ان کا بھی رخ ہو گیا، نہ اون کے دل میں استبازی مستحکم ہے، اور نہ یہ جانتے ہیں کہ صداقت کیا چیز ہے۔ اس قسم کے لوگ لاپرواہ، لاابالی، کمزور اور مہمل دنیا میں ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں

لہذا یہ نہایت ضروری کہ کیرکٹر کے استحکام اور چال چلن کی تربیت کے واسطے سعی بلیغ کیجاوے، کیرکٹر ایک بہت بڑی دولت ہے، انسان کی وقعت کے لحاظ سے اسے اعلیٰ درجہ کی جائداد تصور کرنا چاہئے، اگر کسی شخص میں اغراض و مقاصد کی دیانت پائی جاوے اور اسکی بنیاد اپنی ذات کے صحیح اندازے اور ان قوانین کے اتباع پر منحصر ہو جنکو وہ درست جانتا اور مانتا ہے، تو وہ اسکو عروج بخشتی ہے، اوسے طاقت دیتی ہے اور اُس سے بڑے بڑے کام کراتی ہے، جو شخص وفادار اور صادق القول ہو، جو اپنی زبان کا زیادہ پاس کرتا ہو، وہی پختہ خصلت، اور عدیم المثال خوبیوں کا جامع ہے۔ ہم کسی کی خصلت اس طریقہ کے اعتبار سے معلوم کر سکتے ہیں، جس میں وہ ان لوگوں کے ساتھ جو اوس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، سلوک اور برتاؤ کرتا ہے، اور اس بات سے بھی سمجھ سکتے ہیں، کہ وہ روزمرہ زندگی کے معمولی فرائض کو کس طریقہ سے ادا کرتا ہے۔ انیس سو برس قبل (سنہ ۱۹۰۰) جبکہ وسویس کا کوہ آتش فشاں پھٹا تھا، شہر پامپیائی زیر زمیں دفن ہو گیا، مگر دروازۂ شہر پہ جو سپاہی کھڑا تھا، اپنی جگہ سے نہ ہلا بیشک یہ سچا سپاہی تھا، سب بھاگے جارہے تھے مگر یہ اپنی جگہ کھڑا تھا، یہاں کھڑا رہنا اسکا فرض تہا، اس مقام کی حفاظت کے واسطے یہ مامور کیا گیا تہا، اور اس نے اپنا فرض بجا لانے میں مطلق پس و پیش نہ کیا، نتیجہ یہہ ہوا کہ اسکا بدن تودۂ خاک ہو گیا، مگر اسکی یاد ابتک تازہ ہے، یہہ سپاہی تربیت یافتہ تھا، اسکا کیرکٹر مکمل تھا، اور بے شک اس میں اغراض و مقاصد کی دیانت پائی جاتی تہی

کیرکٹر جس کے معنی اخلاق ہیں، کسی علم و فضل کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ ایک طرح کا ضبط و انضباط ہے، جو چال چلن میں قربانیوں سے پیدا کیا جاتا ہے، اور جو ہوا و ہوس کے دبانے اور روحانی صفات کی ترقی پر منحصر ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اخلاق ایک ایسی صفت ہے، جو محض منکسرانہ برتاؤ سے حاصل ہو سکتی ہے، مگر ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ جو لوگ بالطبع منکسر المزاج ہیں، اور اون کا برتاؤ بھی مودبانہ ہے، لازمی طور پر اون کا چال چلن پاکیزہ نہیں ہوتا اور انواع و اقسام کے امراض اخلاقی میں وہ مبتلا پائے جاتے ہیں پس ایسے اشخاص کو کسی حالت میں ذی اخلاق نہیں کہہ سکتے، کیرکٹر کے ساتھ بہت سے فرایض وابستہ ہیں، اور جب تک اُن واجبات کی پابندی نہ کی جائے، محض عجز و انکسار سے کیرکٹر نہیں بنتا، بلکہ اخلاق کی درستی کے لئے نفس کو بُری نیتوں، خراب ارادوں، رذیل عادتوں اور جملہ آلائشوں سے پاک کرنا چاہئے، جارج ہربرٹ کہتے ہیں کہ ایک ذرہ اخلاق، من بھر علم سے بہتر ہے، ممکن ہے کہ ایک شخص

عقل وفہم اور علوم وفنون میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا ہو لیکن دیانت، نیکی، سچائی، اور فرض کی بجا آوری میں اوسکا درجہ بہت سے غریب اور جاہل کسانوں سے بھی نیچا ہوگا" ایک فلاسفر نے ایکبار اپنے دوست کو لکھا کہ تم ذی علم لوگوں کی عزت اور قدر ومنزلت کرنے پر اصرار کرتے ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ اچھی عادت ہے، لیکن اسکے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے، کہ کشادہ دلی، غور وفکر، دنیا کا تجربہ، عمدہ عادات واطوار، کام کا شوق، دیانت اور صداقت کی محبت، ان اوصاف کی اکثر زبردست سے زبردست عالم وفاضل میں بھی کمی رہتی ہے" ایک لڑکے سے جب پوچھا گیا کہ تم نے فلاں باغ کے سیب کیوں نہ چرالئے، وہاں تو کوئی دیکھنے والا نہ تھا، اوسنے جواب دیا کہ ہاں، مگر میں خود بہت بڑا دیکھنے والا وہاں موجود تھا، میں کسطرح پسند کرتا کہ آپ اپنی نظروں میں ذلیل بنوں، جب تک یہ قوت ارادی، اور یہ نور ایمان انسان میں پیدا نہیں ہوتا، اسوقت تک اسکا چال چلن محفوظ نہیں رہ سکتا جس طرح پرہیزگار شخص کو شراب خواری سے خود بخود نفرت پیدا ہوجاتی ہے، اور مآل اندیش کو عیاشی اور فضول خرچی سے عداوت ہوجاتی ہے اسیطرح بری عادتوں سے محفوظ رہنے کیلئے صرف اچھی عادتوں اور پسندیدہ باتوں کا اختیار کرنا کافی ہے۔

جرمن شیلر کہتا ہے کہ "خدا نے دنیا میں انسان کو بہت کم مہلت دی ہے ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سے دشمنوں پر ہم کو غالب آنا ہے، بہت سی مشکلات میں پڑنا اور بہت سے مرحلے طے کرنا ہے، بہت سی برائیوں کو روکنا، بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنا ہے، بہت سی ضرورتوں کو مہیا کرنا اور بہت سی نیکی کرنا ہے" بہادر اور متدین لوگ روپیہ کی خاطر کام نہیں کرتے، بلکہ یہ کام کرتے ہیں، الفت کیواسطے، عزت کیواسطے اور چال چلن کیواسطے، جسوقت سقراط نے اپنے اخلاقی اصول سے دست کش ہونے کے بجائے موت قبول کرلی تو اوسوقت اوسکو نہ روپیہ کا خیال تھا نہ ملک کا۔ اینڈریو مارول ایک محب وطن تھا، اوسنے بھی انجام تک شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، اور اسکا چال چلن بے داغ رہا، اسکی قبر پر مقام ہل بنی ہوئی ہے۔ جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے" نیکوکار اسکے شیدا تھے بدکار اس سے ڈرتے تھے، معدودے چند لوگوں نے اسکی تقلید کی، اور اسکے عہد میں شاید ہی کوئی اسکا ثانی ہو"

انسان اپنی زندگی کو جیسا چاہے بنا سکتا ہے، اس دنیا میں یہ امر بالکل ہمارے امکان میں ہے کہ کارآمد بنیں یا نکمے: اخلاق یا اچھا چال چلن جسطرح قوموں کی کامیابی کا ذریعہ ہیں، اسیطرح افراد کی کامیابی کا بھی وسیلہ ہوسکتے ہیں، یہ سچ ہے کہ بعض لوگ اخلاق کے بغیر بھی دنیا میں کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اونکی کامیابی اصولی ترقی کے ذیل میں نہیں آسکتی۔ دنیا میں حقیقی کامیابی ایک ایسی زندگی سے پیدا ہوتی ہے، جس میں فرض کی ادائی اور چال چلن کی اصلاح میں سختیاں برداشت کیجائیں، خطرات کا مقابلہ کیا جائے، استقلال اور ثابت قدمی کیساتھ ایک کام برابر کیا جاتا رہا ہو، جو ایک ہی مقصد کو منضبط کرتا اور دوسرے خیال کو آنے نہ دیتا ہو، ایک ہی خیال کے مختلف پہلو سوچتا اور اوسکے مالہ وما علیہ پر غور کرنے کی مشق کرتا ہو، اور جو ہمیشہ سچائی، دیانتداری، اور فرض کے متعلق اپنے ضمیر کے مشورہ پر قایم رہا ہو، جس نے فرض کو کامیابی کے خیال پر مقدم رکھا ہو، جس نے سرگرمی کے ساتھ برائیوں اور گناہوں کے خلاف جنگ کی ہو، جو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہو، اور جو اعلیٰ اصول کا پابند رہا ہو، اسکی زندگی کسی طرح ناکام نہیں رہ سکتی۔

یہ نہایت پسندیدہ بات ہے کہ زندگی کے پروگرام میں اعلیٰ مقاصد ابتدا ہی سے داخل کرلئے جائیں۔ لارڈ ارسکن نے بدشعوری ہی سے استقلال اور راستی کے جو اصول اختیار کئے تھے وہ اس لایق ہیں کہ قوم کا ہر فرد اون کو اپنے لوح دل پر نقش کرلے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جب مجھے شعور آیا

تو پہلا اصول میں نے یہ اختیار کیا کہ جس کام کے متعلق میرا ضمیر حکم کرتا تھا کہ یہ فرض ہے' بس بلاتامل اوسکو کرگزرتا تھا اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرتا تھا' وہ ابتدائی زمانہ مجھے یاد ہے میں اس عادت کا معتقد ہوں' اور اسی اعتقاد و یقین کو قبر تک اپنے ہمراہ لیجاؤنگا' آجتک میں نے اس اصول کو کبھی نہیں توڑا' اور نہ مجھے اس بات کی شکایت ہے کہ اسکی مزاولت سے مجھے بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑی ہیں" وہ شخص جو اوپر نہیں دیکھتا اُسے پستی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیگا' جو جانور اڑنا نہیں جانتا وہ زمین پر رینگنے کے سوائے اڑنا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کسی قوم کے اخلاق و خصایل ہی سے اوسکے عروج و زوال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے قدما جنکے کارہائے نمایاں کی تقلید کے ہم آرزومند ہیں اون کا کیرکٹر بے داغ تھا' مگر کیرکٹر کیا چیز ہے' کیرکٹر دراصل اخلاقی صفات کا دوسرا نام ہے' انہی صفات کے باعث انسان کی عزت کیجاتی ہے' اسی کے سبب سے ایک شخص دوسرے کا معتقد ہوتا ہے' اسی کے ہوتے ہوئے ایک شخص زیادہ معزز خدمت حاصل کر سکتا ہے' ایک کارخانہ دار جب کسی کو ملازم رکھتا ہے۔ تو اوس کے نوکر رکھنے کا بہت بڑا سبب یہ ہوتا ہے' کہ جس شخص کو ملازم رکھا گیا ہے' وہ ایماندار اور راستباز ہے' یعنے اوسکا چال چلن بیداغ ہے' ایسی عادات کے پیدا کرنے کے لئے انسان کو زندگی کی چھوٹی بڑی تمام باتوں میں اخلاق کے نشو ونما کا خیال رکھنا چاہئے اور شکسپیر کا یہ قول مدنظر رکھنا چاہئے کہ "اپنی ذات کے ساتھ وفادار اور صادق رہو اسکا انجام یہ ہوگا کہ تم ہر شخص کے ساتھ صادق اور وفادار رہوگے" ؎

ہنوز ایں نقشہا در خامۂ نقاش جا دارد

سیّد علی اصغر بلگرامی

غنی کشمیری

ہر چند فطرتی و منظہری و فروغی وغیرہ بھی کشمیری شاعر ہیں۔ اور یہ سب دربار ہائے خاندان مغلیہ میں اعزاز حاصل کر چکے ہیں اور ان کے کمال کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن ملا محمد طاہر غنی کشمیری بھی ایک ایسا نازک خیال شاعر گذرا ہے جو نہ صرف کشمیر اور ہندوستان میں مشہور ہے بلکہ ایران تک اسکی سخنوری کا شہرہ پہنچا ہے۔ مرزا صائب کو غنی کے کلام سے خاص دلدادگی تھی اور جب کوئی ہندوستان سے ایران جاتا تھا تو وہ فرماتے تھے کہ تم ہمارے لئے ہندوستان سے بھلا کوئی تحفہ لائے ہو۔ یعنے غنی کشمیری کے کچھ تازہ اشعار سناؤگے۔ صائب ایسے شاعر کا یہ کہنا غنی کے دستگاہِ سخن کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مرزا صائب نے غنی کے دو سو شعر انتخاب کر کے ایک بیاض پر لکھے تھے۔ مرزا صائب نے غنی کے اس شعر۔

حُسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدیم

کو یہاں تک پسند کیا اور انتہائے جوش میں کہا کہ اگر غنی اپنے اس شعر کو مجھے دیدیں تو میں اپنا تمام کلام غنی کو دیدوں۔ اور میرزا عبدالقادر بیدل فرماتے ہیں کہ اگر مذکورۂ بالا شعر جلال اسیر

کا ہوتا تو میں شعر کہنا ترک کر دیتا۔ غنی کی نسبت ایسے ایسے باکمال شعرا کا یہ حسنِ ظن انکی انصاف پسندی اور سخن شناسی کو ظاہر کر رہا ہے غنی کے کمال کا اعتراف علی العموم کیا جاتا ہے۔ غنی کی طبیعت قلندرانہ اور درویشانہ تھی۔ کسی رئیس کی ملازمت نہیں کی۔ بادشاہ والا جاہ ہندوستان نے سیف خاں حاکم کشمیر کو لکھا کہ غنی کو پائے تخت میں روانہ کر دو سیف خاں نے غنی کو طلب کر کے کہا کہ آپ ہند کو جائیے بادشاہ نے آپ کو یاد کیا ہے۔ غنی نے انکار کیا اور کہا۔ کہلا بھیجو وہ (غنی) دیوانہ ہے۔ سیف خاں نے کہا کہ میں ایک عاقل کو دیوانہ کیونکر کہہ سکتا ہوں۔ غنی یہ سنکر دیوانہ وار گریباں پھاڑ کے روانہ تنہا نہ ہوئے اور تین دن کے بعد انتقال کیا۔ محمد علی ماہر نے غنی کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ خوب کہا ہے۔

چو داوش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد
تہی چوں کرد بزم شیخ را گفتند تاریخش
کہ آگاہے سوئے دار البقا از دار فانی شد

غنی نے جوانی ہی میں دنیا کو الوداع کہا ۱۰۷۹ھ۔ غنی نازک مزاج بھی حد کے تھے۔ عنایت خاں ناظم صوبہ کشمیر نے ایک بار غنی سے کہا کہ جو شعر ایک بار سننے سے سمجھ میں نہ آئے وہ شعر شعر نہیں۔ غنی کو یہ قول ناپسند ہوا اور کہا کہ آجتک میں تم کو سخن فہم سمجھتا تھا مگر آج سے معلوم ہوا کہ تم سخن فہم نہیں ہو اور پھر کبھی ناظم سے ملاقات نہیں کی غنی نے صرف تئیس برس شعر کہا اور اس قلیل مدت میں یہ شہرت اور کمال کہ کاملان فن نے غنی کو اُستاد مانا سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غنی کے اشعار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ ایک لاکھ سے زیادہ تھے مگر اس کا عشر عشیر ایک دیوان ہے۔ جسکو مرزا محمد علی ماہر نے جو شیخ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ کمال سعی سے ترتیب دیکر حق شاگردی ادا کیا ہے۔

آپ تصنع کے ساتھ شاعری نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فارسی و عربی کی تکمیل حضرت شیخ محسن فانی کی صحبت میں کی جو عالم باعمل ہونے کے علاوہ صاحبدل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ یہانتک کہ شیخ موصوف وقتاً فوقتاً آپ سے علمی مشورہ لیا کرتے تھے آپکی طبع رواں کی سلسال موج بحر بیکراں کیطرح ہر دم زوروں پر رہتی تھی۔ اور قلزم سخن کا شوق ایران تک لہریں لے رہا تھا۔ جس کے زور تلاطم کے ساتھ ایران کا ملک الشعرا مرزا صائب تبریزی سرمایۂ سخن کے بہجا مولانا غنی کے پاس کشمیر میں بلا تکلف کھنچا چلا آیا۔ دیرتک مُلّا کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ بقحوائے

کند ہم جنس با ہمجنس پرواز

شعر و سخن کے باہم خوب چرچے رہے پر لطف صحبتیں رہیں۔ آئے دن مرزا صائب کی تواضع کے لئے دماغ کے خوانچے سے تر و تازہ اشعار اچھوتے خیال اور معنی و بندش کے علاوہ جدت کے بیش بہا تحائف سے آراستہ و پیراستہ ہو کر پیش ہوا کرتے تھے جس سے مرزائے موصوف کی خوب روحانی غذا بنتی۔

مرزا جیسے قادر الکلام مسلم الثبوت اُستاد شاعر کو گرویدہ بنا لینا غنی مرحوم کے جادو اثر کلام کا کام تھا۔

ذکر ہے کہ مرزا موصوف کشمیر کے مناظر کی سیر کے لئے باہر تشریف لیگئے۔ چونکہ آپ ملا غنی کے ہاں ہی فروکش تھے اسلئے مرزا کی بیاض بھی وہیں پڑی تھی۔ تلامذہ فن سے ایک ارادتمند وہیں موجود رہتا تھا سرسری طور پر مرزائے موصوف کی بیاض اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مطالعہ کرتے کرتے ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ قلمزن کیا ہوا دکھائی دیا۔ اور مصرعۂ ثانی یہ تھا ؏ کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

باوجود کوشش کے بھی جب مصرعۂ اول نہ پڑھا گیا تو ناچار ملا صاحب سے عرض کی کہ قبلہ یہ مصرعہ لکھکر کاٹ دیا ہے۔ یہاں کیا تھا؟ ملا صاحب نے فرمایا۔ مجھے کیا معلوم کہ کیا تھا۔ شاگرد نے پھر عرض کی کہ یہاں کیا ہونا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ غور کیا جائے کہ یہاں کیا ہونا چاہیئے پھر ذرا سی فکر کے بعد فرمایا۔ کہ میرے خیال میں یہ ہونا چاہیئے ؎

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت
کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

شاگرد نے وہیں وہ مصرعہ لکھدیا۔

ایک دفعہ مولانا نے یہ شعر لکھا ؎

موئے میاں تو شدہ کرالپن   گرد جدا کاسۂ سر از تن

کہتے ہیں کہ اس شعر کا یہی لفظ کرالپن ہی مرزا کو تبریز سے کشمیر لانے کا باعث ہوا تھا۔ یہ لفظ چونکہ کشمیری زبان سے تھا۔ اسلئے مرزا اس سے نا آشنا تھے۔ حضرت کیخدمت میں پہونچکر کرالپن کی تحقیق فرمائی جسکا ملا صاحب نے جواب دیا "کرالپن نام رشتہ ایست کوزہ گران کاسہ را از چرخ جدا می سازند" یہ تشریح سنکر مرزا بار بار اس شعر کو پڑھتے تھے اور فرطِ مسرت سے بے اختیار جھومتے تھے۔

افلاس جو ازل سے شعرا کا خاص حصہ ہے۔ ملا صاحب باوجود تخلص غنی کرنیکے بھی افلاس سے نہ بچ سکے۔ اسپر بھی آپ متوکل پیشہ اور قناعت پسند تھے۔ شہنشاہ ہند کے ایما سے حاکم کشمیر سیف اللہ خاں نے آپ کو دربار میں تشریف لیجانے کے لئے عرض کیا۔ مگر آپ نے دیوانگی کا عذر پیش کر کے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ذیل کی روایت سے حضرت کے افلاس دنیا میں بھی مطمئن رہنے کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی جگہ الگ بنوائی تھی جسمیں فکر سخن کیوقت یہ لعل بے بہا جلوہ فرما ہوا کرتا تھا۔ وہاں ایک دن ایک صاحب آپ کی ملاقات کو آئے۔ دروازے کھلے پائے اور حضرت کو وہاں نہ پاکر واپس چلے گئے۔ دوسری دفعہ پھر انہیں حضرت کو شوق ملاقات آپ کے آستانہ پر کھینچ لایا۔ دروازے کو بند پاکر دستک دی۔ ملا صاحب نے اندر سے دروازہ کھولا۔ آنیوالے صاحب نے حیرانگی سے استمزاج کیا کہ میں ایک دفعہ پیشتر حاضر خدمت ہوا۔ آپ نہ تھے۔ مگر آج آپکی موجودگی میں دروازہ بند پایا۔ اسکا کیا سبب ہے تو آپ نے فرمایا کہ متاع دوکان تو میں ہی ہوں جب میں ہی یہاں نہ ہوا تو دروازہ بند کرنا بے سود۔ اب چونکہ میں موجود ہوں لہذا دروازے کا بند ہونا لازمی تھا۔

غنیؔ غالباً تجرد پسند ہی رہے اور کوئی اولاد بجز زادہائے طبع (اشعار) کے نہیں چھوڑی۔ دیوان کی ترتیب غنی کے ایک شاگرد مسلمؔ نے کی۔ مسلمؔ نے اپنے اُستاد کی دو تاریخیں کہی ہیں۔ دونوں کے مصرعہ ہائے تاریخ حسب ذیل ہیں۔

نہاں شدہ گنج ہنرے زیر زمیں

۱۰۷۹ھ

دیگر

حیّ غنیا

لباس ما بکساراں تعلق بر نمی تابد
بود ہمچوں حباب از بخیہ خالی پیرہن مارا

تعلقات کے دشوار گزار مرحلوں سے آپ کس سبک روی کے ساتھ نکل گئے ہیں کیا خوب فرماتے ہیں کہ جس طرح احباب کا پیرہن بخیہ سے خالی ہے۔ ہمارا بے لوث دامن بھی آلایش دنیا سے پاک ہے اہل دل لوگوں کا یہی خیال ہونا چاہیئے۔

دم جاں بخش او تا رنگ حیرت بخت عالم را   زہر آئینہ در پیش نفس دیدم مسیحا را

محبوب کے دم جاں بخش کا رنگ حیرت اس عالم میں اس خوبی سے گرایا گیا ہے اور آپ کو دم مسیح کے سامنے جسطرح اپنا آئینہ پیش کرتا ہوا

نظر آتا ہے۔ اُس جاں بخشی کا رنگ دیکھکر مسیح محو حیرت ہے کہ میری مسیحائی خاک میں ملی جاتی ہے۔ مسیحا اور آفتاب کی منزل گاہ چونکہ چرخ چہارم ہے۔ اسلئے تقابل ضروری تھا۔

رندانہ

جہاں تمام سخر زجام شد جمشید را ۔ بگیر جام کہ خواہی گرفت عالم را

لطف زبان

یار با آئینہ می گوید زند ئے التفات ۔ سادہ رویاں دوست میدارند روئے سادہ را

توکل اہل سخن

صاحب سخن ز جنبد از بہر قوت از جا ۔ دایم بخانہ خود روزی رسد زبان را

ذیل کے شعر میں خیال آفرینی ملاحظہ ہو۔ اپنے دست و پائے شکستہ کا علاج خود ہی کیا ہے مگر ایک اور لطف بھی پیدا ہوتا ہے کہ زندگی میں انکی (دست و پا) درستی محال تھی۔ آخر کار تختۂ تابوت سے چوب بندی کی یعنے مرکر اپنا علاج کیا۔

چوں شکست دست و پایم بر ہے دیگر نداشت ۔ عاقبت برخویش بستم تختۂ تابوت را

وصف نرم زبانی

وضع ملایم بود تیغ زباں را سپر ۔ تیرہ نہ سازد نفس آئینۂ آب را

شمع و پروانہ کے مضامین صدہا مضامین دیکھے سُنے لیکن غنی نے بالکل ہی نئے رنگ میں شعر کہا ہے پروانہ کو مرنے کی طرف غیرت دلاکر توجہ دلائی ہے اور وجہہ کیا خوب بتائی ہے کہ شمع جو تیری معشوق ہے دوسروں کے مزار پر جاکر روشن ہوتی ہے۔ حالانکہ اُسکو تیری ہی خاک پر رہنا چاہیئے۔

پروانہ گو بمیر ز غیرت کہ شمع را ۔ روشن کنند خلق بخاک مزارہا

خواب دم صبح

مرگ گوارا شود موئے چو گردد سفید ۔ لذت دیگر بود خواب دم صبح را

اس شعر کے لطف اور ادا بندی پر صدہا شعر نثار کئے جاسکتے ہیں

حسن و عشق کے تعلقات کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ معشوق کی بیوفائی کو کس خوبی سے ثابت کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

چشم تو بمن خواست کہ پیغام فرستد ۔ گرداند زبہ چوں شرہ از تازنگہ را

نیا جام اور تازہ شراب

جام لبریز سر زانوئے تفکر نیست ۔ باشد خیال تازہ شراب کہن مرا

نازک خیالی

ذیل کا مطلع کسقدر معنی خیز ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں کہتے ہیں کہ تیرے لعل (لب) کے دور میں پیمانہ شراب پُر ہوگیا یعنے شراب کا وجود نہ رہا یا اسکو کوئی پیتا نہیں اور دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں جب یہ حال ہو تو میں ڈرتا ہوں کہ خانہ شراب دوبارہ خراب نہ ہو۔ لطف معنوی کے سوا تناسب الفاظ کس حد کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

پر شد بدور لعل تو پیمانۂ شراب ۔ ترسم دگر خراب شود خانۂ خراب

مذمت گدائی بطور واقعہ

ز شرم انگشت دارد در دہاں طفل ۔ سر پستاں گرفتن ہم گدائی است

ذیل کے مطلع میں تخم اشک سے گل آتش کو اُگایا ہے۔ کیا فکر اور تلاش ہے مضمون خلاف واقعہ بھی نہیں:-

سوز دلم چو شمع بجائے رسیدہ است ۔ کز تخم اشک من گل آتش دمیدہ است

اسی زمین میں یہ دو شعر بھی قابل تعریف ہیں۔ پہلے میں قوس و قزح کے رنگ اُڑنے کو ملاحظہ کیجئے۔ اور دوسرے میں نسیم مصر کے فیض و اثر کو دیکھئے کیا مناسب تلمیح ہے:-

قوس قزح اگرچہ بگردوں کشیدہ سر ۔ ابرو ئے یار دیدہ و رنگش پریدہ است

افتاد گل ز دیدۂ یعقوب بیچو اشک ۔ دانم نسیم مصر بکنعاں رسیدہ است۔

عاشقانہ

بالش خوباں دگر از پرست ۔ شوخ مرا فتنہ بزیر سر است

نئی مثال

وایم بیادِ شوق جلوریز می رود گلگونِ اشک راشرہ ام تازیانہ است

گلگون اشک کی ترکیب دیکھنے کے قابل ہے ۔ گلگون اشک کی تعریف یہی ہے اور جب مژہ کو تازیانہ کہا تو گلگوں کے معنی اسپ سرخ رنگ کے بھی ہیں۔

عبرت

غافل مشو زعاقبت کار خود غنی دل نہ بخواب مرگ کہ دنیا فسانہ ایست

ولہ

دل منور کے شود در ظلمت آباد بدن شمع را روشن نمی سازند تا در قالب است

تشبیہات

در اضطراب از شب تارم ستارہ ہاست یا در میان سوختہ کاغذ شرارہ ہاست

دلہائے عاشقاں بہ دو دست آبلہ شد اما بپائے نازک او شیشہ پارہ ہاست

ولہ

چہ غم ازیں کہ بط بادہ سست پرواز است کہ در گرفتن رنگ پریدہ شہباز است

بطِ سست پرواز کو شہباز ثابت کرنا حد کی قادر الکلامی ہے اور لطافت ایہامی کو اہل سخن سمجھ سکتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ گو بط بادہ سست پرواز ہے مگر رنگ پریدہ کے پکڑنے میں شہباز ہے ۔ یعنی شراب رنگِ رخ کو تازہ کردیتی ہے ۔ یہ شعر رندانہ رنگ میں جس پایہ کا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

ایضاً رندانہ

توبہ از مے کنم در پیری مے کشی در شب مہتاب خوش است

بے سامانی

مرا بخانہ صفائی ز بینوائی نیست خوشم کہ در کف من ساغر گدائی نیست

ولہ

شمشیر او ہلاک رگ دل بریدن است ایں آب تیز تشنۂ منزل بریدن است

مطلع کتنا لطیف نازک ہے مصرع اولیٰ میں کہا ہے کہ اس کو ہلاک ساختن لیجئے اور اور آب تشنہ منزل بریدن ۔ ہوبہو کیا خوب مثال ہے ۔ آب تیغ کی کیا اچھی تعریف ہے ۔

غم نصیبی

ما را بغیر داغ جگر در ایاغ نیست چوں لالہ درد ساغر ما غیر داغ نیست

رشک

سباد مے کہ بہ سودائے زلف دلبر خاست مرا ز رشک بہ تن ہمچو شانہ مو بہ خاست

مفلس کی کوشش کے متعلق یہ شعر کسقدر سچا ہے ۔ اور مصرعۂ ثانی میں مثال دیگر واقعہ کو بالکل صحیح ثابت کر دیا۔

سعی مفلس کے بجائے مے رسد آہ می بے برگ تیر بے پر است

غنی نے ہر رنگ میں طبع آزمائی کی ہے ۔ نازک خیالی اور مثال میں تو یہ دوسرے صائب ہیں ۔ تصوفانہ رنگ میں بھی خاص لطف پیدا کیا ہے ۔ غنی کا دیوان جواہر میں تولنے کے قابل ہے ۔ اگر کسی سخن شناس امیر شہزادہ کے جلیس و قریں ہوتے تو یقینی انکو اپنے اشعار کے صلہ میں لاکھوں روپیہ ملا ہوتا ۔ اور جن بادشاہوں نے بعض شعرا کو ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ روپیہ دیدیا ہے ۔ ایسے اشعار غنی کے دیوان میں بکثرت ہیں ۔ چند اشعار کا انتخاب ان کے دیوان سے اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ سخن سنج حضرات کو لطف تازہ حاصل ہو اور اردو گو شعرا فارسی شعرا کی نازک خیالیوں سے متاثر ہوں تاکہ موجودہ اردو شاعری کو نازک خیالیوں سے مالا مال کرنے کا خیال پیدا ہو۔ میرے ذہن ناقص میں فارسی شاعری میں ہزارہا خیال ایسے ہیں جنکی جھلک تک اردو میں نہیں آئی ہے ۔ ناظرین غور و انصاف سے غنی کی معنی آفرینی ملاحظہ فرمائیں ۔

مطلع اولیٰ

جنونے کو کہ از قید خرد بیروں کشم پا را کنم زنجیر پائے خویشتن دامان صحرا را

یہ مطلع سرسری نظر سے دیکھئے تو صرف عاشقانہ ہے لیکن غور سے ملاحظہ

کیجئے تو تصوفانہ ہے۔ جنون سے مراد جذبۂ عشق ہے اور عشق اربابِ تصوف
کے نزدیک اسی کو کہیں گے جو ذاتِ باری تعالیٰ سے ہو۔ عاشقانِ خدا
اپنی وارفتگی سے مجنون نظر آتے ہیں اسلئے کہ وہ دنیاوی آرائش و تکلفات
سے بری ہیں اور بعضے بے بصیرت انکو بے خرد بھی کہتے ہیں۔ غنی
کہتے ہیں کہ ایسا عشق کہاں ہے۔ یعنے بہت مشکل ہے کہ میں قیدِ خرد
سے پاؤں باہر کھینچ لوں اور دامانِ صحرا کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈال لوں
یعنے اہلِ دنیا سے قطع تعلق کرکے صحرا نشین یا عزلت گزین ہو جاؤں
کتنا پُر معنی مطلع ہے ناظرین نے تمہید میں ملاحظہ کیا ہے کہ غنی بادشاہ
کی ملازمت کا ذکر سنکر دیوانہ وار جنگل کو چلے گئے اور تیسرے روز وصال
ہو گیا۔ اللہ اللہ غنی کو دنیا سے کسقدر گریز تھا۔ غنی شاعر کاہے کو اعلیٰ
درجہ کے صوفی تھے۔

توقیرِ محتسب

بہ بزمِ مے پرستاں محتسب خوش عزتے دارد   کہ چوں آید بہ مجلس شیشہ خالی میکند جا را

اسی زمیں میں غنی نے مطلع کیا خوب کہا ہے۔ کتنی پاکیزہ تلمیح ہے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن   کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشمِ زلیخا را

بے تعلقی

لباسِ ما سبکساراں تعلق بر نمی تابد   بود ہمچوں حباب از بخیہ خالی پیرہن ما را

رندانہ

بود از شعلۂ آوازِ قلقل بزمِ مے روشن   سرت گردم مکن خاموش ساقی شمعِ مینا را

یہ شعر جسکو میں نے رندانہ کہا ہے یہ تصوف میں بھی ہے اور نیچرل
رنگ میں بھی۔ اسلئے کہ اگر شمعِ مینا سے مراد حیات اور روح لے لیجائے
تو شعر کے معنی بدرجہا بڑھ جائینگے معنی سنج حضرات خود غور فرمائیں۔

معنی نازک

اگر لب از سخن گوئی فرو بندیم جا دارد   کہ نبود از نزاکت تابِ بستن معنی ما را

طفلِ بدخو کا گہوارہ

فلک در گردش است از بہرِ خوابِ بختِ ناسازم   بود جنبشِ گہوارہ راحت طفلِ بدخو را

دشمن کی عاجزی

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہیست   پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

تصوف و عرفان

دل بہ استدلال بستم ماندم از مقصود دور   نردباں کردم تصورِ راہِ ناہموار را

غنی نے خوب بات بیان کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرفانِ الٰہی میں دلیل
اور نشان ڈھونڈھنا اصلی مقصد سے دور ہو جانا اور راہِ ناہموار کو نردبان
(سیڑھی) تصور کرنا ہے۔

ایضاً

گرم رو مانندِ شمعم بسکہ در راہِ فنا   دور نہ بود گر بسوزد در کفِ دستم عصا

حب الوطنی

بسکہ شد زنجیرِ پایم رشتۂ حب الوطن   در سفر دایم چو سوزن چشم دارد در قفا

شوقِ سنگ خوردن

گر رسد در گوشِ من آوازِ سنگِ کودکاں   میروم از خانۂ زنجیر بیروں چوں صدا

راحت رسانی

سعی بہرِ راحتِ ہمسایگاں کردن خوش است   بشنود گوش از برائے خوابِ چشم افسانہا

اس زمین میں ایک شعر کتنا نیا کہا ہے اور کتنی پاکیزہ مثال ہے شمع
کا پروانہ کے غم میں انگلی کاٹنا شاید کسی شاعر نے کہا ہو۔ مگر سنا نہیں
مضمونِ شعر بہت لطیف ہے مرنیکے بعد افسوس و قدر سے کیا حاصل
مطلب یہ ہے کہ دوست کی قدر زندگی میں کرنا چاہئے

بعدِ مرگم گر خورد افسوس آں سرکش چہ سود   می گزد انگشت شمع از بہرِ پروانہا

مثال

سنگیں دل است ہر کہ بظاہر ملائم است   پنہاں درونِ پنبہ نگر پنبہ دانہ را

تلاشِ مضمونِ نو

در مکرر بستنِ مضمونِ رنگیں لطف نیست   کم دہد رنگ از کسے بندد حنائے بستہ را

معرفت

بیا بلبل ببیں در پردۂ گل آفتابے را   چرا از سادگی محبوب خود کردی نقابے را

بلبل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو گل پر کیا فریفتہ ہے بلکہ پردۂ گل ہٹا کر آفتاب حقیقت کو دیکھ نقاب نہیں بلکہ چہرۂ معشوق حقیقی کو دیکھنے کی کوشش کر یعنے مجاز سے حقیقت کو پہچان۔ خوب شعر کہا ہے۔

عبرت

تابوت مردۂ دوش ہشیار کرد ما را   پائے بخواب رفتہ بیدار کرد ما را

غنی کی نازک خیالی کو دیکھنا چاہئے کیا بات پیدا کی ہے۔ قاعدہ ہے کہ انسان کو مردہ دیکھکر موت یاد آتی ہے۔ مصرعۂ ثانی میں کیا پاکیزہ مثال پیش کی ہے اور محال کو ممکن ثابت کر دیا۔ سوئے ہوئے پانوں نے ہشیار کیا یعنے مردہ (جو بے حس ہے) نے ہم کو عبرت دلوائی ذیل کے ایک مطلع میں کتنی مختلف باتیں موزوں کر دی ہیں اور پھر کس عاشقانہ اور رندانہ رنگ میں۔

سجدہ در مسجد و در میکدہ پیمانہ خوش است   گریہ در خانقہ و خندہ بمیخانہ خوش است

ولہٗ

کشمیر از صباحت روشنگر جہان است   حسن سیاہ آنجا گر ہست خال ہست

عاشقانہ

آں شوخ بقتل من و لخت میان است   در مرثیہ ام معنی باریک توان بست

ایضاً

شمع میگوید بہ اہل بزم با سوز و گداز   سر بریدن پیش این سنگین دلان گل چیدن است

ذیل کے شعر میں عاشقانہ نازک خیالی ملاحظہ ہو۔ غنی سا صوفی مزاج گوشہ نشین اس رنگ میں نکالے۔ کتنا گہرا رنگ تغزل ہے۔ پائے حنا بستہ پر سر گھسکے حنا سے صندل کا کام لیا ہے۔

چو سر بپائے تو سودم ز درد سر رستم   حنائے پائے تو ام کرد کار صندل سرخ

لب لعلت چو مقابل بہ مئے ناب شود   ساغر بادہ ز خجلت چو حباب آب شود

اسی زمین میں یہ مطلع بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

عاشق از آرزوئے مرگ چو بیتاب شود   زر بقاتل دہد از کشتہ سیماب شود

غنی نے اس مطلع میں ایسی نازک خیالی کی ہے۔ جسکی داد دینا مشکل عاشق بیتاب کو سیماب قرار دیکر دست قاتل سے کشتہ ہونا عجیب خیال آفرینی ہے۔ سیماب جب کیمیائی ترکیب سے کشتہ ہوا تو وہ اکسیر ہے اور اس سے سونا بنانا مشکل نہیں۔ پس اس طور سے قاتل کو زر دیا گیا اللہ اللہ کیا آرزوئے قتل اور کیا قدر دانی قاتل ہے۔

مرگِ عزیزاں

زندہ در گورم اگر گردش افلاک کند   بہ کہ در مرگ عزیزاں بسرم خاک کند

وجہ گریہ

میکنم گریہ ز آلودگی دامنِ خویش   اشک تا دامن آلودۂ من پاک کند

وصفِ خاموشی

بے زباں باش اگر میل فراغت داری   طفلِ اشک است ز تکلیف دبستاں آزاد

عبرت

نشانے نیست در خمخانۂ خاک از مئے عشرت   ز جام خالیٔ نرگس ہمیں آواز می آید

اس شعر میں جس لطف سے عبرت کا رنگ پیدا کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ خم خانۂ خاک (دنیا) میں سچی خوشی کا معدوم ہونا اکثر اشخاص خصوصاً اہل اللہ کے نزدیک یقینی ہے۔ مصرعۂ ثانی میں نرگس کا جام بنایا ہے۔ مگر یہ جام مئے عشرت سے خالی ہے اور خالی پیالہ کھنکھنانے سے آواز دیتا ہے۔ نرگس کا آواز دینا گویا لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ تم دنیا میں عشرت کے طالب نہ ہو۔

ولہٗ

محتسب بر در میخانہ نشستن دارد   توبہ چوں شیشۂ مئے قصد شکستن دارد

فروتنی

نقش پایم زرہ خاک نشینی گوید کہ بہر جا کہ نشانند نشستن دارد

ولہٗ

اشک کے موتی میں تاگا یا رشتہ ڈالنا آجتک نہیں سنا غنی گوہر اشک میں تارِ نگہ اسلئے ڈالتے ہیں کہ آویزہ دُرِ بنا گوش یار میں جگہ پا گئے

تارِ نگہم رشتۂ گوہر شدہ از اشک این دیدہ تمنائے بنا گوش کہ دارد

چاک پیراہن یوسف

چاک پیراہن یوسف نہ بود بے معنی خندہ بر پاکیٔ دامان زلیخا دارد

ترکِ غرور

ازیں ہوا کہ ترا در سراست می ترسم کہ چوں حباب رود عاقبت سرت بہ ہوا

ذیل کے شعر میں مضمون کی عمدگی اور خیال کی سچائی کو ملاحظہ کیجئے کہاں خیال پہنچا ہے بات معمولی ہے لیکن ہر شخص کا ذہن اس واقعہ کی طرف نہیں پہنچتا۔ عنانِ عمر کا دستِ اختیار میں نہ ہونا کتنی واقعی بات ہے اور مصرعۂ اولیٰ میں جنبشِ نبض سے اپنے خیال کو کیسا سچا ثابت کیا ہے۔

معلوم شد ز جنبشِ نبضم کہ یک نفس در دست اختیار نباشد عنانِ عمر

اعجاز لکھنوی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا پیام قوم کو

جو انہوں نے اپنی وفات حسرت آیات کے چند روز قبل خاکسار ایڈیٹر کو بھیجا تھا

جنابِ من - میں بیمار ہوں اور کم فرصت۔ جو کچھ ممکن ہو گا "عصر جدید" کے لئے لکھونگا بہر حال ایک مختصر رائے یا مضمون بھیجتا ہوں وہو ہذا۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت

مسلمانوں کو سب سے بڑی ضرورت سادہ معاشرت کی ہے اور یہ ناممکن ہے جب تک کہ اُن میں جفاکشی کا مادّہ اور راستی نہ پیدا ہو۔ اور اُس کے لئے ایک اعلیٰ مطمحِ نظر ہونا لازم ہے۔ تاکہ اپنی دولت اور اپنے وقت' اپنی عزت' اور اپنے سوخ کو بہترین مقصد کے لئے استعمال کر سکیں۔ باہم عداوت اور بُری رسموں اور خراب عادتوں میں دولت اور وقت اور قوت کو ضایع نہ کریں۔ وہ مطمحِ نظر اسلام کی ترقی اور خلقِ خدا کی خدمت ہے۔ اگر یہ بات امیر و غریب سب کے سامنے ہو تو چند سال میں کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔

راقم غلام الثقلین

حیات و ممات

یہ مسئلہ حقیقتاً قابل غور ہے کہ جب موت زندگی کا خاتمہ ہے تو زندگی کیوں مصائب آلام اور خطرات سے پُر ہو۔

اس مسئلہ کے کئی پہلو ہیں اوّل یہ کہ جب انسان کو فنا ہونا ہے تو وہ اس دنیا میں کیوں محنت اور مشقت کرے۔ دوّم یہ کہ جب انجام موت ہے تو وہ اپنی زندگی کو مشکلات کا شکار کیوں بنائے۔ سوم یہ کہ جب انسان کی ہستی کا اخیر عدم ہے تو وہ اپنی فانی ہستی کو اس عالم کے چند روزہ کاروبار میں مصروف ہو کر کیوں خراب کرے۔

یہ وہ ادق مسایل ہیں جنہوں نے ہمیشہ کل ربع مسکوں کے حکماء کو تو کیا متقدمین اور متاخرین سب کو اپنی نوعیت، حالت اور کیفیت سے سرگردان اور حیران کر رکھا ہے ان مسایل کا آجتک کوئی قطعی یا فیصلہ کن تصفیہ نہ ہو سکا جو کسی انسان کے قلب کو مطمئن کر سکتا، گو دنیا کی موجودہ روش اس مسئلہ کے معانی اور مطالب کے خلاف ہے مگر حکماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس میں بہت سے عمدہ قواعد اور حکمت کے نکات مخفی ہیں۔

ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک روشن دوسرا تاریک مگر مسئلہ زیر بحث اپنے معانی اور الفاظ کے لحاظ سے دونوں سے الگ نہایت مطلب خیز اور مغالطہ انگیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسکی تہ تک پہنچنے کے لئے زیادہ غور و فکر اور عقل رسا کی ضرورت ہے۔

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کیسی ہی عمدہ زریں اور قابل قدر بات کیوں نہ ہو جب افراط اور تفریط کا رنگ اختیار کرتی ہے اپنی خوبی سے گرجاتی ہے یہی حالت بعینہٖ اس مسئلہ کی ہے اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنی زندگی محض بیکاری میں گذار دے کیونکہ اگر وہ ایسی زندگی بسر کریگا اس کا ہر لمحہ اور اس کا ہر تنفس اسکے اوپر وبال جان ہو جائیگا، شگفتگی، زندہ دلی، اور مسرت پژمردگی، افسردہ دلی اور یاس سے بدل جائیگی۔ اور یہ اسکے مقصد اور معانی کے خلاف ہے۔

جو کچھ اس مسئلہ کا ماحصل ہے۔ وہ بقول مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا بخوبی واضح اور روشن ہے یعنے (مرجاؤ قبل اسکے کہ تم کو موت آئے) اب اگر اس سے کوئی یہ سمجھے۔ قبل اس کے کہ تمہاری موت کا وقت آئے تم اپنے ہاتھ سے خود اپنی موت کا سامان کرو، خواہ زہر کہا کر خواہ کسی اور طریقہ سے۔ تو یہ درحقیقت اسکی سمجھ اور فہم کا قصور ہے۔ کہ وہ اس مقولہ کے اصل مقصد کو نہ سمجھا، ایشیا کے مشہور فلاسفر شیخ سعدی نے اسکے مطلب کو یوں ادا کیا ہے۔

اے برادر چو عاقبت خاک است
خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی

انسان میں دو طرح کی بیماریاں پائی جاتی ہیں ایک جسمانی اور دوسری روحانی یہ مسئلہ جو ہمارے پیش نظر ہے گو ہر دو جسمانی اور روحانی امراض کے روکنے اور معالج ہونے کا دعوٰے کرتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ روحانی امراض کے سدباب کرنے اور روکنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جو ایک محدود زمانے تک اس دنیا میں رہتا ہے۔ دنیا میں زیادہ منہمک ہو جاتا ہے گو اس کا ظاہری جسم تندرست و توانا رہتا ہے مگر اسکی روح طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا

ہو جاتی ہے۔

انسان عموماً اپنے جسم کی آرائش صحت اور تندرستی کا زیادہ خیال رکھتا ہے
اور روح کیطرف سے بالکل غافل ہوجاتا ہے وہ اس ترقی کو دنیا کے
دام تزویر میں پھنسکر قطعی بھول جاتا ہے کہ ایک روز اسکو فنا ہونا ہے اور
اس عالم کو چھوڑنا ہے۔ بڑے بڑے فاتح اور بہادر سے بہادر لوگ
جنکی زندگی کے حالات ہم روزمرہ کتب سیر میں پڑھتے ہیں۔ اگر غور
سے دیکھا جائے تو پر از رنج و محن ہیں ان کی زندگی گو ہماری نظر
میں نہایت ہی شاندار اور ہمارے گمان میں تکالیف سے بری ہے
لیکن دراصل ہماری معمولی زندگیوں سے بھی زیادہ پرخطر اور کہیں
زیادہ رنج و تکالیف سے بھری ہے۔

حق یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی روحانی اصلاح کرتے رہتے ہیں اور
صحت روحانی کو جسمانی سے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں انہیں
کی زندگی زیادہ خوشگوار اور رنج و الم سے پاک ہوتی ہے۔

اس مسئلہ پر غور کرنا کہ ہمارا انجام آخر فنا ہے ہمیں سینکڑوں
برائیوں سے روکتا ہے اور ہماری توجہ کو اسطرف مائل کرتا ہے
کہ ہم ایسے وسائل مہیا کریں جن سے ہماری زندگی اطمینان اور
مسرت سے گذرے اور ہمیں رنج و غم اور تکالیف سے نجات ہو۔
یہ مسئلہ ہمیں ایک ایسا زریں اصول سکھاتا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے
تو یہ تمام تکالیف اور مصائب سے ہمیں پاک کردیگا وہ اصول کیا ہے؟
قناعت: قناعت کے یہ معنی نہیں کہ گوشہ نشینی یا عزلت گزینی اختیار
کیجائے بلکہ حرص و آز سے بچنا اور ان کو دور سے سلام کرنا اصلی
قناعت ہے۔ ہمیں اس زندگی کو کبھی اصلی زندگی نہیں شمار کرنا
چاہئے۔ ہمیں یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ جو کچھ بھی وقت ہمارا یہاں
گذرے وہ خوشی انبساط اور اطمینان کے ساتھ گذرے اور یہ اپنے
اصلی معنوں میں بغیر درستی روح ممکن نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام فنا ہوتا ہے

دنیا اور اسکے عیش میں مبتلا ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے ہم روزمرہ
دیکھتے ہیں کہ جو لوگ دنیا کی اس ناپائدار دلربا عشرت کی بھول بھلیاں
میں پھنس جاتے ہیں اور اپنی عاقبت کو بالکل بھول جاتے ہیں وہ بہت
زیادہ تکلیفوں مصیبتوں اور طرح طرح کی جسمانی اور روحانی عقوبتوں
میں مبتلا رہتے ہیں۔ کاش وہ سمجھتے۔

دنیا خوابیست زندگانی دروے
خوابیست کہ درخواب بہ بینی آنرا

جب سے مغربی ترقی کا دور شروع ہوا ہے دنیا نے یوں سمجھ لیا ہے
کہ ایک نیا جنم لیا ہے لوگ اس زمانے کو دور ترقی کہتے ہیں مگر حکما
اسکے خلاف ہیں ان کے نزدیک یہ اصلی ترقی نہیں انکا خیال ہے کہ
جسقدر ممالک متمدنہ دنیاوی ترقی کرتے جاتے ہیں اسیقدر روحانی
ترقی رو بہ تنزل ہوتی جاتی ہے۔ دنیا نہایت ترقی کیساتھ مادی
ترقی کر رہی ہے اور دنیا کے مہذب ترین ممالک میں جو اسوقت اوج
ترقی پر خیال کئے جاتے ہیں روحانیت کا استیصال ہو رہا ہے۔ وہاں
ہر طرف حرص و ہوس کی آگ لگ رہی ہے جو ہر لحظہ اور ہر دم ترقی کرتی
جاتی ہے۔ یہ اس مہذب دنیا کی کشمکش کا خاکہ ہے جہاں صرف دنیا
ہی کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا گیا ہے اور اس ساری جد و جہد
کا نتیجہ دولت ہی کو سمجھا گیا ہے اور جسکی پیروی اب کل دنیا کرنا چاہتی
ہے دنیا اور اسکی زندگی کی مثال مثل خواب یا سراب کے ہے جسکی
وقعت خیال اور گمان سے زیادہ نہیں مگر انسان جو اپنے انجام کو
بھول گیا ہے اس دنیا کے کھلونوں ایسا مبتلا ہے کہ اس زندگی کو
ابدی اور اس مادی ترقی کو اصلی ترقی سمجھتا ہے جو درحقیقت اسکے
کل مصائب۔ آلام اور افکار کا سرچشمہ ہے ؎

عجب طرح کے حوادث ہیں بحر ہستی میں
ہراک کا حال یہاں مثل نقش آب رہا

اگر ہم فرض کر لیں کہ انسان ایسی ترقی کر گیا جو ممکن سے ممکن ہو سکتی ہو اور کرہ ارض ۔ باد ۔ آب ' اور آتش کا ہر سربستہ راز اسکے قبضہ قدرت میں آگیا تو کیا ممکن ہے کہ باوجود ایسی قدرت اور طاقت کے ان مصائب آلام اور تکالیف میں جن سے اسکو ہمیشہ رات دن سابقہ رہتا ہے ۔ کمی آسکے ۔

جسقدر قدرت اور طاقت بڑھتی جائیگی جسقدر شائستگی ترقی کرتی جائیگی اسیقدر ۔ زیادہ اسکی تکلیفیں اُسکی ضرورتیں اور اسکے رنج و محن زیادہ ہوتے جائینگے ۔ ذوق مرحوم فرماتے ہیں ۔

منہ سے بس کرتے نہ ہر گز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتے

ہم دیکھتے ہیں کہ جسقدر بزرگ خدا کے برگزیدہ اور اسکے مقبول بندے دنیا میں ہدایت کرنے اور راستی کا راستہ دکھانے اس دنیا میں آئے کسی نے دنیا حاصل کرنے اور اسکو اپنا معیار ترقی سمجھنے اپنی تمام زندگی دوڑ دھوپ میں گزارنے اور اسمیں نام آوری پیدا کرنیکی تعلیم نہیں دی ۔ بلکہ اس کے بجائے سادہ روی اختیار کرنے خدا کی یاد اور اسکی عبادت بجا لانے کی ہدایت کی جو زندگی کے خوشگوار بنانے اور اسے آرام و آسائش سے گذارنے کی بہترین وسایل ہیں ۔

مرزا برکت علی شروانی

اراده

انسان کی حرکات مختلف قسم کی ہوتی ہیں ایک تو وہ جن میں خواہشات کا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے نوزائیدہ بچوں کے حرکات جو پڑے ہاتھ پاؤں مارا کرتے ہیں ۔ مگر ان کا کوئی خاص مدعا نہیں ہوتا ۔ لیکن ذی شعور انسان کی حرکات کسی خاص مدعا کے حاصل کرنے کے لئے یا کسی خواہش کے دل میں پیدا ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں بعض اوقات بہت غور و فکر اور کوشش و سعی کے بعد ان کا ظہور ہوتا ہے جسکی ذہنی تصویر نفس ناطقہ کے سامنے کھنچی ہوتی ہے ۔

عقلمند لوگ خواہشات سے مغلوب ہو کر کسی مدعا کے حاصل کرنے کے لئے اندھا دھند کارروائی نہیں کر بیٹھتے ۔ بلکہ کسی امر کا ارادہ کرنے سے قبل گذشتہ تجربات پر غور کرتے اور نتیجہ کو اچھی طرح سمجھ کر ارادہ کرتے ہیں ۔ اور در اصل قوی اور مفید ارادہ وہی ہے ۔ جو عقل ' حافظہ ' واہمہ ' اور فکر کو پورے طور پر کام میں لانے کے بعد کیا جائے اعلیٰ درجہ کی قوت ارادہ دو یا زیادہ مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے وقت ظاہر ہوتی ہے ۔ یعنے جبکہ نفس ناطقہ کے سامنے دو یا زیادہ مدعا کی تصویریں حاضر ہوں اور اُن میں سے ایک کو اختیار کرنا اور دوسرے کو ترک کر دینا مقصود ہو ۔ اور پھر ان ذرایع اور وسایل کو اختیار کیا جائے جو منتخب کئے ہوئے مدعا کے حصول کے لئے ضروری ہیں ۔ جب انسان کسی شئے کی بھلائی برائی پر غور کرتا ہوتا ہے تو اُسکے تاثرات اور جذبات و خواہشات میں جوش پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اس غرض سے تامل کرتا ہے کہ مقاصد کی نفع و نقصان اور راحت و رنج کا صحیح اندازہ کرے ۔ اُسوقت خواہشات میں تناقص اور جھگڑا واقع ہوتا ہے اور انسان کی

قوتِ فیصلہ اُن میں سے کسی ایک مدعا کے حصول پر آمادہ کر کے قوتِ ارادہ کو مستحکم کر دیتی ہے۔

وحشی اور عقلمند میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ وحشی آدمی کا ارادہ اسکی خواہش کا تابع ہوتا ہے۔ مثلاً وحشی آدمی کو کسی دشمن کے مارنے کا خیال آئے تو وہ فوراً اسکو اپنے زہریلے تیر کا نشانہ بنائے گا۔ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن دور اندیش اشخاص اہم معاملات میں عرصۂ دراز تک غور و خوض کرتے اور نتایج کو سوچتے رہتے ہیں۔ اسی سے تجاویز انسانی دانشمندانہ خیال کیجاتی ہیں اور یہی انسان کی خواہشات کو حیوانات کی خواہشات سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں۔ کیونکہ شریفانہ اور مہذب زندگی اعمال کے نتایج پر غور و تامل کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے انسان میں خصایل حمیدہ پیدا ہوتے ہیں اور بجائے اسکے کہ وہ خواہشات کا تابع رہے جو خواہشات اسکی محکوم ہوجاتی ہیں۔

انسان اس دنیا میں دماغی اور اخلاقی اوصاف ساتھ لیکر آیا ہے اور ان اوصاف پر اسکا اثر بہت کم پڑ سکتا ہے اسکی زندگی میں جو واقعات اور حالات پیش آتے ہیں وہ کل یا اکثر اُسکے قبضۂ قدرت سے خارج ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ انسان میں محنت، ہنرمندی، اور استقلال کی ایسی قوت ہے کہ وہ بہت کچھ خارجی حالتوں کی صورت بدل سکتا ہے اس میں حزم و پرہیزگاری اور دور اندیشی کی قوت ہے تاکہ وہ اپنے نطرتی کمزور جسم کو طاقت سے عمر کو بڑھائے اور بیماری کے حادثات کو کم کرے علم حاصل کرنیکے استعداد سے اپنے قواءِ عقلی کو تیز کرے اور اُن کو مفید طریقوں سے کام میں لائے۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کے مصائب کے بہت بڑے حصے کا سبب خود انسان کے وہ اعمال ہوتے ہیں جو اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ انسان کی قوت کا دار و مدار اسکی تعلیم اور اپنے رویہ کے حسن انتظام پر ہے اور خصوصاً اپنی طبیعت اور میلان کی اصلاح پر جسکا انسان کی خوشی میں بہت بڑا حصہ ہے۔

خواہش اور ارادہ کے تعلقات کی نسبت علما کی رائیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ اصل میں یہ سوال نہیں ہے کہ آیا جو کچھ وہ نہیں خواہش کرتا وہ بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔ کیا قوت ارادی بغیر کسی تحریک کے کام کرتی ہے اور کیا وہ تحریک سوائے کسی اعلیٰ درجہ کی لذت حاصل کرنے کے اور کوئی ہو سکتی ہے۔ انسان کی طبیعت میں جو تحریکیں پیدا ہوتی ہیں وہ آپس میں متضاد ہوتی ہیں اور انسان اُن میں سے کسی تحریک کے بموجب عمل کرتا ہے۔ انسان کے رویہ پر خوشی اور تکلیف طرح طرح لباس میں اثر ڈالتی ہیں۔ جو خواہش سب سے آخری اور سب سے قوی ہوتی ہے وہی ارادہ بن جاتی ہے۔ ارادہ ایک ایسے لوہے کے مانند ہے جسکے چاروں طرف خواہشات کا مقناطیس رکھا ہے جس مقناطیس میں زیادہ قوت ہوگی وہی اس لوہے کو کھینچ لیگا۔ انسان کے اعمال دماغی اور اخلاقی ساخت اور ان خارجی مؤثرات کا لازمی نتیجہ ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پیدا ہوا ہے۔

لیکن بعض علماء جو ارادہ کے حامی ہیں بیان کرتے ہیں کہ ارادہ خواہش کا محکوم نہیں ہے اگر ارادہ پر خواہش کا قوی اثر پڑتا ہے تو ارادہ بھی خواہشات پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا اور انسان کا ارادہ صرف لذات والم کا غلام نہیں ہے۔ اس رائے کے حامی کہتے ہیں کہ انسان ایسے کام بھی کر سکتا ہے جو وہ پسند نہیں کرتا اور وہ خواہش کی حاکمانہ قوت معطل کر سکتا اور طبیعت کے ناواجب اثروں کو روک سکتا ہے اور فقط فرض ادا کرنیکی خاطر وہ راستہ اختیار کرتا ہے جو بہت کم خوشی بخشتا ہے یا جس سے بہت کم خوشی کی امید ہوتی ہے اور ایک لمحہ میں دو متضاد راستوں میں سے ایک کو اختیار کر لیتا ہے جب انسان کے نفس پر مختلف طرح کی تحریکیں اپنا اثر ڈالتی ہیں تو نفس کسی تحریک کو پسند کرنے ان میں موازنہ کرنے کسی ایک کو اختیار

اور باقی کو رد کرنیکی قوت عمل میں لاتا ہے۔ اور دلیل و فکر کی قوت سے ایک تحریک پر استحکام سے کاربند ہوتا اور اپنی تمام توجہ اُسپر صرف کرتا اور اسطرح اس تحریک کے اثر اور قوت کو بڑھاتا ہے اور انسان میں دوسری تحریکوں کو رد کرنے، ان کو پامال کرنے اور انکی قوت کو زائل کرنیکی طاقت موجود ہے۔ مشق سے قوت ارادی اسطرح بڑھ جاتی ہے جس طرح تن آسانی سے خواہشات قوی ہوجاتے ہیں تمام علم الاخلاق کی بنیاد اسپر ہے کہ انسان میں خیر وشر میں سے انتخاب کی قوت ہے ہر شخص فطرتاً اپنے بعض کاموں سے شرمندہ اور پشیمان ہوتا اور بعض پر فخر و مباہات کرتا ہے اگر خود اُسکے دل میں یہ یقین نہ ہو کہ اُس کو ان اعمال پر اختیار ہے تو اس قسم کے خیالات اسکی طبیعت میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتے۔

سید شاہ ولی الدین چشتی

دردِ دل

اُو، تفرقہ پرداز دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والے زمانے، تجھکو ایک حالت پر قرار نہیں، تجھکو کسیکا ایک صورت بیٹھنا بھاتا نہیں۔ صبح کچھ ہے، شام کچھ ہے، دنیا میں بڑے سے بڑا انقلاب، بڑی سے بڑی جنگ، کچھ نہیں۔ البتہ وہ انقلاب جو دلوں کے درمیان واقع ہو۔ اور دلوں سے مراد وہ دو دل ہیں جن میں حقیقی محبت رہی ہو۔ ایک اولوالعزم بادشاہ کو اسکی رعایا تخت سے اتار دے۔ ایک راجہ کی راجدھانی چھپٹ جائے۔ کسی بادشاہ کا ملک کوئی دوسرا بادشاہ لے یہ سب باتیں اُس انقلاب کے آگے کچھ نہیں ہیں کہ کسی کا محبوب تفرقہ پرداز زمانہ کے ہاتھوں اُس سے جُدا ہوجائے۔ اسکا اندازہ ہر فرد وبشر کو نہیں ہوسکتا البتہ وہ دل جو درد محبت سے آشنا ہیں اور کسی سے حقیقی و قلبی محبت رکھتے ہیں وہی اسکو اچھی طرح محسوس کرسکتے ہیں۔

دنیا میں بہترین آرام و آسایش اور دنیا کی اچھی اچھی سیر و تفریح کی چیزیں اور عمدہ سے عمدہ قدرتی مناظر اُسکی نظر میں بالکل ہیچ و ناکارہ ہیں۔ ایسا شخص ہر وقت اپنی قوت کو زندگی سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے۔ کسی قسم کا صدمہ کسی قسم کی بیماری، کسی قسم کا زخم یہ سب چیزیں کچھ نہیں بلکہ اصلی صدمہ وہی ہے جو دل پر ہو، اور بیماری وہی ہے جو دل کی ہو، اور زخم وہی زخم ہے جو بغیر کسی ہتھیار کے دل پر پہنچایا گیا ہو۔ ایسے مریض کی بیماری ایک موہوم سے خیال سے مبدل بہ صحت ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے بستر سے شاداں و فرحاں اُٹھ بیٹھتا ہے اور اسکے دل کا گھاؤ تھوڑی دیر کے لئے مندمل ہوجاتا ہے وہ خیال یہ ہے کہ شاید اُسکا محبوب اُس سے ملجائے۔

مفارقت کا عالم سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مفارقت کی گھڑیاں بے حد روح فرسا ہوتی ہیں۔ یہانتک کہ اضطراب کی حالت میں وہ خود بخود باتیں کرنے لگتا ہے۔ گویا اُسکا محبوب اُسکے سامنے کھڑا اسکی تمام باتیں سن رہا ہے۔ کبھی زمین سے خطاب ہے، کبھی آسمان سے، کبھی چاند سے، کبھی تاروں سے، وہ ان چیزوں سے مدد کا خواہاں ہوتا ہے مگر جواب نہیں پاتا، بالآخر وہ اس زبردست قوت کی طرف جو ایک پل میں دنیا کو مٹا سکتی ہے رجوع ہوتا ہے اور وہ ہاتھ جو دنیا میں سب سے بلند اور طاقتور ہے دستگیری

چاہتا ہے۔ لیکن اُس وقت اور اُس ہاتھ سے مدد کے لئے مرضی اور وقت کی ضرورت ہے۔

محبوب کی تصویر سامنے ہوتی ہے تو وہ یوں گویا ہوتا ہے کہ تو جیتی جاگتی تصویر ہے۔ تو ہو بہو وہی ہے۔ تیری تصویر سے بھی تبسم عیاں ہے تیری تصویر سے بھی ادائے شرم ٹپک رہی ہے۔ کاش تو گویا ہوتی' کاش تو سنتی ہوتی: تو میں اپنے دل کا اظہار پھر تیرے سامنے کرتا' چاہے تو کچھ جواب نہ دیتی' لیکن سُن تو لیتی۔ تو بہت پیاری تصویر ہے تو بہت قیمتی تصویر ہے۔ تو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے ؎

تجھ سے تصویر تری اچھی ہے
گو کشیدہ ہے مگر پاس تو ہے

اگر خدا کے بعد کسی کی پرستش ہوتی تو میں تیری کرتا۔ اے کاغذ کے ٹکڑے پر نظر آنیوالے' تو نے میرے ساتھ بے اعتنائیاں کیں ہیں' لاپروائیاں کی ہیں' لیکن مجھے اب اُسکا مطلقاً خیال نہیں۔ انصاف سے بعید ہے کہ میں تیری بے اعتنائیوں اور تغافل شعاریوں کا خیال کر کے ان احسانات کو جو تو نے میرے ساتھ مدتوں کئے ہیں بھلا دوں' تو نے اکثر میری دلجوئی کی ہے' میری تکلیف کو تکلیف سمجھا ہے' تیرے تسکین دہ الفاظ اور وہ محبت آمیز شرمیلی ادائیں' کیا میں بھول سکتا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تیری جفا عین وفا ہے' تیرا ستم عین رحم ہے ؎

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت کا کچھ مزا ہی نہیں

اے میرے جان و دل کے مالک اگرچہ زمانہ کے تفرقہ پرداز ہاتھوں نے میرے اور تیرے درمیان مفارقت کی مستحکم دیوار اٹھا دی ہے لیکن تو ہر وقت میرے پاس ہے' تو میرے دل میں ہے' تیرا خیال میرے سر میں ہے' میں تیرے ہی خیال سے مزے لے رہا ہوں' مجھے تجھے تو نہ یاد ہے تیرے خیال سے بھی محبت ہے' تو چاہے مجھے بھلا دے' کیونکہ کج ادائی' بیرخی' عاشق فراموشی تیرا شیوہ ہے۔ لیکن یہ مجھ سے محال ہے کہ میں تیرے خیال سے باز آجاؤں' ممکن ہے کہ تیرے دلمیں میرا مقام نہ ہو لیکن میرے دلمیں سوائے تیرے کسی کی جگہ نہیں' اگرچہ میری تمناؤں اور آرزوؤں کے لہلہاتے ہوئے کھیت پر یاس و نا امیدی کی بجلی گر چکی ہے۔ لیکن پھر بھی تجھ سے ملاقات کا ایک موہوم سا خیال اُس مرجھائے ہوئے کھیت کی آبیاری کر دیتا ہے کاش تیرے دل میں رحم ہوتا' اور رحم کے ساتھ انصاف' میرا بھولا بھالا دل' ناعاقبت اندیش دل' تیری اداؤں پر مٹنے والا دل' وہ دل جو مجھے سب سے کہ اسمیں تیرا خیال ہے' پیارا دل ہے' تیری محبت کے دریا میں ڈوب چکا ہے' اور اسقدر تہ میں جا کر بیٹھ گیا ہے کہ اسکا اوپر لانا سوائے تیرے کسی سے ممکن نہیں۔ میری محبت کی تلاطم میں ہے۔ بادِ مخالف کے تیز جھونکے چل رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ گرداب بلا یا ہوا کے تیز و تند جھونکے' اُسکو ڈبو دیں' لیکن تیرا ایسا ناخدا اسکو ساحل مقصود تک لا سکتا ہے۔ محبت کی گھاٹی نہایت دشوار گزار ہے' محبت کی منزل سب منزلوں سے ٹیڑھی ہے۔ اِس دشوار گزار اور پُرخطر راستہ کو طے کرنا کارے دارد۔

آنکھیں ہمیشہ تیرا نظارہ کرتی ہیں۔ تیری ہی طلبگار رہتی ہیں' دل تجھ ہی کو چاہتا ہے' پاؤں تیری ہی تلاش میں دوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی' لیکن میں خود کو ان باتوں سے روکونگا۔ محض اسوجہ سے کہ اگر تیرے دل میں میری کچھ بھی محبت ہے تو شاید کسیوقت تیرا دل پسیج جائے ورنہ ہمیشہ تیرے خیال ہی سے دل لگی کرتا رہونگا ؎

نہیں ہے تجھ میں وفا اور ترے خیال میں ہے
کہ یہ شریک ہمارا ہر ایک حال میں ہے

س۔ م۔ ح

حقوقِ نسواں

روشن خیال اور قدیم طبقہ کے حضرات دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق عطا کئے ہیں اور جسقدر ان کے حقوق کی حفاظت وحمایت کی ہے۔ اسکی نظیر پیش کرنے سے دنیا کے تمام مذاہب قاصر ہیں۔ قرآن میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے "لھن مثل الذی علھن بالمعروف" (مردوں پر عورتوں کے وہی حقوق ہیں جو مردوں کے اپر ہیں، آنحضرت نے فرمایا ہے "رفقا بالقواریر" مطلب یہ کہ جنس لطیف یعنے عورتیں مثل آبگینوں کے ہیں ان کیساتھ نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ ہونا چاہئے کہ کہیں انہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔

اسمیں شک نہیں کہ اسلام کا عمل درآمد اس بارہ میں بالکل صاف ہے۔ اور اگر محض ہدایات اسلامی پر نظر ڈالی جائے تو کسی مذہب کے شخص کو اس سے زیادہ مکمل اور عادلانہ دستور العمل حقوق نسواں کے متعلق نہیں مل سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرت اسلامی کی بنیاد کیا انہی اصول پر قایم ہے اور کیا مسلمانوں کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ انہی اصول کے مطابق ہے جو رفع اعتراض کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اور ہدایات اسلامی پر مسلمانوں کا عملدرآمد نہیں رہا ہے وہاں اسکے متعلق بھی وہ اصول اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں۔ فقہ کی رو سے رشتہ زوجیت منقطع کرنیکا اختیار صرف مرد کو دیا گیا ہے جب اصولاً نص قرآنی کی رو سے مرد عورت دونوں کے حقوق مساوی تسلیم کئے گئے تو پھر عورت کو یہ حق کیوں نہیں دیا گیا حقیقت یہ ہے کہ محض طلاق و افتراق کا ایک ایسا زبردست حق ہے جو دوسرے تمام حقوق پر بھاری ہے اور اگر اس کو عورت سے چھین لیا جائے تو اسکے دوسرے تمام حقوق معطل ہو جاتے ہیں اور عورت کی وہ منزلت ہرگز باقی نہیں رہتی جو اسلام اور بانیٔ اسلام نے اُس کو عطا کی ہے۔ نکاح کے بعد عورت کی حیثیت محکوم کی سی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آقا (یعنے شوہر) سے حقوق کا مطالبہ تو کر سکتی ہے لیکن ان کو لے نہیں سکتی۔ وہ مرد سے کھانا کپڑا مانگ سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے اسکے ساتھ تعلقات زوجیت باقی نہ رکھہ سکتی ہو تو اس سے آزادی حاصل نہیں کر سکتی' اسمیں شک نہیں کہ عورت کے لئے خلع افتراق کی ایک ایسی شکل ہے جس سے وہ بمعاوضۂ مہر مرد سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے لیکن احکام فقہیہ کی رو سے اسکا نفاذ بالکلیہ مرد کے اختیار اور مرضی پر منحصر رکھا گیا ہے۔ اور عورت کو عملدرآمد موجودہ کے لحاظ سے کوئی ایسا حق نہیں دیا گیا ہے جس کی رو سے وہ حکماً مرد کے خلاف مرضی خلع کا نفاذ کرا سکے۔ جب زن وشو کے حقوق مساوی سمجھے جاتے ہیں تو انصافاً اور عقلاً اور اصول اسلام کے رُو سے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرد جب چاہے' جس وقت چاہے' بغیر کسی وجہ موجہ کے عورت کو طلاق دینے کا حق رکھے اور عورت باوجود وجہ موجہ اور اسباب قویہ کے اس حق سے محروم رہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے زن وشو کو مساوی حقوق عطا کئے ہیں؟ اس حق کے نہ ہونے کی وجہ سے عورت جس بیکسی اور بے بسی کی حالت میں ہے اُسکی تصویر المراۃ الجدیدہ کا مصنف جو مصر کا ایک روشن خیال عالم ہے بالفاظ ذیل کھینچتا ہے:-

"وہ عورت کیونکر آزاد خیال کی جا سکتی ہے جس کو اُس کا باپ
مثل جانوروں کے گھر سے باہر دھکیل دیتا ہے۔ اور ایسے
شوہر کے سپرد کر دیتا ہے جس کو وہ نہیں جانتی اور نہ اسکے
حالات سے اس قدر واقفیت پیدا کر سکتی ہے کہ اس کی نسبت
کوئی رائے دے سکے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے
ہر طبقہ میں لوگ عموماً شادیاں اسیطرح کرتے ہیں اور عورتوں سے
ایسے عظیم الشان کام میں جس پر اُن کی آئندہ خوش نصیبی یا
بدبختی کا دارومدار ہے کوئی رائے نہیں لیجاتی۔ اس موقع پر
یہ نہیں کہہ سکتے کہ جسطرح عورتیں اپنے شوہر کی نسبت شادی سے پیشتر
کچھ نہیں جان سکتیں اسیطرح مرد بھی اپنے ہونیوالی بیویوں کے
حالات سے مطلق واقف نہیں ہوتے۔ کیونکہ مرد کو اس بات
کی اجازت ہے کہ اگر بیوی ناپسند ہو تو اس کو طلاق دیدے
یا دوسری یا تیسری یا چوتھی بیوی کرسکے۔ برخلاف اسکے اگر عورت
کو شوہر ایسا ملے جسکے ساتھ زندگی بسر کرنا ناگوار ہو تو اُسکے
لئے نجات کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ پس عورتوں کا ایسے
مردوں کے ساتھ منسوب ہونا جنکے حالات سے وہ مطلق آگاہ
نہیں ہیں اور ناپسند ہونے کی حالت میں اُن سے نجات
نہ پاسکنا غلامی نہیں تو اور کیا ہے"

گو مصنف مذکور کے وہ خیالات جو اس نے اپنی کتاب میں آزادیٔ نسواں
کے متعلق ظاہر کئے ہیں بعض حضرات کے نزدیک قابل غور ہوں مگر
سطور بالا میں اسنے جن امور کا اظہار کیا ہے کیا انکی اصلیت سے
کسی کو انکار ہو سکتا ہے۔ کیا ہندوستان میں علی العموم اس قسم کی
شادیاں نہیں ہوتیں؟ کیا بہت سے مواقع پر لڑکیوں کی شادی
ان کے خلاف مرضی نہیں کر دی جاتی؟ اور کیا ایسی حالت میں اُن کو
اس امر کا حق نہ دینا کہ اگر وہ اپنے شوہر سے ناراضمند ہوں تو
اُس سے جدائی اختیار کر سکیں۔ اُن پر ظلم شدید نہ ہوگا؟ اور کیا
ایک ایسا مذہب جو رحمت کاملہ کا نمونہ اور عدل و انصاف و مساوات
کا حامی ہے ایک ایسے کمزور اور ضعیف فرقہ پر اس تشدد اور جبر و
زیادتی کا روادار ہوگا؟

اسی جبر و تشدد کا نتیجہ ہے کہ عام طور پر مردوں کے اخلاق فاسد
ہوتے جاتے ہیں اور اُن میں انواع و اقسام کی معاشرتی بیماریاں
پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک طرف تو انکو مطلق العنان اور بے لگام چھوڑ دیا
گیا ہے اور دوسری طرف عورتوں کو ان کا محکوم بنا دیا گیا ہے
انہیں اس کا اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ مردوں کی معاشرتی خرابیوں
کا انسداد کریں اور جو خرابی خاندان میں پھیل رہی ہے اُس کو روک
سکیں یا کم از کم خود ہی کو اُس کے بُرے اثرات سے بچا سکیں۔

عموماً مرد باوجودیکہ استطاعت نہیں رکھتے بہ لطائف الحیل
کئی کئی شادیاں کر لیتے ہیں۔ عورت جب ان کے گھر جاتی ہے تو
اپنے آپ کو انواع و اقسام کی تکالیف میں مبتلا پاتی ہے اور دنیا
میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہوتی جو اس کو ان آفات سے نجات
دلاسکے۔ اگر اس کے والدین یا دوسرے قرابتدار ذی استطاعت
ہوتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ حفاظت حقوق زوجیت کے لئے
دعوے کیا جاتا ہے۔ اور ایک مدت مدید کے بعد عدالت شوہر سے
ضمانت عدم ایذارسانی لیکر نان و نفقہ کی ڈگری صادر کرتی ہے
مگر کیا اس سے عورت کو مرد کی ایذارسانیوں سے نجات ملجاتی ہے
اور اُسکو آرام و اطمینان نصیب ہو جاتا ہے افسوس ہے کہ واقعات
بالکل اس کے خلاف ہیں۔ پہلے تو عدالت سے نان و نفقہ کی جو
ڈگری صادر ہوتی ہے اُسمیں مرد کی آمدنی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ دوسرے
عدم ایذارسانی کی ضمانت محض بیکار چیز ہے اس سے مرد کے
مظالم کا حقیقی طور پر انسداد نہیں ہوتا ارادل تمانت

داخل کرکے عورت کو اپنے گھر بجانے کے بعد پہلے سے زیادہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتے ہیں۔ شوہر کے گھر میں عورت کا کون ایسا ہمدرد بیٹھا ہے جو اس کا حامی بنکر عدالت میں رپورٹ دے اور ثبوت پیش کرے اور جب تک قوی شہادت سے ثابت نہ ہوجائے ان زیادتیوں کا کوئی تدارک نہیں ہوسکتا۔ عدالت میں جو مقدمات دائر ہوتے ہیں اُن سے بدرجہا زیادہ روزمرہ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور اسطرح ایک بے زبان' بیکس اور بے بس فرقہ پر ہزاروں مظالم برپا کئے جاتے ہیں اور سب اس لئے کہ اسکا چارہ کار عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھا گیا ہے۔

ان خرابیوں اور زیادتیوں کا صرف یہی نتیجہ نہیں ہوا کہ ملک کا شیرازۂ اخلاق بکھر رہا ہے' بداخلاقی' بدتہذیبی' اور خانگی معاشرت میں بدنظمی پیدا ہورہی ہے اور اس سے ہونہار بچوں اور آئندہ نسلوں پر برا اثر پڑرہا ہے بلکہ ایک بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ عورتوں کی صحت' اخلاق اور زندگی پر بے حد مضر نتایج مترتب ہورہے ہیں۔ عورتوں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔ جو لوگ تعدد ازدواج کی تائید میں بزعم خود ایک بہت بڑی دلیل یہ لایا کرتے ہیں کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اسلئے تعدد ازدواج قانون فطرت کے موافق ہے وہ ہندوستان کی مردم شماری پر نظر ڈالیں جسکے آخری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد میں عام طور پر کمی اور مردوں کی تعداد میں زیادتی ہے چنانچہ صرف صوبۂ متحدہ میں ۵۲۱۷۳ یا ۵ء۳ فیصدی عورتیں کم ہوگئی ہیں اور مردوں کی تعداد میں بقدر ۴۰۶۹۱ یا ۳۱ء فیصدی کے اضافہ ہوا ہے۔ بنگال و پنجاب اور دیگر صوبوں میں بھی فرقۂ اناث کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ جس کے تین وجوہ بتائے جاتے ہیں۔

(۱) ملک میں طاعون و ملیریا کا پھیلنا' غریب مستورات کا بند و غلیظ و مضر صحت گھروں میں مقیم رہنا' اور بوجہ جہالت کے اصول حفظان صحت سے ناواقف ہونا۔

(۲) کم عمر اور کمسن لڑکیوں کی شادی کردینا' اور ان بے زبان بچیوں کا نند اور خوشدامنوں کی بدسلوکیوں سے تنگ آکر خودکشی کرلینا اور امراض میں مبتلا ہونا۔

(۳) پوشیدہ امراض کا لاحق ہونا اور مارے شرم کے لڑکیوں اور نوعمر بیویوں کا ان کے اظہار سے باز رہنا' اور امراض کا بڑھتے بڑھتے مہلک ہوجانا۔

لہذا ملک کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ ان سوشل خرابیوں کے انسداد کی تدابیر سوچیں اور بے زبان فرقۂ نسواں کی حالت پر رحم کریں۔

پہلی وجہ جو بیان کی ہے وہ ایسی ہے جو کم وبیش مردوں سے بھی متعلق ہوسکتی ہے۔ کیونکہ طاعون و ملیریا کی جسطرح عورتیں شکار ہوتی ہیں اسیطرح مرد بھی کم وبیش ان امراض کے نذر ہوتے رہیں

تیسری وجہ جو بیان کیگئی ہے وہ بھی ایسی نہیں ہے جو مردوں سے متعلق نہ ہوسکتی ہو۔ کیونکہ کم عمری اور کمسنی میں مردوں کو بھی ایسے امراض لاحق ہوتے ہیں جن کو ماں باپ سے بیان کرنے میں انہیں شرم و حجاب دامنگیر ہوتا ہے اور وہ ان کا دفعیہ نہیں کرسکتے بلکہ یہ وجہ بہ نسبت عورتوں کے مردوں سے زیادہ متعلق ہے کیونکہ اس زمانہ میں بہ نسبت عورتوں کے مردوں کے اخلاق زیادہ خراب ہوگئے ہیں۔ ابتدائے عمر ہی میں وہ طرح طرح کے ناقابل بیان امراض میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کی صحت ابتدائی عمر میں نسبتاً زیادہ اچھی رہتی ہے۔ شادی ہونیکے بعد سے البتہ انکی صحت' تندرستی اور خوشحالی ہر چیز کا

زوال شروع ہو جاتا ہے لیکن مرد شادی ہونے کے بعد اکثر سنبھل جاتے ہیں اور شادی سے انکی روحانی اور جسمانی بیماریوں کا ایک حد تک انسداد ہو جاتا ہے ۔ دوسری وجہ البتہ ایسی ہے جسکا تعلق براہ راست عورتوں سے ہے اور اسکو ہم عورتوں کے کے انحطاط مردم شماری کی ایک بڑی وجہ قرار دیسکتے ہیں اور یہ محض اس سبب سے پیدا ہوئی ہے کہ عورتوں کے ہاتھ میں ان آفات و مصائب سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہیں دیا گیا ہے ۔

عورتوں کی خودکشی کے متعلق کلکتہ کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ سال بھر میں گیارہ لڑکیوں نے جنکی عمر دس اور بیس سال کے درمیان تھی خودکشی کا ارتکاب کیا ۔ جس کے راز پر مفصلۂ ذیل واقعہ کسیقدر روشنی ڈالتا ہے ۔

سب ڈویژنل ہوڑہ کے اجلاس میں ایک چودہ سالہ لڑکی نے اپنے اظہار میں لکھوایا ہے کہ "میرے بیاہ کو چار برس ہوئے ۔ میں تین دفعہ اپنے خاوند کے گھر ہو آئی ہوں، میرا خاوند کسی اور عورت سے مانوس ہے، وہ مجھے زد و کوب کرتا، اور دن میں ایک دفعہ کھانا دیتا رہا ۔ مجھے سونے کے لئے چارپائی کے بجائے چٹائی ملتی رہی، میں نے دو دو تین تین دن کھانا نہیں کھایا ۔ تین ماہ تک مجھے گھر کے اندر بند رکھا گیا۔"

ان حالات کی موجودگی میں اگر بدقسمت لڑکیاں اپنے دامن عصمت کو سیاہ کرلیں، یا اپنی زندگی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیں تو کیا تعجب ہو سکتا ہے ۔ ممکن ہے کہ اور قومیں اپنے مذہبی اور سوشل رسوم سے مجبور ہو کر کچھ نہ کر سکیں لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ مسلمان بھی اس جہالت کا شکار ہو رہے ہیں ۔ والدین لڑکیوں کی شادی کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ جب تک لڑکی رضامند نہ ہو نکاح نہیں ہو سکتا ۔ سسرال والے اس حکم کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جس طرح مرد کو ناموافقت اور مجبوری کے عالم میں طلاق کا اختیار ہے ۔ اسی طرح عورت بھی خلع کرا لینے کی مجاز ہے ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ بہتر وہی شخص ہے جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے زیادہ بہتر ثابت ہو ۔

مشکل یہ ہے کہ اگر لڑکی کی رضامندی شادی کرنے کے وقت حاصل کر لی جائے تو اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان میں لڑکی اپنے شوہر کے حالات اور طبیعت و خصلت سے عموماً ناواقف ہوتی ہے پس اگر وہ سنی سنائی باتوں پر اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر دے تو اس سے ان آئندہ ہونے والی خرابیوں کا کیا انسداد ہو سکتا ہے ۔ اگرچہ مردوں کو بھی اس قسم کی خرابیوں کا سامنا ہوتا ہے لیکن ان کے پاس ایک ایسا ذریعہ ہے یعنے حق طلاق ہے جس سے وہ آئندہ مکروہات کا انسداد کر سکتے ہیں جس سے عورتیں بالکل محروم ہیں ۔

شرع نے اگرچہ عورت کو خلع کا اختیار دیا ہے اور اصول اسلام اور احادیث صحیحہ اور احکام قرآنی پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا یہ اختیار مرد کی مرضی کا تابع نہیں ہے ۔ لیکن موجودہ عملدرآمد اور فقہا کے تعامل کی رو سے عورت کے لئے یہ حق اسقدر محدود اور مقید کر دیا گیا ہے کہ اس کا ہونا اور نہ ہونا مساوی ہے مثلاً اگر کوئی مرد خلع پر راضی نہ ہو تو فقہ حنفی کے مطابق دنیا میں کوئی ایسی قوت نہیں ہے جو مرد و عورت میں تفریق کرا سکے ۔ فقہ شافعی اور مالکی کی رو سے قاضی کو جبراً مرد کے خلاف مرضی تفریق کا اختیار ہے مگر اسی صورت میں جبکہ شرعی عدالت میں مرد کی زیادتی اور عورت کی مظلومیت ثابت ہو جائے ۔ بہرکیف کسی مذہب کے احکام فقیہہ کی رو سے یہ ثابت نہیں ہے کہ عورت کے ہاتھ میں اس

حق کا نفاذ دیا گیا ہو۔ یا عورت اپنے اختیار اور مرضی سے مرد کے علی الرغم اپنے اس حق کو حاصل کر سکتی ہو۔ ایسی حالت میں اُن مظالم کا کیا انسداد ہو سکتا ہے۔ جو مرد عورت کو خفیہ طور سے پہنچا سکتا ہے جنکا ثبوت وہ قاضی یا حاکم عدالت کے سامنے پیش نہیں کر سکتی مرد کے لئے حق طلاق کے مباح ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بیان کیجاتی ہے کہ زن وشو کے تعلقات نازک ہوتے ہیں کہ اُن سے دوسروں کو واقفیت نہیں ہو سکتی اور جو بُری بھلی باتیں ان کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں ان سے ہر شخص آگاہ نہیں ہو سکتا ایسی صورت میں ان کے معاملات کا تصفیہ دوسروں کے ہاتھ میں دینا خطرناک تھا۔ اسی دلیل کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ اس حق سے محض مرد مستفید ہو اور عورت محروم رکھی جائے کیا وجہ ہے کہ اس فیصلہ کا اختیار صرف ایک فریق کو حاصل رہے اور دوسرا فریق محکوم اور بے دست و پا کر دیا جائے۔

یہ وہ اعتراضات ہیں جو اصول اسلام کے رو سے مسئلہ طلاق و افتراق کے متعلق مروجہ فقہ اور مسلمانوں کے موجودہ عملدرآمد پر کئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسکی جانب گہری دلچسپی کیساتھ اپنی توجہ معطوف کرنی چاہئے کیونکہ اس مسئلہ کے غلط طور پر رائج ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے انتظام معاشرت میں بڑے بڑے رخنے پڑ گئے ہیں اور انکی خانگی زندگی آفات ومصائب اور خانہ جنگیوں کا مرکز بنگئی ہے۔

نصوص قرآنی اور احادیث نبوی موجودہ عملدرآمد کس قدر منافی اور مخالف واقع ہوئے ہیں اسپر بشرط زندگی آئندہ بحث کیجائیگی۔

محمد عبد الباسط

عرب

بہارِ خلد جسے دیکھنی ہو آئے عرب | زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے جائے عرب
دلِ آشنائے عرب ہے جگر فدائے عرب | ازل سے ہے مرے سر میں بھری ہوائے عرب
عرب کی یاد میں کیا کیا گزرتی ہے دل پر | یہ اُس سے پوچھئے جو دل سے ہو فدائے عرب
کٹے ہوئے مرے دل میں ہیں گھر عرب کی زمیں | کھُبی ہوئی ہے مری آنکھ میں فضائے عرب
نبیؐ کے موئے مژہ عاشقوں سے کہتے ہیں | کہ رکھلو آنکھوں میں چُن چُن کے خارہائے عرب
رسولِ پاک کی جب یاد مجھکو آتی ہے | تڑپ تڑپ کے یہ کہتا ہے دل کہ ہائے عرب
سنا ہے جب سے عرب میں ہے روضۂ حضرت | پھرا رہی ہے مجھے کو بکو ہوائے عرب
دیا ہے شمس و قمر پر ہمیں خدا نے شرف | چمک چمک کے یہ کہتے ہیں ذرہ ہائے عرب

عرب کو کیوں نہو سارے جہان پہ فخر اے حسن
کہ گھر خدا کا جہاں ہے، وہی ہے جائے عرب

رعد جونپوری

طوطا

قدرت نے بنایا تیرا نقشا | رنگین وحسین و شوخ و رعنا
صانع کی یہ صنعتیں ہیں ساری | اعضا سے عیاں ہے دستکاری
یک لخت زمردیں ہیں بازو | آنکھوں میں تری بھرا ہے جادو
ہر ناز و ادا ہے فتنہ انگیز | عشوے میں غضب کے لطف آمیز
سُرخی نہیں اس سے ہے نمودار | لعلِ لب مہ جبیں ہے منقار
ہے چال سے بانکپن ہویدا | ہو فتنۂ حشر جس سے برپا
سر پہ ہے کلاہ بھی طرحدار | خوشرنگ ترے گلے میں اک ہار
نطقِ بشری زبان میں ہے | جادو کا اثر بیان میں ہے
نغموں میں عجیب دلبری ہے | امرت سے تری صدا بھری ہے
واللہ عجب ترا بیاں ہے | مقراض کوئی ہے یا زباں ہے
محبوب ہیں تیری سب ادائیں | معشوق بھی لیتے ہیں بلائیں
صورت میں بھی دلپذیر ہے تو | انداز میں بے نظیر ہے تو
گو دستِ غنی پہ تو مکیں ہے | گہ زیب کنارِ مہ جبیں ہے
بچے بھی فدا ہیں تجھپہ دل سے | ہاتھوں پہ ہیں شوق سے بٹھاتے
کرتا ہے تری ہر ایک خاطر | بے عیب ترا ہے حسن ظاہر
ہر طرح کی گو کہ دلبری ہے | لیکن تری ایک خو بُری ہے

اُلفت کا کوئی صلہ نہیں ہے،
آنکھوں میں تری وفا نہیں ہے،

پر یہ نہیں کچھ تجھی پہ الزام | کیوں مفت کروں میں تجھکو بدنام
عالم کا بدلگیا ہے اب رنگ | دنیا میں ہر اک کا ہے یہی ڈھنگ
افسانہ ہے ایک آشنائی | اک حرفِ غلط ہے باوفائی
بیگانے ہوئے ہیں دوست سارے | ہیں آج عدو جو کل تھے پیارے
اگلے سے رفیق اب نہیں ہیں | جو دوست ہیں مارِ آستیں ہیں

ذاکر ہے عبث وفا کی اُمید
الفت ہے یہاں دغا کی تمہید

ذاکر بازید پوری

مسز نائڈو سے خطاب

(از ریورنڈ سی ایف۔ اینڈریوز صاحب)

چھیڑ کر سازِ سخن اے نازنینِ خوش بیاں | خوب ہی تونے سنائے نغمہ ہائے دلستاں

دیکھکر اپنی زباں میں تیری نظم دلپسند
میں ثنا خواں ہوں ترا اور دل سے ہوں احساں مند

کم نہیں تارا ۔ کی نظموں سے ترا حسن بیاں
آہ ! جو دامانِ گلچینِ اجل میں ہے نہاں

سچ کہا ملٹن نے یعنی ایک شاعر کی حیات
کیا ہے بس اک نغمۂ پرسوز سازِ کائنات

خاص خاص افرادِ ملت کی ہیں جو دلسوزیاں
جو کہ ہیں شایانِ شان ، دردِ ہندوستاں

بارک اللہ تیری نظموں میں بھی ہے رنگِ وفا
اور پہلو میں ہے تیرے بھی دلِ درد آشنا

سیفر کاکوروی

ماخوذ از ہندوستان ریویو
جنوری ۱۹۱۳ء

دستی پیچ

کسطرح ہو نہ قدرت ربِّ قدیر ہاتھ
بیمثل واقعی ہے یہی بینظیر ہاتھ

جب ہاتھ ہے تو دست نگر کیوں کسیکا ہو
پھر کیا غرض بڑھائے جو پیش امیر ہاتھ

کیا فکر دستِ غیب سے ہاتھ آئیگا اگر نہیں
تا زیست جب اٹھائیں نہ برنا و پیر ہاتھ

مانا ہزار ہاتھ خدا کے ہیں تجھکو کیا
زندان کاہلی میں ہے تیرا ۔ اسیر ہاتھ

دل مشورت جو دے تجھے ہاتھوں سے کام لے
گویا کہ بادشاہ ہے تو اور وزیر ہاتھ

یہ کاہلی نہ مار آتا رہے تجھے کہیں
سانپ آستین کا نہ بنے ۔ دلپذیر ہاتھ

باندھے ہے کمر سفر پہ تو افلاس دور ہو
منزل میں ساتھ ساتھ ہو یہ ہمسفیر ہاتھ

ہاتھوں سے زر کمائے تو تجھ پر نظر پڑے
بہرِ سلام اٹھائیں صغیر و کبیر ہاتھ

چاندی کی چاندنی ید بیضا سے کم نہیں
چاندی ہو ہاتھ میں تو ہو ماہ منیر ہاتھ

تو ہاتھ اگر ملائے تو مفلس کو زر ملے
دنیا پکار اٹھے کہ ہے روشن ضمیر ہاتھ

مٹھی اگر ہو بند سحاب کرم کہیں
مٹھی تری کھلے تو ہو ابر مطیر ہاتھ

خشکہ ملیگا تو اُسے کیونکر نہ ہو جو ہاتھ
ہاتھ آئے کیا پلاؤ لگے کیا پنیر ہاتھ

ہاتھوں کو تو نہ توڑ یہی دسترس ہیں سب
دینگے یہ ایکروز منافع کثیر ہاتھ

انسانکو شرف ہے سرِ دست ہاتھ سے
ہاں اے صمیم یاد رہے یہ اخیر ہاتھ

انسان اہلِ صنعت و حرفت سے لے سبق
خود دستکار ہو تو بنے دستگیر ہاتھ

صمیم بلند شہری

عدالت حسن

ہوا فرمانِ شاہِ حسن جاری جا بجا
پکڑ کر مجرمانِ عشق سب دربار میں آئے

خطاب اُنسے کیا معشوق نے اے عشق کے بندو
تمہیں معلوم بھی ہے کسلئے سرکار میں آئے

محبت کرکے رسوائے جہاں تم نے کیا مجھکو
غضب ہے ذکر میرا کوچہ و بازار میں آئے

کہا ظالم، ستمگر، تندخو، نا آشنا مجھکو
ذرا پروا نہیں ' جو کچھ دلِ بیمار میں آئے

بلا سے آپکی میں دلکش و دلسوز و دلبر ہوں
ہتھیلی پر رکھے دل آپ کیوں بازار میں آئے

کبھی تو آپکے نالوں سے ہلتی ہے زمیں تھم تھم
کبھی نالوں سے چکر گنبدِ دوار میں آئے

کبھی وحشت کے ہاتھوں چلدئے صحرا نوردی کو
کبھی سنبھلے تو اٹھکر کوچۂ دلدار میں آئے

کبھی سوئے نہ راتوں کو فقط اتنی تمنا میں
تصور بن کے کوئی دیدۂ بیدار میں آئے

کبھی تو کوچۂ جاناں کے چکر رات بھر کاٹے
اندھیری رات میں شوقِ لقائے یار میں آئے

کبھی کافر بنے تم اپنے منہ سے اور کبھی مومن
دیارِ زلف میں یا کشورِ رخسار میں آئے

کبھی تو جان دیدی ڈوبکر چاہِ زنخداں میں
گڑھے سے گور کے پھر تم کبھی گفتار میں آئے

کہا کس نے تھا تم کنجِ حرم سے دیر میں آؤ
یہ کیوں تم حلقۂ تسبیح سے زنار میں آئے

کہا کس نے تھا تم سے اپنا دل یوسف کو تم دیدو
بتاؤ کسلئے تم مصر کے بازار میں آئے

کہا کسنے تھا تم لیلیٰ کی خاطر ہو بنو مجنوں
یہ کیوں تم سوئے صحرا حسرتِ دیدار میں آئے

گنوائی جانِ شیریں کسنے فرہاد کی صورت
یہ کیوں اک محبت کی خاطر دامنِ کہسار میں آئے

سُنی یہ گفتگوئے تلخ جب اُن غم نصیبوں نے
بیانِ طوطیٔ شکر فشاں گفتار میں آئے

جُھکا کر سر کہا یہ مجرمانِ عشق نے رو کر
خدا اپنی ہے جو کچھ مرضیٔ سرکار میں آئے

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

باسط بسوانی

نالۂ عندلیب

کدھر گیا وہ مرا کنجِ خوشگوار دریغ
نہ جوشِ گل ہے نہ وہ موسمِ بہار دریغ

کہاں ہے آہ! وہ پھولوں کا کاروانِ نشاط
کدھر گیا مرا دلکش وہ سبزہ زار دریغ

رُلا رہا ہے لہو مجھکو شوقِ لالہ و گُل
چمن میں صورتِ شبنم ہوں اشکبار دریغ

وہ سُرخ سُرخ ہوئیں کیا گُلاب کی کلیاں
گلے لگا کے میں کرتی تھی جنکو پیار دریغ

وہ بھینی بھینی کدھر ہے نسیمِ عنبر بار
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی کہاں مینہہ کی پُھوار دریغ

کہاں وہ نرگسِ شہلا کی چشمِ مستانہ
کہاں وہ کیف سے حُسن کا خمار دریغ

رہا نہ آہ! وہ کم کم اُبھار کلیوں کا
گلوں کی سُرخ قبائیں ہیں تار تار دریغ

نہ وہ چمن ہے نہ وہ رونقِ بہارِ چمن
نہ شاخِ گُل ہے نہ وہ پنجۂ چنار دریغ

سکوتِ شام میں کوئل کی دلربا وہ صدا
سیاہ ابر میں بگلوں کی وہ قطار دریغ

وہ طائرانِ ترنم سرا وہ جوشِ بہار
وہ نہرِ آب، وہ سبزہ، وہ جوئبار دریغ

وہ ہلکی ہلکی شفق اور وہ موجِ خندۂ گُل
عجب نشاط فزا تھا وہ روزگار دریغ

کدھر گئی مرے پھولوں کی انجمن ہے ہے
فراقِ گُل سے ہیں آنکھوں میں جان زار دریغ

چمن میں خاک اڑاتی ہے آہ بادِ خزاں
گلوں کے تختہ میں اب تودۂ غبار دریغ

نہ وہ فضائے چمن ہے۔ نہ اب وہ رنگِ بہار
خزاں نے آکے گلوں کا کیا شکار دریغ

گئے وہ دن کہ جب آنکھوں میں تھی گلوں کی بہار
رُلا نہ خون مجھے اے شوقِ سوگوار دریغ

فراقِ گل میں جو توڑوں تڑپ کے دم صیاد
مرے چمن میں نہ لانا مرا مزار دریغ

غبارِ شوق نہ کرنا مرا صبا برباد
کہ بعدِ مرگ رہے کچھ تو یادگار دریغ

مرے لحد پہ یہ صیاد قصہ لکھ دینا
بنا کے صحنِ چمن میں مرا مزار دریغ

قطعہ

گھڑی سے دل کو لگائے نہ بلبلِ شیدا
کہ اس چمن کا نہیں کچھ بھی اعتبار دریغ

صدائے غنچہ ہے بانگِ شکستِ رنگِ بہار
فروغِ لالہ و گل۔ خندۂ بہار دریغ

اخگر

یادِ احبابِ دکن

فاںؔ بالی کو سب احبابِ دکن بھول گئے
جیسے بلبل کو گل و سرو سمن بھول گئے

کیا فراموش ہوئی سیرِ لبِ دریا کی
وہ شبِ ماہ وہ گلگشتِ چمن بھول گئے

لبِ ساگر وہ پرندوں کا چہچہانا سرِ شام
جوشش آب رواں کی وہ پھبن بھول گئے

داغ جاتا رہا اور وہ گلچہرہ نہیں شوخ ادا
نگہ ناز پر آشوب و فتن بھول گئے

وہ کمانِ ابرو اور مژگاں کی وہ ناوک فگنی
چین میں جس سے تھے چین برن بھول گئے

تھا کیا انداز نظر اور وہ تیکھی چتون
بانکپن اور وہ بیا خستہ پن بھول گئے

نازنیں شانوں پہ زلفوں کا وہ لہرا جانا
طرۂ مشکیں کے وہ پیچ و شکن بھول گئے

جلوہ افروز تری نیرنگیٔ قدرت کیا کیا
نرگسِ چشم کا ہر طرفہ وہ فن بھول گئے

مے غرورِ شی نگہ مست کی کیا سہو ہوئی
غمزے اور عشوے وہ سب زہد شکن بھول گئے

زیرِ لب کہنا کیا کا وہ کچھ انداز کے ساتھ
کیوں؟ وہ افسونگری لعلِ یمن بھول گئے

وہ تبسم وہ تکلم وہ اشارت وہ ادا
ہائے کیا صحبتِ یارانِ کہن بھول گئے

حشر دوشی رفتار مگر یاد نہیں
فتنہ انگیزیٔ قد مشفقِ من بھول گئے

عشق اب کیسا! کہ وہ عشق کا سودا بھی گیا　　چاہ اب کیسی! کہ وہ چاہِ زنخداں بھول گئے

اب کہاں ذوقِ نواسنجیٔ فریاد و فغاں　　ستم و جور بھی جب غنچہ دہن بھول گئے

اب کہاں لطفِ شکر خندۂ خوبانِ چگل　　شکر بیزی وہ غزالانِ ختن بھول گئے

اب کہاں وہ کہ سر و پا کی خبر بھی تو نہیں　　یہ کسی یاد میں آسائشِ تن بھول گئے

کیوں نہیں اب لبِ زخمِ دلِ محزوں خنداں　　کیا نمک پاشیٔ ملیحانِ دکن بھول گئے

ہو گیا ختم مگر قصۂ وصل و ہجراں　　وہ تپش بھولے وہ سب دل کی لگن بھول گئے

فیض سے الفتِ گل کی ہے یہ اب بلبل　　وحشت و شورشِ سودا میں وطن بھول گئے

یاد ہے اس بتِ خوبی کی نہ وہ کھیلائی لہر　　اشکِ خجلت دہنِ گنگ و جمن بھول گئے

جوششِ گریۂ پیہم کا وہ چسکا نہ رہا　　لذتِ کاوشِ اندوہ و محن بھول گئے

قیس اور نل کی حکایت وہ سراسر جھوٹی

اثرِ جلوۂ لیلیٰ و دمن بھول گئے

بے خودی میں ہے یہ اندازِ تغافل کیسا　　کہ خیالِ عدم روح و بدن بھول گئے

کیا غریب الوطنی میں یہ ملی کیفیت　　کہ نگارِ در و دیوارِ وطن بھول گئے

سرکشی کر کے غرض پھر گئی چشمِ شریک　　فرطِ خود بینی میں در راہِ عدن بھول گئے

کیا ہو پھر شوقِ نئے میکدہ دیرینہ کا　　دل سے جب جام و سبو شیشہ و دن بھول گئے

محوِ حسن ہو گئے کیا نقش طرازانِ ازل　　کہ کمر بھول گئے اور دہن بھول گئے

رہروِ راہِ فنا کو کوئی اس سے مطلب　　کیوں مگر ترک کہن رسمِ کفن بھول گئے

بزم خالی ہوئی دیرینہ احبا سے تمام

ہم بھی افسانۂ پارینۂ سخن بھول گئے

لاابالی - امروہہ

رباعیاتِ اوج

پیری کی بلا سے ناگہاں آئی ہے　　رخصت کے لئے عمرِ رواں آئی ہے

مرجھا گئیں اوج دل کی کلیاں افسوس　　کیا باغِ جوانی میں خزاں آئی ہے

پژمردہ کہیں غنچۂ دل کھلتا ہے　　سب عضو خمیدہ ہو کے سر ملتا ہے

گلشن کی بہار کو خزاں نے لوٹا　　پیری سے شباب اب گلے ملتا ہے

عشاق میں ہم بھی نام کر جائیں گے　　اب ہجر میں جان سے گزر جائیں گے

آنا ہو تو آؤ ورنہ بیتابی میں　　خنجر سے گلا کاٹ کے مر جائیں گے

دکھ درد کا حالِ زار کس سے کہئے　　مونس ہمدم نہ یار کس سے کہئے

ہے تیرہ تب جو غم و مصیبت ہم پر　　کوئی نہیں غمگسار کس سے کہئے

احوالِ دلِ سوزِ نہاں کہتے ہیں　　دکھ درد و الم کی داستاں کہتے ہیں

چاہو اسے تم غلط فسانہ سمجھو　　اپنی بیتی یہ جانِ جاں کہتے ہیں

ہر ایک سے نہ رازِ عشق کہنا اچھا　　ہر روز کا ظلمِ یار سہنا اچھا

بیکار ہے یہ نالہ و شیون اے اوج　　ہو ضبط تو خاموش ہی رہنا اچھا

مضموں میں کیا حسن دلآویزی ہے　　ہر شعر میں رنگِ درد انگیزی ہے

دیکھی ہے اوج طبعِ رنگیں کی بہار　　گلزارِ سخن میں کیا گہر ریزی ہے

اوج گیاوی

مناظرۂ نظم و نثر

نظم نے نثر سے اک دن یہ کہا از رہِ ناز　　کہ میں وہ ہوں کہ ثنا خواں ہے زمانہ میرا

موہنی کہتے ہیں جس کو وہ ہے صورت میری　　کون سا دل ہے کہ جو مجھ پہ نہیں ہے شیدا

دلفریبی میں ہوں بڑھکر چمن رضوان سے — دل نشینی میں نہیں ہے کوئی ثانی میرا

حسن میرا مہ و خورشید سے بھی بڑھکر ہے — آبرو میں در شہوار بھی ہے مجھسے گھٹا

کون سا دل ہے کہ جس دل میں نہیں میری جگہ — کونسی بزم ہے جسمیں نہیں میرا چرچا

حسن کی شان بڑھانیکا ذریعہ میں ہوں — عشق کا نام جہاں میں ہے مجھی سے زندا

قیس کی یاد زمانہ میں مرے دم سے ہے — میں نہ ہوتی تو نہ کرتا کوئی ذکر لیلیٰ

میری ہی وجہ سے ہے نل و دمن کی شہرت — مجھسے ہی شیریں و فرہاد کا ہے نام اُچھلا

گل و بلبل کی ہے تشہیر مرے باعث سے — شمع و پروانہ کا ہے میرے ہی دم سے شہرا

ہے غذا روح کی گانا اسے سب جانتے ہیں — جان گانے کی جسے کہتے ہیں میں ہوں بخدا

آبرو دہر میں ہر شئے سے ہے بڑھکر میری — مرتبہ میرا زمانہ میں ہے سب سے بالا

خوبیاں مجھ میں جو ہیں وہ تجھے حاصل ہیں کہاں — تیری صورت سے مجھے ہوتی ہے نفرت بخدا

سن چکی نظم کی گفتار تو بولی یہ نثر — میں بھی کچھ عرض کروں آپ جو مانیں نہ برا

دیکھتا کون ہے خود آنکھ کا اپنے شہتیر — سچ کہا ہے نہیں کہتا ہے کوئی عیب اپنا

خوبیاں آپ میں جو ہیں وہ مجھے ہیں معلوم — آپکی ذات میں جو وصف ہیں ہے مجھپہ کھلا

کہتے ہیں لوگ جسے مخرب اخلاق ہیں آپ — آپ ہی سے ہے پڑی جھوٹ کی دنیا میں بنا

آپکی چاہ جو رکھتے ہیں وہ ہیں دیوانے — آپسے جن کو محبت ہے ہے اُن کو سودا

قیس و فرہاد کے قصہ کی ضرورت ہی کیا — لیلیٰ و شیریں کے افسانہ سے حاصل کیا ہے

شمع و پروانہ کی ہے داستاں بالکل بیہودہ — گل و بلبل کی کہانی سے بھلا نفع ہے کیا

الغرض آپ جسے سمجھے ہوئے ہیں خوبی — وہ بُرائی ہے نہیں کچھ بھی بُرائی کے سوا

آپکا حال جو ہے خوب ہے روشن مجھپر — رنگینی میں سو کروں آپ ہی کیا وصف اپنا

کیجئے غور تو ہو جائے ابھی یہ معلوم — کہ مری ذات سے قایم ہے نظام دنیا

کیجئے اس سے سوا اور اگر غور مزید — تو پھر آئے نہ نظر آپ کو کچھ میرے سوا

یعنی قرآں جسے کہتے ہیں کلام اللہ سب — یہ مجھے میں ہے اور اسمیں ہے مرا ہی جلوا

مختصر یہ جو سمجھتا کہ ہے نظم اچھی چیز — بھیجتا نظم میں قرآن محمدؐ پہ خدا

ایک شاعر

سلسلۃ الذہب

ہو سکے انساں سے خاطر خواہ کیونکر کوئی کام — ہے فنا سب کو بقا تجھ کو خدایا ہے دوام

تیری قدرت دیکھکر حیراں ہیں سب بندے ترے — یہ ابہر اک کام حکمت پر ہے مبنی لاکلام

عالم الغیب اے خدا تیرے سوا کوئی نہیں — قادر مطلق ہے تو مجبور ہیں سب خاص و عام

ایک منعم ایک مفلس ایک سلطاں اک گدا — ہے غرض خالق کی مرضی پر جہاں کا انتظام

یہ جہاں فانی ہے اسمیں نیک رہتا ہے نہ بد — چھوڑ جاتا ہے مگر ہر ایک اپنا اپنا نام

اب کہاں ضحاک لیکن ظلم سے بدنام ہے — اب کہاں کسریٰ مگر عدل اس کا ہے مشہور عام

ہیں نشاط روح کے اسباب احسان و کرم — رہ نہیں سکتا جہاں میں کوئی ظالم شادکام

ہے مآل افتادگی اس کا خبردار اے بشر — نفس بد کے ہاتھ میں دینا نہ عقل و ہوش کی زمام

حد سے بڑھکر کنہ خالق میں نہ تو گام زن — ذہن انساں سے ہے برتر نارسا اور عقل خام

چند ہی افراد خیر الناس کے مصداق ہیں — شک نہیں ہیں عوام انساں کے حق میں بد دوام

کوششوں سے تھک نہ جا ہرگز نہ دو ہمت سے — دیکھ کیونکر پھر سنورتا ہے ترا ہر ایک کام

صبر و شکر اس کو ہے لازم جسے لت جاہ کی ہو — کون ہے جسکی جہاں میں حاجتیں نکلیں تمام

شکر کر خالق کا اسکی نعمتوں میں ہے اذھین

کرتے ہیں شکر اہل دل تو زحمتوں میں ہے اذھین

ہے زیادہ کام میں تیرے زیاں اور کم ہے سود — کوششیں جتنی ہیں تیری ہیں پئے نام و نمود

کل نہ ہو ممکن تو کیا ہو آج جو ممکن ہو کر — اے نرفرصت بے خبر دور سے چہ باشی زود

تہلکہ میں پڑ رہے ہیں مسلم اپنے ہاتھوں آہ — حالت اسلام پر کر رحم اے رب ودود

ہوتی ہے لوگوں کو بدگوئی سے فرصت ہی کہاں — کرتے کیوں یاد خدا پڑھتے نبیؐ پر کیوں درود

کان آواز اذاں پر رکھتے کیوں نیہ بگوش — جب لگی ہے صدائے بربط و چنگ و سرود

عبرت آموز اپنے حق میں ہیں یہ سلف کے واقعات — عاد کی حالت ہوئی کیا کیا ہوا احوال ثمود

وہ زباں جس سے نہ پہنچے نفع ہے وجہ زیاں — ہو نہ جس میں جود علت کا سبب ہے وہ وجود

غیر کو غم خود کو بے غم سمجھ ہو یہ ہے سوء انجام — ہے زیاں جس میں سراسر کر تہ عرش فکر سود

تربیت نا اہل و ناکس کو بنا دی کب ہے اہل — کیا بنے قوس۔ انمہ جس میں نہ ہو پیچ۔ وہ بڑ تو

اے ذہین انسان میں جو علم تو انسان ہے
جسم ہے انسان۔ علم انسان میں گویا جاں ہے

ذہین حیدرآبادی

پچھلا پہر

نقاب الٹتا ہے چہرے سے خسروِ خاور — کہو یہ لیلیٰ شب سے کہ اوڑھ لے چادر

یہ وقت پچھلے پہر کا سکون خواب کا وقت — خدا کی قدرت کامل کا دلکش منظر

سماں بندھا ہوا جوش بہار قدرت کا — سکوت چھایا ہوا ممکنات عالم پر

گھروں کے جن میں دروازے سب کے ہیں بند — چہل پہل ہے نہ ہنگامہ ہے نہ شور و شر

پرند سوتے ہیں سب اپنے آشیانوں میں — چرند تھان پہ بیٹھے ہوئے جھکائے سر

تمام خلق کو گھیرا ہے خواب غفلت نے — گماں ہے شہر خموشاں کا سارے عالم پر

ہر ایک شئے پہ سیاہی کا رنگ پھیلا ہے — سیہ ہیں ارض و سما و جبال و بحر و بر

چمکتے ہیں جو تارے قیاس کہتا ہے — فلک کی نیلی قبا میں ٹکے ہوئے ہیں گہر

چراغ ماہ کی بھی روشنی ہوئی مدہم — ہے وقت برہمیٔ صحبت مہ و اختر

بلاکش شب ہجر سے کوئی پوچھے — کہ رات تم نے گذاری ہے یا رب کیونکر

خیال خواب پریشاں تھی شب کی بیداری — لگی تھی آنکھ ہوئی انتظار میں جو بسر

وداع ہوتے ہیں دیکھو وہ شاہدان وفا — نکل چکی ہے مگر حسرت دل مضطر

ادھر ہے شوق تمنا ادھر ہے شرم و حجاب — نیاز و ناز کی ہیں صحبتیں یہ پچھلے پہر

اشارے ہوتے ہیں رخصت کے آنکھوں آنکھوں میں — ادھر کی آنکھ ادھر ہے ادھر کی آنکھ ادھر

مسافر اٹھے ہیں پچھلے پہر کی خنکی میں — کمر کو باندھ رہے ہیں لپیٹ کر بستر

وہ شب کی ہلکی سیاہی سحر کی ضو وہ سپید — وہ اک سے ایک کی رخصت کا دلکشا منظر

شفق کے رنگ میں آمیزش سپیدۂ صبح — عروس وقت کے تن پر تھا قدرتی زیور

ذخیرہ - اکتوبر ۱۹۱۵ء

جھکا وہ جانب مغرب سر مہ کامل — چلا وہ آنکھیں جھپکتا نجوم کا لشکر

فلک کا چار پہر میں کیا ہے دورہ ختم — ہے شب کے جاگنے کا بار انکی آنکھوں پر

وہ نکلا صبح کا تارا وہ رات ختم ہوئی — سفیدہ صبح کا تھا روئے لیلیٰ شب پر

نماز صبح کو اٹھنے لگے نماز گذار — جھکے ہیں سجدۂ معبود میں تمام شجر

وظیفۂ سحری میں ہیں سب کے سب مصروف — بلند و پست و جبال و بحار و دشت و در

نظر فریب سہانا وہ وقت صبح بہار — بھرا ہے کوٹ کے لطف خدا کا جس میں اثر

نسیم صبح کے وہ خوشگوار جھونکے سرد — جو گدگداتے ہیں غنچوں کو بیدھڑک آکر

ہنسی جو دیر سے غنچے کئے ہوئے تھے ضبط — تو ہنس پڑے لب گلہا گئے سے وہ کھل کھلکر

نہلا کے دایہ ابر بہار نے رخ گل — پنہا دیا دُر شبنم کا قدرتی زیور

سنک جو پائی ہے موج نسیم کی اس دم — تو سبزہ لیتا ہے انگڑائیاں اٹھا کر سر

سماں یہ دیکھکے مرغان نغمہ سنج اٹھے — سرودیں گانے لگے بھیرویں بہم دیگر

نسیم صبح کی دیکھی جو چال مستانہ — نظر بھی لوٹ گئی فرش سبزۂ تر پر

شجر نہال تھے موج صبا کی جنبش سے — گلوں کے رخ پہ تھا رنگ بہار کا پوڈر

دُر خوشاب کا دانہ تھا موتیے کی کلی — نگیں عقیق یمن کا تھا لالۂ احمر

نسیم آئی دبے پاؤں صحن گلشن میں — کہ بوئے گل کو جو پائے تو لے اڑے یکسر

پٹے دہن تو ہوئی ہلکی سی سنسناہٹ کا — ہوا طیور کی نغمہ سرائیوں پہ اثر

کہ سر ملا کے گلے بازیاں لگے کرنے — صدا سے تان کی تھے وجد میں تمام شجر

ہوا میں گونج رہی ہے جو مرغ صبح کی تان — تو ایک وجد ہے طاری تمام عالم پر

دہن سے غنچے کے گرتے ہیں قطرۂ شبنم — کہ دودھ جیسے اگلتا ہے شیرخوار پسر

مذاق شبنم و گل میں ہے حسن و عشق کا جذب — ادھر تو خندہ لبی ہے ادھر ہے دیدۂ تر

کسے سنائے کوئی داستان بلبل و گل — مشاہدہ کا تقاضا ہے دیکھ لو آکر

وہ دیکھو پہنچے ہیں بلبل ہیں گل کی خندہ لبی — سنو وہ زمزمہ سنجی بلبل خود سر

نیاز و ناز کی صحبت میں دخل ہے کسکو — ہوائے صبح بھی آئے تو آئے تھم تھم کر

ہوا پرست چمن جا رہی ہیں گلشن کو — نظر فریب ہے اسوقت باغ کا منظر

غبار دہلوی

خدا میرا نگہبان ہے

اے خداوند دو عالم! تو نگہباں ہے میرا　دستِ قدرت میں ترے سرِ رشتۂ جاں ہے مرا

جادۂ صدق و صفا میں ہے تو ہی میرا رہبر　تو ہی یا رب! رہنمائے دشتِ امکاں ہی مرا

موت کے سایہ میں ہے جو وادیٔ اندیشہ ناک　پھر رہا ہوں اس میں کیا پھر نہیں ہے نقصاں مرا

ساتھ تو ہر وقت ہے میرے یہ ہے تجھکو یقیں　تو ہر اک آفت میں حامی ہے یہ اعیاں ہے مرا

تو ہی یا رب! میرے دستِ ناتواں کا ہے عصا　گوئے ہمت تو ہی ہے، اور تو ہی چوگاں ہے مرا

خوانِ نعمت غیب سے مجھکو عطا کرتا ہے تو　رزق پہنچاؤں بہم ورنہ کہاں امکاں ہے مرا

میکدے میں دہر کے ہوں آہ! وہ مستِ الست　تیرے سرجوشِ کرم سے جام جوشاں ہے مرا

تو ہی ارماں ہے دلِ رنجور کا ربِّ کریم　ورنہ کوئی کب شریکِ دردِ پنہاں ہے مرا

ڈھانک لے پردہ مرا اے میرے ستارِ عیوب　لیئے آلودہ بہت دامانِ عصیاں ہے مرا

وہ عناصر کا ہیولیٰ ہوں کہ ہوں نقشِ فنا　ہوں وہ مجموعہ کہ شیرازہ پریشاں ہے مرا

شیوۂ ملت میں میرے کفرِ نعمت ہے گناہ

شاکرِ رحمت ہوں شاکر! شکر ایماں ہے مرا

شاکر میرٹھی

قطعۂ تاریخ اجراء رسالۂ ذخیرہ

نکلا ہے رسالۂ ذخیرہ　پُر شوکت و پُر بہار و پُر جوش

تہذیب و مذاق کا نمونہ　علم و اخلاق و عافیت کوش

خوبی کے شعار سے مزین　زینت کے نگار سے ہم آغوش

ہے ساغرِ بادۂ لطافت　آئیں جلدی کہاں ہیں مے نوش

طالب لکھدو یہ سالِ اجرا　رنگِ دلِ ناظرِ انجمن ہوش

۱۹۱۵

طالب بنارسی

تازہ غزلیں

جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا　شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے　شمع کا رنگ جسے خون ہو پروانے کا

اٹھ گئے آپ جو پہلو سے قیامت آئی　لگ گیا درد کو پہلو مرے تڑپانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی　کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

رات بھر آتشِ حسرت سے جلا کرتی ہے　شمع پر صبر پڑا ہے کسی پروانے کا

تو نے صورت نہ دکھائی تو یہ صورت ہوگی　لوگ دیکھیں گے تماشا ترے دیوانے کا

رات دن دونوں کھلے رہتے ہیں تیرے وُن کیلئے　در تو یہ ہو کہ در ہو کسی میخانے کا

جلوۂ حسن کی طاقت نہیں شتّا تو مگو　شمع آئی کہ ہوا خاتمہ پروانے کا

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلا راز جلیل

خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

منشی لطیف احمد صاحب اختر مینائی مددگار ہوم سکریٹری دولتِ آصفیہ

دل کے ارمان ہے گو نہ رہا دل باقی　بجھ گئی شمع مگر ہے ابھی محفل باقی

میں ابھی ہوں تو ابھی ہے تلوار بھی اے قاتل　آج رہ جائے نہ کوئی ہوسِ دل باقی

سرزمیں نجد کی اب دیکھکے پھٹتا ہے جگر　قیس و لیلیٰ ہیں نہ ہے ناقہ و محمل باقی

نالۂ دل پہ نہیں غیر اگر ہنستے ہیں　ہم دکھا دیں گے تماشا جو رہا دل باقی

وائے قسمت جو ہم آئے تو چمن میں دیکھا　گل خزاں لے گئی ہے شورِ عنادل باقی

ہاتھ سینے پہ جو رکھو تو ہو معلوم تمہیں　کیا کہوں میں کہ نہیں ہے تپشِ دل باقی

کس سے ناکامیٔ مقصود کی فریاد کریں　رہ گئے پائے طلب اور ہے منزل باقی

صحبتِ عیش میں اپنی بھی گذرتی تھی کبھی　اب وہ راتیں ہیں نہ باتیں ہیں نہ شیشہ و دل باقی

دردِ دل میں ہے وہ لذت کہ نہیں جی جانتے　ہم رہیں یا نہ رہیں کاش رہے یہ دل باقی

خلشیں اور تو سب نکلیں لیکن اختر
لائبہ کانٹوں کا ہے کانٹا ہو مرے دل باقی

مولوی احمد علی صاحب شوقؔ قدوائی لکھنوی

دل کھو بیٹھے ہم کو اس سے راز عشق نہ کہنا تھا
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے - اتنا سمجھے رہنا تھا

کیوں ہنستے ہو ہمیں جو برہنہ آج جنوں کے ہاتھوں ہوں
کچھ دن گذرے ہم نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

نزع کے وقت آئے ہو اب پوچھتے ہو کیا ہے مجھے
حالت میری سب کہہ گذرے جو کچھ تم سے کہنا تھا

آگے کیا وہ رویا کیں یہ رہ رہ ہو نظارہ میں
آنکھیں کچھ نا سو نہیں تھیں جن کو ہر دم بہنا تھا

ہمت ہارے جی سے بیٹھے مرے لب لذت کبھی اے شوقؔ
مرنے کی جلدی کاہے کی تھی عشق کا غم کچھ سہنا تھا

مولوی سید احمد صاحب زیدؔ بلگرامی مغفور

پھرے بہت دیر میں حرم میں چمن چمن کو ہزار دیکھا
مگر جہاں میں ترا مقابل نہ ہم نے پروردگار دیکھا

جو کاکل و روئے یار دیکھا تو سنبل و لالہ زار دیکھا
عجیب لیل و نہار دیکھا قرین جاں کے تتار دیکھا

خزاں جو آئی تو باغباں نے چمن میں پھر کر ہزار دیکھا
نہ تخم دیکھے نہ برگ دیکھے نہ پھول دیکھے نہ بار دیکھا

لگا کے پہلو پہ میرے خنجر کہا جو قاتل نے مجھ سے ہنس کر
غضب ہے تختہ کھلا ہوا ہے ہرا بھرا لالہ زار دیکھا

مثال طفلی چلی جوانی وہ آئی پیری ہوئے وہ فانی
یہ عمر کی ہے سبک روانی نہ آیا ہرگز سوار دیکھا

جہاں میں ایسا یار کم ہے جو وقت مشکل پہ ہووے ہمدم
کسی سے امید کیا رکھیں ہم نہ دل کو بھی غمگسار دیکھا

یہ غنچے کیوں آج ہنس رہے ہیں لبوں کو بھی کھلا رہے ہیں
یقیں ہے ہم کو یہی ہوا ہے انہوں نے روئے بہار دیکھا

ہوا ہے کیا انقلاب دوراں خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
جو بیٹھتے تھے مزار پر ہیں انہیں بھی زیب مزار دیکھا

شباب پیری میں یاد آیا تو دل نے کیا کیا مزہ اٹھایا
خدا کی قدرت ہے زیدؔ ہم نے خزاں میں لطف بہار دیکھا

مولانا احمد حسین صاحب شوکتؔ میرٹھی

ذرا پوچھے کوئی عمر رواں سے
کہاں جاتی ہے آئی تھی کہاں سے

نگہ ہو سرخرو ہر سخت جاں سے
جو نکلے تیغ قاتل درمیاں سے

کہا قاتل نے دم دیتا ہے ہم کو
بھلا کشتے میں دم آیا کہاں سے

گھلا ہے نیل کیوں چشم فلک میں
یہ جلتا ہے مرے دود فغاں سے

بھلا صید افگنی چلے چڑھے کیا
جو بیٹھے تیر چلے میں کہاں سے

شب وعدہ ملے گا دل سے دل آپ
ملاؤ تو زباں پہلے زباں سے

حرم میں جب سے چوما حجر اسود
ٹپک ہوں بت کے سنگ آستاں سے

بشر کو سر چڑھا کر سر بلندی
پٹکتی ہے زمیں پر آسماں سے

سحر کی پیش بندی شام وعدہ
دیے ہیں ہاتھ کانوں میں اذاں سے

بناتے ہو سوال وصل پر منہ
زباں کا کام لیتے ہو دہاں سے

اگر بہرے نہ ان کے کان دشمن
نہ کرتا نالہ باتیں آسماں سے

فنا کی راہ ہر غافل کو تا صبح
بتائی شمع نے جلکر زباں سے

جو دل سے بیٹھنا پہلو میں سیکھا
تو اٹھنا سیکھئے دردِ نہاں سے

نہیں افشائے راز اے شمع آساں
زباں نکلے جو یہ نکلے زباں سے

غبارِ خاک مجنوں گردِ محمل
رہا پیچھے نہ گرد کارواں سے

قفس میں آشیانہ یاد آیا
گر گئی یاں بھی بجلی آسماں سے

غضب حرف شکایت تھا شب وصل
انہیں نیند آئی میری داستاں سے

گئے مسجد سے سیدھے دیر کو ہم
کہاں کی راہ نکلی ہے کہاں سے

جو گل کی آگ ہو بلبل کے دل میں
تو نکلے برق بنکر آشیاں سے

اثر شوکتؔ ہو یہ دل کی کشش کا
کہ ان کے تیر کھنچتے ہیں کماں سے

مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا لکھنو

ستاتا تجھکو یوں بھی گردش ایام آتا ہے
رفاہِ عام کے کاموں میں بھی الزام آتا ہے
مجھے تو دین و دنیا کا نہ کوئی کام آتا ہے
مگر سب کام بنتے ہیں کہ تیرا نام آتا ہے

بیاں کیا ہو کہ تم پر کچھ نہ کچھ الزام آتا ہے
برائے نام آتا ہے جو ہم تک جام آتا ہے

ذرا سے دل میں ہے اللہ اکبر اسقدر وسعت
سمائے جو نہ عالم میں وہ دل میں نام آتا ہے

یہاں دنیا وہاں لینا ہزاروں ایک کے بدلے
خدا کی دین ہے یوں آخرت میں کام آتا ہے

میں حیراں ہوں کہ روزی روز پہنچے مجھ سے جاہل کو
جسے کوئی ہنر یارب نہ کوئی کام آتا ہے

گر پہنچی رقیبوں سے اذیت اسقدر ہم کو
کہ تنہائی میں آتا ہے اگر آرام آتا ہے

سنورتے ہیں وہ کام اپنی غرض جن میں نہیں شامل
بگڑتے ہیں وہی جن میں خیال نام آتا ہے

جو اپنے صرف میں آتا ہے اوس سے فائدہ **حامد**
جو نذر مستحق ہو بس وہی تو کام آتا ہے

حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی

ہو رہے غیر کا وہ، یار کا منشا ہے یہی
عشق ہی چھوڑ دو، غیرت کا تقاضا ہے یہی

میں کسی اور کو دل دوں، وہ کسی اور کو دے
اب تو ہم دونو کے حق میں، مگر اچھا ہے یہی

مر مٹے کب کا ہوئے، انکی محبت میں مگر
بدگماں اب بھی ہیں وہ مجھسے، تماشا ہے یہی

درد الفت کو نہ کیوں دل میں چھپا کر رکھوں
سبب زیست یہی، باعث ایذا ہے یہی

تم جو کہتے ہو تو انکار محبت ہی سہی
ورنہ لے دیکھیے میری زیست کا منشا ہی تو ہے یہی

اور بھی آب ملامت سے یہ شعلہ بھڑکے
مفتی عشق کا اس باب میں فتویٰ ہے یہی

ستم و جور بھی ہے، ضبط کی تاکید بھی ہے
اور کہتے ہو کہ عشاق کا حصا ہے یہی

میں وفادار نہیں اور وہ ستمگار نہیں
دشمن و دوست کی ہر بزم میں چرچا ہے یہی

یا رط غیار مرحالت رویں اور تم
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو مجھے رونا ہے یہی

اے خدا ایسی ہو اس خرمن ایمانی کی
یہ کہاں ؟ گر تپش ہے تپ کلیسا ہے یہی

گو جو نہ ہو شکوہ بیداد نہ ہو
صبر کی داد خدا لیجیے، سوچئے یہی

بڑ گیا، بد رہا، جیتے ہوا تو ہے ہلال
بس سمجھ لیجے تری تقدیر میں لکھا ہے یہی

مائل جور ہے شوخ ستم ایجاد مگر
دل یہ کہتا ہے کہ معشوق کا شیوہ ہے یہی

خون منت زدہ ہے رخ لالہ و گل کی **اظہر**
خون جائز ہے مجھے جس کا دعوی ہے یہی

قطعہ تاریخ مولانا حالی مرحوم و مغفور نور اللہ مرقدہ

از منشی عبد الخالق خلیق دہلوی

ایک تھے اپنے وقت میں حالی
شاعر خوش بیان اہل ہنر

بزم قدرت کے آپ عاشق تھے
خوب لکھا ہے نظم میں نیچر

انکا ہر شعر سلک مروارید
انکا دیوان معدن گوہر

آپ تھے پیشوائے اہل سخن
آپ تھے یادگار اہل ہنر

ہائے افسوس دہر فانی میں
ٹھیر سکتا نہیں کوئی دم بھر

آپنے بھی جہاں سے رحلت کی
ہوا ہے ماتم کدہ بنا ہے گھر

رو رہے ہیں عزیز اور احباب
بزم ماتم جہاں ہے سرتا سر

فکر تاریخ تھی **خلیق** مجھے
ہاتف غیب ہو گیا رہبر

کیوں "غم مرگ" ہو نہ سال وفات
جبکہ آجائے یوں "اجل" بے سر

۱۳۳۳

تاریخ اجرائی رسالہ "ذخیرہ" ۱۹۱۵ء

شد طبع "ذخیرہ مرصع" حالا
گلدستہ مضمون و معانی آرا

ناظر بزبان لاابالی اکنوں
"تاریخ بخوان" "ذخیرہ ہوش افزا"

۱۹۱۵ء

لاابالی امروہہ

شایع ہوا آج وہ ذخیرہ
ہے جسکی نظم و نثر پر جوش

لکھا یہ خبر نے مصرعۂ سال
ہے دیکھئے یہ ذخیرہ ہوش

۱۹۱۵ء

خبر جونپوری

ایڈیٹوریل

کچھ اپنی نسبت

العلم قوة ایک نہایت مشہور مقولہ ہے جسکی زبردست صداقت ہر زمانہ اور ہر قوم نے تسلیم کی ہے اگر ہم تاریخ عالم ہستی کی مختلف اقوام کے غلبہ و عروج کا پتہ لگائیں یا زمانہ حال میں اقوام یورپ کی ترقی کے صحیح اسباب معلوم کرنا چاہیں تو انکی قوت کا راز ہم کو نہ تو انکے قوائے جسمانی کی ساخت میں ملیگا اور نہ انکی اسباب ارضی و طبیعی میں بلکہ یہ راز ہم کو انکے ذہنی و عقلی ارتقاء میں ملیگا۔ ذہنی و دماغی نشو و نما کے دو بڑے ذرائع ہیں اول وسیع مشاہدات دوسرے مفید معلومات کی تحصیل۔ اور ترقی پذیر اقوام نے اپنے افراد قوم کی ذہنی و دماغی نشو و نما و ترقی کو سب سے اہم و مقدم و مقدس فریضہ تسلیم کیا ہے۔ علوم و معارف کے دروازے ہر کس و ناکس کیلئے کھول دئے ہیں اور عقلی و علمی آزادی کو ہر شخص کا فطری حق سمجھا ہے۔

تعلیم کی ابتدائی عمومیت و مجانیت کیساتھ یورپ و امریکہ میں سب سے زبردست ترقی معلومات کا ذریعہ پریس ہے حقیقتاً یہ ہے کہ آج یورپ کی ترقی کا انحصار زیادہ تر پریس ہی پر ہے اور یورپی اقوام کی دور ترقی میں یہی وہ زبردست ترین آلہ ہے جس نے ایک انقلاب عظیم انکے خیالات و احساسات و جذبات میں پیدا کردیا اور کر رہا ہے پریس کی بدولت علاوہ لاکھوں کروڑوں کتابوں کے ہزارہا روزانہ اخبار و ماہانہ رسالے مختلف علوم و فنون پر شایع ہوکر آناً فاناً اطراف عالم میں پھیل جاتے ہیں اور قوم کے خیالات میں ایک عظیم تغیر پیدا کردیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھی اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ قوت و عروج کا ایک شاندار زمانہ گزر چکا ہے مگر یہ وہی زمانہ ہے جبکہ مسلمانوں کی ذہنی و دماغی ترقی کی سطح دیگر اقوام عالم سے زیادہ مرتفع تھی آنحضرت کی رحلت کے بعد ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ شاہی حکم سے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان میں شروع ہوگیا۔ ہارون رشید کے عہد میں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قایم کیا گیا۔ اور مامون کا عہد خلافت تاریخ اسلام میں عہد زرین ہوگیا۔ اس نے عظیم الشان کتب خانے بغداد میں قایم کئے اسکا دربار علماء و فضلا کی مجلس اور بغداد تمام عالم کا مرکز علوم بنا ہوا تھا۔ گو اسلامی سلطنتوں میں انقلاب ہوگئے ہیں مگر مسلمانوں کا علمی مذاق بدستور قایم رہا۔ بنی عباس ایشیا میں بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اندلس میں ایک دوسرے کے مخالف رقیب تھے لیکن علم و حکمت اور ادب و انشا کی سرپرستی میں ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لیجائے۔ ایک عجیب بات تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں علوم و فنون کی روشنی قایم رہی اُن کا ذہنی و دماغی تفوق بھی قایم رہا اور اُن کا تمدن سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور وہ سچی و اصلی برتری جو انکو اقوام عالم پر حاصل تھی اسکی وجہ یہی تھی کہ انکی ذہنی و دماغی ترقی میں پنہاں تھا۔

اہل ملک کی ذہنی و دماغی ترقی کے نشو و نما کیلئے علاوہ مکاتب و مدارس کے زمانہ حال میں اخبارات و رسالے بھی بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ آج اخبارات و رسالوں کا جو اثر ہمارے تخیل و مذاق پر ہے وہ بدیہی ہے چنانچہ دیسی پریس کے ذریعہ احساس قومیت و حقوق شناسی کے متعلق جو زبردست تحریک ملک میں پیدا ہوگئی ہے اسکی اہمیت و قوت میں کیسکو کلام ہوسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ ملک میں اعلیٰ مذاق کی ترقی کیلئے اعلیٰ درجے کے اخبارات اور رسالے بہت کم تر ہوئی ہیں حتیٰ کہ اعلیٰ مذاق کے اخبار و رسالے صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

حیدرآباد اسوقت حضور اقدس و اعلیٰ کے عہد میمنت مہد میں ہر قسم کی ترقیوں کا مرکز بن رہا ہے یہاں ہم کو مشرقی علوم کے فارغ التحصیل اور علوم مغربیہ میں گریجویٹ بکثرت نظر آتے ہیں سرکار عالی کے حلقوں میں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے آثار نمایاں ہیں اور یہاں کی بیداری کا سب سے نمایاں ثبوت حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام اور انجمن ترقی اردو کی تجدید ہے علمی ترقیوں کی بہترین توقعات اسوقت حیدرآباد سے وابستہ ہیں ایسے حالات میں یہاں ایک عمدہ رسالہ کی نہ صرف گنجایش بلکہ شدید ضرورت ہے اور یہی حالات و ضروریات ہیں جنسے باخبر اشخاص ہم خیال میں متفق ہونگے کہ اس علمی کام کی انجام دہی کیلئے بہترین مقام حیدرآباد ہے جہاں ہندو و مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور جہاں مختلف زبانوں کے مروج ہونے کے باوجود سب کا ذریعۂ اظہار خیالات اردو ہے اور اردو کو یہاں کی سرکاری زبان ہونیکا امتیاز حاصل ہے رسالہ ذخیرہ کیلئے یہ امر باعث افتخار ہے کہ اسکا مرزبوم ایک ایسی سرزمین ہے جہاں ہندو و مسلمانوں کے اختلافات اور اردو ہندی کے جھگڑے معدوم ہیں اور مجھے امید ہے کہ یہی خصوصیات اسکو ہماری توقعات سے زیادہ کامیاب کریگی۔ ایک زمانہ تھا جبکہ حیدرآباد میں سررشتہ علوم و فنون قایم تھا عہدہ دار و ہیں منصب کثرت سے علم دوست بلکہ خود بھی اردو فارسی عربی زبان کے ادیب تھے عمدہ عمدہ اخبار و رسالے لائق ایڈیٹروں کے زیر قلم شایع ہوتے تھے جیسے "حسن" و "مخزن الفواید" ایسے مشہور و معروف رسالے یہاں نکل چکے ہیں جنمیں ایسے ایسے نامور اہل قلم مضامین لکھا کرتے تھے جنکے علم و فضل پر ملک و قوم کو فخر اور بجا فخر ہے ذخیرہ کی اجرا کا مقصد اولین مذاق علمی کی اشاعت اور زبان اردو کی خدمت ہے ہمارا اعتقاد ہے کہ ہندوستانی میں بحیثیت زبان ترقی کی استعداد اور فطری مادہ کی فراوانی ہے۔ ملک کے منتخب انشاپردازوں کے علمی خدمات اس رسالہ کیلئے حاصل کرنیکی کوشش کیگئی ہے اور ناظرین ان صفحات میں بعض ایسے اہل قلم حضرات کے مضامین ملاحظہ فرمائینگے جنکے رشحات قلم سے باوجود انکی سلیقہ شعاری کے اردو رسالے اب تک محروم ہیں باقی قواعد و ضوابط رسالہ عنوان کسی دوسری جگہ پر مندرج ہیں ہمکو امید ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی متفقہ کوشش سے ہماری توقعات اور ارادے پورے ہونگے اور جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے اسمیں خدا کی عنایت و تائید سے ہم کو کامیابی ہوگی۔ یہ امر باعث افتخار و خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰحضرت بندگانعالی کی تیسویں سالگرہ ہمایوں کی مبارک تقریب میں اس علمی کام کا آغاز ہو رہا ہے۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

ایڈیٹر

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

فلسفۂ ازدواج

مؤلفہ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس

کی نسبت

مولانا حالی، مولانا ذکاء اللہ اور مولوی عزیز مرزا کے خیالات کا اقتباس

"آپ نے یہ کتاب لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرے" الطاف حسین حالی

"اس تاہل یا تجرد کے فائدوں اور نقصان کو میزان عدل میں تول کر تاہل کے پلڑے کو گراں اور تجرد کے پلڑے کو سبک فلسفیانہ ثابت کیا ہے حکما اور علماء و فضلا کی رائیں ازدواج کے بارے میں لکھی ہیں بتلایا ہے کہ جو شخص اپنے تئیں محلی بالفضائل اور مخلی عن الرذائل بنانا چاہتا ہے وہ اس کتاب کو بالاستیعاب دل لگا کر مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس میں کیسے کیسے جواہر بہتر ہیں جو اسکے خریدار کے ہاتھ آسکتے ہیں"۔ محمد ذکاء اللہ

"میں نے اس کتاب کا مطالعہ اول سے آخر تک کیا اسکا پیرایۂ بیان نہایت شگفتہ اور عبارت چست اور بامحاورہ ہے مصنف نے جابجا مشہور مصنفوں کے اقوال سے اپنے دلائل کو تقویت دی ہے جس سے کتاب کی قیمت اور بڑھ گئی ہے آخر میں ایسی عمدہ بحث کی ہے کہ کشمکش حیات کے ایسے ایسے راز بیان کئے گئے ہیں جو انسان کو کارزار ہستی میں سرخرو بنانے کیلئے کیمیا اثر ہیں" محمد عزیز مرزا

ضخامت ۲۰۰ صفحات تقطیع ۱۸/۲۲ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجہ

قیمت صرف عہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ } ذخیرہ بک ڈپو حیدرآباد دکن

تاج

اردو لٹریچر کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

اگر آپ گھر بیٹھے صرف ایک روپیہ سال میں بہترین اعلیٰ مضامین نظم و نثر، اچھوتے بیش بہا اخلاقی قصے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں تو

منیجر "تاج" کالی کمان حیدرآباد دکن سے درخواست کیجئے

عطرِ سخن یا جذباتِ مسلم

مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی موجد علمی تاش

اس مجموعہ میں تقریباً ایک سو بڑی چھوٹی ایسی منظومات شامل ہیں جو ہندوستان کے بہترین دل و دماغ کے نتائج افکار اور ادبی نازک خیالیوں کا بے نظیر مرقع ہیں جملہ منظومات اسلامیات سے متعلق اور انداز خاص رکھتے ہیں۔

جذباتِ مسلم میں خواجہ حالی، علامہ شبلی، اکبر، اقبال، اسمعیل، ظفر، شفیق، عزیز، نیاز، صفی وغیرہم چالیس پچاس مشہور و غیر مشہور شعرا کا کلام درج ہے از انجملہ بعض نظموں کے عنوان حسب ذیل ہیں:- مناجات، پردہ، نسیم، نعرۂ مستانہ، بشارت، شمع ہدایت، جلوۂ حق، مسلمان صاحبزادہ، ترانۂ مسلم، یادِ ماضی، مستقبل قوم، اسلامی اخوت، سرمایۂ مسلم، آوازِ قرآن، صبحِ ازل، قسمت، آفتاب، ختم، اعظم، ہمت و تدبیر، شکوۂ اسلام، رمضان، عید، حج، تاج محل، قرآن مجید۔ شغل التکفیر۔

لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ سرورق رنگین و دلکش صفحات کلاں ۱۷۰ قیمت اصلی ایک روپیہ آٹھ آنے عہ رعایتی چند روز کیلئے ایک روپیہ (عہ) جلدی کیجئے ورنہ افسوس ہوگا۔

پتہ:- کارخانہ علمی ٹکس و علمی تاش لاہور

مفید دکن پریس کالی کمان حیدرآباد دکن میں چھپا

جلد ۱ نمبر ۲ — اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ — نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ

مرتبہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

تصاویر

(۱) قدر بلگرامی (۲) طاق کسریٰ حالت ابتدائی میں (۳) طاق کسریٰ کے آثار قدیمہ (۴) طاق کسریٰ کی موجودہ حالت (۵) سکۂ اردشیر بابک کے دو نمونے

فہرست مضامین

نثر

نظم

قیمت سالانہ للعہ — دفتر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا — فی پرچہ ۶/

ضوابط رسالہ

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کے آخر میں حتی الامکان پوری پابندی کیساتھ شایع ہوا کریگا اسکا حجم فی الحال ۴۸ صفحہ ہوگا اور ہر صفحہ میں دو کالم ہونیکی وجہ سے معمولی رسالوں کی تقطیع کے ایک سو صفحات کے قریب عبارت ہوگی۔

(۲) رسالہ ہذا میں نظم و نثر کے بہترین علمی اخلاقی مضامین اس غرض سے شایع کئے جائینگے کہ ملک میں علم کا صحیح مذاق پھیلے اور اردو زبان کو ترقی ہو۔ اس امر کی کوشش کیجائیگی کہ انگریزی زبان کے بہترین مضامین کا اقتباس اسمیں درج کیا جائے اور قصص و حکایات کو بھی جگہ دیجائیگی جو دلچسپ اور پر لطف ہونیکے ساتھ عمدہ نتیجہ خیز ہوں مگر سیاسیات سے اسکو مطلق تعلق نہ ہوگا خالص تعلیمی مضامین اس رسالہ میں شایع کئے جائینگے۔ اسکے مضامین جسطرح علم دوست اصحاب کیلئے مفید ہیں اسیطرح تعلیم یافتہ خواتین کیلئے بھی انکا مطالعہ خالی از دلچسپی نہوگا۔

(۳) رسالہ باتصویر اور اعلیٰ درجے کے ایوری فنیش کاغذ پر شایع ہوا کریگا سالانہ قیمت بلا امتیاز مبلغ للعہ مع محصول ڈاک پیشگی مقرر ہے

(۴) نمونہ کا پرچہ ۳ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جائیگا۔

(۵) جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

(۶) اگر کوئی نمبر وقت پر نہ پہنچے تو دوسرا پرچہ پہنچنے کے قبل اطلاع دینے پر مفت ورنہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

(۷) خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور درج ہوا کرے اور سکونت تبدیل کرنیکی صورت میں مفصل پتہ سے اطلاع دیں۔ جملہ خط و کتابت واضح طور پر کیجانی چاہئے۔

(۸) اشتہارات کی چھپائی بذریعہ تحریر طے ہو سکتی ہے۔

(۹) تا اطلاع ثانی ذخیرہ کے متعلق تمام خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہئے۔

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

مالک و ایڈیٹر رسالہ "ذخیرہ"

اندرون دروازہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن

قدر بلگرامی کی تصویر ایک مہینہ قبل کلکتہ بھیجی گئی تھی جو باوجود متعدد تقاضوں اور تار برقیوں کی
روانگی کے ہنوز نہیں آئی۔ تیسرے نمبر کیلئے ہمنے جو تصویر تجویز کی تھی ناچار وہ اس نمبر
کیساتھ شائع کردیجاتی ہے تاکہ التزام ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ آئندہ نمبر میں قدر بلگرامی
کی تصویر اور علامہ جرجی زیدان کی سوانحعمری انشاءاللہ شائع کیجائیگی

منیجر

علامہ جرجی زیدان

راستی وراستبازی

الصِّدقُ یُنجی والکذبُ یُہلِک
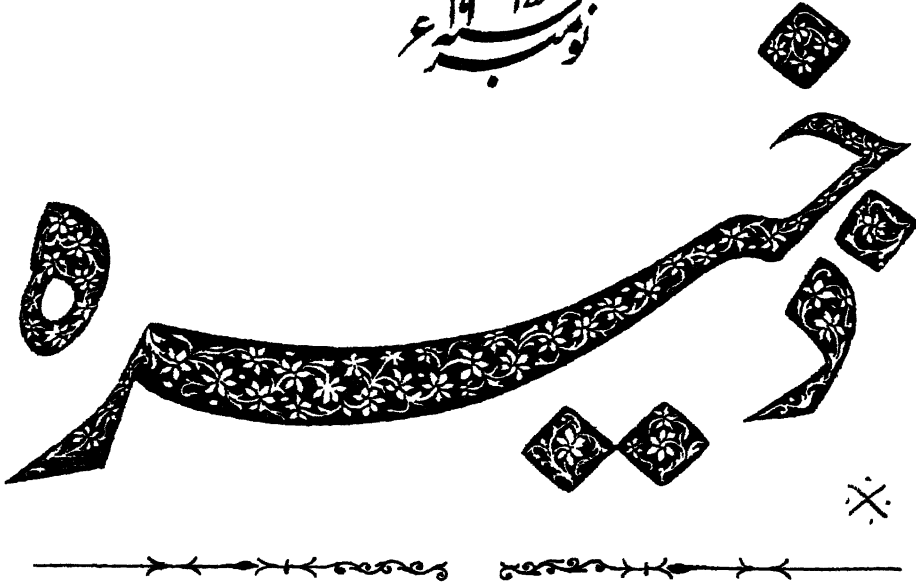
راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

راستی وراستبازی ہمداستان سازی رفتار ست باگفتار وگفتار باپندار یعنے ازیں ہرسہ تار ہمیں یک آہنگ خیزد وہیچ یکے ازیں سہ بادیگرے نستیزد۔

راستی آدمیت کی جان ہے۔ سیدھا وہی چلتا ہے جو سچا ہے جھوٹ کی راہیں ٹیڑھی ہیں۔ منہ پر تلواریں کھانا اور پیٹھ نہ پھیرنا' زخموں میں ٹانکے لگوانا اور تیور میلے نہ کرنا' بڑی جرأت اور جوانمردی کا کام ہے۔ مگر اصلی سورما وہی خدا کا بندہ ہے جسکا سچ بولنے میں پاؤں نہ ڈگے' سچی بات اکثر کڑوی لگتی ہے' جھوٹ میں مسرت کا مزہ ہے' گو اثر میں ہلاہل ہو۔ وقت پر جھوٹ سے کام بھی نکل آتا ہے جیسے کیمیاگر کا جوڑ کہیں چلگیا تو چل گیا مگر پھر ایک نہ ایک دن کھوٹا کھرا پہچان لیا جاتا ہے۔ آدمی ابن الوقت بنکر جھوٹ سے اپنا مطلب تو بنا لیا کرتا ہے۔ مگر دل کے قرار اور پاکدامنی کی آسایش سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہر وقت دلمیں کھٹکا لگا رہتا ہے کہ دیکھئے کب یہ بھانڈا پھوٹتا ہے' کب رسوائی کا سامان ہوتا ہے' جسکے دل میں چور بیٹھا ہو' وہ کیونکر اپنے سایہ سے نہ بھڑکے ایک جھوٹ کے نباہنے میں سو جھوٹ نئے گھڑنے پڑتے ہیں یہانتک کہ آدمی جھوٹ کا پتلا بنجاتا ہے۔ جان وبال میں پڑجاتی ہے'

اگرچہ آغاز آسان نظر آتا ہو مگر انجام دشوار ہو جاتا ہے، دروغگو را
حافظہ نباشد۔ آخر کبھی نہ کبھی قلعی کھل جاتی ہے۔ چشموں میں آنکھ
نیچی کرنی پڑتی ہے، اور جو اتفاق سے کچھ دنوں داؤں چل بھی گیا تو
اپنے دل کی چٹکیاں بے چین کرنے کو کیا تھوڑی ہیں اور رفتہ
رفتہ جب اس پوشیدہ تازیانہ کا بھی متحمل ہو گیا پھر تو سب مساوات
ہے، کیسی ذلت کہاں کی خواری بے حیائی کا جامہ پہن کر آدمی
پکا بے ایمان، دغاباز بن جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جھوٹ آدمیت
میں گہن لگا دیتا ہے۔

زمانہ جھوٹ سے بھرا ہوا ہے، جدھر دیکھو پہاڑ کے پہاڑ جھوٹ کے
ہیں، بڑی جرأت، بڑی احتیاط، بڑی دانائی چاہیئے۔ تا کہ آدمی
راستبازی کیساتھ اپنی زندگی بسر کر جائے اور ان پہاڑوں میں
ٹکریں نہ کھائے، اپنی برائیوں کا آپ عذر کرکے دل کو سمجھا لینا
اور اس عذر بدتر از گناہ سے اپنی دانست میں اپنے خدا کو دھوکہ
دے لینا، نقصان مایہ یا شماتت ہمسایہ کے خوف سے اپنی شخصیت
میں بٹہ آنے یا اپنی حماقت ظاہر ہو جانے کے ڈر سے جھوٹ
بولنا، اُن لات و عُزّیٰ کی پرستش میں جنکا لوگوں نے وضع
نام رکھا ہے، سچی بات کو دروغ کے پردے میں چھپانا اور
اپنے نزدیک اُسکو بڑی وضعداری قرار دینا، دوستوں کی دلداری
دشمنوں کی تذلیل، حاکموں کی خوشامد، ملانوں کی تسکین، جاہلوں
کی تالیف، کی خاطر حرف راست سے درگذر کرنا اس زمانہ کا
وتیرہ ہو گیا ہے، راہِ راستی میں بڑے بڑے دشوار گذار پہاڑ اور
ٹیلے ہیں، ذرا غور کرو اپنے نفس کی خوشامد کیسی میٹھی معلوم ہوتی ہے،
یہ وہ کافر شراب ہے کہ منہ سے لگی ہوئی نہیں چھوٹتی، یہ وہ جھوٹا
آئینہ ہے کہ کبھی سچی صورت نہیں دکھاتا ؎

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ
ولکن عین السخط تبدی المساویا

اپنے حسن کا گمان خوش آوازی کا یقین، علم کا غرہ، دانشمندی کا
گھمنڈ، یہ ادنیٰ شعبدے نفس کے ہیں۔ جنکی بدولت مردوں کو
کنگھی آئینہ کا شوق ہوتا ہے۔

ہمسایہ والوں کو زیر قدم در گوش کن کہنا پڑتا ہے کج بحثی سے
دوستوں کا دماغ پریشان ہوتا ہے، تقدیر کی شکایت، ناشکری
کے کلمات، ہر مجلس میں سنے جاتے ہیں، عرفان نفس کے یہی
معنی ہیں کہ اپنے حساب کتاب کی جانچ میں پہلو تہی، اپنی خطا سے
چشم پوشی، اپنی طرف کی پچ نہ کرے۔ خودبینی کو عیب کیوں
گنتے، اگر خودبینی کو اکثر دروغ بینی لازم نہ ہوتی، خودبینی،
حق بینی کے ساتھ ہو تو عین صواب ہے! من عرف
نفسہ فقد عرف ربہ ورنہ سراسر خطا، سبز عینک
لگا کر دیکھو تو سارا جہاں ایک باغ سبز نظر آتا ہے۔ ہزاروں میں
ہزاروں رنگ ایک سے ایک نرالے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر
اصل دونوں کی پا بہوا ہے۔ جو شخص ایسے ڈھکوسلوں پر
نہیں بھولتا اپنا چال آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے اور آپسے سچ بولنے
میں کوتاہی نہیں کرتا، وہ کمتر اوروں کی عیب چینی کریگا اور
انکی خطاؤں کو ہمیشہ چشم حلم و ملائمت دیکھے گا۔

شاید سب سے ذلیل تر وہ جھوٹ ہی جو پیسہ کے واسطے بولا جاتا ہے۔ روزمرہ کی
خرید و فروخت، سودا سلف میں لوگ کتنا جھوٹ بولتے ہیں دکاندار
چار پیسے زیادہ لینے کی غرض سے اپنی راہ اور خریدار چار پیسے بچانے
کی غرض سے اپنی راہ جھوٹ بولتا ہے۔ ایک یہ کہتا ہے کہ مینے اسی
کے ساتھ کا مال دس روپیہ کو بیچا ہے، دوسرا بول اٹھتا ہے
کہ مینے اگلے مہینے فلاں بازار میں دس آنہ کو لیا تہا۔ کوئی لعل
سوداگر اپنے بڈہے گھوڑے کے جھوٹے دانت دکھا کر گاہک کو

پہنانا چاہتا ہے۔ کوئی کھلاڑی پرائی زمین کا رہن نامہ لکھتا پھرتا ہے۔ مگر سچائی کا وہ زبردست سکہ ہے، کہ کھرا ہی رہتا ہے جو معاملے کا سچا ہے، سچے بیوپار میں گفت وشنود کی تکلیف نہیں، بھاؤ چکانیکا دردسر نہیں، کسی قسم کا کھٹکا نہیں، وقت ضایع نہیں ہوتا، زبان نہیں تھکتی، جانبین کو آسایش ہے۔ جھوٹے بیوپار کا فروغ چار دن کی چاندنی ہے، ساہوکاری میں سچائی کی ساکھ ہے، اور ہر قسم کے معاملت میں سچائی سے بہتر کوئی دلال نہیں۔

ایک قسم کا جھوٹ وہ ہے جسکو عرف میں خلق و مروت کہتے ہیں، مثلاً جس شخص کی صحبت سے جی بھاگتا ہو اس سے خلوص کا اظہار کرنا اپنی مقتضائے طبیعت کے خلاف کسی کی رائے یا مذاق سے اتفاق بیان کرنا خاطر سے ہاں میں ہاں ملا دینا ہر ملاقاتی سے اسکی مرضی کے موافق باتیں کرنا جس امر پر بہت سے لوگ متفق ہوں اسکو خواہ مخواہ بجا کہنا گو دل میں بیجا جانتا ہو تالیف قلوب کے واسطے سچ کو چھپانا یہ سب نیا سازی کے کردار ہیں اسمیں کچھ شک نہیں کہ ان کرداروں میں کبھی کچھ مروت یا احتیاط کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر زیادہ تر بزدلی، طمع دنیا، خوف نقصان، خواہش تحسین، انکی طرف داعی ہوا کرتی ہے۔ راست باز کو چاہیے کہ ان دواعی کی آمیزش کو نکال ڈالے اور جہانتک مروت یا احتیاط کا مقتضا ہو اسے قایم رکھے۔ مروت اور احتیاط ان صفات میں نہیں ہیں جو جھوٹ کے روادار ہوں۔ مبالغہ بھی کیا بے مصرف جھوٹ ہے، گناہ بے لذت اسی کا نام ہے، فقط اس لالچ پر کہ اپنی تقریر کی طرف سامعین متوجہ ہوں یا اپنی کچھ مشیخت ظاہر ہو سننے والے تعجب کریں لوگ ایک کو دس بیان کرتے ہیں جھوٹ کے پہاڑ تیار کرتے ہیں۔ مبالغہ بیجا شاعری میں بھی معیوب ہے۔ اگرچہ شاعر شعر اس غرض سے نہیں کہتا کہ لوگ اسے سچ جانیں یا اسکے مضمون پر عمل کریں۔ اور حق تو یہ ہے کہ عالی مرتبت شاعر مبالغہ کے پرتو میں حقایق ہی بیان کرتے ہیں افسوس کی جگہ ہے کہ ہم لوگ اپنے روزمرہ میں راستی کی عظمت بھول جائیں، سچائی کے پردے میں جھوٹی باتیں بنائیں، لڑکوں کو مبالغہ کی عادت سے بہت بچانا چاہیے، ورنہ آگے چلکر جھوٹ کی عادت ہوجائے گی، اور جو کام بدناسمجھی سے کھیل میں کرتے تھے، شعور میں غرض سے کرنے لگیں گے ایک قسم مبالغہ کی خوشامد ہے، خوشامد کو جھوٹ کی تجارت کرتے ہیں۔ اسکے بازار کی گرمی، سردی، رواج، عجب، اور خود پسندی کا بہت صحیح تھرمامیٹر ہے۔ خوشامدی کے شرمانے کو حکیم سنائی کے قصیدہ گوئی چھوڑنے کی حکایت کافی ہے۔ اگر لوگوں کو اتنی سمجھ ہوتی کہ خوشامد در پردہ بنانا ہے تو خوشامدی کو کوئی منہ نہ لگاتا پیٹ بھرنے کے بہت سے وسیلے دنیا میں ہیں، کیا ضرور ہے کہ آدمی چار پیسوں کی خاطر جھوٹ سے اپنی زبان گندی کرے

چہ حاجت کہ نہ کرسئ آسماں
نہی زیر پائے قزل ارسلاں

تکلف بھی ایک طرح کا مقطع جھوٹ اور خوشامد ہے جو منافقانہ ملاقات کی مشکلوں کو آسان کر دیتا ہے، جب اختلاف مزاج وفطرت یا بغض وعناد باہمی کی وجہ سے لوگ آپس میں بخلوص ملنے نہیں پاتے تو چار ناچار تکلف اور خلق مصنوعی کو اپنا سفیر بنا لیتے ہیں۔ ایسے معاملوں میں جہانتک کدورت نفس صاف ہوسکے صاف کرنی چاہیے اور منافقانہ ملاقات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

حق سچائی کا یہ ہے کہ سوتے جاگتے خوشی وغم سزا و جزا امن و خوف میں سچ کے سوا کچھ زبان سے نہ نکلے اور وہ بھی ادھورا

نہو، پورا ہو، کھرا ہو، جھوٹ کا غش اس میں نہ ملا ہو، جو دلمیں ہو، وہی زبان پر ہو، اور کردار بھی اسکے خلاف نہو، پکا سالک وہی ہے، جسکی پندار و گفتار و رفتار ایک ہے، دیکھو طبیعت اور فطرت کیسی سچی ہے، پانی کبھی جلاتا نہیں، آگ کبھی بجھاتی نہیں، دہوپ ٹھنڈا نہیں کرتی، برف سے کوئی شئے گرم نہیں ہو جاتی، چاندنی میں تپش نہیں ہوتی، خدا کا کارخانہ عیاذاً باللہ اگر سچا نہ ہوتا تو آدمی کی عقل کس کام آتی علم سے کیا فایدہ ہوتا، راستی وہ صفت نہیں جسکو کوئی حکیم ہی بتائے کوئی ملا ہی سمجھائے، تو لوگ اُسکو اچھا جانیں، آجتک کس بندۂ خدا نے کبھی کسی حکیم یا ملا سے پوچھا ہے کہ بتاؤ سچ اچھا ہے یا جھوٹ، وہ کون جھوٹا ہے جو اپنے جھوٹ کی تاویل نہیں کرتا، جھوٹا تو خود کھڑا سچ کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے، اور پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں سچا ہوں، کوئی مجھے جھوٹا نہ جانے الفضل ما شهدت به الاعداء

چھوٹے بچے بھی کبھی نہیں پوچھتے کہ جھوٹ کیوں برا ہے، سچ کیوں اچھا ہے، سچ ہے کون پوچھ سکتا ہے کہ آگ کیوں جلاتی ہے، پانی کیوں بجھاتا ہے۔

سچائی کو آسان نہ سمجھنا، اگر جھوٹ بولنے کے لئے لومڑی اور بندر کی سی مکاری کی ضرورت ہے، تو سچ بولنے کے واسطے حکیموں کی سی جانچنے، پرکھنے والی عقل درکار ہے۔ جو ہر شئے کو اپنی حیثیت واقعی میں دیکھے اور جلد بازی سہل انگاری نہ کرے، اور نیت بھی خالص چاہیے تاکہ غبار نفسانیت نگاہ صدق کو مکدر نہ کردے نہیں تو پندار و گفتار کا مطابق ہونا معلوم، بہتیرے جھوٹ دنیا میں ایسے بولے جاتے ہیں، جنکا عذاب سارا بے احتیاطی اور کاہلی کے سر ہے۔ سچائی کی عادت وہ عمدہ ریاضت روحانی ہے، جسکی بدولت سارے قوائے نفس کو قوت پہنچتی ہے اور جس قدر دروغگوئی سے نفس میں برائی کی قابلیت زیادہ ہوتی جاتی ہے اوسیقدر راستی سے بھلائی کی استعداد بڑہتی جاتی ہے، سچے کی عقل اور علم اور نیکوئی سب کو دن بدن ترقی ہے۔ علاوہ ان نعمتوں کے خود سچائی میں ایک آسایش اور مسرت دلی ایسی ہے جسکے مزے سے دروغگو واقف ہی نہیں علی الخصوص جب کوئی موقع ایسا آپڑے کہ سچ بولنے میں نقصان جھوٹ بولنے میں نفع ہو تو اُسپر بھی سچا سچ بولنے میں اصرار کرے اور داعیۂ نفس کی ایک نہ سنے۔ فقط

عماد الملک

اس مہینہ میں مرحوم منشی سید غلام حسنین صاحب قدر بلگرامی کی تصویر سے ہم اپنے رسالہ کو زینت دیتے ہیں۔ یہ تصویر ہم کو ہمارے قدیم کرمفرما مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے عنایت فرمائی ہے جنکی عنایتیں ذخیرہ پر خاص قسم کی ہیں، منشی قدر مرحوم مولویصاحب موصوف کے جد امجد کے حقیقی بھائی تھے، بجز اسکے قدر مرحوم کی کوئی اور تصویر موجود نہیں ہے، اور چونکہ آپکے کلام بلاغت نظام سے اہل ملک ایک عرصہ سے متمتع ہو رہے ہیں، اسلئے اہل ذوق کی عموماً اور آپ کے کثیر التعداد تلامذہ کی خصوصاً قدرتی طور پر یہ تمنا ہوگی کہ اس نازکخیال شاعر کی زیارت سے مشرف ہوں، الحمد للہ کہ ہم اس دیرینہ ضرورت کو مولویصاحب موصوف کی عنایت سے پورا کرنیکے قابل ہوئے۔ **ایڈیٹر**

قدر بلگرامی

منشی سید غلام حسنین قدر بلگرامی کملائے فن کی صف میں ممتاز جگہ لینے والوں میں ہیں، ہندوستان میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اِن کے نام و کمال سے واقف نہ ہو، ارباب سخن تو خاص طور پر انکے قدرداں ہیں، دنیا جانتی ہے کہ بلگرام ایک مردم خیز خطہ ہے، جہاں ہر فن کے کامل گذرے ہیں، اور جنکے کارناموں سے کتب سیر و تاریخ معمور ہیں، شاعر بھی ایسے ایسے گذرے جو نہ صرف اُردو بلکہ فارسی اور عربی میں سخنوَرانہ قابلیت دکھا گئے ہیں اور آجتک اُنکا کلام قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، میں بخیال طوالت بلگرام کے کاملین کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، مولف خزانہ عامرہ (مولانا غلام علی آزاد بلگرامی) بھی آپ کے اجداد میں سے ہیں، اور انہوں نے بعض شعرا کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے قدر بلگرامی قابل تذکرہ شخص اور ان کے کمال فن میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا، قدر کے سوانحی حالات بھی بعض اُن کاملین فن سے ملتے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی جفاکشی اور علم دوستی کے سبب ناموری حاصل کی اور معمولی حالت سے ممتاز درجہ اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔

قدر بلگرامی کی شرافت سیادت سے ظاہر ہے لیکن اعلیٰ نسبی کے سوا وہ صاحب کمال بھی تھے، ان مجموعی خوبیوں کے لحاظ سے وہ ہر طور پر قابل قدر شخص ہیں۔ فقیر ہیچمداں کے والد قدر مرحوم کی ملاقات خاص طور پر تھی جس زمانہ میں وہ کیننگ کالج لکھنؤ میں پروفیسر تھے ایک روز میں اپنے والد مرحوم کیساتھ قدر مغفور کے مکان واقع امین آباد میں گیا، میں اس زمانہ میں بہت کمسن تھا، مگر مجھے اُن کی شکل و صورت بخوبی یاد ہے، قدر مذکور اِس زمانہ میں گو پروفیسر تھے، مگر وہ کچھ زیادہ خوش نظر نہ آتے تھے، اسلئے کہ جب اُنسے میرے والد نے کہا کہ "میں بندہ زادہ کو بعد چندے آپکی خدمت میں بھیجونگا" تو انہوں نے یہ فرمایا کہ "مولانا آپ کو خود تجربہ ہے کہ فارسی دانی کی کیا حالت ہے، اور اسکا کون قدردان ہے، آپ اپنے کو اور مجھ کو دیکھیئے" اس بیان سے یہ غرض ہے کہ قدر کی بلند ہمتی کچھ اور چاہتی ہے اور وہ خاص ایک شاعرانہ امتیاز کے طالب تھے، پروفیسری میں کیا رکھا تھا، یہ ایک قسم کی معلمی ہے، چنانچہ قدر کی نسبت جو مجمل سوانحی حالات بیان کئے جائینگے اُن سے اِن کی ابتدا اور انتہا کا پتہ چلے گا، قدر کے والد ماجد کا نام سید خلف علی اور سنہ ولادت ۱۲۴۹ ہجری ہے، غلام حسنین آپ کا تاریخی نام تھا، آپ حسینی سید ہیں اور شہر واسط آپ کا مسقط الراس ہے، جہاں سے جد القبیلہ سید محمد صغریٰ آکر بلگرام میں متوطن ہوئے قدر شیعی مذہب رکھتے تھے، مگر اُن میں کسی قسم کا تعصب نہ تھا وہ مرنجاں مرنج آدمی تھے اور صلح کُل ان کا مشرب تھا، اپنے ایک شعر میں ظریفانہ طور پر خود فرماتے ہیں ؎

خدا معلوم کیا گو مگو ہے قدر کا مذہب
کہ شیعہ ہے نہ سنی ہے مسلماں ہے نہ ہندو ہے

فارسی زبان میں قدر کو خاص طور پر کمال اور تبحر حاصل تھا لیکن

انکی عربی دانی فارسی سے دوسرے درجہ پر تھی، قدر واجدعلیشاہ کے طربناک اور مسرت خیز عہد میں وارد لکھنؤ ہوئے، یہ وقت لکھنو کے لئے بہت ہی مبارک و مسعود تھا، ہر طرف عیش و راحت کا سامان تھا، ہر فن کے کامل یہاں موجود تھے، اور بادشاہ کاملین فن کی قدر اور عزت افزائی فرماتے تھے، فیض عام جاری تھا، خوشحالی اور فارغ البالی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، واجدعلیشاہ خود شاعر تھے، اور یہ شاعری برائے نام نہیں تھی، بلکہ وہ قابل اور عروض داں شاعر تھے، شعرا کے خاص طور پر قدرداں تھے، اور تمام منتخب شعرا دامن دولت سے وابستہ رہتے تھے، مشاعرہ کی صحبتیں ہوا کرتی تھیں، شعرا اپنی کامیابیوں پر نازاں تھے، اور شاہانہ نوازش و اکرام سے مالامال، منتخب شعرا سے لکھنؤ خطۂ شیراز بنا ہوا تھا، ایسے وقت میں قدر کا لکھنؤ میں آنا ایسا ہے جیسا کہ ایک بلبل خوشنوا کو گلستاں میں چھوڑ دیا جائے۔

قدر اپنے فطری مذاق شاعری کیوجہ سے شاعری کیطرف متوجہ ہوئے، اور یہ توجہ انکی معمولی نہ تھی انکا مجموعۂ کلام دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انکی طبیعت ہمہ گیر تھی، وہ مثل دیگر اساتذہ اردو فارسی کے اصناف سخن پر قادر تھے گو صرف غزل گوئی بھی مشکل کام ہے مگر انہوں نے اسکے سوا قصائد میں جو روانی اور جوہر طبعی دکھایا ہے، اس سے انکی قابلیت کا ثبوت بدرجۂ اتم ہوتا ہے، غزل گوئی میں خیالات ایک حد تک محدود رہتے ہیں یعنے اسمیں زیادہ تر عاشقانہ جذبات کی تصویر مختلف انداز سے اتاری جاتی ہے، ادابندی اور نازکخیالی کا اظہار ایسے اثر انداز الفاظ میں کیا جاتا ہے کہ سننے والے کے دل پر خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، شعرائے اردو فارسی نے اس فن میں خاص شہرت اور ناموری پیدا کی ہے، نقادان سخن انکی سخن آفرینی پر لوٹ ہیں، اور بیشمار غزل گو شعرا میں صرف چند شعرا کی غزل گوئی کو تسلیم کیا گیا ہے مگر سخن فہم اصحاب کو سمجھنا ہے کہ قصیدہ نگاری میں خیالات کی جولانی اور رنگا رنگی کیلئے میدان بہت وسیع ہونا چاہئے اور یہاں صرف عشق و محبت کی باتوں سے کام نہیں چلتا، مختلف قسم کی تشبیب اور گوناگوں انداز کی تمہیدوں کے بعد شاعر کو اپنے ممدوح کی مدح و ثنا کرنا پڑتی ہے، اور قصیدہ میں ہر رنگ کی شاعری کا نمونہ دکھایا جاتا ہے طائر خیال کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں رہتی، اور اشعار میں مبالغہ اس حسن سے پیدا کیا جاتا ہے کہ قبائح محاسن معلوم ہوتے ہیں، قدر نے قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ان کے دل و دماغ مضامین کا مخزن ہیں اور انکی طبیعت ایک بحر مواج ہے جو روکے سے نہیں رک سکتی، دم فکر ان کے اشعار سلک مروارید معلوم ہوتے ہیں، انکی آبداری سچی اور دیرپا ہے جن ناظرین نے ان کا کلام دیکھا ہے وہ پیشتر ہی سے میرے ہم خیال ہونگے لیکن جن حضرات نے کلیات قدر کو بغور و تامل نہیں دیکھا ہے وہ ان کے منتخب کلام کو دیکھکر اعتراف کرینگے۔

آپ ابتدا میں شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے پھر سحر و برق اور مرزا غالب سے مشورۂ سخن جاری رہا چنانچہ ایک مقام پر اعتراف کرتے ہیں ؎

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند
مجھسا بھی زمانہ میں نہ ہوگا اے قدر
بدنام کنندۂ نکونامے چند

قدر میں علمی قابلیت اور مناسبت طبعی تو موجود ہی تھی ان

منتخب شعرا کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی واجد علیشاہ کا زمانہ
پھر کیونکر قدر کو شاعری کا شوق اور جوہر طبعی دکھانے کا ذوق
نہوتا، چند روز میں قدر پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگیں، پہلے
قدر کا تعلق ملازمت شاہ غازی الدین حیدر کی بیگم نواب
سرفراز محل کے دارالانشا میں ہوا، لیکن قدر کو ابھی اطمینان
کلی حاصل نہ ہوا تھا کہ انتزاع سلطنت ہوا اور گلزار اودھ
میں خزاں نمودار ہوئی ۱۸۵۶ء کا زمانہ تھا کہ قدر ناچار
لکھنؤ سے اپنے وطن مالوف کو لوٹے، غدر کی خانہ براندازی
سے مرزا عباس بیگ (غالب کے بھانجے) اور نواب
غلام حسین خاں حسین اور مرزا قادر بخش صابر دہلوی شاہزادہ
خاندان تیموریہ بلگرام میں آئے اور قدر کی صحبت کو غنیمت
جانکر ایام غدر یہیں گذارے۔

قدر کو بھاشا میں اچھا دخل تھا، بعد تسلط تلاش روزگار
پنجاب کو گئے، اور چند روز سرکاری فوج میں بھی منشی رہے
لیکن وہاں آپ کی طبیعت نہ لگی، آخر کار مستعفی ہوکر دہلی میں
آئے، یہ مقام ان کے لئے بہت دلچسپ تھا، اسلئے کہ مرزا غالب
سے فیض صحبت حاصل ہوا اور کلام پر اصلاح لینے لگے اسکے
بعد ہردوئی میں مدرس ہوکر آئے اور اس موقع پر آپ نے
یہ رباعیاں کہیں ؎

پھر شہر میں قدر سا سخندان آیا — پھر باغ میں بلبل خوش الحان آیا
کیونکر نہ جواں ہو پھر زلیخائے سخن — پھر مصر سے یوسف سوئے کنعاں آیا

دیگر

ہشیار ہو قدر بلگرام آیا ہے — سوچو تو زمانہ کس کے کام آیا ہے
اتنا نہ سنو یہیں ہوئے تھے پیدا — روئے تھے جہاں وہی مقام آیا ہے

یہاں بھی آپکی شاعری نے رنگ جمایا، قدر کو شاعری کی طرف
مایل دیکھکر ہیڈ ماسٹر نے انکو روکنا چاہا، مگر شاعری کا شوق کب
روکے رکتا ہے، لیکن ہیڈ ماسٹر کی اس شکایت کی وجہ سے کہ
قدر کو ریاضی میں کافی دخل نہیں ہے، لکھنؤ کے نارمل اسکول
میں بھیجدیا گیا، قدر نے چند ہی روز میں ریاضی میں مہارت
حاصل کرلی، اور مہونہ کی تحصیلی اسکول میں افسر مدرس مقرر
ہوئے، چند روز بعد ڈائرکٹر اودھ کی سفارش سے ہردوئی میں
مدرس فارسی مقرر ہوئے، جسکا اظہار آپ نے ذیل کی رباعی
میں کیا ہے۔

درجہ میں بڑھا ہوا ہے جب تسبیح قدر — دونا ہوا رتبہ یہ کہے کس سے قدر
اول تو مدرس ہی ہے ہردوئی کا — پھر اسپہ ہے ہمعدد مدرس سے قدر
۳۰۴ ۳۰۴

پھر کیننگ کالج لکھنؤ میں سات سال چھ مہینہ دسمبر ۱۸۸۳ء
تک پروفیسر رہے، قدر کی طبیعت طالبعلمانہ تھی، اسی زمانہ پروفیسری
میں آپ نے پنگل یعنے ہندی کا عروض پنڈت جٹا شنکر پانڈے
بھٹاچار بنارسی سے جو وہیں سنسکرت کے پروفیسر تھے حاصل کیا
اور ماہرہ و قواعد العروض تصنیف کرکے نئی بات عروضیوں کو
بتائی، افسوس کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ارادہ تھا کہ ایک
مبسوط کتاب مثل قواعد العروض فن قافیہ میں بھی لکھیں، موجودہ
قواعد العروض اردو میں اپنے قسم کی بہترین کتاب ہے، اور
پنجاب یونیورسٹی کے السنہ مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانوں میں بطور
کورس شریک رہ چکی ہے، جنوری ۱۸۸۴ء میں نبیرۂ مرزا غالب
نواب آغا مرزا بیگ خاں بہادر سرور جنگ استاد حضور نظام کی
تحریک سے بتقریب مسند نشینی شاہ دکن میر محبوب علیخاں خلد اللہ
اثنائے سفر کلکتہ میں بمقام بنارس شرفیاب حضوری ہوکر قصیدہ
تہنیت موسوم بہ آئینہ محبوب خدمت میں پیش کیا۔ جس کا
مطلع یہ ہے ؎

منتخب شعرا کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی واجد علیشاہ کا زمانہ
پھر کیونکر قدر کو شاعری کا شوق اور جوہر طبعی دکہانے کا ذوق
نہوتا، چند روز میں قدر پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے لگیں، پہلے
قدر کا تعلق ملازمت شاہ غازی الدین حیدر کی بیگم نواب
سرفراز محل کے دارالانشا میں ہوا، لیکن قدر کو ابہی اطمینان
کلی حاصل نہ ہوا تہا کہ انتزاع سلطنت ہوا اور گلزار اودہ
میں خزاں نمودار ہوئی ۱۸۵۶ء کا زمانہ تھا کہ قدر ناچار
لکھنؤ سے اپنے وطن مالوف کو لوٹے، غدر کی خانہ براندازی
سے مرزا عباس بیگ (غالب کے بھانجے) اور نواب
غلام حسین خاں حسین اور مرزا قادر بخش صابر دہلوی شاہزادہ
خاندان تیموریہ بلگرام میں آئے اور قدر کی صحبت کو غنیمت
جانکر ایام غدر یہیں گذارے۔

قدر کو بھاشا میں اچھا دخل تھا، بعد تسلط تبلاش روزگار
پنجاب کو گئے، اور چند روز سرکاری فوج میں بہی منشی رہے
لیکن وہاں آپ کی طبیعت نہ لگی، آخر کار مستعفی ہوکر دہلی میں
آئے، یہ مقام ان کے لئے بہت دلچسپ تھا، اسلئے کہ مرزا غالب
سے فیض صحبت حاصل ہوا اور کلام پر اصلاح لینے لگے اسکے
بعد ہردوئی میں مدرس ہوکر آئے اور اس موقع پر آپ نے
یہ رباعیاں کہیں ؎

پھر شہر میں قدر سا سخنداں آیا — پھر باغ میں بلبل خوش الحاں آیا
کیونکر نہ جواں ہو پھر زلیخائے سخن — پھر مصر سے یوسف سوئے کنعاں آیا

دیگر

ہشیار ہو قدر بلگرام آیا ہے — سوچو تو زمانہ کس کے کام آیا ہے
اتنا نہ ستنسو ہیں ہوتے پیدا — روئے تہے جہاں وہی مقام آیا ہے

یہاں بھی آپکی شاعری نے رنگ جمایا، قدر کو شاعری کی طرف
مایل دیکھکر ہیڈ ماسٹر نے انکو روکنا چاہا، مگر شاعری کا شوق کب
روکے رکتا ہے، لیکن ہیڈ ماسٹر کی اس شکایت کی وجہ سے کہ
قدر کو ریاضی میں کافی دخل نہیں ہے، لکھنؤ کے نارمل اسکول
میں بہیجدیا گیا، قدر نے چند ہی روز میں ریاضی میں مہارت
حاصل کرلی، اور مہونہ کی تحصیلی اسکول میں افسر مدرس مقرر
ہوئے، چند روز بعد ڈائرکٹر اودہ کی سفارش سے ہردوئی میں
مدرس فارسی مقرر ہوئے، جسکا اظہار آپ نے ذیل کی رباعی
میں کیا ہے۔

درجہ میں بڑہا ہوا ہے جبسے قدر — دونا ہوا رتبہ یہ کہے کس سے قدر
اول تو مدرس ہی ہے ہردوئی کا — پہرا اسپہ ہمعدد مدرس سے قدر
۳۰۴ ۳۰۴

پہر کیننگ کالج لکھنؤ میں سات سال چھ مہینہ دسمبر ۱۸۸۳ء
تک پروفیسر رہے، قدر کی طبیعت طالبعلمانہ تہی، اسی زمانہ پروفیسری
میں آپ نے پنگل یعنے ہندی کا عروض پنڈت جٹاشنکر پانڈے
بھٹاچار بنارسی سے جو وہیں سنسکرت کے پروفیسر تھے، حاصل کیا
اور ماہرہ و قواعد العروض تصنیف کرکے نئی بات عروضیوں کو
بتائی، افسوس کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ارادہ تھا کہ ایک
مبسوط کتاب مثل قواعد العروض فن قافیہ میں بھی لکھیں، موجودہ
قواعد العروض اردو میں اپنے قسم کی بہترین کتاب ہے، اور
پنجاب یونیورسٹی کے السنہ مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانوں میں بطور
کورس شریک رہ چکی ہے، جنوری ۱۸۸۴ء میں نبیرہ مرزا غالب
نواب آغا مرزا بیگ خاں بہادر سرور جنگ استاد حضور نظام کی
تحریک سے تقریب مسند نشینی شاہ دکن میر محبوب علیخاں خلد اللہ آں
اثنائے سفر کلکتہ میں بمقام بنارس شرفیاب حضوری ہوکر قصیدہ
تہنیت موسوم بہ آئینہ محبوب خدمت میں پیش کیا۔ جس کا
مطلع یہ ہے ؎

باغ پر آج گھٹا ٹوپ اٹھا ہے بادل — خسرو باد بہاری کا کھنچا دل بادل

اس قصیدے کے صلہ میں ملبوس خاص عطا ہوا اور امیدوار ملازمت ہوکر حیدرآباد آئے اور چارسو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی مگر قدر مرحوم نہایت نحیف الجثہ تھے اور اس پر مرض ضیق النفس ہمدم ہوگیا جس سے ضعف غالب ہوتا گیا، حیدرآباد کی آب و ہوا اور ناموافق ہوئی۔ شدت مرض سے بغرض معالجہ پھر لکھنؤ آئے لیکن مرض سے جانبری نہ ہوسکی، اور باون برس کی عمر میں ۲۳ ذیقعدہ سنہ ۱۳۰۱ ہجری، مطابق ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۴ء بروز یکشنبہ لکھنؤ میں انتقال کیا، اور میر خدا بخش کی کربلا میں دفن ہوئے مرحوم کی ایک مشہور غزل کے مقطع کے مصرعۂ ثانی سے آپ کا سن وفات برآمد ہوتا ہے، وہو ہذا ؎

بہار آخر ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلہ ہے
یہاں بیڑی پڑا ہنیکو ہر اک دیوانہ آتا ہے ۱۳۰۱ھ

مرحوم کا ایک لڑکا انکے سامنے ہی مرچکا تھا۔ قدر کثیر التلامذہ تھے، انکی تصانیف ہیں (۱) دیوان مع غزلیات و قصاید و مثنوی موسوم بہ کلیات قدر طبع ہوچکا ہے، جسکے آخر میں ایک واسوخت بھی موجود ہے، (۲) عطر مجموعہ، شرح مجموعۂ سخن جسپر سرکار انگلشیہ سے صلہ پایا، طبع ہوچکا ہے (۳) رسم عرشی شرح قصاید عرفی (۴) نظم الارکان (۵) قواعد العروض مارمہرہ (۶) مصلحات اردو وغیرہ ہیں، قدر کی زندگی کا خاتمہ جلد ہوا ورنہ انکی تصانیف کی تعداد اور بڑھتی، آپ نے مبداء فیاض سے عجب باذاق طبیعت پائی تھی، ایک بار آپکو بانسوں کی ضرورت پڑی کسی نے کہا کہ تحصیل میں بہت سے بانس موجود ہیں، یہ سنکر آپنے منشی جواہر لال تحصیلدار کی خدمت میں یہ رقعہ نظم فرماکر بھیجا ؎

جناب منشی عالی گہر جواہر لال — میں جس مکاں میں رہتا ہوں سنئے اسکا حال
جو دن کو دھوپ ہے سر پر تو رات کو شبنم — یہ خشک و تر ہی میری جان کیلئے جنجال
تمام بانسوں کی خاطر کنو جو بن بانس پڑے — مگر کسی نے نہ اک بانس کا کیا اقبال
سنا ہے آپکی تحصیل میں ہیں بانس بہت — جہاں سے گنج میں آئے وہاں ہیں ٹال کی ٹال
مجھے بھی بھیجئے دو انمیں سے اسی نوے بانس — جو حکم ہو ابھی کٹ آئیں کچھ نہیں ہے محال
جو کچھ پڑیگی کٹائی ڈھلائی میں حل ضرر — قرار بر کف آزادگاں نہ گیرد مال
برا جو مانو برا ماننے کی بات نہیں — نہ آپ ہو گئے امیر اسمیں اور نہ میں کنگال
جواب دوگے نہ جب تک نہیں ہے قدر کو چین
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

اس رقعہ کو پڑھکر تحصیلدار صاحب بانس تو ایک طرف اپنے آپ کو نذر کرنے کے لئے تیار ہوگئے، اسکے علاوہ آپکی کلیات میں بحر طویل و رمل مضاعف الارکان جسکے ہر مصرعہ میں دو سو چھپن رکن ہیں اور دو مصرعوں میں ختم کیا گیا ہے قابل دید ہے، ایک اور نظم بھی تربھنگی چھند کے نام سے موجود ہے، آپ کا علی بند جو فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے، نہایت درجہ مقبول ہے، قدر نہایت منکسر المزاج اور خلیق تھے، حافظہ اور ذہانت جو شاعری کا جوہر ہے وہ انمیں بدرجہ اتم موجود تھا، اور ہزارہا اشعار نوک زبان تھے، بعض شعرا نے انپر اعتراضات بھی کئے لیکن یہ برابر برجستہ جواب سے معترضین کو قایل کردیا کرتے تھے، حسین نے قدر کے اس شعر پر اعتراض کیا ؎

دل شرر تھا سوزش غم سے اچھلکر رہگیا
میں جہاں بیٹھا بہ رنگ شمع جلکر رہگیا

اعتراض یہ تھا کہ شمع کیواسطے بیٹھنا نہیں بلکہ اوٹھنا شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے، قدر نے فوراً مصحفی کا شعر سنداً پڑھدیا ؎

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آسن مارے
گر ہلاتے ہیں تو اب جاتے ہیں گردن مارے

قدر کے اس شعر پر بھی اعتراض کیا گیا ؎

قاصد یہ کہنا پاکے مرے یار کا مزاج
پوچھا ہے اک غریب نے سرکار کا مزاج

اعتراض یہ تھا کہ محبوب کو سرکار کہنا کہاروں کی بولی ہے یہ اعتراض سر مشاعرہ خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نے کیا تھا۔ لیکن قدر کی یادداشت کو دیکھئے کہ انہیں کے اُستاد کا شعر نظیراً پیش کیا۔ ؎

باغ کو جائیگا ابر سیہ مست اٹھا
پیش خیمہ تو روانہ ہوا سرکار کا آج

حقیقت یہ ہے کہ معترض کو حد درجہ کا محتاط اور محقق ہونا چاہیے ورنہ اعتراض سے بجز خفت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔
کالکا پرشاد موجد لکھنوی نے جو خوشنویس ہونے کے سوا بہت اچھے فارسی داں تھے، قدر کے اس مصرعہ پر اعتراض کیا[1] ؎

ایک سے ایک ہیں کلجگ کے زمانے والے

اعتراض یہ تھا کہ کلجگ کے بعد زمانہ کیوں کہا، قدر کا جواب کیسا صاف اور باقاعدہ ہے کہ کال اور جگ اسم ترکیبی ہو کر عَلَم ہو گیا۔ اسلئے زمانہ کا ادخال جائز ہے۔ جس طرح حضرت ناسخ فرماتے ہیں ؎

تین تربینی ہیں دو آنکھیں مری

تربینی سے مراد گنگا جمنا اور سرسوتی ہے۔ مگر چونکہ اسمیں ہی عَلَمیت ہے، اسلئے تین کا لفظ لانا بدنما نہیں ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ موجد ایسی معمولی باتوں سے آگاہ نہ ہونگے لیکن یادداشت کے نقص سے یہ باتیں نظر انداز ہو جایا کرتی ہیں۔
عارف علیشاہ عارف خراسانی نے حافظ شیرازی کے اس شعر پر دبی زبان سے اعتراض کیا ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اعتراض یہ تھا کہ ایک جگہ ردی ساکن ہے اور دوسری جگہ متحرک اس عیب کو غلو کہتے ہیں، قدر نے جواب دیا کہ شاعر جب کوئی عیب کر کے اعلام کر دیتا ہے تو وہ اُس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے عارف نے اس پسندیدہ جواب کو تسلیم کر لیا۔ قدر نے اس واقعہ کو ایک قطعہ میں یوں نظم کیا ہے ؎

نوشت مطلع پر نور خواجہ شمس الدیں بدیں فروغ گہر بار واز سحاب کجا
صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
فتاد عقدہ در اندیشہ خردہ گیراں ز لفظ تا بکجا و دگر خراب کجا
کہ یک وی متحرک دگر روی ساکن خطاست بہر خطا حکم ارتکاب کجا
غلو اگرچہ بود عیب قوافی را تراست پایہ این مایہ احتساب کجا
مباش غرہ بدیں یک دو نکتہ دانستن نظر بود ہمہ کس را بہر کتاب کجا
نخست گفت کہ اے صاحب دانش و داد صلاح کار کجا و من خراب کجا
سپس ز نفس خطا تازہ کرد عذر خطا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا
اشارہ چیست و عبارت بلیغ و عذر لطیف اگر خطا بود اینہا دگر صواب کجا

مباش رنجہ ز غوغائے مدعی اے قدر
سخن یکے است جواب ترا جواب کجا

۱۲۹۵ھ میں آپ نے اپنے پدر گرامی قدر کی وفات پر جو رباعیاں کہیں ان سے آپکی جدت اور انداز بیان پر خوب روشنی پڑتی ہے

آئی ہے بلائے ناگہانی ہم پر انا للہ تنگئی ہے دم پر
جو مرگ پدر میں قدر ہم پر گذری ہرگز وہ مصیبت نہ پڑی آدم پر

ہر دست خطا خیز ہے اولا تجھسے ظالم سمجھیگا میرا مولا تجھ سے
یوں میرا پدر رہو پنہٗ زخم لحد امید نہ تھی یہ اے منولا تجھ سے

[1] نظام نور دراقم جاگیر نواب فخر الملک بہادر کا دوسرا نام ہے۔

قولہٗ

گو میرے پدر نے ربط عالم چھوڑا   پر سلسلۂ وفا نہ اکدم توڑا
اسدرجہ ہے نظام کا دم بھرتے   توڑا تو نظام پور میں دم توڑا

الغرض قدر ایک کامل اور محقق شاعر تھے انکی معلومات وسیع تھیں اصناف سخن پر قادر تھے انکی شاعری میں حرف گیری کی گنجایش بہت مشکل سے نکلتی ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ کسی کامل سے کامل شاعر کے کلام پر بھی نکتہ چینی کا تہیہ کر لینے سے کچھ نہ کچھ اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں، قدر کو انتقال کئے ہوئے تقریباً ۳۵ سال ہوئے ہیں۔ ۳۵ برس ادھر زبان اور خیالات کا رنگ اور تھا، اب اسکی کچھ اور حالت ہے، مگر پھر بھی اِن کے کلام میں صدہا اشعار میں تغزل اور لطف زبان کی خوبیاں موجود ہیں، آپکے دیوان میں سادگی، شوخی، رنگینی، نزاکت، ادابندی، اور حسن بیان کا لطف ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے، عروض وقافیہ اور تحقیق لفظی میں آپ نے وہ کمال حاصل کیا تھا، کہ لکھنؤ سے شہر میں شعرا آپکی تحقیق کو مسلم اور آپکو کامل اُستاد تصور فرماتے تھے چنانچہ ملاحظہ ہو ؎

انتخاب

منہ فق ہو سحر بنکر جسے شب امکاں کا   وہ مہر قیامت ہے مطلع مرے دیواں کا
اس دشت میں اکثر پامال بلا رہبر   دستار خضر گر کر جادہ ہے بیاباں کا
جو عمر مقرر ہے سانسوں سے ہوا آخر   وقفہ رہے صرصر خرمن امرد دہقاں کا
گو ذرہ عالم ہوں پر اصل سے محرم ہوں   میں قطرۂ شبنم ہوں اس مہر درخشاں کا
وہ پاک محبت ہے اک نور کی وحشت ہے   دروازۂ جنت ہے چاک اپنے گریباں کا

ہر لفظ میں معنی کا اک شور ہے شوخی کا
اے قدر ہے رخ پہ کیا سید کے نمکداں کا

قدر کے مذکورہ بالا اشعار میں جو لطافت اور حسن تخیل موجود ہے اسکو ہر سخن فہم سمجھ سکتا ہے، خیالات کی لطافت اور معنوی نزاکتوں کو غور سے دیکھئے، مطلع میں کس حسن کے ساتھ مبالغہ کیا ہے، وہ اپنے دیوان کے مطلع کو مہر قیامت قرار دیتے ہیں، اور اسکی روشنی سے شب امکان کی سیاہی کو مٹاتے ہیں، مطلع کو مہر قیامت مان لینے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا، کہ شب امکانی سیاہی مفقود ہو گئی اسلئے کہ مہر قیامت کا طلوع روزانہ آفتاب کا طلوع نہیں ہے کہ چار پہر کے بعد آفتاب غروب ہوا، اور شب نمایاں ہو گئی، قیامت کا دن بہت طولانی ہوگا۔

بہرحال قدر کا مطلع باعتبار مفہوم و بلاغت معنوی حد درجہ قابل تعریف ہے۔

دوسرا شعر (اس دشت میں الخ) بھی مضمون آفرینی کے لحاظ سے بالکل نیا ہے، اردو میں ایسی نازک خیالی اور معنی خیزی قدر کی انتہائی قابلیت پر دال ہے، فرماتے ہیں کہ اس دشت (دنیا) میں اکثر رہبر پامال بلا رہے ہیں اب اس خیال کو بعض واقعات سے ملائیے، تو اس شعر کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہ سکتا مصرعہ ثانی بطور تمثیل ہے، اور تمثیل بھی ایسی نئی اور لطیف ہے کہ باید و شاید فرماتے ہیں، دستار خضر گر کر (یعنے قزاقوں اور رہزنوں کی دستبرد سے حضرت خضر کی دستار بھی سر پر قایم نہ رہ سکی اور قزاق اسکو لیکر گھسیٹتے ہوئے بھاگے مگر چونکہ یہ دستار خضر علیہ السلام کی تھی لہذا وہ (دستار) بیابان میں ایک جادہ بن گئی تاکہ دوسرے راہرو اس سے ہدایت اور نصیحت حاصل کریں مفہوم شعر کو دیکھئے کسقدر لطیف اور نازک ہے دستار کا جادہ کتنا نیا ہے اصل مطلب یہ ہوا کہ گو ہادی اور رہبر مبتلائے مصائب و آلام ہوں لیکن انکی شان رہبری نہیں جاتی، ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخلاق یا کیرکٹر کو ترک نہ کرے اور مستقل مزاجی سے کام لے

یہ شعر وسعتِ معنوی کے لحاظ سے شرح مبسوط کا محتاج ہے لیکن بخیالِ طوالت اختصار سے کام لیا گیا ہے، علیٰ ہذا یہ شعر "گو ذرۂ عالم ہوں الخ" بھی بہت ہی دلکش شعر ہے، رنگ تغزل کی لطافت کو ملاحظہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ شعر متصوفانہ رنگ میں کس پایہ کا ہے فرماتے ہیں کہ گو میں ایک ذرہ بے حقیقت ہوں لیکن مہر حقیقت سے محرم ہوں، پھر اسکی وضاحت کرتے ہیں کہ میں مہر درخشاں کا قطرۂ شبنم ہوں عام روایت و خیال کے مطابق جب آفتاب نکلتا ہے تو وہ قطرات شبنم کو جذب کر لیتا ہے، گو بظاہر اس جذب و انجذاب سے شبنم کی فنا لازمی ہے، لیکن شبنم کا آفتاب میں جذب ہو جانا اسکا انتہائی عروج اور شرف ہے، شبنم جب آفتاب حقیقت سے ملگئی تو بے حقیقت نہ رہی اور اسی طرح جب ذرہ آفتاب سے نور فیض کا اکتساب کرتا ہے تو وہ آفتاب کا محرم ہے اور بناہی تعلقات سے غیریت نہ رہی، مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات عالم (خواہ وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ) مظہر ذات حقیقت ہیں اور سب کی رجوع اسی طرف ہے الیہ المآب والیہ المصیر۔

اشعار میں ایسی ہی خوبیاں پیدا کرنے کا نام شاعری ہے۔

باقی اشعار کا مطلب صاف ہے مقطع میں قدر نے اپنی سخن آفرینی پر ناز کیا ہے، اور یہ ناز انکا ایک حد تک صحیح ہے، اردو زبان میں ایسی معنی آفرینی سہل کام نہیں ہے۔

قدر نے ذیل کا مقطع کسقدر نیا کہا ہے، ہرچند اسمیں کوئی نازک خیالی اور معنی آفرینی نہیں ہے، مگر پھر بھی اسمیں خاص لطف و کیفیت ہے میرے خیال میں یہ تشبیہ بالکل جدید ہے دلِ داغدار کو چیر کر مطلع آفتاب بنانا عجیب تلاش ہے ؎

چیرا جب داغدار دل کو
اک مطلع آفتاب نکلا

ولہٗ

بھٹکتا پھرتا ہے مسجد کی راہ میں واعظ
بتادے راستہ کوئی شراب خانہ کا

یہ شعر بظاہر بالکل رندانہ ہے، لیکن کنایتاً اسمیں ایک لطیف خیال ظاہر کیا ہے، وہ یہ کہ جب واعظ بحیثیت واعظ مسجد کے راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے اور اسکو یکسوئی نہیں حاصل ہے تو اسے شراب خانہ کا راستہ بتا دینا چاہیئے تاکہ وہ رندوں میں اسوقت تک ملازم رہے جب تک وہ واعظ بننے کے قابل نہ ہو اور مسجد کے راستہ کو نہ پہچانے اِسی زمین کی دوسری غزل کا مطلع ذیل خوب کہا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں معشوق کی مست آنکھ کو کشتیٔ مے سے تشبیہ دی ہے اور مست آنکھ کے نشہ کو بہتا ہوا دریا کہا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں چشم یار سے نشہ ابلنا عجیب خیال ہے اور دوسرے مصرع میں تشبیہ کسقدر تام ہے ؎

اس آنکھ سے ابلتا ہے نشہ شراب کا
کشتیٔ مے سے بہتا ہے دریا شراب کا

قدر کا مطلع ذیل قابل داد ہے، پیمانہ کی تعریف اس سے زیادہ مناسب الفاظ میں نہیں ہو سکتی، اور مصرعۂ ثانی میں وجہ کتنی اچھی بیان کی ہے، نرگس مستانہ کو پیمانہ سے کیا خوب مثال دی ہے

جب سے شبیہ نرگس مستانہ ہو گیا
چشم و چراغ میکدہ پیمانہ ہو گیا

شکل دوئی پسند نہیں میری آنکھ کو
ٹپکا جو اشک گوہر یکدانہ ہو گیا

بلبل کی روح کیا مرے تن میں سما گئی
جب آ گئی بہار میں دیوانہ ہو گیا

قدر کے ذہین اور معنی آفریں ہونے میں کوئی شک نہیں انکی تحقیقات اور تلاش استادانہ ہے انکے دیوان میں کم و بیش ہر رنگ کے شعر ہیں ذیل کا شعر محض قافیہ پیمائی کے طور پر کہا ہے نظیر اکبر آبادی کا سا رنگ اس شعر میں ہے مصرعۂ اولیٰ کی لطافت

ورنگینی قابل غور ہے ؎

ہوئے ہیں طائر روح شہیداں یہ پر بستہ
ذرا پھر دیکھ اے قاتل قفس منگوا لالوں کا

اسی زمین میں یہ شعر رنگ تغزل اور نیز بندش کے لحاظ سے کچھ زیادہ
قابل تعریف نہیں ؎

بھری ہیں آرزوئیں مردہ تم کا مرقع ہے
یہ دل ہے حسرتوں کی گور یا پتلا ملالوں کا

ولہٗ

جب فغاں نغموں سے بلبل گلفشاں ہو جائیگا
ٹوکری پہونچی سارا آشیاں ہو جائیگا

اسی زمین میں یہ شعر کتنا بلیغ کہا ہے، دشت پیمائی کا ثبوت کیا
دیا ہے، بعد مرگ اضطراب دشت پیمائی کا ثابت کرنا مشکل تھا
لیکن جسم کا خاک ہو کر ریگ رواں بنجانا اضطراب دشت پیمائی
کو ثابت کر رہا ہے، ریگ رواں کا اضطراب مٹائے نہیں
مٹ سکتا ؎

اضطراب دشت پیمائی نہ چھوٹے گا کبھی　　خاک ہو گا جب بدن ریگ رواں ہو جائیگا
اسکی اس نامہربانی پر تو مٹتا ہوں جاں　　کیا قیامت ہوگی جب وہ مہرباں ہو جائیگا

ولہٗ

آئے لحد پر آج بڑا حوصلہ کیا　　اللہ کیا حضور نے خوف خدا کیا
اے یار آنکھ لڑتے ہی برما گئی نظر　　آنکھوں سے خون ہو کے کلیجا بہا گیا

ولہٗ

شیشۂ مے کو لگی ہے ہچکی　　یہ کسی مست کو کیا یاد کیا

ذیل کے مطلع میں حسن بیان ملاحظہ ہو، خدا کی نعمتوں کا شکر کس
پیرایہ میں ظاہر کیا ہے، دونوں مصرعے حد درجہ چست ہیں ؎

آدمی کی کیا حقیقت تھی اسے کیا کر دیا　　اے سحاب مکرمت قطرہ کو دریا کر دیا

ولہٗ

پھوڑے سے سوا ہے دل دیوانہ ہمارا　　تربت میں ہلائے نہ کوئی شانہ ہمارا
دم آنکھوں میں اٹکا ہے ذرا اسکل دکھا دو　　جلد آؤ کہ لبریز ہے پیمانہ ہمارا
سایہ کے لئے ابر سیہ جھوم کے آیا　　جب قصد ہوا جانب میخانہ ہمارا

ولہٗ

گذر جائیگی شب پلک مارتے میں　　پر اس وقت کی التجا یاد رکھنا

قدر کا یہ شعر لطف زبان سے متعلق ہے۔ سحر کا شعر بھی اسی خیال
سے ملتا ہوا ہے اور بہت مشہور ہے ؎

رنگ کی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

دونوں شعر میں معشوق پر عاشقانہ طنز کیا گیا ہے۔ ذیل کے شعر میں
کیا اچھی بات پیدا کی ہے کہتے ہیں کہ مجھے جنون عشق ہے اور تمہیں
مجھ سے وحشت۔ مطلب یہ ہے کہ میری تمہاری یکساں حالت
ہے اور حسن و عشق کا تعلق یکرنگی ہی چاہتا ہے مگر مصرعہ ثانی
میں افسوس کرتے ہیں کہ کیا خبر تھی عشق میں میرا یہ حال اور
تمہارا یہ رنگ ہوگا ؎

مجھے جنوں ہے، تمہیں مجھ سے اور وحشت ہے　　مرا یہ حال تمہارا یہ حال ہونا تھا
آئی تھی باغ میں کہیں سے مخمور گھٹا　　تاک بڑھ بڑھ گئے نشہ میں ہوئی چور گھٹا

اسی زمین میں ذیل کا شعر کسقدر با مزہ کہہ گئے ہیں مصرعہ ثانی میں
گھٹا کو اپنا دود دل ثابت کیا ہے۔ بندش اور زبان
کتنی اچھی ہے۔

آئے اٹھے بارش کا بہانہ کیا ہے　　یہ تو بنجاتا ہے دود دل مخمور گھٹا
یا الٰہی یوں ہی سرسبز رہے باغ مراد　　زیر انگور ہوں میکش سر انگور گھٹا

واہ

دیکھنا غافل نہ رہنا چشم تر سے دیکھنا　　آئینہ جب دیکھنا میری نظر سے دیکھنا

آدمی سب خوبصورت ہیں محبت چاہئے　　چاہیئے لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھنا
دم بدم اسکی لچک کرتی ہے مجھکو بیقرار　　میں لپٹ جاؤنگا اس نازک کمر سے دیکھنا

ولہٗ

لاغری میں قیدِ وحشت سے چھٹے　　طوق گردن ڈھیلا ہوکر گر گیا

ولہٗ

بیٹھا ہوا بس دور سے دیکھا کرے انکو　　نازک ہیں بہت ہاتھ لگایا نہیں جاتا

قدر نے طویل بحروں میں جو غزلیں لکھی ہیں انمیں اکثر اشعار اچھے لکھے ہیں، ذیل کی طرح میں مصرعوں کی برجستگی اور مضامین کی بلندی ملاحظہ ہو ؎

الٹ کے دفتر ہر آسماں کا کیا رخ آہوں نے لامکاں کا
پڑا رہا شور الاماں کا دہرا رہا غل کہاں کہاں کا
عدم کی ہستی کا میں مکیں ہوں بقا جہاں ہو فنا وہیں ہو
غبار اٹھوں میں تو کچھ نہیں ہوں غبار ہوں صحنِ لامکاں کا
جو پیس ڈالے محبتِ گل، نہ ہو دامنِ توسل
جو خاک ہو جائے جسمِ بلبل غبار ہو صحنِ بوستاں کا
الٹ دیا وہ طبق زمیں کا پتا نہیں چرخ ہفتمیں کا
برا ہو آہِ دل حزیں کا کہ مجھکو رکھا نہیں کہیں کا

ذیل کے اشعار شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں خصوصاً آخری شعر قدر کے حصہ کا ہے، ساقی سے ساغر نہ پہنچنے کی شکایت اور مصرعۂ ثانی میں مثال کس رنگ کی ہے ؎

غیر ممکن ہے نہ ہو تیرے برابر آفتاب　　لاکھ گردش کھائے گردوں لاکھ چکرائے آفتاب
دور ساغر ہم تلک پہنچا نہ ساقی یا نصیب　　جاتا ہے مشرق سے مغرب تک برابر آفتاب

ولہٗ

نبض کی شکل ہے ہر رگ میں مِرا قاتل بیتاب　　اب تو ہر عضو ہوا ہے صفتِ دل بیتاب
مجھسے فرماتے ہیں رکھلے کلیجہ میں اسے　　ہے اگر خنجرِ ابرو پہ ترا دل بیتاب

ولہٗ

آپکی تقریر لاثانی دہن ہے لاجواب　　پھر جواب سر نہ دو مجھکو تو اسکا کیا جواب

ولہٗ

لڑا آتا ہے آنکھیں گرفتارِ الفت　　نظر بند ہوگا گرفتارِ الفت

ولہٗ

عدو کی تواضع سے غافل نہ رہنا　　کہ جھکنے میں اسکے ہے خنجر کی صورت

قدر نے ذیل کی طرح میں بعض اشعار کس مزے سے نکالے ہیں یہی وہ اشعار ہیں جو استادانہ قابلیت کو منوا دیتے ہیں۔ مزہ کیا ہے شوخ بیانی اور دردمندانہ جذبات کی تصویر اتارنا دل لگی نہیں ہے ؎

دل تو تڑپے دو قدم زلفِ سیہ فام بہت　　پر تو جھاڑے کہیں بلبل قفس و دام بہت

اسی زمین میں یہ شعر کس رنگ میں کہا ہے، داغ و امیر نے بھی اس سے زیادہ لطف کیا تھا اس قافیہ کو نہ کہا ہوگا ؎

مجھسے کہتے ہیں کہیں ذبح نہ کر ڈالو کہیں　　رکھ کے سر زانوؤں پر کرتے ہو آرام بہت

یہ شعر بھی غضب کا ہے ؎

زلف یاد آتی ہے آ دیکھئے کیا ہوتا ہے　　ٹیس اٹھتی ہے مرے دل میں سرِ شام بہت

ذیل کا شعر کیا مرثیہ ہے جس مشاعرہ میں یہ شعر پڑھا گیا ہوگا نقادانِ سخن نے سر دھن لیا ہوگا ؎

قیدیٔ زلف کا رہ رہ کر اکھڑتا ہے دم　　شب سے ہے خانۂ زنجیر میں کہرام بہت

شوخ بیانی اور ٹھاٹ

سپر پھرا دونگا ترا دیکھنا اے گردشِ دہر　　کاوے دو دونگا تجھے اے ابلقِ ایام بہت
روز دو جام چڑھاتا ہے خدا خیر کرے　　ہو چلا ہے فلکِ پیر بھی بدنام بہت

رندانہ شوخی

جا تو ساقی کوئی قاضی کا پیالہ لے آ　　دھوم بھٹی میں مچاتے ہیں مے آشام بہت
آمد و رفتِ نفس بند نہ کر کہنا مان　　اسی مالا پہ میں جپتا ہوں ترا نام بہت
قدر رندانہ غزل جو کہی صلِ علیٰ　　رات کیا پی گئے تھے بادۂ گلفام بہت

[1] مہروماہ

ولہ

آنکھ رونے کو جگر جلنے کو لب فریاد کو — کوئی شئے اسنے بنائی جسم میں بیکار کب
بر ہی گلشن ہے تنہا ہے مئے گلرنگ ہے — خاک ہے سب دل بہلتا ہی بہلائے یار کب

ذیل کی طرح میں کیسے رنگین اور بامزہ اشعار کہے ہیں ساری غزل مرصع لاجواب ہے' اس سے زیادہ عاشقانہ رنگ کیا ہو سکتا ہے' ہر شعر میں ایک لطف خاص ہے' بعض اشعار اپنے معنی کے لحاظ سے بالکل نئے ہیں' مثلاً الفت رخ کا پہل ملا الخ کے معنوں پر غور فرمایئے کتنی جدید معنی آفرینی کی ہے۔ الفت گل معشوق کا پہل ملا کہ سینے میں ایک تازہ گل کھلا۔ کیا گل کھلا۔

جب دل کا آبلہ ٹوٹا تو صدائے عندلیب پیدا ہوئی۔ گل و بلبل کے تعلقات کو کس رنگ میں بیان کیا ہے' خونیں آبلہ دل کو گل سے کسقدر مشابہت ہے اور چونکہ عاشق کے دل کا آبلہ ہے اسکے ٹوٹنے کی صدا آواز عندلیب سے مشابہ ہونا چاہیئے ۔

داغ جو کہتا عندلیب نقشے جائے عندلیب — رنگ ہے لا عندلیب گل میں سمائے عندلیب
ہو سکے گل کھول کر جا ہو باغ میں گر — دیکھے میں کچھ دوش پہ بیٹھے نہ جا عندلیب
جب غم گل میں زبان ذکر ترا ہوا جلی — بن گئی لپ ہو کی کلی تیرے نالہ تا عندلیب

خون فوارش کا جو ہے اب عبث خموش ہے — گل ہمہ تن تو گوش ہے شور مچا عندلیب
اف رے خزاں کا دستبرد بن گئی گلشن میں — گل کی جگہ ہیں خار و خس پھر ہیں بجا عندلیب
جب گل و غنچہ باغ کے چننے کو باغباں چلے — اپنی کلی کے نام سے پر میں چھپائے عندلیب
روتے ہیں باغباں کہ جلتے ہیں آشیاں تک — پہنچے نہ گل کے کان تک آہ رسائے عندلیب
روٹھے ہیں دونوں ہے تم اب صلاح بہم — گل کو منا ہیں ہم جا کے انکو منائے عندلیب
یوں ہی رہے جو صلح گل دونوں طرف ہو ایک دل — بولیں ہزار گل ہم کہیں ہائے عندلیب
عشق کو راہ کیا ملی حسن کو اک سزا ملی — آتش گل سے جا ملی گرمی نوائے عندلیب
صحن چمن ہے تا بہ در گل ہی گل آ میں سب نظر — آئے یہاں اسقدر بار نہ پائے عندلیب
الفت رخ کا پہل ملا سینے میں تازہ گل کھلا — ٹوٹا جو دل کا آبلہ آئی صدائے عندلیب
حسن کو لاکھ ناز ہو پھر بھی ہے فوق عشق کو — تم سر گل پہ دیکھ لو برہنہ پائے عندلیب
عشق کی جب ہوا چلی حسن نے سانس تک نہ لی — چٹکی اگر کوئی کلی آئی صدائے عندلیب
باغ تو کوئے یار ہے پھول وہ گلعذار ہے — غیر بجا ہے خار ہے قدر بجائے عندلیب

ولہ

ساتھ قاصد کے میرے جا پہنچا میاں کوئے دوست — ایک دن تبلا تا تبلا تا نشان کوئے دوست

(باقی آئندہ)

اعجاز لکھنوی

انتخاب بیاض علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی عطر اللہ مضجعہ

(آقا رضا)

بجوئی تو سوار یصد در زمیں نہ نشست — تو تا سوار شدی فتنہ بر زمیں نہ نشست

(سحابی)

عالم بخروش لا الہ الا ہوست — غافل بگماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بوجود خویش موجے دارد — خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

(شیخ علی نقی)

کام فرمات ہوس عشق بلا انگیز است — شاہد ایں مثل کوہکن و پرویز است
ہر کہ برخواست از در دگرے بہتر بود — گدایان کوئے تو خاک ہمہ یوسف خیز است
شکر شد از تپ ہجران تو می پندارم — ہفت غربال فلک بر سرم آتش بیز است

(مرزا محمد مقیما)

لب بستہ ز جرأت طلب باش — در حضرت عشق با ادب باش
گستاخی شکوہ است اندوہ — فرمان رضا شنو طرب باش
خواہی کہ بروز روز باشی — شب روز کناں بکار شب باش
بر چرخ بلند حیرتت چیست — از دیدن خویش در عجب باش

(سید علی اصغر بلگرامی)

علم الابدان

العلم علمان علم الابدان و علم الادیان

مرحوم و مبرور میجر سید حسن بلگرامی - آئی ' یم ' ایس ' (ریٹائرڈ) نے ہماری درخواست پر اپنے مضامین کا ایک مجموعہ ہمیں اسوقت عنایت فرمایا تھا ' جبکہ اس امر کا شان و گمان بھی نہ تھا کہ اس ہمہ دمند انسان کا وجود اسقدر جلد ہمارے درمیان سے اٹھا لیا جائیگا - بیسویں صدی اس لحاظ سے مدتوں یادگار رہیگی کہ اسمیں ہندوستان کے تاج وقار و امتیاز سے بیشمار درخشندہ ستارے غائب ہوگئے ' اور باوجود امتداد ایام ملک انکا جانشین پیدا کرنیسے معذور رہا ' میجر صاحب کی ذات متنعمات سے تھی ' اور انکی زندگی سے ارتقاء ملک و ملت کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں -

آپ کے زور قلم کے نمونے ولایت کے اخبار و رسایل میں بکثرت موجود ہیں مگر رسایل ہند میں یہ امتیاز صرف ذخیرہ کو حاصل ہے کہ آپ کے مستقل سلسلۂ مضامین سے اردو داں پبلک پہلے پہل اسکے ذریعہ سے روشناس ہوگی ' مرحوم کی یادگار کیساتھ یہ مضامین اوراق ذخیرہ میں شایع ہوا کرینگے ' فی الحال اسکی پہلی قسط پیش کیجاتی ہے - آپکی تحریر کا بڑا وصف یہ ہے کہ مضامین کو آپ نہایت عام فہم اور سہل ممتنع طریقہ سے ادا کرتے تھے ' انشاءاللہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں آپ کی با تصویر سوانح زندگی سے اوراق ذخیرہ کو زینت دینگے -

ایڈیٹر

انسان ہمیشہ سانس لیتا رہتا ہے مگر یہ نہیں سوچتا کہ اسمیں کیا حکمت ہے ' موٹی باتیں تو ہر شخص تھوڑے غور اور تجربے سے دریافت کرسکتا ہے ' مگر صنعت کاملہ کی باریکیاں جو ہر چیز میں موجود ہیں علم کی مدد کے بغیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں - ع

کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

مثلاً ایک انسان کا بدن ہے ' اللہ اللہ کیا کاریگری اسمیں صرف کیگئی ہے اور کیا کیا صنعتیں دکھائی گئی ہیں ' انسان کے بدن میں کون کون سے عضو ہیں ' وہ بنے کیونکر ہیں ' اور ان کا مصرف کیا ہے اور کیونکر ہر ایک اُن میں اپنا کام کرتا ہے ' سیلانِ خون کیونکر ہوتا ہے ' تنفس کا کیا فایدہ ہے ' غذا کیونکر ہضم ہوتی ہے ' اعضا کو اس سے کیونکر قوت پہنچتی ہے ' یہ سب باتیں اس لایق ہیں کہ انسان انہیں سمجھے اور جانے ' علم الابدان کو ہمیشہ جملہ علوم پر ترجیح ہے ' کیونکہ حفظ صحت بخوبی نہیں ہوسکتا ' جبتک آدمی اس علم سے واقف نہ ہو اور علم کا اکتساب صحت بدن پر موقوف ہے اس علم میں انسان کے طریقۂ زندگانی سے بحث کیگئی ہے یعنے انسان کیونکر جیتا ہے ' کیونکر حرکت کرتا ہے ' پیدا کیونکر ہوتا ہے '

اور پھر کیسے مرجاتا ہے' ان باتوں کے دریافت کرنے کیلئے
ہر عضو کی ہیئت اور ساخت اور قوت اور غایت سے واقف
ہونا ضرور ہے۔

زندگی کیا چیز ہے؟ بظاہر اس سوال کا جواب نہایت دشوار ہے اور
اسکی کنہ کو پہنچنا' انسان کی فہم سے باہر معلوم ہوتا ہے' مگر پہلے
یہ سوچنا چاہئے کہ لوازمات زندگی کیا ہیں' یعنے وہ باتیں
جو ہر جاندار میں پائی جائیں خواہ وہ انسان ہو خواہ حیوان
یا نباتات۔ اس امر کی تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ

(۱) ولادت

(۲) نمو

(۳) بلوغ

(۴) انحطاط

(۵) موت

حیوان اور نباتات میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ ان کو لوازمات
کہتے ہیں' اور یہی صفات مجموعۂ زندگانی ہیں' کوئی ذی روح
ان صفات سے خالی نہیں ہے' اور کسی غیر ذی روح میں یہ صفات
جمع نہیں ہوسکتے' پس چاہئے کہ پہلے ہم لوازمات زندگی
کا احوال اچھی طرح دریافت کریں تاکہ زندگی کی حقیقت بخوبی
ہمارے ذہن نشین ہوجائے۔

(۱) ولادت کے معنے ہیں ماں باپ سے جدا ہونا' اور مثل اور
ابنائے جنس کے بغیر مدد و اعانت بجائے خود زندگی بسر کرنیکی
قوت کا حاصل ہوجانا' اس تعریف میں حیوانات اور نباتات
دونوں داخل ہوگئے' اسلئے کہ جب تک گٹھلی یا قلم یا بیج
اصل درخت سے جدا نہوئے اسوقت تک کوئی نیا درخت
نہیں پیدا ہوسکتا' اور وہی اصل درخت گویا ان سب کے
ماں باپ کی جگہ ہے'

(۲) نمو قد و قامت و جسامت میں زیادتی ہونیکو کہتے ہیں' اگرچہ
لوازمات زندگی میں اسکا شمار ہے مگر یہ غیر ذی روح میں بھی
پایا جاتا ہے' مثلاً اگر مصری کی ڈلی یا شورہ یا نمک کی قلمیں
مناسب موقع سے رکھی جائیں تو ان میں بھی نمو پیدا ہوتا ہے'
مگر ذی روح اور غیر ذی روح کے طریقہ نمو میں بہت فرق ہے
اول تو یہ کہ غیر ذی روح میں نمو صرف اوپر کے سطح پر مادہ کے
جم جانے سے ہوتا ہے' بخلاف اس کے جاندار میں اعضا کے
ہر جزو میں نمو ہوتا ہے' مثلاً درخت کی شاخ یا پھول پتے
یا حیوان کا قلب یا دماغ یا اور اعضا جو بڑھتے ہیں انکی ہر ایک
چیز کو نمو ہوتا ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ جتنے اعضا جاندار ہیں' ان میں ہر وقت
زوال ہوتا رہتا ہے' ان کے اجزا ہر وقت مصرف میں آتے ہیں
اور ان اجزا کا بدل ما یتحلل ہمیشہ ان کو پہونچتا جاتا ہے تاکہ
انکی قوت باقی رہے' غرض یہ ہے کہ جاندار چیزوں کے اجزا
ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور نئے ہوتے جاتے ہیں' ہر ساعت
ان میں ایک سلسلہ کون و فساد کا چلا جاتا ہے' مگر یہ تبدل
و تغیر ایسا بتدریج ہوتا ہے کہ اس کا تمیز کرنا ممکن نہیں البتہ
زمانہ دراز کے بعد بخوبی نظروں میں آنے لگتا ہے' مثلاً اگر کسی
بچے کو آدمی تین چار برس کے بعد دیکھے تو صاف معلوم ہوگا
کہ اسکے اجزا میں بہت بڑا فرق آگیا' اگرچہ بچہ وہی ہے
مگر جو گوشت و پوست اسکا کسی زمانہ میں تھا وہ باقی نہیں رہا
بلکہ بالکل بدل گیا اور نیا ہوگیا ہے' اس سے زیادہ تر
بدیہی تمثیل یہ ہے کہ اگر کبھی کسی انگلی میں چاقو لگ جاتا ہے
یا انگلی چھل جاتی ہے تو زخم بھرنے کے بعد داغ رہجاتا ہے'

مگر بتدریج یہ داغ بھی جاتا رہتا ہے، اور کھال نئی ہوجاتی ہے، اس قسم کا زوال غیر ذی روح میں نہیں ہوتا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ وہ مادہ جسکے سبب سے غیر ذی روح کو نمو ہوتا ہے اپنی حالت پر رہتا ہے، یعنے ماہیت نہیں بدلتی، اگر پانی میں نمک گھول دیں، اور اسمیں نمک کی ایک قلم بھی ڈال دیں تو اسکو نمو ہوگا، مگر یہ نمو صرف اسواسطے ہوتا ہے کہ نمک کے اور اجزا پانی کو چھوڑکر قلم پر چڑھ جاتے ہیں جاندار چیزوں کا حال اسکے برعکس ہے، کیونکہ اگرچہ جاندار چیزوں کو بھی نمو کے لئے اجزائے بیرونی کی ضرورت ہوتی ہے، (جیسے کہ حیوانات کیلئے غذا اور نباتات کے لئے اجزائے ارضی و ہوائی کی) مگر جبتک ان میں استحالہ نہ ہوجائے اور انکی ماہیت بالکل بدل نہ جائے اسوقت تک یہ نہ حیوان کو قوت پہنچا سکتے ہیں اور نہ نبات کو مثلاً غذا جب تک تحلیل نہ ہوجائے اور اسکے اجزائے قویہ معدہ و امعا اور جگر و قلب وغیرہ کے عمل کے بعد جذب ہوکر خون کے ساتھ نہ مل جائیں، اور فضلہ الگ نہ ہوجائے اُسوقت تک وہ کبھی کسی کام نہیں آسکتے اور نہ انکو فائدہ دے سکتے ہیں چنانچہ جب معدہ ضعیف ہوجاتا ہے اور ہضم صحیح نہیں ہوتا، اُسوقت کیسی ہی اچھی غذا ہو قوت نہیں پہنچاتی، اسکا ایک سبب یہ ہے کہ غذا میں جیسا چاہئے استحالہ نہیں ہوتا اور اسکی ماہیت خوب نہیں بدلتی اور فضلہ زیادہ پیدا ہوتا ہے، یہی حال نباتات کا ہے انکی غذا میں بھی استحالہ ہوتا ہے، مگر غیر ذی روح شئے، مثلاً نمک کی قلم میں جب اور اجزا نمک کے ملجاتے ہیں اور اسکے باعث سے اسکو نمو ہوتا ہے، توان اجزا میں کچھ تبدل اور تغیر نہیں آتا، بلکہ جیسے تھے ویسے ہی رہتے ہیں، جب پانی میں گھل جاتے ہیں اس حالت میں بھی وہ نمک کے اجزا کہلائینگے اور اب قلم پر جم جانیکے بعد بھی وہی نمک رہیں گے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ جاندار چیزوں کے نمو کی حد معین ہے، ہر حیوان اور ہر نبات ایک خاص قد تک پہنچکر رک جاتا ہے مگر غیر ذی روح مثلاً وہی نمک کی قلم جتنا چاہے بڑھتی چلی جائے یعنے اُس کے نمو کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

(۳) لوازمات زندگانی میں تیسرا بلوغ ہے، بلوغ سے یہاں مراد ہے بتدریج رسیدگی کو پہونچنا، واضح ہو کہ قبل جوان ہونیکے انسان کے ہر عضو میں ایک طرحکا تغیر ہوتا ہے، اور پختگی اور رسیدگی آتی جاتی ہے، جسکے باعث ہر عضو کو اپنا کام کرنیکی صلاحیت زیادہ ہوجاتی ہے اور روز بروز اسکی قوت بڑھتی جاتی ہے یہانتک کہ وہ اپنا کام نہایت عمدہ طور پر کرنے لگتا ہے، مگر نمو اور بلوغ میں بہت فرق ہے، نمو فقط جسم کے بڑھنے کو کہتے ہیں اور بلوغ اعضا اور قویٰ کی پختگی اور رسیدگی کا نام ہے، جوان آدمی اور ایک دن کے بچہ کا باہم مقابلہ کرنے سے یہ فرق صاف ظاہر ہوجائیگا۔

پہلا فرق تو دونوں کے قد و قامت اور جثہ میں ہے جو محض نمو کے باعث سے ہوا کرتا ہے، مگر اس کے سوا بھی بہت سے فرق پائے جاتے ہیں، بہت سے قویٰ ایسے ہیں کہ جو جوان میں موجود ہیں مگر بچے میں نہیں، مثلاً ادنیٰ سا فرق یہ ہے کہ وہ بول سکتا ہے یہ مطلق نہیں بولتا، وہ صاحب عقل و حواس ہے، یہ محض نادان وہ زور آور ہے یہ بیچارہ کمزور، بہتیری باتیں مابہا الامتیاز اسی قسم کی اور بھی ہیں اور یہ سارا تفاوت بلوغ کے سبب سے ہے اسلئے کہ ایک حد بلوغ کو پہنچ چکا ہے، اور دوسرے میں ہنوز روز اول ہے، جو کچھ بلوغ ہوا ہے، پیدا ہونیکے قبل ہوا ہے

(۴) انحطاط، انتہائے بلوغ اور ابتدائے انحطاط

میں تمیز کرنا نہایت دشوار ہے، بلکہ اکثر یہ دونوں امر دوش بدوش ہوتے ہیں، یعنے بعض اعضا کو ابھی بلوغ ہو رہا ہے، اور بعض میں انحطاط شروع ہوگیا، مگر آخر چلکر تمام اعضا کو انحطاط ہوتا ہے، اور اسکا انجام موت ہے۔

(۵) (موت) یہ بات ہر شخص جانتا ہے، کہ موت کا ایک دن معین ہے، ایک دن اس قالب کو چھوڑ دینا پڑیگا، اور مکروہات دنیا سے نجات ہوجائیگی، اور بیشک موت میں سوائے مشیت ایزدی کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا، اسلئے کہ خداوند عالم نے انسان کے اعضا کو اسطور پر بنایا ہے اور ایسے اجزا سے مرکب کیا ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے سے اُسکا یہ ارادہ تھا کہ انسان ایک مدت محدود سے زیادہ نہ جیے، اگر کوئی مرض یا کسی قسم کا صدمہ انسان کو لاحق نہو تب بھی موت اوسکے لئے لازمی ہے، یہ کل خدا نے ایسی بنائی ہے، اور اُس کے پرزے اس ڈھنگ کے گھڑے ہیں، کہ انکا گھس جانا ضرور ہے، اور جہاں کوئی پرزہ ضایع ہوا تو پھر کسی کے بنائے نہیں بنتا کُل کا چلنا پرزوں کے بگڑتے ہی موقوف ہوجاتا ہے، اور اسی کا نام موت ہے، انسان کے بدن میں قادر مطلق نے ایسی کاریگری صرف کی ہے، کہ شاید روئے زمین پر کوئی ایسی کَل نہیں جسکا اصول انسان کے کسی عضو میں موجود نہو، بایں ہمہ بہتیری ایسی حکمتیں ہیں جنکے سمجھنے سے فہم انسان قاصر ہے، مگر سمجھانے کیلئے انسان کے بدن کو گھڑی سے تشبیہ دیتے ہیں، دونوں کا حال ایک ہی سا ہے، جتبک کہ سب پرزے درست اور صاف ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر قایم ہیں اسوقت تک کل چلی جاتی ہے، مگر جسوقت کسی پرزے پر میل آیا کل بگڑ گئی جبتک صاف نہو گا گھڑی درست نہ چلیگی، یہی حال عوارض بدنی کا ہے، اور جسطرح اسمیں بعض اعضائے رئیسہ ایسے ہیں کہ اپنر نظام بدن کا دار و مدار ہے، اور انکی بیماری نہایت سخت ہوتی ہے، ویسے ہی گھڑی میں بھی بعض پرزے نہایت نازک ہیں، اور جلدی نہیں درست ہوتے، اور بے اُنکے گھڑی چل نہیں سکتی اور جب گھڑی کا کوئی نازک پرزہ ضایع ہوجاتا ہے تو گھڑی کا چلنا موقوف ہوجاتا ہے، علیٰ ہذا اگر انسان کا کوئی عضو رئیس ضایع ہوجائے تو اُسکا جینا محال ہوجاتا ہے، اور یہ بولتی ہوئی کَل بند ہوجاتی ہے، فرق اتنا ہے کہ گھڑی کے بنانے والے بہتیرے ہیں، مگر انسان کے بدن کا پرزہ کسی سے نہیں بنتا، بلکہ اُسکا میل صاف کرنا یعنے بیماری کا دفع کرنا بھی ایک امر دشوار ہے، جب آدمی نے ایسی کَل بنائی کہ بول سکے تو کیا تعجب کی بات ہے، کہ خدا نے ایسی کَل بنائی کہ جسمیں عقل و فہم بھی ہے، اور علاوہ اسکے بہت سی باتیں اور زیادہ ہیں، اور انسانکی جان بھی ویسی ہی نازک ہے، جیسے گھڑی کی کَل کہ ادنیٰ سبب سے جاتی رہتی ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا بگڑ گیا۔

سید حسن بلگرامی

رُباعی

تکلیف و مصیبت پہ عبث رونا ہے
قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہونا ہے
سیم و زر و کیمیا ہے کیا شئے اے ہوش
سب خاک ہی اور خاک ہی میں سونا ہے
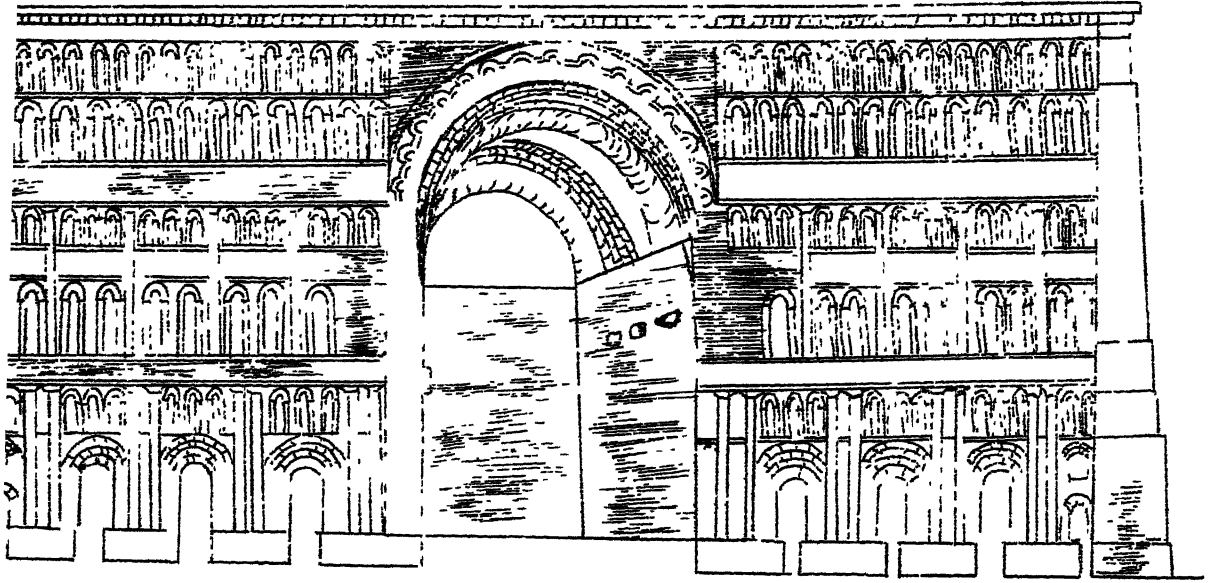
(۱) طاق کسریٰ حالت ابتدائی میں
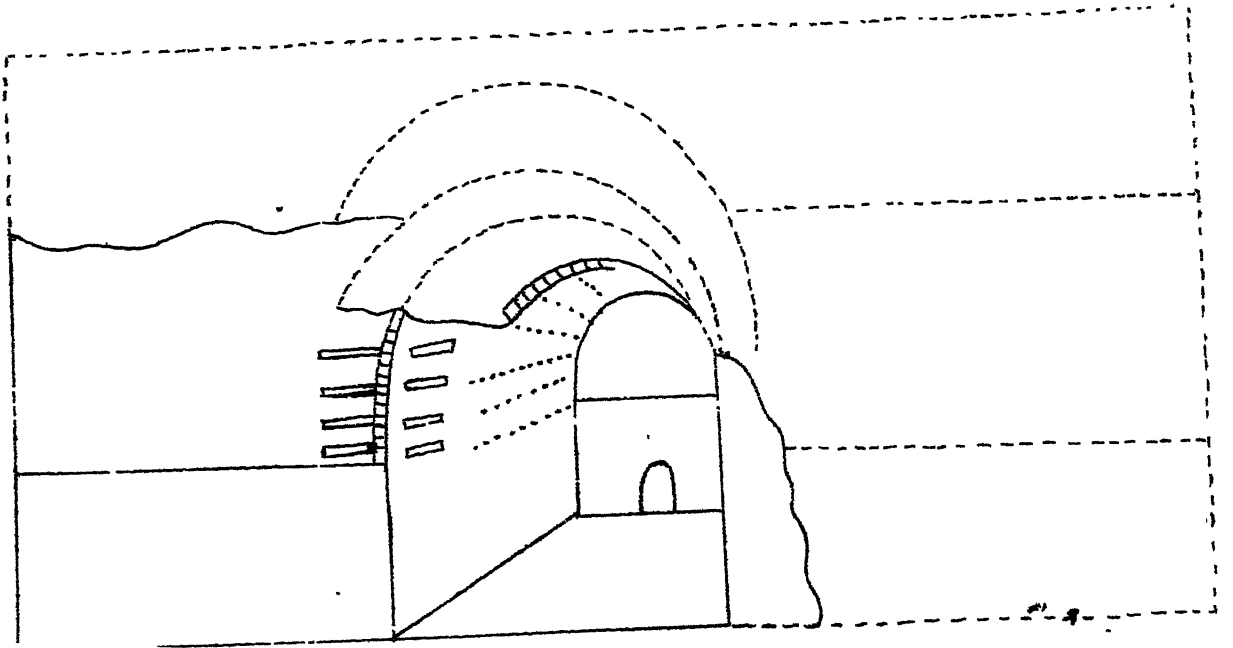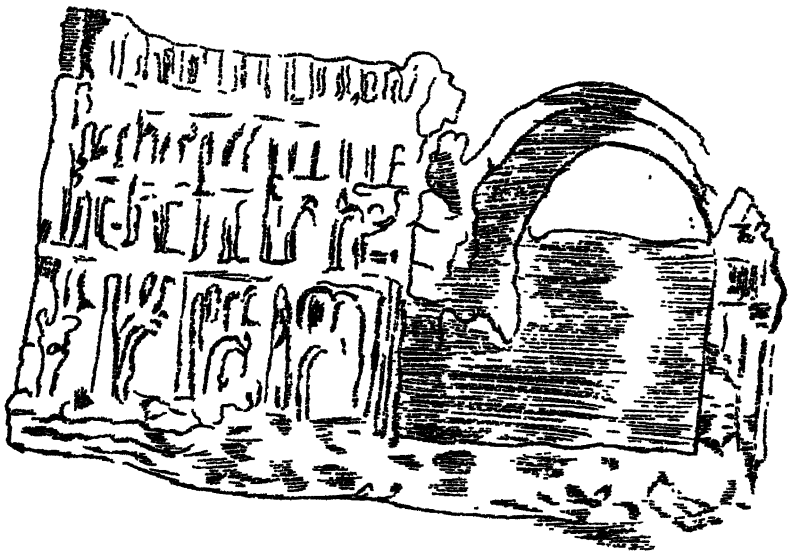
(۳) طاق کسریٰ کی موجودہ حالت

(۴) سکۂ اردشیر بابک کے دونوں رُخ

طاقِ کسریٰ

مضمون ذیل ہمارے دیرینہ عنایت فرما مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی کے قلم ندرت رقم کا چکیدہ ہے' جو آپکے زیر ترتیب سفرنامۂ عراق کا ایک دلچسپ حصہ ہے' اسمیں طاقِ کسریٰ کے تاریخی واقعات' و امتیازات' اور موجودہ حالات کی نسبت تحقیق اور تلاش کی جو داد دیگئی ہے' وہ اربابِ نظر سے مخفی نہ رہیگی' ہماری استدعا ہے کہ ناظرین اس مضمون کو بالاستیعاب ملاحظہ فرمائیں۔

ایڈیٹر

شب گذشتہ کو مینے قصد کیا تھا کہ آج بغداد جاکر رصافہ[1] اور کرخ[2] کے اُن آثار باقیہ کی سیر میں دن بھر گذاروں مگر میرے رفیق الطریق کی رائے یہ ہوئی کہ بغداد کے کھنڈروں کی سیر سے قبل طاق کسریٰ کی سیر کرنا چاہیئے اسلئے کہ عراق عرب کے اس حصہ میں متمدن زمانہ کی اس سے زیادہ قدیم اور مہتم بالشان کوئی یادگار اسوقت باقی نہیں ہے' علاوہ اسکے بغداد کو نوشیروان کے اس باغ داد سے ایک خاص تعلق ہے' اور باعتبار فتوحات اسلامی ایوان کسریٰ آثار اسلام سے ہے' جسکے دیکھنے سے حضرت رسالتمآب کا ابتدائی زمانہ یاد آتا ہے' اور آتشکدۂ فارس اور بحیرہ ساوا کے معدوم ہوجانیکی وجہ سے اب صرف یہی طاق آپ کی ولادت کے آیاتِ ظاہرہ میں سے باقی رہگیا ہے' مینے اُن کی رائے سے اتفاق کیا' اگرچہ بغداد سے مداین کو قفہ[3] بھی جاتا ہے' مگر چونکہ دہارہ کے خلاف جانا پڑتا تھا' اسلئے انہوں نے آمد و رفت کے لئے ایک مقطوع عربانہ[4] کا بندوبست آٹھ مجیدی[5] میں رات ہی کو کرلیا تھا' سحر کرکے بعد نماز فجر ہم دونوں مداین کو روانہ ہوئے' یہ مقام کاظمیہ سے ۲۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے بارہ بجے ہم طاقِ کسریٰ پر پہنچ گئے' یہاں کے قصور شاہی کو برباد اور شہر کو ویران دیکھکر بہت حسرت ہوئی' خصوصًا اس خیال سے کہ نوشیروان اور اُس کے جانشینوں نے اِن محلسراؤں کے استحکام میں کسقدر اہتمام کیا ہوگا کہ منصور خلیفۂ دوم عباسی سعئ بلیغ کے باوجود قصر الابیض کے ایک حصہ کو بھی مسمار کرانے کا متحمل نہ ہوسکا' اور اسکی ایک مسلم اینٹ بھی اپنے محل سے الگ نہ ہوئی' مگر زمانہ جس نے یونان و مصر روما و بابل' اور قیصر و افراسیاب' کی ایسی ہزاروں سلطنتوں کو ہاون روزگار میں پیس ڈالا' اسی زبردست قوت نے ملوک عجم کے ان یادگاروں کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادیہے اور اب سوائے اسکے کہ خوبصورت محلات اور شاہی عمارتوں کے تودے سرنگوں پڑے ہیں' کوئی حصہ عمارت قابل دید نہیں رہا ہے'

[1،2] بغداد کے محلوں کا نام ہے [3] ٹوکرا [4] پوری گاڑی [5] معادل دو روپیہ آٹھ آنہ سکۂ قیصری

تصویر نمبر (۱) اس مشہور محل سرا کے، اس حصہ کو ظاہر کرتی ہے جسکو (Throne Room) یا تخت گاہ کہتے ہیں، اسکے وسط میں وہ تاریخی ایوان ہے، جو طاقِ کسریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جسمیں تاجِ کیخسروی زنجیر طلائی کے سہارے سے لٹکا رہتا تھا، اس مشہور تاج کا وزن تین سو من بیان کیا جاتا ہے، (اور جب ہم ایوان کی ضخامت اور اُسکے استحکام پر نظر کرتے ہیں، تو یہ وزن بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا) جسمیں لعل بدخشانی، زمرد کامرانی، اور دوسرے جواہر خوش آب جڑے ہوئے تھے، اسکے نیچے تخت طاقدیس[۱] بچھا ہوا تھا جسپر شہنشاہ عجم جلوہ افروز ہوا کرتے تھے، چونکہ ساسانیوں کے جانشین ایران میں صفویہ اور قاچاریہ ہوئے اسلئے اسی رسم کی تتبع میں وہاں کا موجودہ تاج کیانی نہایت وزنی اور طہران میں تخت طاؤس کے اوپر عین وسط میں زنجیر طلائی کے سہارے لٹکا ہوا ہے، عیدین یا نوروزی دربار میں شاہ ایران تختِ طاؤس پر بیٹھکر تاج کیانی کو اپنے سر کے نیچے لے لیتے ہیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ تاج پہنے ہوئے ہیں۔

اس شاندار ایوان میں تخت طاقدیس بچھا ہوا تھا جس کے چاروں پائے مرصع بہ یاقوت سرخ اور جسکے اطراف کئی سو طلائی گیند اور فانوس آویزاں تھے، ہر گھنٹہ گذرنے پر اس تخت کے پہلو سے ایک شیر سر باہر نکالکر ایک طلائی کرہ اپنے منہ سے سونے کے طشت میں ڈال دیتا تھا جس سے ایک بلند آواز پیدا ہوتی تھی۔ یہ تخت فریدوں شہنشاہ عجم کی فرمایش پر مہر برزین نامی ایک شخص نے بنایا تھا، فریدوں کے بعد ہر بادشاہ اس تخت کی رونق و زیبایش کیجانب حوصلۂ شاہانہ سے متوجہ رہا، مگر خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشیروان کے زمانہ میں اسکی زیب و زینت حد کمال کو پہنچ گئی تھی، گشتاسپ جس نے ایک سو بیس سال تک ایران میں حکومت کی تھی اسکے عہد میں حکیم جاماسپ نے صور آسمانی اور کواکب مشہورہ کی صورتیں اس تخت پر بنائی تھیں، علاوہ بریں اسوقت تک جسقدر کرۂ ارض دریافت ہوچکا تھا اسکا نقشہ اور جغرافیائے عالم بھی اسپر کندہ تھا، یہ تخت چند طبقوں پر منقسم تھا، خسرو پرویز ہر فصل میں طبقۂ مناسب پر جلوس کرتا تھا۔

یہی طاق نوشیروان اور اسکے جانشینوں کی عدالت گاہ ہے اسی ایوان میں پیغمبر آخر الزماں کی ولادت کیوقت شگاف پڑگیا تھا، تصویر مذکورہ میں اس رفیع الشان ایوان کے دونوں طرف سرتاپا طاق دکھلائے گئے ہیں جسکے چودہ کنگرے حضرت کی پیدائش کے وقت زور سے گر پڑے تھے، اور اسکی آواز دور تک گئی تھی، گویا یہ اس تباہی کا نمونہ تھا جو کل سلطنت ایران پر عنقریب آنے والی تھی ؎

چو صیتش در افواہِ دنیا فتاد
تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد

یہ ایوان جسکے ارتفاع و استحکام کی تاریخ میں مثال دیکھائی ہے سنہ ۵۵۰ء میں یعنے ہجرت سے ۷۲، سال قبل ساحل دجلہ پر بحکم نوشیروانِ عادل تعمیر کیا گیا تھا اور موجودہ تصویر اسکے اسی رخ کو ظاہر کرتی ہے، جو لبِ دجلہ ہے، اینٹ اور چونے کی جیسی یہ عمارت تھی، تمام دنیا میں ایسی عالیشان عمارت کسی نے نہیں بنائی، اسکا پچھلا حصہ مسقف دربار کے بڑے اوطاقوں[۲] سے

---

۱ ملوک ساسانیاں کے تخت کا نام ہے ۱۲

۲ جمع اوطاق - یعنے کمرہ ۱۲

مشتمل تھا اسمیں ایک دالان ۱۵۰ گز مربع تھا جسمیں ۲۴۴ گز
طویل، ۶۵ گز عریض اور ۸۲ گز مرتفع ایک چبوترہ بنا ہوا تھا
غرض سارے شہر مدائن بلکہ دور دور تک کوئی عمارت کیا
بلحاظ استحکام اور کیا بلحاظ رفعت وشان اسکی ہمسر نہیں تھی
مگر افسوس اب وہ کچھ نہ رہا، یہ تصویر کئی معتبر مگر ناقص تصویروں
سے ایک ہیئت مجموعی ظاہر کرنیکو اس سفرنامہ کے لئے بطور
خاص تیار کیگئی ہے تاکہ اس ایوان کی رفعت وشان
کی نسبت ایک صحیح اندازہ اس سے قایم ہوسکے ورنہ فی زمانہ
ایوان کسریٰ کے آثار اسقدر ناقص حالت میں باقی ہیں کہ
انسے اسکی گذشتہ عظمت کا صحیح اندازہ بہ شکل قایم کیا جا سکتا ہے
بغداد سے قرب کی وجہ سے اور اسلئے بھی کہ شط دجلہ میں سے
شب وروز گذرنے والے جہازوں کی یہ عمارت مدنظر رہتی ہے،
مشرق ومغرب میں اسکو غیر معمولی شہرت حاصل ہوگئی ہے
اور ہر زمانہ میں سیاح اسکی تصویریں اتارنے میں دلچسپی ظاہر
کرتے رہے ہیں۔

بوقت تعمیر یہ عمارت چار منزلوں پر منقسم کیگئی تھی، اور عین
وسط کے رفیع الشان ایوان نے عمارت کے دونوں حصص
کو بالمناصفہ تقسیم کر دیا تھا جس سے اسکی وضع بہت شاندار ہوگئی تھی
وسطی ایوان جو تاریخ میں طاق کسریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا
ہے، اندر سے ستر فیٹ عریض اور نوے فیٹ بلند تھا
اور اسکے اوپر طاقچوں کی دو قطاریں تھیں پہلی قطار میں
ہر طرف تیرہ اور دوسری قطار تیرہ تیرہ طاقچوں پر منقسم
تھی، ایوان کے داہنے اور بائیں پہلوؤں میں ہر طرف
چار خوشنما ستون بنائے گئے تھے، جس میں اوپر کو ہر طرف
تین چھوٹے طاق اور اسکے نیچے ایوان اور ستونوں کے
وسط میں ایک ایک اور مابقی میں دو دو محرابیں بنائی گئی
تھیں، درجۂ اسفل میں ہر طرف آٹھ ستون تھے اور ہر دو
ستونوں کے بیچ میں ایک کمان دس سے بارہ فیٹ تک
عریض بنائی گئی تھی، ان کمانوں کے اوپر تین تین طاقچے بنے
تھے، اسطرح ساری عمارت از سرتا پا، کمانوں، محرابوں،
اور طاقچوں پر مشتمل تھی جو نیچے سے اوپر کو جاتے ہوئے طول
وعرض میں بلحاظ مناسبت، بتدریج بڑھتے یا گھٹتے گئے تھے،
اور ان سب کا صدر وہ نوے فیٹ بلند ایوان تھا جس کو
طاق کسریٰ سے موسوم کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ امر غور طلب ہے کہ ساری عمارت میں سطحی درجہ
کی چھ بڑی محرابدار کمانوں کے منجملہ صرف دو کمانیں وار پار
کھلی ہوئی تھیں، مابقی جسقدر چھوٹی بڑی کمانیں دو طرفہ
اوپر سے نیچے تک تھیں اون میں سے کوئی بھی دریچہ نما نہ تھی
بلکہ سب پشت کی طرف سے پٹی ہوئی تھیں اور ایوان کسریٰ
کے طاقدار طرز تعمیر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، کہ یہ وضع صرف
زیب وزینت کے خیال سے اختیار کیگئی تھی اور اس سے یہ
منشاء نہ تھا کہ ہوا یا روشنی کی آمد وشد کا ذریعہ قایم کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایوان کسریٰ عام رواج کے
برخلاف اینٹوں کو مسطح رکھکر تعمیر کیا گیا تھا، جس سے اندازہ
کیا جا سکتا ہے کہ اسکی تعمیر اور جوف بندی میں کسقدر لسدار
اور پایدار مصالحہ استعمال کیا گیا ہوگا۔

تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ ایوان کی دونوں جانب
دیوار میں وار پار چھ چھ قطار سوراخوں کی بنائی گئی تھیں
یہ قطاریں نقشہ نمبر (۲)، کے ملاحظہ سے واضح ہوسکتی ہیں فی زمانہ
یہ سوراخ بند ہوگئے ہیں مگر ان کے مصرف کی نسبت انگریز

مورخین کا بالاتفاق یہ خیال ہے کہ ان سوراخوں میں طنابوں کے سہارے شمع و فانوس لٹکا کر ایوان روشن کیا جاتا تھا، ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو اسلئے کہ فی زماننا قاہرہ کی مسجد سلطان حسن نجف کے روضۂ جناب امیر اور ہندوستان کی اکثر مساجد میں بھی رواج پایا جاتا ہے' اور اس خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ تحت طاقدیس کے اطراف جو نقرئی اور طلائی فانوس آویزاں تھے وہ ۶۳۷ء میں مسلمانوں کو مداین کی غنیمت میں ہاتھ آئے تھے'

ایوان کا جوڑ جس مقام پر دیوار سے ملایا گیا ہے وہاں چار مقامات پر بنظر استحکام مزید سنگین لکڑی کے ضامن دیئے گئے ہیں' اور یہ ضامن دیوار کی پوری ضخامت میں پائے جاتے ہیں' جو (۲۳) فیٹ دبیز ہے' یہ ضامن بھی نقشہ نمبر (۳) میں بوضاحت تبلائے گئے ہیں۔

ایوان کی چھت پانچ فیٹ دبیز رکھی گئی تھی' جس میں اینٹوں کی یکے بر دیگرے چار تہیں دیگئی تہیں'

اس عمارت کی دیوار مخروطی شکل کی بنائی گئی تہی چنانچہ اب بھی نیچے کا حصہ' حصۂ بالائی کے مقابلہ میں زیادہ ضخیم ہے' اس ایوان کی داہنی طرف کا رہا سہا حصہ ۱۸۸۸ء میں منہدم ہوگیا اوسکے بعد ۱۹۰۹ء میں بیچ کے طاق کا حصۂ پیشیں بھی نذر باد فنا ہوا' اب صرف ایوان کا پچھلا حصہ اور بائیں طرف کی کچھ عمارت باقی ہے' تصویر نمبر ۳ ایوان کسریٰ کے آثار باقیہ کو ظاہر کرتی ہے' اس عالیشان عمارت کا یہ حصہ ہر وارد و صادر کو اپنی عبرت خیز داستانیں سناتا اور زبانِ حال سے آنیوالی نسلوں کو یہ تبلاتا ہے کہ ملوک عجم باوجودیکہ زبردست تھے لیکن جس قوم نے اپنی تسلط

حاصل کیا' خداوند عالم نے اسکو ان سے زیادہ قوت عطا فرمائی تھی' اور گو ملوک عجم کی سلطنت زایل ہوگئی مگر میں اُن کے ہیبت و شوکت کی زندہ مثال موجود ہوں ؎

جزائے حسن عمل بیں کہ روزگار ہنوز
خراب می نکند بارگاہِ کسریٰ را

یہاں پر ایک مقام بنام مصلائے جناب امیرؑ مشہور ہے جنگ صفین کو روانگی کے موقع پر حضرت نے یہاں مقام فرما کر نماز ظہر پڑہی تھی' اسوقت شہر کی حالت رو بہ خرابی تھی' اگرچہ خاص شہر مداین بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہوگیا تھا مگر اسی عدم مزاحمت نے فاتح لشکر کو شہر میں ہنگامہ برپا کرنے پر زیادہ جری کردیا تھا' اور فتح مداین کیوقت نہایت بیدردی کیساتھ شہر کی رونق برباد کیگئی' چنانچہ عباسیوں کے زمانہ میں' کہ فتح مداین کو صرف ایک صدی گزری تہی' یہ شہر بالکل ویران ہوگیا تھا' اور یہاں کی عمارتوں میں صرف ایوان کسریٰ اور قصر الابیض باقی رہگئے تھے' منصور دوانیقی جو کفایت شعار خلفائے عباسیہ کی صف اول میں شمار کیا جاتا ہے' اس نے اسی خیال سے کہ یہ شاہی محلسرائیں یوں ہی عالم کس مپرسی میں پڑے پڑے تاراج ہوجائینگی' ارادہ کیا تھا کہ ان باقیات الصالحات عمارتوں کو مسمار کرکے اسی اینٹ اور چونہ سے شہر بغداد کی تعمیر شروع کرے' مگر اُن وجوہ کی بناء پر جسکا تذکرہ تعمیر بغداد کے ضمن میں کیا جائیگا' وہ اپنے ارادہ سے باز رہا۔

وہ مداین جو پانچ صدیوں تک ساسانیوں کا پائے تخت رہا۔ اب اُس شہر کا پتہ نہیں ہے' کہ کہاں پر آباد تھا'

---

[1] Ctesiphon.

اور تمام عمارتوں کے منجملہ صرف طاق کسریٰ کا اسیقدر حصہ باقی رہگیا ہے، جو تصویر نمبر (۳) میں ظاہر کیا گیا ہے، قصر الابیض بھی چوتھی صدی ہجری میں منہدم ہوگیا، چنانچہ مداین سے ایک فرسخ شمال کی جانب اوسکے کھنڈر پائے جاتے ہیں،

ایوان کسریٰ کے طول وعرض کو آسانی کیساتھ دل نشین کرنے کے لئے نقشہ نمبر (۲) طیار کیا گیا ہے جسمیں نقطے عمارت کے اُس حصے کو ظاہر کرتے ہیں جو بالکل فنا ہوچکی ہے، مگر جو حصہ خطوط کے ذریعہ سے تبلایا گیا ہے وہ عمارت کی حالت موجودہ کو ظاہر کرتا ہے، اس کا خاکہ مداین ہی میں تیار کیا گیا تھا، اور اب اس ذریعہ سے عمارت کا عرض وطول سمجھانے کی کوشش کیجائیگی۔

(۱) وسطی ایوان اور اسکے دونوں پہلوؤں کا مجموعی طول	۳۱۲ فیٹ
(۲) دیوار کی بلندی	۱۰۵ فیٹ
(۳) ایوان کا سطحی عرض	۸۶ فیٹ
(۴) ایوان کا اندرونی طول	۱۶۳ فیٹ
(۵) سطح زمین سے ایوان کی چھت تک	۹۵ فیٹ
(۶) ایوان کی چھت سے عمارت کی انتہا تک	۱۰ فیٹ
(۷) ایوان کے دیوار کی ضخامت	۲۳½ فیٹ
(۸) ایوان کے پہلوئے راست دیوار کا عرض	۱۳ فیٹ
(۹) ایوان کے پہلوئے چپ کی دیوار کا عرض	۱۳ فیٹ

اس سلسلہ کے حسب ذیل تاجداروں کو عمارت بنانے کا شوق رہا۔

(۱) اردشیر بابک[1] بانی خاندان ساسانیہ نے پہلے پہل ۲۲۸ء میں اردشیر آباد تعمیر کیا جو بعد کو مداین کے نام سے مشہور ہوا۔

(۲) شاپور[2] اول وثانی[3]۔ آخر الذکر نے چوتھی صدی عیسوی میں سربستان تعمیر کیا

(۳) فیروز[4] نے فیروز آباد بنایا

(۴) خسرو اول[5] یعنے نوشیروان عادل نے مداین میں ۵۵۰ء میں ایوان کسریٰ تعمیر کیا۔

(۵) خسرو ثانی[6] پرویز نے کرماشاہ اور بغداد کے مابین قصر شیرین اور دوسرا ایوان ۲۰۰ گز طویل ۲۰۰ گز بلند اور ۱۰۰ گز عریض مداین میں بنایا تھا۔

(۶) یزدجرد[7] نے کوشک یزدجرد مداین میں بنوایا۔

اس عہد کی مشہور عمارتیں فی زمانہ مداین، سربستان اور فیروز آباد، میں واقع ہیں، علاوہ انکے الحدر میں بھی ساسانیوں کی قدیم عمارتیں موجود ہیں اور یہ مقام موصل سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

(۱) سربستان کی عمارت گنبد نما ہے، جسکی دیواروں میں اینٹ پتھر استعمال کیا گیا ہے، مگر گنبد اینٹ کا بنا ہوا ہے،

(۲) فیروز آباد میں دیواریں، گنبد اور حجرے تمام تر پتھر کے ہیں یہ عمارت سربستان سے بڑی اور زیادہ خوشنما ہے،

۱؎ Artaxerxes (226-241 AD) اردشیر بابک (۲۲۸-۲۴۱ء)

۲؎ Sapur I (241-272 AD) شاپور اول (۲۴۱-۲۷۲ء)

۳؎ Sapur II Postumus (310-379 AD) شاہ پور ذوالاکتاف (۳۱۰-۳۷۹ء)

۴؎ Peroses (457-484 AD) فیروز (۴۵۷-۴۸۴ء)

۵؎ Chosroes I the Just (531-579 AD) نوشیروان کسریٰ (۵۳۱-۵۷۹ء)

۶؎ Chosroes II (590-628 AD) خسرو پرویز (۵۹۰-۶۲۸ء)

۷؎ Yezdegerd III (632-641-651 AD) یزدجرد ثالث (۶۳۲-۶۴۱-۶۵۱ء)

اسمیں برابر برابر تین گنبد بنے ہیں، جنکی حالت ابھی تک اچھی ہے یہاں کے اندرونی حصوں پر پچیکاری کا کام قابلِ دید ہے۔

(۴) مداین میں ہلکے رنگ کی بڑی اینٹیں تمام عمارتوں میں دیکھی ہیں اور انکے اوپر چونے کا استر کیا گیا ہے۔ ساسانیوں نے اپنے ۵۰۰ سو برس کے عہدِ حکومت میں مختلف مقامات پر جسقدر عمارتیں بنائیں اُن سب میں زیادہ مہتم بالشان یہی عمارت ہے، جو مداین میں موجود ہے، مگر افسوس کہ اب یہی عمارت سب سے زیادہ خراب حالت میں ہے، کہا جاتا ہے کہ طاقِ کسریٰ جسکے سینے میں اسلام کے عروج اور عجم کے تباہی کی تاریخ پنہاں ہے، اسیطرح تا قیامِ قیامت اپنے تاجداروں کا مرثیہ خواں رہیگا، اور صفحۂ ہستی سے اسکا نشان بالکل محو نہو جائیگا۔

جن سلاطینِ عجم نے مداین پر حکومت کی اُن کو ملوک ساسانیاں کہتے ہیں، اسلئے کہ ان تاجداروں کا سلسلۂ نسب ساسان بن بہمن بن اسفندیار سے ملتا ہے، اور ساسان چونکہ راہب اور فقیرانہ زندگی بسر کیا کرتا تھا، اسلئے اس نام سے مشہور ہوگیا ہے، اور لغت میں ساسان گدا کو کہتے ہیں، ان سلاطین کو مثل فراعنۂ مصر و قیاصرۂ روم کے اکاسرہ بھی کہتے ہیں، اور اس نام سے یہ اس طرح منسوب ہوئے، کہ نوشیروان عادل نے (خسرو اول) سریرِ سلطنت پر بیٹھکر اپنا لقب کسریٰ اختیار کیا، اس کے جانشینوں نے بھی اپنے اسامی میں اس لقب کو شامل کر لیا، حتیٰ کہ مورخین نے تمام ملوک ساسانیہ کو اکاسرہ کا لقب دیدیا، اور اکاسرہ جمع کسریٰ کی ہے، بفتح کاف وسکون سین و رائے مہملہ والف مقصورہ، اور یہ لفظ خسرو کا معرب ہے، کسریٰ، قیصر، سیزر حقیقت میں ایک ہی لفظ خسرو کی مختلف صورتیں ہیں، جسکے معنی شاہنشاہ کے ہیں، اور در اصل یہ لقب شاہنشاہ ایران کا ہے، رومیوں نے اپنے بادشاہ کو اسی لقب سے یاد کیا، مگر چونکہ قاف ان کے ہاں نہیں ہے، اسلئے اختلافِ زبان کیوجہ سے کے سر ہوگیا، عربوں نے اسکو قیصر لکھ لیا اور اہلِ فرنگ نے لفظ سی کو جو کہ کاف اور سین میں مشترک ہے سین پڑھ لیا، اور کے سر کے سین کو زائے معجمہ سے بدلکر سیزر کہا، غرض ایک ہی لفظ خسرو کی گو مختلف صورتیں ہوگئیں مگر منشا، ومفہوم سب کا ایک ہی رہا۔

ساسانیوں کا پہلا تاجدار اردشیر بابک تھا جس نے بہت معمولی حیثیت سے ترقی کرکے خود کو رتبۂ شاہنشاہی پر پہنچایا تھا، ایران کے تمام طوائف ملوک پر اس نے تسلط حاصل کیا، اور سلطان حرہ کو اپنا مطیع کرکے براہ موصل ارض مداین پر پہونچا، یہاں کی آب و ہوا اسکو پسند آئی، چند روز یہاں قیام کرکے بحرین کو مسخر کیا اور وہاں کے قلعہ سے ایک بڑا خزانہ لیکر مداین کو واپس آیا جہاں پر اس شہر کی بنیاد ڈالی اردشیر آباد اسکا نام رکھا اور مداین ہی کو اپنا پائے تخت مقرر کیا۔ یہ واقعہ ۲۲۸ء کا ہے،

ان سلاطین کا عارضی پائے تخت اصطخر[۱] بھی رہا ہے جو آتش پرستی کا مرکز ہونے کی حیثیت سے بہت متبرک مقام سمجھا جاتا تھا۔ مملکت آذربایجان و عراق و عرب و عجم اور اراضی فارس و کرمان و خراسان ساحل جیحون

(۱) Persepolis

تک اردشیر کے زیر نگین ہوگئے تھے' اور اسکے زمانہ میں حدود ایران
شط فرات سے دریائے خزر تک اور دریائے بحرین سے رود جیحون
تک تھے' پانچسو چون نامور شہر چھ ہزار گاؤں اسکے ملک میں آباد
تھے' اور مردم شماری کرنے سے معلوم ہوا کہ اسی کروڑ رعایا اسکی
مملکت میں موجود تھی'

طبقۂ آخر کے سلاطین ساسانیہ میں نوشیروان عادل اور
خسرو پرویز بہت نامور تاجدار گذرے ہیں' نوشیروان نے
۵۳۱ء سے ۵۷۹ء تک اڑتالیس سال مداین میں نہایت
انصاف اور خوش انتظامی کے ساتھ حکومت کی اور اطراف عالم
کے حکماء و عقلا کو اس نے اپنے پاس جمع کر لیا تھا' بوزرجمہر
دربار نوشیروانی کا مشہور حکیم تھا' اور سلاطین چین وہندوستان
وروم وترکستان اسکے باجگذار تھے' شطرنج اسکے عہد میں
ہندوستان سے آکر ایران میں رائج ہوئی' اور کتاب کلیلہ ودمنہ
بایمائے نوشیروان عادل حکیم برزویہ ہندوستان جاکر لایا تھا
جسکا ترجمہ پہلے مرتبہ زبان پہلوی میں کرایا گیا۔
اپنی مملکت کو اسنے چار صوبوں پر تقسیم کیا تھا۔

(۱) خراسان وسجستان وکرمان۔

(۲) اصفہان وقم وآذربائجان وآرمینیا۔

(۳) فارس واہواز۔

(۴) عراق عرب

نوشیروان کو اس شکوہ شاہانہ سے حکومت کرتے ہوئے انتیس سال
گذرے تھے کہ ایک شب کو اس نے خواب میں دیکھا کہ ایوان کسریٰ
کے چودہ کنگرے ٹوٹ کر گر گئے ہیں' اور اردشیر جو آتشخانہ ایران
کا موبد موبدان تھا اسنے بھی خواب میں دیکھا کہ عجم اور عرب کے
اونٹوں کے درمیان جنگ ہوئی ہے اور اشتران عرب غالب
آگئے ہیں' اس خواب کے تیسرے روز دفعتاً چودہ کنگرے
فراز قصر سے گر گئے اور طاق کسریٰ درمیان سے شگافتہ ہوگیا'
چنانچہ وہ شگاف ابھی تک موجود ہے'

۲۷ اگست ۵۷۱ء کو یعنے ہجرت سے باون برس پہلے مداین
میں یہ حادثہ گذرا اور اسی روز حضرت ختمی مرتبت کی ولادت
باسعادت مکہ معظمہ میں واقع ہوئی' اسی روز بحیرۂ ساوا کاشان
میں خشک ہوگیا' اور آتشکدۂ فارس جو ہزار سال سے روشن تھا
دفعتاً سرد ہوگیا' کاہنوں اور منجموں نے ان عجائبات اور
خواب نوشیروان کے متعلق یہ تعبیر دی کہ نوشیروان کے بعد چودہ
کنگروں کی مناسبت سے چودہ بادشاہ مداین میں سلطنت
کرینگے' اسکے بعد عرب عجموں پر غالب آجائینگے اور سلطنت
اکاسرہ ختم ہوجائیگی۔

طبقۂ آخر کا دوسرا نامور تاجدار خسرو پرویز تھا' اسکی سلطنت
کے اڑتیسویں سال حضرت رسالتمآب کو مکہ سے ہجرت فرماکر صرف
چھ برس ہوئے تھے' اور اسی سال حضرت نے اطراف وجوانب
کے بادشاہوں کے پاس بتقریب دعوت اسلام ایلچی روانہ فرمائے
تھے' چنانچہ خسرو پرویز شاہنشاہ عجم کے نام جو نامہ حضرت نے
روانہ فرمایا تھا' وہ یہاں پر لفظاً بلفظ بلحاظ مناسبت مقام
نقل کیا جاتا ہے' حضرت کے نامہ بر عبداللہ بن حذافہ
سہمی ایک قدیم صحابی اور مہاجرین اولین
سے تھے'۔

---

۱ مسعودی ۔ ۲ خاقان سوسندی
۳ مہاراجہ پرتاب چند ۔ ۴ ایمپراطور ستایانس
۵ سلطان قومی خان ۔ ۶ مجتہد العصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللہ الی
کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ
وامن باللہ ورسولہ وشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ
لا شریک لہ وان محمداً عبدہ ورسولہ وادعوک بدعایۃ
اللہ عز وجل فانی انا رسول اللہ الی الناس
کافۃً لانذر من کان حیاً ویحق القول علی الکافرین
اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔

ترجمہ

"یہ نامہ محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ بزرگ فارس کے
نام ہے' سلام ہو اس پر جسنے ہدایت کا اتباع کیا اور خدا و رسول پر
ایمان لایا' اور گواہی دی کہ معبود خدا کے سوائے نہیں' وہ یکتا ہے
بے ہمتا ہے' اور محمد اس کا بندہ اور رسول ہے' میں تجھکو بلاتا ہوں
بدعوت خدا (اسلام کیطرف) تحقیق کہ میں خدا کا رسول ہوں
کل آدمیوں کی طرف تاکہ اون کو ڈراوں اور خوف دلاؤں
جو زندہ ہیں' اور کفار پر الزام وحجت قائم کروں' اسلام لا'
تاکہ تو سلامت رہے' اور اگر انکار و سرکشی کریگا' تو بیشک
تمام مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر رہے گا"

خسرو اس نامے کو پڑہکر بہت غضبناک ہوا' نامہ کے آگے
اس نامہ کو چاک کر دیا' اور کچھ جواب نہ دیا۔ جب حضرت کو
خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا مزق کتابی مزق اللہ ملکہٗ
یعنے اُس نے میرے نامہ کو پارہ کیا خدا اُسکے ملک کو پارہ پارہ
کرے' چنانچہ خلفاء کے ہاتھوں حضرت کی یہ پیشین گوئی پوری
ہوئی۔

خسرو پرویز کے زمانہ میں مملکت ایران کی مادی ترقی بحد کمال
پہنچ چکی تہی' اسکے پاس زر و جواہر اور خزانے بکثرت تھے'
ازانجملہ چند تاریخی خزانوں کے نام یہاں پر درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) گنج بادآورد۔ نقاس شاہنشاہ قسطنطنیہ نے خسرو
کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر اپنا کل زر و جواہر جو مملکت ایران کے
دس سال کے محاصل کے برابر بیان کیا جاتا ہے' کشتیوں پر
بارکرا کر ملک اتیا لیا کو اس ارادہ سے روانہ کیا تہا کہ ہزیمت
ہونے کی صورت میں خود بہی اتیا لیا کو بہاگ جائیگا' ناگاہ باد مخالف
چلی اور جسطرف سے خسرو کی فوج بعزم تسخیر قسطنطنیہ آرہی تھی
تمام زر و مال کی کشتیاں اوس جانب کو چلی گئیں۔ فرخان سپہ سالار
خسرو نے تمام کشتیوں کو ضبط کرکے کل دولت خسرو کے پاس
مداین میں بھجوادی' خسرو نے اُسکو اپنے خزانۂ عامرہ میں داخل
کرکے اسکا نام گنج باد آورد رکہا۔

(۲) گنج عروس۔
(۳) گنج دیبۂ خسروی
} ان خزانوں کو خود خسرو نے جمع کیا تھا'

(۴) گنج افراسیاب۔ یہ افراسیاب کا جمع کیا ہوا خزانہ خسرو
کے ہاتھ لگا تھا۔

(۵) گنج خضراء۔ یہ خزانہ اہل عرب کے زر و مال سے جمع کیا گیا تھا

(۶) گنج شادآورد۔ اسکو ذو القرنین نے جمع کیا تہا شادمانی
ایک دہقان کی رہنمائی سے خسرو کے ہاتہ آیا تھا۔

(۷) بساط رنگارنگ' خسرو پرویز کے پاس سو گز لانبا ایک
فرش ریشمیں تھا' جسپر جواہرات گراں بہا جڑے ہوئے تھے' اُسکو
دیکھکر گمان ہوتا تہا کہ ایک سبزہ زار ہے جسپر گل و ریاحین
کھلے ہوئے ہیں' دن کے وقت جب آفتاب کی روشنی اس پر
منعکس ہوتی تہی' تو اس فرش سے انواع و اقسام کے رنگ نکلا
کرتے تھے' فتح مداین کے بعد یہ بساط غنیمت میں مسلمانوں
کے ہاتھ آئی تھی اور جسوقت یہ بساط نادر مدینہ میں پہنچی تو

ٹکڑے ٹکڑے کرکے مسلمانوں پر تقسیم کردیگئی۔

(۸) شطرنج ۔ خسرو کے پاس ایک نادر شطرنج تھی جسکے مہرے نصف یاقوت سرخ کے اور نصف یاقوت کبود کے تھے'

(۹) شبدیز ایک گھوڑا ارض روم میں خسرو کے ہاتھ آیا تھا جسکا نام شبدیز تھا' اسکا قد غیر معمولی طور پر دراز تھا اور اپنے وقت کے حسین اور نادر الوجود گھوڑوں میں شمار کیا جاتا تھا' کرمان شاہ کے قریب' طاق بستان میں پتھر پر اسی شبدیز کے سارے قد کی تصویر فرہاد کوہکن کی بنائی ہوئی ابھی تک موجود ہے' اور اس میں تصویر شبدیز پر خسرو سوار ہے' باوجود امتداد ایام منوز شبدیز کے مجسمہ کا صرف ایک حصہ خراب ہوا ہے۔

خسرو پرویز بلحاظ گنج وذخائر وسامان سلطنت بہت خوش نصیب بادشاہ گذرا ہے' اسکی خوش بختی میں اس حیثیت سے اور چار چاند لگ گئے تھے' کہ شیریں کا سا نگار دلربا اسکے ہاتھ آیا تھا' شیریں اصل میں رومی نژاد تھی' اور اسکے حسن دلبری کے افسانے مشرق میں کافی شہرت رکھتے ہیں' فرہاد کوہکن جو برگزیدہ نقاشان چین سے تھا' شیریں کا عاشق وشیفتہ ہوگیا تھا' اور اسکی یادگار میں کوہ بے ستوں پر طاق بستان اسکے تیشہ کی صنعت کاری کا نمونہ ہے' اور اس طاق میں اسکی بنائی ہوئی شیریں کی تصویر اسوقت تک موجود ہے۔

بعض مورخ کوہ بے ستون کی ساری سنگتراشی کو فرہاد کیطرف منسوب کرتے ہیں' یہ درست نہیں ہے' بلکہ فرہاد سے پہلے زمانہ کی داریوش فارسی کی تصویر وہاں موجود ہے جس میں داریوش کے پیچھے دس تصاویر یکے بعد دیگرے اور بھی ترشی ہوئی ہیں اور ان تصاویر کے نیچے بخط قدیم کچھ عبارت کندہ ہے۔ یہ دس تصویریں اُن بادشاہوں اور طوائف ملوک کی ہیں' جو بابل موصل' جزایر خالدات' بلاد ساحل فرات' اور ارض بیت المقدس پر فرمانگذار رہے ہیں' اور خط قدیم میں داریوش کا قصہ اسطرح لکھا ہے کہ "داریوش نے فتح بابل اور نابذان بخت نصر کی بیخ کنی کے بعد ان دس سلاطین پر تسلط حاصل کیا' اور داریوش نے حسب فرمان لہراسپ شاہنشاہ ایران ان کے ملکوں کو فتح کرکے اپنے فتوحات کے قصہ کو کوہ بے ستون میں اسلئے ثبت کرایا کہ زمانہائے دراز تک یادگار رہے" ان دس مفتوحین کے نام بھی پڑھ لئے گئے ہیں مگر یہ سب نام بالکل غیر مانوس ہیں اسلئے اس مقام پر ان کا اعادہ بے ضرورت سمجھا گیا۔

سنہ ہجری

الغرض اڑتیس سال تک مداین پر حکومت کرکے ۱۰ جمادی الآخر شب سہ شنبہ کو خسرو پرویز قتل ہوا' اور اسی دخمہ میں رکھا گیا جسمیں ہرمز و نوشیروان دفن تھے' اسکے بعد شیریں نے بھی زہر کھاکر اپنا کام تمام کرلیا' خسرو کے بعد ساسانی سلطنت پر زوال شروع ہوگیا اور تاج کیخسروی مردوں سے عورتوں اور بچوں پر منتقل ہوگیا'

اس سلسلہ کا آخری تاجدار یزدجرد ثالث بن شہریار تھا' مذہب اسلام نے اوسوقت تک کافی ترقی کرلی تھی' بدر واحد کے عظیم الشان معرکوں میں کامیابی حاصل کرکے نبرد آزمائیوں کا حوصلہ ان میں پیدا ہوگیا تھا' شام واسکندریہ کی فتوحات نے ملک گیری کی امنگیں ان میں پیدا کردی تہیں' اسلام کی صداقتوں کو پھیلانا اور ساری دنیا کو خدائے واحد کی پرستش کا سبق دینا انہوں نے اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا' اسی اصول کی بناء پر یزدجرد کے پاس بھی ایک وفد بغرض دعوت اسلام روانہ کیا گیا' مگر اس وفد کے اعضاء

غیر معمولی جوش والے اور آداب سلاطین سے بے بہرہ تھے' اسی لئے
اس وفد کا انجام یہ ہوا کہ مسلمانوں اور ساسانیوں کے درمیان
۶۳۵ء میں میدان قادسیہ پر جنگ ہوئی جس میں کامیابی مسلمانوں کو
نصیب ہوئی' اور کوشک قادسیہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا'
اسی طرح چھ روز تک مسلسل خونریز مقابلے ہوتے رہے یہاں تک
کہ لشکر عجم میدان جنگ سے فرار کرکے مداین میں پناہ گزین ہوا
مگر مسلمانوں نے اون کا تعاقب کیا اور بغیر جنگ و جدال کے
مداین ساسانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا' یزدجرد مع عیال و
اموال محل چھوڑ کر صحرا میں چلا گیا' اور فتحیاب لشکر اسلام
کوشک یزدجرد میں داخل ہو گیا' غنیمت میں کافور سفید کا اتنا
بڑا ذخیرہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا کہ عرب نمک کے بدلے میں ہموزن
کافور دیتے تھے' علاوہ اسکے تاج کیخسروی' تخت طاقدیس'
بساط رنگا رنگ نرد ہائے شطرنج اور بہت سی اشیائے نفیسہ
عربوں کو ملے' ایک زرہ موتیوں سے مرصع غنیمت میں ملی تھی
جس کے ہر دانہ مروارید کا وزن دو دینار اور زرہ کے قبوں
پر یاقوت سرخ و زبرجد کے پھول بنے تھے اور شاخ و برگ لعل و زمرد
کے تھے' اسکے سوائے کسریٰ کے خاص ہتھیاروں کا ایک
صندوق بھی غنیمت میں ملا تھا' اور درفش کاویانی جس کو
اہل عجم اپنی فتح و فیروزی کا طلسم خیال کرتے تھے' بہادران
اسلام کے قبضہ میں آگیا تھا' ایرانیوں کا یہ قومی پھریرہ
نہایت خوشنما اور مرصع بجواہر تھا جو عہد فریدون سے زوال
مداین تک دولت عجم کا نشان امتیاز رہا تھا۔

غرض مداین پر مسلمانوں کا پورا قبضہ ہو گیا' اور یزدجرد نے
جلولا اور حلوان میں جاکر پناہ لی مگر وہاں بھی معرکہ آرائی
ہوتی رہی حتے کہ لشکر عجم نے آتش مقدس کی قسم کھائی کہ اب
لشکر عرب سے منہ نہ پھیر سکیں گے' اسکے بعد میدان نہاوند پر
۶۴۱ء میں لشکر فارس و عرب کے مابین ایک آخری مگر معرکہ
خیز جنگ ہوئی جسمیں چالیس ہزار مسلمانوں نے زیر سالاری سعد
بن ابی وقاص پانچ لاکھ فارسیوں پر فتح عظیم حاصل کی اور
عرب مورخین اسکو فتح الفتوح کے نام سے یاد کرتے ہیں'۔

اس جنگ کے بعد چار ہزار برس کی قدیم کیانی سلطنت
کا چراغ بالکل گل ہو گیا' بقیۃ السیف اہل مداین نے اسلام
کے دامن میں پناہ لی کچھ لوگ ہندوستان کیطرف چلے گئے
اور اکثر ایران میں منتشر ہو گئے' یزدجرد عراق عرب سے مایوس
ہو کر عراق عجم میں چلا گیا' اور دس سال تک اپنی منتشر قوم کی
شیرازہ بندی کی سعی لاحاصل میں مصروف رہا یہاں تک کہ
اُسیکے ایک عامل نے کمر زریں کی طمع میں بمقام مرو ۶۵۱ء
میں اُسکا کام تمام کر دیا اور یزدجرد کے خاتمہ کے ساتھ پارسیوں
کی سلطنت دنیا سے منقرض ہو گئی۔

۵۰۰ سنہ (قبل مسیح) میں کیانی حکومت ایران میں قایم
ہوئی' اور اسیکے ساتھ اصلی اور حقیقی ایرانی سلطنت کا دور
شروع ہوا' اس نامور حکومت کا چراغ اسکندر اعظم کے ہاتھوں
۳۳۰ سنہ (ق م) میں گل ہوا' ۳۳۰ سنہ (ق م) سے ۲۲۶ء تک
ایران میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا مگر ۲۲۶ء میں
ساسانی حکومت کی بنیاد پڑی' چار سو پچاسی (۴۸۵) سال تک انہوں نے
ایران پر حکومت کی اس سلسلہ میں ۳۲ تاجدار گذرے اور
سلطنت زمانۂ اسلام تک قایم رہی' عربوں نے عراق عرب کو
۶۴۱ء میں فتح کر لیا اور عراق عجم کو بھی ۶۵۲ء میں کامل طور
پر فتح کرکے ساسانی سلطنت کا چراغ گل کر دیا' اور اسی زمانہ
سے ایران میں اسلامی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

" کے متعلق تھا کہ مداین پہونچکر وہاں کے قدیم طرز تعمیر کا معائنہ کرنا میسر ہوگا، مگر یہاں پہنچکر سوائے ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے کچھ بھی نہ ملا، البتہ عہد ساسانیہ کی تاریخ جو یہاں کے چپہ چپہ پر لکھی ہوئی ہے، اُسکے مطالعہ میں چشم عبرت سے گھنٹوں مصروفیت رہی اور کوئی شک نہیں کہ دجلہ و ایوان کسریٰ تاج کیخسروی اور دخمۂ نوشیروانی کی جستجو میں طبیعت نے وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ دل نے دنوں اس تلاش کی لذت اٹھائی، جلی ہوئی اینٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا، چونہ کی ذراسی خاک، منہدمہ عمارتوں کے تودوں اور طاق کسریٰ کے شگاف کی زبانی ان کانوں نے وہ وہ داستانیں سنیں کہ مداین کی سیکڑوں تاریخوں کی ورق گردانی دل میں وہ تاثیر پیدا نہ کرسکتی۔

فتح مداین کے بعد حضرت سلمان فارسی حسب الحکم حضرت عمرؓ یہاں کے پہلے عامل مقرر کئے گئے تھے، یہ بزرگوار رسول مقبول کے نہایت معتمد صحابی تھے، اور انکی نسبت ارشاد پیغمبری ہوا تھا سلمان منی اهل البیت جنگ احزاب و خندق میں خندق انہیں کی تدبیر سے کھودی گئی تھی، آپ پہلے مجوسی تھے، اسکے بعد نصرانی ہوئے مگر دین حق کی تلاش میں اسفار دور و دراز کرنیکے بعد بالآخر مدینہ منورہ میں آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر شرف اسلام حاصل کیا تھا، انہوں نے نہایت خوش انتظامی، کمال دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ اپنی حکومت کا زمانہ ختم کیا، باوجود قدرت و اختیار کے کھجور کی زنبیلیں اور پنکھے بنکر یہ اپنی گذر اوقات کیا کرتے تھے، اور زہد و تقوی میں اپنے معاصرین پر فائق تھے، اہل سیر کو انکی عمر میں اختلاف ہے، بعض ۳۶۰ اور اکثر ۲۵۰ لکھتے ہیں، غرض ۳۳ھ میں مداین ہی میں انکا انتقال ہوا اور

سلطنتوں کا عروج و زوال ایزد متعال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، وہ تاجدار جنکے آثار کی سیر میں آج ہم مصروف ہیں ابھی کل کی بات ہے کہ تخت طاقدیس پر متمکن اور تاج کیخسروی زیب سر کئے ہوئے تھے سارا ایران اُن کے زیر نگین تھا، مگر آج انکی خاک خاک میں ملگئی، اور اپنا ملک اپنے جانشینوں کے لئے نہایت بے بسی کیساتھ خالی کرگئے ایوان کسریٰ اور بیشمار سر بفلک عمارتیں جو مداین کی سرمایہ ناز تھیں، خاک کے تودے ہوکر منوں مٹی کے نیچے دبی پڑی ہیں، اور جن تاجداروں نے نہایت وقار و جبروت کے ساتھ حکومت کی تھی، ان میں سے بعض کے ناموں اور کارناموں کی بھولی ہوئی یاد کے سوائے اب کچھ باقی نہیں اور ایرانی تمدن کے قصر فلک فر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے ؎

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ عدل
گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند

نوشیرواں کی ہڈیاں گلکر خاک ہوگئیں، اُسکے عہد کی عمارتیں بنکر بگڑگئیں مگر اُسکے کارنامے جریدۂ عالم پر ثبت ہیں اور کسیطرح محو نہیں ہوتے، اُسکی یاد ہم کو مداین کے آثار قدیمہ کی سیر کے لئے کھینچ لائی ہے، شیراز کا زندۂ جاوید شاعر صنادید عجم کے کارناموں کی رطب اللسانی میں غیر معمولی احسان کرگیا ہے، جس وجہ سے ہمارے گھر فریدوں اور نوشیرواں کے ناموں سے اسقدر آشنا ہیں، اور ایسی عمر سے جبکہ نوشیرواں کا نام ہمارے لئے ویسا ہی بے معنی ہوتا ہے، جیسا کہ ہارون الرشید کا، ان ناموں کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزین ہوجاتی اسیطرح کا ایک دیرینہ اشتیاق ہم کو نوشیرواں کے آثار باقیہ

طاق کسریٰ سے ایک میل کے فاصلہ پر انکا مزار واقع ہے، ایک عرب انکے گنبد کا مجاور ہے، ایک بقال اور دس پانچ گھر عرب دیہاتیوں کے ان کے گنبد کے اطراف آباد ہیں، اسی مناسبت کیوجہ سے اس مقام کو سلمان پاک کہتے ہیں، یہ مقام بغداد سے پچیس کیلومیٹر جنوب مشرق کو ساحل دجلہ پر واقع ہے، علاوہ حضرت سلمان کے حذیفۃ الیمانی اور عبد اللہ انصاری پدر بزرگوار جابر رحمہم اللہ مدفون ہیں، ۷۶۲ء میں جب بغداد کی بنیاد رکھی جارہی تھی، مداین کے قصور شاہی بہت خراب حالت میں تھے، البتہ شہر کسیقدر آباد تہا، عباسی دور میں عربی تمدن نے یہانپر اپنا پورا اثر کیا، چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں مداین ایک خوبصورت اور گنجان آبادی کا شہر تہا، اسمیں ایک عالیشان مسجد جامع موجود تہی، اور شہر کے بازار جلی ہوئی اینٹ کے بنے ہوئے اور خوب بارونق تھے، یہاں پر علم کا اچہا چرچا ہوگیا تہا اور مداین کے شعرا و اہل علم کی دور دور تک شہرت ہورہی تہی۔

عباسیوں کے زوال اور بغداد کی تباہی کے بعد مداین بہی سیاحوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا اور آٹھویں صدی ہجری میں جبکہ متوکل کی اولاد بغداد سے بھاگ کر مصر میں حکومت کر رہی تہی، مداین بالکل ویران ہوچکا تھا، صرف مغربی ساحل دجلہ پر چند دیہات کسیقدر آباد تھے، اس کے بعد سے اسکی ویرانی ترقی پکڑتی گئی اور وہ مداین جو پانچسو سال تک شاہان فارس کا پائے تخت رہ چکا ہے، اور جس کے قدیم تمدن، اور عظمت و شان کے افسانے اکثر مورخوں نے بیان کئے ہیں، تمام گذشتہ خصوصیات کو اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے اسوقت ایک چھوٹے سے چھوٹے قریہ سے بہی بدتر ہے، ان مزاروں کی زیارت کی خاطر کبہی کبہی مسلمان زائرین اسطرف آنکلتے ہیں اور حضرت سلمان کے مزار کے اطراف کی آبادی موجودہ شہر مداین کی ساری کائنات ہے، آجکل یہ مقام بجائے مدائن کے سلمان پاک کے نام سے شہرت رکہتا ہے، اور ڈویژن حلہ میں داخل ہے، گورنمنٹ کی طرف سے ایک مدیر اور ایک کاتب سلمان پاک پر متعین ہے، چنانچہ آجکل سلیمان جمیل افندی مدیر اور محمود ندیم افندی کاتب ہیں، مگر یہ لوگ یہاں پر قیام پذیر نہیں ہیں، مداین جدید کی حیثیت کا اس امر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قہوہ خانہ اور کاروان سرا جو عرب میں ہر چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں بھی پایا جاتا ہے، یہاں پر نہیں ہے، نینوا بابل اور اسور کے کھنڈروں کی طرح یوروپین سیاحوں نے مداین کے مسمار شدہ آثار و نشانات کی تحقیقات پر ابہی تک توجہ نہیں کی ہے میرا خیال ہے کہ ایک ایسی سلطنت جسکا تمدن ایشیا میں چار ہزار سال تک قایم رہا، جو وارث تاج کیومرث و افراسیاب تہے اور جسمیں بہمن و بہرام نوشیروان و خسرو پرویز ایسے نامآور تاجدار گذر گئے ہیں، اور جس سلطنت کی دولت و ثروت کا اندازہ اس تفصیل سے ہوسکتا ہے، جو جنگ قادسیہ و نہاوند کے ضمن میں بیان کیگئی ہے، ان کھنڈروں کے کھودنے کے بعد حیرت خیز انکشافات کی امید لگائی جاسکتی ہے اور بالکل ممکن ہے کہ وہ دخمے جنہیں نوشیروان اور اکثر ساسانی تاجداروں کی ہڈیاں دفن ہیں، برآمد ہوں، جو شاید دنیا کو محو استعجاب کردیں، اور بیشمار نوشیروان پرست اس از یاد رفتہ سرزمین کی زیارت کو آنے لگیں۔

مداین کی سیر کا ثمرہ مجہے ایسا ملا ہے کہ شاید اس سے

بڑھکر ایک عالی حوصلہ شخص بھی امید نہیں لگا سکتا تھا' گنبد سلمان کے قریب چادر[1] کے نیچے ایک خاندان رہتا تھا' جکی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت تھا' اسمیں ایک دس برس کے بچے کے گلے میں چند نقلی منکوں کے ساتھ ہندوستان کی چوّنی کے برابر ایک سکہ بھی پرویا ہوا تھا' جو کہنگی کے باعث بالکل سیاہ ہو رہا تھا' اسکا جب میں نے بغور امتحان کیا تو اردشیر بابک کے اُس سکہ کے مشابہ معلوم ہوا جکی تصویر[2] اس سے پہلے میری نظر سے گذر چکی تھی' یہاں کے دیہاتی عرب تانبے یا چاندی کے سکّوں یہ جو اُنکو ادہر اُدہر پڑے ہوئے دستیاب ہو جاتے ہیں' سوراخ کر کے اپنے بچوں کے گلے میں ڈال دیتے ہیں' بالکل اسیطرح جیسے کہ شیر کے ناخن یا کلمہ کا روپیہ آسیب وغیرہ سے حفاظت کیلئے ہندوستانی بچوں کے گلوں میں ڈالنے کا رواج ہے' مجھے اس قدیم سکہ کا رائج الوقت سکہ سے تبادلہ کرنے پر اس عرب کو راضی کرنے میں کسیقدر دقت ہوئی' غرض ایک دو قرانی جس پر مظفر الدین شاہ کی نہایت عمدہ تصویر بنی ہوئی تھی دیکر میں نے یہ "انتیک[3]" سکہ حاصل کر لیا' دوسرے روز کاظمیہ واپس ہو کر میں نے اسکو صاف کیا تو وہ نقرئی ثابت ہوا' اس سکہ کی ایک دورخی تصویر نمبر (۴) اس مقام پر دیجاتی ہے ' (۱) داہنے ہاتھ پہ کمان رکھی ہوئی ہے' (۲) اسطرف صرف صورت نظر آتی ہے اور اطراف کی عبارت بوجہ امتداد زمانہ محو ہو گئی ہے' سر کے بال اُس گھونگھر والی ٹوپی کے مشابہ ہیں جو ہندوستان کے جج استعمال کیا کرتے ہیں' یہ سکہ فل سکیپ ورق کیطرح پتلا ہے' باوجود اسکے دونوں رخوں پر تصویر خوب منبت ہے' یہ سکہ مداین کے کھنڈروں کے زیر و زبر کرنیکی زیادہ تائید کرتا ہے' اور ایک سرگرم محقق کے لئے یہ میدان غیر معمولی وسعت و گنجایش رکھتا ہے' علاوہ پرانے قصور و عمارات کے ذخیرے آتشکدے' سکے' کتبے وغیرہ برآمد ہونیکی بہت کچھ امید لگائی جا سکتی ہے' اور ان خزانوں کے سراغ کی بھی توقع ہوتی ہے جن کے مداین کی بربادی کے ساتھ اُس میں دفن ہونے کا تاریخ پتہ دے رہی ہے فقط

سید علی اصغر بلگرامی

رائے کی تبدیلی ۔ لوگ کہتے ہیں اپنے رائے کو تبدیل کرنا بے عزتی ہے' مگر میں اسکو زندگی سمجھتا ہوں' اگر تم زندہ ہو تو تم کو ضرور تبدیلی اختیار کرنا پڑیگی ۔ صرف مُردے کی رائے نہیں بدلتی' انسان کو جہاں سچائی نظر آئے اُسکو فوراً قبول کرلے' سچائی کے برخلاف ضد کرنا حمق ہے' کسی نتیجہ یا کسی پارٹی کی نسبت رائے کی تبدیلی کو لوگ مضحکہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں' مگر میں اُسکی عزت کرتا ہوں' میں نے خود ہی اپنی رائے بیسیوں معاملوں کی نسبت تبدیل کی ہے'۔

گلیڈ اسٹون

---

[1] خانہ بدوش خاندان عرب کمبل کے ڈیروں کے نیچے عمریں بسر کیا کرتے ہیں' اوسکو محاورہ میں چادر کہتے ہیں ۱۲

[2] Numismatic chronicle 1872 vol XII. Plate III.

[3] قدیم Antique.

پیکروفا

خورشید مرزا نے جب بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تو بیرسٹری کا خبط دماغ کو پریشان کرنے لگا، شہرت، آزادی، عزت اور ناموری کا راز صرف بیرسٹری میں مخفی تھا۔

مغرب کی میٹھی چھری اسکے دل پر اپنا وار کر چکی تھی، فیشن اور تہذیب کی پرستش کو وہ جراحت دل کا مرہم سمجھتا تھا، خورشید کو بجز اُسکے اور کسی بات کا افسوس نہیں تھا، کہ بڑے میاں (والد) نے مرتے دم اپنی بھتیجی مہر النسا کو ان کے گلے باندھ دیا تھا، خود تو دنیا سے چل بسے، مگر جہاں اور باتوں میں بیٹے کی آسایش کا خیال رکھا، وہاں شادی کے معاملے میں فاش غلطی کی، خورشید شادی کی سزا بھگتنے کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن چون و چرا کرتا تو لاکھوں کی دولت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

شادی کے بعد ایک ہفتہ جوں توں گذرا ہوگا کہ تعلیم کے بہانے سے گھر کو خیرباد کہا، اس قلیل عرصہ میں مہر النسا کی صورت سے بیزار ہو گیا تھا، وہ شریف زادی، پردے میں رہنے والی، سیدھی سادھی بھلا کیا جانتی تھی، کہ خورشید کے تخیلات کی پرواز کہاں تک ہے، کالج میں خورشید کو جب اپنے والد کے مرنے کی خبر ملی تب بھی گھر کا رُخ نہیں کیا۔

نواب مرزا (مہر النسا کے والد) نے کئی مرتبہ لکھا کہ تمہارے والد مر چکے ہیں، ایک بار ہو جاؤ، مگر خطوط کے جواب میں صرف کارڈ پیغام پہنچاتے تھے، کہ چھٹی نہیں ملسکتی۔

خدا خدا کرکے بی۔ اے کا نتیجہ نکلا، شکر ہے کہ محنت بیکار نہیں گئی اب کالج میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی، انگلینڈ کی کشش تھی، جو روپئے کی فکر میں خورشید گھر آیا، لیکن کتنے دنوں بعد شاید پورے تین سال ہو چکے تھے، نواب مرزا سے ملکر یہی کہا کہ میں اسی ہفتہ میں یورپ جانے والا ہوں۔

یہ سنکر نواب مرزا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، غور کرنے لگے کہ صاحبزادے اب تک کالج میں رہے، اور اب یورپ جاتے ہیں، مرحوم بھائی نے لاکھوں واسطے دلا کر میری بچی کو کہیں کا نہ رکھا، نواب مرزا نے کہا کہ میاں صاحبزادے تم کالے کوسوں سمندر پار جاتے ہو، خدا تمھارا حافظ نگہبان ہے، لیکن اپنی چچی سے تو مل لو، کیا قباحت ہے، خورشید نے ٹالنے کیلئے کہا کہ وقت کم ہے، اور کام بہت ہیں تاہم کوشش کرتا ہوں، دعا کیجئے کہ میں کامیابی کیساتھ واپس آجاؤں، نواب مرزا وضع دار آدمی تھے، پیشانی پر بل نہ آنے دیا کہا خدا تم کو کامیاب و بامراد لائے۔

(۲)

مہر النسا ایک خوبصورت لکھی پڑھی لڑکی تھی، اسکی تعلیم مغربی طرز پر نہیں ہوئی تھی، مگر خانہ داری کی تعلیم اسکے ماں باپ نے دلوائی تھی، البتہ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ شاعری کیا چیز ہے، مضامین لکھنے کے کیا کیا طریقے ہیں، اخبارات و رسایل کا دیکھنا کس حد تک درست ہو سکتا ہے، لکچر بازی کا کچھ بھی تجربہ نہ تھا، خدا بخشے مولوی نذیر احمد مرحوم نے اپنی چند تصنیف

نواب مرزا کو تحفتاً بھیجی تھیں، وہی کتابیں مہرالنسا کے مطالعہ میں اکثر رہتی تھیں، روزہ نماز کی پابندی، شوہر پرستی، والدین کی اطاعت اسکی زندگی کا مقصد تھا، خورشید نے لاکھ بے رُخی کی، کبھی سیدھے منہ بات تک کرنے کا روادار نہیں تھا، مگر اس کا پاک اور معصوم دل شوہر پر ہر وقت قربان ہونیکو تیار تھا، وہ اپنی آنکھیں ہر وقت شوہر کے قدموں تلے بچھانے کے لئے آمادہ تھی، نواب مرزا کا سایہ ہوتے ہوئے اسکو کبھی بات کی کمی نہیں تھی، خورشید مفلس ہوتا اور مہرالنسا کو بھوکا بھی رکھتا تو وہ نہایت خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار تھی، اُف تک نہ کرتی، یہ فخر ہندوستان ہی کو حاصل ہے اس زمین میں ایسی ایسی مقدس دیویاں پیدا ہوئیں، جنکی نظیر اب تک کوئی اور ملک پیش نہ کر سکا۔

خورشید کو اپنی بیوی کا حسن پسند نہیں تھا، اپنے نقطۂ خیال سے مہرالنسا کی ہستی کو عذاب جان سمجھا ہوا تھا، وہ خدا سے چاہتا تھا کہ یہ بلا کسی طرح ٹل جائے، کیا اچھا ہو اگر یہ مر جائے،

مہرالنسا کی خلش نے خورشید کی زندگی کرکری کر رکھی تھی خورشید ظاہر پرست، خوشامد پسند اور متلون المزاج تھا، خورشید وہ آنکھیں چاہتا تھا، جن میں دلکشی ہو، اسکی بیچین نگاہیں مغربی حسن اور ناز و انداز کو ڈھونڈھتی تھیں، پُرمسرت زندگی شاعرانہ زندگی کے تصور میں وہ گھنٹوں محو رہتا تھا، اور کہتا "آہ وہ عورتیں"

غریب ہندوستان کی معصوم عورتوں کا مقابلہ یورپ کے طرار، شوخ، دلفریب جنس لطیف سے کہاں ہو سکتا ہے، ان سب پر وہ "اعلیٰ تعلیم" کا تاج یہاں کہاں !!

کبھی کبھی خورشید کے دماغ میں گردش کرنیوالا خون رک جاتا تھا یوروپین تمدن، زن و شوہر کے تعلقات، انکی گرمجوشی، انکا برتاؤ انکی محبت......

بہرحال خورشید نہایت ولولے اور بڑے جوش و ارمان کیساتھ جہاز پر سوار ہو گیا۔

(۳)

سمندر کی ٹھنڈی ہوا، جہاز کی سبک رفتاری، پانی میں خوشنما موجیں، آسمان کا تاروں کیساتھ سمندر کی تہ میں دکھائی دینا، ایسے بیشمار دلکش و نظرفریب مناظر خورشید کو اپنی جانب مائل کر رہے تھے۔

لندن کی اونچی اونچی عمارتیں، خوبصورت، نازک اندام عورتوں کا ہجوم، دریائے ٹیمز کی تفریح، غرض ایسے ہی تخیلات اسکے دماغ میں چکر لگا رہے تھے،

امتحان بیرسٹری سے بڑھکر ایک اور خواہش اسکے دل میں تھی وہ ایک جنس لطیف کی صحبت چاہتا تھا، جس سے بغلگیر ہونیسے اسکی محبت کے سمندر میں جوش کا طوفان پیدا ہو، اسکی رائے میں زندگی کا لطف تب ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ خورشید اپنے ہاتھ میں وہ ہاتھ لینا چاہتا تھا، جسکے چھونے سے محبت کے جذبات میں برقی حرکت پیدا ہو، جس سے پُرمسرت بیخودی اسپر طاری ہو کر اسکے بیقرار دل کے سکون کا باعث ہو۔

جہاز میں بہت سے یوروپین جنٹلمین سوار تھے، شام کیوقت تفریح کے لئے لیڈیوں کو ساتھ لئے تختہ پر آتے تھے، اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا نظارہ شفق کی سُرخی دیکھکر دل بہلایا کرتے تھے، انکی قابل رشک زندگی نے خورشید کو اور دیوانہ بنا دیا، وہ چاہتا تھا کہ جہاز کی رفتار تیز ہو، ہفتہ بھر کا راستہ گھنٹہ بھر میں طے ہو جائے دن تو شور و غل اور ہنگامے میں ختم ہو جاتا تھا، مگر رات، وہ رات

جو خورشید کے حق میں پہاڑ تھی، کاٹے نہیں کٹتی تھی، اضطرابی
کے ساتھ صبح کا انتظار کرتا تھا، اگر تھوڑی دیر کے لئے نیند آگئی
تو پریشان کن خواب اُسکو سونے نہیں دیتے تھے، کبھی کالج لائف
شادی امتحان کی مصروفیت اُسکے آنکھوں کے سامنے پھرتی تھی،
کوئی ناول دل بہلانے کے لئے پڑھنا شروع کیا، جی اُکتا گیا
تہ کرکے رکھدیا، سیمین تنان لندن سے ہم آغوشی کی آتش
شوق بھڑک رہی تھی، کبھی یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ اگر جہاز
کو طوفان سے مقابلہ کرنا پڑے تو انجام کیا ہوگا، حسرت
و ارمان لیکر آبی قبر میں دفن ہونا پڑیگا، یہ مایوس کن خیال
آتے ہی اُسکے خوبصورت خط و خال پر مُردنی چھا جاتی تھی، پھر
یہ بڑبڑا کر خاموش ہوجاتا تھا "مرگِ انبوہ جشنے دارد"

(۴)

عروس البلاد لندن تیرا کیا کہنا، یہ جملہ جوش کیساتھ
خورشید مرزا نے کہا جبکہ وہ شام کی تفریح سے واپس آچکا تھا،
گھر، اور گھر کے ساتھ ہندوستان کو بھول گیا تھا، ڈنر، پارٹی
ناچ، سیر، تفریح، تھیٹر اسکی زندگی کا جزو بنگئے تھے، بیرسٹری
کی تکمیل، وہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔
نظارہ بازی کا دلچسپ مشغلہ، حسن بے حجاب، نئے پریجمال تصویریں
ہر وقت اُسکے پیش نظر رہتی تھیں، ہوٹلوں کا پرتکلف کھانا
سواری کے لئے اعلیٰ درجہ کی موٹر کار، رہنے کے لئے عالیشان
مکان، فیشنبل سوسائٹی کی شرکت، کنواری لڑکیوں کا پیانو
پر نازک انگلیوں سے بجا کر گانا، یہ تمام واقعات ایسے تھے کہ
خورشید جنت میں پہنچ گیا تھا۔
لندن کی زندگی میں قریبًا چار سال ختم ہوئے لیکن خورشید کو
ابھی لندن میں آئے ہوئے پہلا ہی دن تھا، بیرسٹری کیساتھ
ایم۔ اے کی ڈگری بھی ملی مگر وہ جنس لطیف جس کو وہ اپنی
زندگی کا حصہ دار بنانا چاہتا تھا نہ مل سکی۔
یوں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں صورتیں دیکھیں لیکن کوئی صورت
اسکے پسند نہ آئی، اگر آئی بھی تو عارضی جوش کیطرح "محبت"
بہت جلد ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔
آخر تھیٹر میں ایک پریجمال اکٹرس مس روز سے آنکھ لڑی
دل بے قابو ہوگیا۔ پھر کیا تھا کورٹ شپ کیساتھ ہمیشہ کیلئے
محبت کے عہد و پیمان ہوئے۔
مس روز خورشید کی زندگی کی جزو بنگئی، واقعی میں مس روز خوبصورت
تھی، جہاں بن سنور کر نکلی لاکھوں نگاہیں اُٹھ گئیں، ہزاروں
دل تھام کر رہگئے، خورشید کو لوگوں نے مبارکباد کے خطوط بھیجے،
اسی تقریب میں ڈنر ناچ کے جلسے ہوئے، اب خورشید کو
لندن میں زیادہ دن رہنے کی ضرورت نہیں تھی، نواب مرزا
کی دعا بھی قبول ہوچکی تھی، صاحبزادے کامیاب بامراد
شادکام ہندوستان آنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے،
مس روز کے کئی عاشق دیوانے ہو رہے تھے، غرضکہ خورشید
انکی ارمانوں کا خون کرکے، امریکہ، جاپان، ہوتا ہوا ہندوستان
واپس آیا۔

(۵)

جب نواب مرزا کو معلوم ہوا کہ صاحبزادے سند بیرسٹری کیساتھ
محبت کا ڈپلومہ (مس روز) بھی ساتھ لائے ہیں تو بیچارے
کے رہے سہے اوسان خطا ہوگئے، مہرالنسا تیرا حشر کیا ہوگا؟
اس سوال پر بار بار غور کرنے لگے، مگر آدمی تھے سمجھ دار استقلال
کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، خورشید کو لکھ بھیجا کہ اپنی بیوی کو لیجاؤ،
یہ امانت آپکی ہے، اگرچہ میں باپ ہوں، لیکن مہرالنسا کی

شادی ہو جانے کے بعد اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے، میں
چراغِ سحری ہوں، تم مختار ہو۔
جوں ہی یہ خط خورشید نے دیکھا، مارے غصے کے کانپ گیا اور کہا،
بوڑھے کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔
خورشید نے یورپ سے آنے کے بعد شہر سے باہر ایک کوٹھی کرایہ
پر لی تھی، جہاں انگریزوں کی آبادی تھی، خورشید مرزا اپنے
آپ کو ہندوستانی نہیں بلکہ یوروپین سمجھا ہوا تھا۔
نواب مرزا کے خط کو چاک کر کے پھینکدیا، اور آدمی سے کہدیا کہ
تمہارے صاحب سے کہو کہ ہم کچھ نہیں کر سکتا، جو کچھ ہونا تھا،
ہو گیا، یہ گول گول جواب سنکر ایک تو خدمتگار، اس پر ہندوستانی
صاحب کی آنکھیں دیکھکر ڈر گیا، کمپونڈ کے باہر آکر دم لیا، جان
بچی لاکھوں پائے، جواب سنکر نواب مرزا کے ہاتھوں کے طوطے
اڑ گئے، "ایں گل دیگر شگفت"
خانداں کے چشم چراغ، نام لیوا، کیسے بزرگ کے فرزند، ولی کے
پیٹ میں شیطان، مغربی تعلیم نے صاحبزادے کو پاگل بنا دیا،
اچھا بابا، اگر تم کو اپنی بیوی کی لاج نہیں، اور خدا اور رسول کے
حکم کا کچھ خوف نہیں تو جانے دو، کسی کی قسمت کو میں بدل نہیں
سکتا ہوں، صبر، خدا ہمارا نگہبان ہے،
نواب مرزا کے دوست، حیدر علی پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے،
ایک زمانہ کی ملاقات، بے تکلفی، دونوں میں بے حد تھی، وہ ان
تمام واقعات کو اچھی طرح جانتے تھے، انہوں نے کہا کہ نواب
آپ مہرالنسا کو میرے ساتھ کر دیکھیں، خورشید کو کیسا چکمہ دیتا
ہوں، بہت دیر تک دونوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں آخر
یہ طے فرمایا کہ دوسرے روز صبح مہرالنسا مردانہ بھیس میں
حیدر علی کیساتھ خورشید مرزا کے پاس پہنچا دی جائیگی۔
نواب مرزا گھبرا کر بیٹی سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے آخر
وہ بھی راضی ہو گئی۔
نواب مرزا نے تمام رات تارے گن گن کر کاٹی، صبح نماز سے
فارغ نہیں ہوئے تھے، کہ حیدر علی آئے اور اپنے ساتھ مہرالنسا
کو بھی لے گئے۔

صبح کے وقت مسٹر خورشید مرزا ایم، اے بیرسٹرایٹ لا مس روز
کے ساتھ اپنے خانہ باغ میں محو خرام تھے، مس روز بالکل سادہ
لباس میں تھی، خورشید نے حیدر علی کا کارڈ دیکھکر ڈرائینگ روم میں
بٹھانے کے لئے اشارہ کیا، اور ویلکم ویلکم (خوش آمدید) کہتا
ہوا دوڑا، خورشید نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان وضع
قطع فقیرانہ، خط و خال بالکل زنانہ، حیدر علی کے ساتھ ہے
وہ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن تہذیب مانع تھی۔
خورشید نے مس روز کو حیدر علی سے انٹرڈیوس کرایا، حیدر علی
نے بھی مبارکباد دی، لیکن دبی زبان سے کہا، کہ بیچاری
مہرالنسا کا حشر کیا ہوا ہوگا، اس پر خورشید نے زہرخندہ مسکراہٹ
سے کہا کہ وہ ہمارے بزرگوں کی غلطی تھی۔ اب گفتگو کا رخ
بدلنے لگا، حیدر علی نے بہت سے واقعات بیان کئے
آخر میں کہا کہ میں ایک خاص ضرورت سے آپ کے پاس
حاضر ہوا ہوں۔
خورشید۔ فرمائیے تکلف نہ کیجئے، آپ بھی میرے محسن اور عنایت فرما
ہیں، میں بحیثیت انسان ہونے کے آپ کے ساتھ ہمدردی
رکھتا ہوں،
حیدر علی۔ مہرالنسا کی طرف اشارہ کر کے، آپ انکو نہیں جانتے
یہ میرے مرشد کے صاحبزادے نظام شاہ ہیں، کچھ دن تنہائی

کی زندگی بسر کرنے کے لئے میرے پاس آئے ہوئے تھے' لیکن میرے مکان میں کوئی موزوں جگہ انکے لئے نہیں ہے' بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کو تکلیف دوں کہ اس کوٹھی کے کسی کمرے میں (جہاں بالکل شور و غل نہ ہوتا ہو) صرف دو مہینے کے لئے جگہ دیجئے' پھر یہ اپنے ملک کو چلے جائینگے'۔

خورشید علی۔ بہت خوب' یہ تو بالکل معمولی بات ہے'

حیدر علی۔ یہ بہت خوبیوں کے انسان ہیں' حافظ قرآن سوائے عبادت کے انکا کوئی اور مشغلہ نہیں رہا میرے دل میں انکی عظمت بیحد ہے' انکے مذہبی معلومات بہت اعلیٰ ہیں' آپ بھی گاہے گاہے مستفید ہوسکتے ہیں'

خورشید۔ شکریہ' میں آپ کا بیحد ممنون ہوں' کوشش کرونگا'

حیدر علی۔ کھانے کا انتظام یہ ہوگا' کہ میرے گھر سے ماما روزانہ صبح شام کھانا لایا کریگی' چونکہ انکی غذا بالکل سادہ ہے' اسلئے یہ میرے سوائے کسی) کے پاس کا کھانا نہیں کھاسکتے'۔

یہ تمام باتیں ہونے کے بعد درست ہوگیا' حیدر علی نے یہ بھی کہا کہ آپ کے چچا کے پاس انکو رکھنے کا ارادہ تھا لیکن وہ خانگی افکارات میں ایسے محو ہیں کہ توبہ ہی بھلی' اسپر انکی جوان لڑکی گھر میں موجود ہے' دنیا کیا کہے گی۔ خیر اب آپ جائیں اور آپکے مہمان' یہ کہکر حیدر علی رخصت ہوئے

مس روز نظام شاہ کو دیکھکر خوش ہوئی' ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا ٹم ہمارا گیسٹ (مہمان) ہے۔

نظام شاہ (مہر النسا) روزانہ ان دونوں کی زندگی کا معاینہ کرتے تھے' اکثر مس روز پیانو بجایا کرتی' کبھی کبھی نظام شاہ کو بھی بلا لیتی تھی' خورشید نے دو ایک مرتبہ نہایت ادب کیساتھ شاہ صاحب سے قرآن مجید کے بارے میں سوالات کئے' شاہ صاحب نے چند آیتیں نہایت خوش الحانی سے سناکر خورشید کو حیرت میں ڈالدیا' مہر النسا کی آواز میں قدرتی سوز تھا' اسپر آیات قرآنی سبحان اللہ۔

ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا' حیدر علی بھی کئی وقت آئے اور اپنے ساتھ تفریح کے حیلہ سے مہر النسا کو نواب مرزا سے ملا آتے تھے' خورشید بیرسٹر تھا' مگر یہاں اسکی بیرسٹری رہ گئی' چکمہ میں آگیا کیونکہ سچائی کی فتح کا وقت قریب آگیا تھا'۔

خورشید کے پاس بال (ناچ) کا جلسہ تھا' منتخب یوروپین مہمان شریک تھے' رات کو خوب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی' بال روم پیانو کی سُریلی صدا سے گونج رہا تھا' خورشید مرزا تھوڑی دیر کے لئے مس روز کو لیکر بال روم سے باہر آیا' دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے' مس روز نے نظام شاہ کو خادمہ بھیجکر بلوا لیا اور کہا کہ یہ ہمارا جلسہ ہے' انگریزی میں خورشید سے کہنے لگی کہ تم ان سے پوچھو' کبھی انہوں نے بھی دیکھا ہے' خورشید مترجم کا کام کررہا تھا' سوال و جواب ہورہے تھے کہ دفعتاً ایک شخص وہاں آیا جو بالکل نوجوان تھا' داڑھی مونچھ ابھی نہیں نکلی تھی' جسم پر کپڑے جابجا پھٹ گئے تھے' انگریز معلوم ہوتا تھا' جسم کے بعض حصوں سے خون بہ رہا تھا' خورشید کا ہاتھ پکڑکر انگریزی میں کہا کہ صاحب مجھے بچاؤ' اس نے مس روز کی طرف بھی دیکھا' جو حیرت سے اسکو دیکھ رہی تھی'۔

خورشید نے کہا تمہارا کیا مطلب ہے'

وہ' صاحب وقت بہت کم ہے' مجھے پناہ دو'۔

مس روز نے خورشید سے کہا پیارے اسکو پناہ دو، میں التجا کرتی ہوں۔

خورشید۔ خونی، ڈاکو، چور، اگر ہو تو ہم بھی دہر لئے جائیں گے۔

وہ۔ میں منت کرتا ہوں، میری حالت پر رحم کرو۔

مس روز نے جلدی سے ایک زنانہ لباس کا جوڑہ اُسکے حوالے کر دیا، جسکو اُسنے پہن لیا، اور ان دونوں کے پیچھے کسی قدر تاریکی میں کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں حیدر علی اور بہت سے پولیس سارجنٹ داخل ہوئے حیدر علی نے کہا کہ ایک بدمعاش یوروپین ڈاکو الفریڈ ہماری حراست سے بھاگ گیا ہم نے اسکا پیچھا کیا، لیکن آپکے کمپونڈ کے پاس آکر خدا جانے کدھر غائب ہو گیا، مہربانی فرما کر تبلائیے کہ کوئی شخص یہاں آیا تو نہیں، مس روز نے نہایت دلیری سے جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہوگی، ہم ابھی بال روم سے یہاں آئے ہیں، ہم کو کچھ معلوم نہیں،

حیدر علی کی نگاہیں مہر النسا سے چار ہوئیں، دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں، حیدر علی تاڑ گیا، غور کر کے کہنے لگا کہ آپ مجھے تمام مکان دیکھنے کی اجازت دیجیے، حیدر علی کو معلوم تہا کہ چور کہاں ہے، تاہم تمام کوٹھی چھان ماری آخر مایوس ہو کر لوٹنا پڑا، خورشید نے نظام شاہ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ کان میں کہا کہ اس شخص کا ذکر حیدر علی سے نہ کرنا ورنہ ایک خون ناحق تمہاری گردن پر ہوگا۔

اصل بات یہ تھی کہ مس روز سے الفریڈ کا تعلق ایک زمانہ میں انگلینڈ میں رہ چکا تھا، مس روز کو پرانی محبت یاد آ گئی اُسنے الفریڈ کو اسوقت تو بچا لیا، خورشید سے اجازت لیکر اُسکی تیمارداری میں مصروف ہو گئی۔

ایک روز دن کے ۲ بجے تھے، خورشید نے دیکھا کہ مس روز کے کمرے کا پردہ ہٹا ہوا ہے، آئینہ میں سے جھانکا تو وہاں کیا تھا، مس روز اور الفریڈ دونوں اس دنیا سے بیخبر، محبت کے سمندر میں غوطہ کہا رہے ہیں۔

خورشید کو کچھ نہ سوجھا، اُسنے نظام شاہ کو بلایا، یہ پرعبرت نظارہ دکہایا، اچانک خورشید کے دماغ میں سنسنی خیز خیالات کا ہجوم ہونے لگا وہ مارنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ادھر ٹیلیفون سے حیدر علی کو اطلاع دی، فوراً اپنے کمرہ میں جاکر دو پستول نکالے ایک نظام شاہ کو دیا، اور دوسرا خود لیا،

مہر النسا کو زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ جانتی تھی کہ خورشید اسوقت کیا چاہتا ہے۔

حیدر علی کو بلوانے کی اطلاع مس روز اور الفریڈ کو آیا کے ذریعہ ملگئی تھی، وہ دونوں بھی مارنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے، مس روز نے بھی دو پستول اپنے صندوق میں سے نکالکر ایک الفریڈ کو دیا اور دوسرا خود رکھ لیا۔

چند منٹ نہ گزرے تھے کہ حیدر علی ۲۵ کانسٹبل موٹروں میں سوار کر کے خورشید کی کوٹھی میں آ گیا، جس کمرے میں دونوں محبت کے بت تاک میں بیٹھے ہوئے تھے، اُدھر کا رخ کرنے کے لئے سپاہیوں کو حکم دیا، اندر سے متواتر گولیوں کی بارش ہونے لگی، مس روز اور الفریڈ دروازہ کی آڑ میں تھے، اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، پولس والے بھی برابر فیر کئے جا رہے تھے، مہر النسا بھی پستول چلا رہی تھی، گو کہ اسکو ابتک پستول چلانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا، مگر اسوقت یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی طاقت اس سے کام کرا رہی ہے۔

دو چار پولیس والے مجروح ہو گئے۔ بس روز اور الفریڈ نے ایکساتھ خورشید پر تاک کر فیر کیا' مہرالنسا نے بجلی کی طرح کود کر اپنے شوہر کو بچالیا' خود دو تین فیر ایسے کئے کہ بس روز اور الفریڈ کا کام تمام ہو گیا' البتہ ایک گولی مہرالنسا کے بازو میں لگی یہ تمام واقعات چند لمحوں میں ہوئے' خورشید بے ہوش ہو گیا مہرالنسا اسپر زخمی ہو کر گر پڑی' خدا خدا کرکے یہ ہنگامہ محشر ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر آیا' اپریشن کرکے مہرالنسا کے جسم میں دھنسی ہوئی گولی نکالی گئی' خورشید کو ہوش آیا تو یہ تمام واقعات خواب معلوم ہونے لگے' مہرالنسا کی حالت دیکھنے کے لئے جب اس کے کمرے میں گیا' تو اس کو کسی قدر ہوش آگیا تھا' حیدر علی وہاں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا' خورشید نے دیکھا کہ حیدر علی کا مرشد زادہ مرد نہیں' بلکہ عورت ہے' حیدر علی سے کہا کہ میرا مہمان خواہ کوئی ہو میں اسکا بیحد ممنون ہوں' اسنے آج میری جان بچالی لیکن یہ مرد سے عورت کیونکر بنگئے' اسپر حیدر علی نے خورشید کا ہاتھ پکڑ کر کہا یہ کوئی غیر نہیں ہے' یہ پیکر وفا مہرالنسا آپکی بیوی ہے' جس سے آپ نفرت کرتے تھے' لیکن الحمدللہ اسنے آج اپنے امتحان میں کامیاب ہو کر اپنی وفا پرستی کا ثبوت دیا۔ فقط

درد حیدرآبادی

غزل فارسی

ہز اکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای شاد بالقابہم

چوں نیست خریدار کسے دل چہ فروشم　　سر نیست بتن در کف قاتل چہ فروشم

غیر از تو دگر نیست دریں عالم تمثال　　لیلی شدہ مجنون تو محمل چہ فروشم

جام دل شکستہ بساقی نتواں داد　　ناقص چو متاعیست بہ کامل چہ فروشم

ایں دیدۂ من طاقت دیدار ندارد　　پروانہ صفت بر سر محفل چہ فروشم

چوں عکس در آئینہ ہر آئینہ تواں دید　　اے مردم دیدہ بہ مقابل چہ فروشم

تا چند زنم لاف ز سودائے محبت　　آسانی عشق تو بمشکل چہ فروشم

چوں پیش نظر شاد بود منزل مقصود　　شور جرس دل بجلاجل چہ فروشم

تنقید

گوکھلے من حیث الانسان

بڑے آدمیوں کی سوانحعمریاں خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں، اونسے کچھ نہ کچھ سبق ضرور ملتا ہے' اور مسٹر گوکھلے کی زندگی تو ہندوستانیوں کے لئے بیحد سبق آموز رہی ہے' انہوں نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کردیا کہ غربت اور بیوسیلگی ترقی کی سدّراہ نہیں ہے' اور کوئی ایسا رتبہ نہیں جو فرض شناسی کی بدولت حاصل نہوسکتا ہو' مگر شرط یہ ہے کہ فرض کی بجاآوری میں انعام یا صلہ کی پروا نہو۔ انہوں نے وطن کی محبت' اور ملک کی بھلائی و ترقی میں اپنی زندگی اپنے وسایل، اپنی قابلیت کے جوہروں' اور اپنے خیالات کو وقف کردیا تھا' مگر حصول مرام کے متعلق انکے توقعات حد سے بڑہے ہوے نہ تھے' بلکہ وہ یہ جانتے تھے کہ ساحل مقصود ابھی کوسوں دور ہے۔ مگر کیا اس سے مدت العمر انکی ہمت میں کوئی فرق آیا؟ وہ اپنا کام ہمت اور دلی شوق سے برابر کرتے رہے وہ حب وطن کے نشہ میں ہر وقت مست رہتے تھے' وہ ہر افتاد کا نہایت شیر دلی سے مقابلہ کرنے پر تیار تھے' اور حقیقت یہ ہے کہ اخلاص اور صداقت سے بھری ہوئی فرض شناسی کا احساس انمیں اسدرجہ غالب تھا کہ لارڈ کرزن ایسے زبردست وایسرائے نے بھی انکی سچی اور بے لوث وطن پرستی کا بارہا اعتراف کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کلکتہ کے کونسل چیمبر میں ہندوستانی ممبر بعض اہم مطالبات کی نسبت دہواں دھار تقریریں کر رہے تھے' ایسے موقعوں پر ڈاکٹر رش بہاری گہوش اور مسٹر گوکھلے کی تقریریں خاص طور پر پرمغز ہوا کرتی تھیں' اسوقت مسٹر گوکھلے کی باری تھی اور وہ اپنے لاجواب دلایل کے پیش کرنے میں کونسل کے وقت کا ایک کثیر حصہ لے چکے تھے' یہانتک کہ تقریر سنتے سنتے مائی لارڈ آف کلکتہ پر غنودگی طاری ہوچلی تھی۔ ناگاہ مسٹر گوکھلے میں درد وطن کے جذبہ کو تحریک ہوئی اور انہوں نے نہایت بیباکی سے کہا "مائی لارڈ یہ وقت چُٹ زنی کا نہیں ہے' اسوقت ہندوستان کے موت و حیات کا مسئلہ درپیش ہے" مسٹر گوکھلے پر وطن کی محبت نے اس درجہ تسلط حاصل کرلیا تھا کہ باالآخر وہی درد' منت کش دوا نہ ہوا۔ اور انچاس برس کی عمر میں شبانہ روز محنت و جانکاہی کی بدولت ظالم موت نے اس واجب التکریم فرد کو ہمارے درمیان سے اٹھالیا'۔

اس رسالہ میں اسی مقدس زندگی کے بعض دلچسپ اندرونی حالات کی' جنکی جہلک بہت کم کسی کو نصیب ہوتی تھی' مسز سروجنی نائیڈو کے جادو اثر قلم نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے' ہمارے مہربان سید خورشید علی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ وہ مسز نائیڈو کے زور بیان کو ترجمہ میں قایم رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ رسالہ کے شروع میں مسٹر گوکھلے کا مختصر حال مترجم کا لکھا ہوا ہے' جو بجائے خود ایک دلچسپ تحریر ہے' اس رسالہ کا مطالعہ اہل ملک کے حق میں جسقدر مفید اور موثر ثابت ہوگا وہ محتاج تصریح نہیں ہے' اسلئے کہ ملک کی خدمت اور وطن کی محبت اس رسالہ کی تعلیم کا پہلا زینہ ہے۔ ہر شخص کو ہاتھ میں

اِسکا ایک نسخہ ہونا لازمی ہے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے چھوٹی تقطیع کے ۵۳ صفحہ پر رسالہ تمام ہوتا ہے، قیمت ۸؍ ہے اور غالباً مترجم صاحب سے فینانس آفس حیدرآباد دکن کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

ترجمان لاہور گذشتہ مہینہ سے اس نام کا ایک علمی رسالہ زیر ایڈیٹری منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری شایع ہو رہا ہے، منشی صاحب موصوف خود اہل قلم سے ہیں اور مختلف رسایل میں آپ کے دلچسپ مضامین ارباب نظر نے مطالعہ فرمائے ہونگے، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یہ پرچہ ڈاک میں پڑ جاتا ہے پہلے نمبر میں خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب نے ترجمان کے عنوان سے ایک افتتاحی مضمون لکھا ہے اور دوسرا مضمون منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کے فکر صحیح کا نتیجہ ہے۔ ترجمان کے دو نمبر اسوقت ہمارے پیش نظر ہیں اور ان میں فلسفہ، سائنس، اور لٹریچر پر جسقدر مضامین نثر و نظم شایع ہوئے ہیں اُنسے لایق ایڈیٹر کی صحت مذاق کا اندازہ ہوتا ہے رسالہ کی تقطیع ۲۶×۲۲/۸ ہے حجم ساٹھ صفحات۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ قیمت مع محصولڈاک تین روپیئے سالانہ۔ نمونہ پانچ آنہ۔ ہماری دعا ہے کہ ہم اسے اچھی طرح پھلتا پھولتا دیکھیں۔

سلطان القلم

ہمارے باب میں ہوئی ہے گفتگو کیا کیا

اخبار "مساوات" الہ آباد مورخہ ۴ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ حیدرآباد دکن سے سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کی ایڈیٹری میں شایع ہوا ہے۔ اور اسمیں سب سے پہلے اعلیٰحضرت نواب سر میر عثمان علیخاں بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی شبیہ مبارک دیگئی ہے، اسکے بعد مضامین نثر و نظم سے رسالہ مزین کیا گیا ہے، یہ رسالہ ادیب کی تقطیع پر اور نہایت عمدہ ایوری فنش کاغذ پر نہایت خوشنما چھپائی کے ساتھ طبع ہوا ہے، عمدگی مضامین کے لحاظ سے ادیب سے ہمارے نزدیک فوقیت حاصل کریگا، جب عالیجناب نواب عماد الملک جیسے قابل اردو انشا پرداز، جنکے خیالات سے آجتک اردو زبان اپنی شومی قسمت سے محروم رہی تھی، اس رسالہ کو علمی اپنے اعلیٰ مضامین سے مزین فرماتے ہیں تو کچھ شک نہیں ہے کہ یہ رسالہ نہایت مفید ہوگا اور اردو لٹریچر میں ایک جدید باب کا افتتاح کریگا۔ ہم اس رسالہ کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا اس کو نظر بد سے بچائے اور یہ روز افزوں ترقی کرے، بہی خواہان اردو کا فرض ہے کہ اسکی ترقی اشاعت میں اعانت کریں۔

اخبار "دبدبۂ سکندری" رامپور مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ۔ محترم مولانا سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی نے حیدرآباد سے اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ ادیب کی وضع پر شایع کر کے اُسکا پہلا نمبر دفتر دبدبۂ سکندری میں ارسال فرمایا ہے۔ چونکہ میرے دلمیں اردو علم ادب کے خادموں کی خاص وقعت ہے اسلئے مینے نہایت وقعت کی

نظر سے نئے رسالہ کو پڑھا۔ سب سے پہلی بات مجھے یہ کہنا ہے کہ ملک
میں اردو رسالے قدردانی کی کمی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اُن
کمی کا اثر ہماری ترقیات کے ہر شعبہ پر مرتب ہوتا ہے جو
ادبی رسایل ہمارے صوبے میں موجود ہیں اُنکے طولانی
مرثئے ہمنے برابر پڑھے ہیں، آخر مرثیہ خوانی کرتے کرتے ہوئے
وہ بند ہو جاتے ہیں، اور یوں ادب اُردو کو صدمہ پہنچ
جاتا ہے، مولانا ہوش کا اُنکی ادبی خدمات کے لیئے ممنون
مشکور ہوں، حیدرآباد کی فیاضیاں اگر صرف ہمت فرمائیں
تو رسالہ کا اجرا مشکل نہیں ہے، گورنمنٹ نظام کی خسروانہ
امداد تو بڑی چیز ہے، جس سے ایسے ایسے دس بیس رسالے
جاری رہ سکتے ہیں، اگر ایک امیر چاہیں تو مالی امداد دیکر
رسالہ کو حیات ابدی کا خلعت عطا فرما سکتے ہیں، لیکن
یہ جب ہی ممکن ہے، جب دلمیں درد ہو اور جب دل سرد ہو
تو پھر کیا بنے سب کیا دھرا گرد ہو، اُردو ادب کی خدمت
بڑی چیز ہے، آجکل اخبار کے فرایض اسقدر اہم ہیں کہ ہزاروں
کے دل پریس کے پتھروں کی سیاہی کے ساتھ سیاہ ہو گئے
اور بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ شان بے نیازی نے خاتمہ کر کے
چھوڑا، اسوقت پریس کا مالک بن جانا آسان ہے لیکن
جیسا جیسا تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے، معلوم ہوتا جاتا ہے کہ
جو افتادیں اس کام میں واقع ہوتی ہیں وہ کسی تجارت میں نہیں
خصوصاً شخصی مقامات حکومت میں، جہاں نہ آزادی ہے نہ
بازار نقد گرم ہے، اور موجودہ مذاق جس مذاق کا ہے وہ
اہل بصیرت سے چھپا نہیں ہے، پھر کون ہے جو کسی اخبار
یا ادبی رسالہ کا مالک بنکر مدعی فلاح ہو سکتا ہے، بہرحال میں
دعا کرونگا کہ نئے رسالہ کو زمانہ کی بے مہری نہ ستائے بلکہ ہما

ہمارے باب میں ہوتی ہے گفتگو کیا کیا

رسالہ بے مہری کے دیو کی صفیں الٹ دے یعنی ناقدردانی کو
شکست دے، اور ہماری دلچسپیاں اس سے ہمیشہ وابستہ رہیں،
مولانا ہوش جنسے روشناس ہونیکا مجھے شرف حاصل نہیں، ذی ہوش
بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اونکی تہذیب سے پتہ چلتا ہے کہ با لیاقت
اہل قلم ہونے کے علاوہ اردو ادب کا درد بھی اپنے دلمیں رکھتے
ہیں، پہلے نمبر میں دلچسپ اور بلند مضامین کا شایع ہونا اُنکی
ادبی قابلیت کا مظہر ہے۔

اخبار "نیر اعظم" مراد آباد۔ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ - سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی نے اُردو
علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ ماہوار حیدرآباد دکن سے
شایع کیا ہے، نثر و نظم اعلیٰ درجہ کے مضامین ہیں، حضور نظام
خلد اللہ ملکہ کا فوٹو دیا گیا ہے، تقطیع رسالہ ادیب جیسی
لکھائی چھپائی کاغذ سب اعلیٰ قسم کا ہے، ایسے علمی اُردو رسالوں
کی نہایت ضرورت ہے، خدا پروان چڑھائے۔

اخبار "مدینہ" بجنور۔ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ - اس نام کا نیا رسالہ جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش
بلگرامی کی زیر ایڈیٹری و ملکیت اکتوبر ۱۹۱۵ء سے شایع ہونا شروع
ہوا ہے، جسکے اول میں ہز ہائینس نواب میر عثمان علیخان بہادر
شاہ دکن کا فوٹو دیا گیا ہے، کاغذ اور تقطیع نہایت موزوں،
ادیب اور العصر جیسی ہے، لکھائی اور چھپائی بھی اچھی ہے،
فی صفحہ دو کالم ہیں، علمی اخلاقی مضامین کا اڑتالیس صفحات
میں قابل دید ذخیرہ ہے، حصہ نظم بھی کافی اور دلچسپ ہے،
ملک کو اس رسالہ کی قدر کرنی چاہیئے۔

اخبار "مشرق" گورکھپور مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ - [illegible]

شائع ہوا ہے۔ اسکا پہلا نمبر ہمارے پاس بھی آیا۔ ہم نے اس کے مضامین کو اچھی طرح دیکھا۔ اقبال و ادبار پر عالیجناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا مضمون قابل دید ہے۔ محاسن ظلمات پر ہمارے کرم گستر خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کا مضمون اچھا نکلا ہے۔ غنی کشمیری کی شاعری پر ہمارے دوست جناب اعجاز لکھنوی کی تنقیح بہت خوب ہے۔ دو ۲ مضامین اور نظمیں اس رسالہ میں جن میں اکثر قابل تعریف ہیں۔ کاغذ بہت اچھا چھپائی بہت اچھی ہے۔ قیمت (للعہ) سالانہ کچھ بھی نہیں ہے، نمونے کا پرچہ (۶ ر) میں ملتا ہے۔ اعلیحضرت کی بہت عمدہ تصویر اور اعلیحضرت کے حالات سے آغاز کیا گیا ہے۔ خدا ضرور برکت دیگا اسے دیکھ کر اعلیحضرت سلطان دکن کی اعلیٰ انسان نوازی اور رعایا پروری کی صفت ایسی نہیں جسکی وجہ سے اعلیحضرت کا نام نامی باعث خیر و برکت نہ ہو۔

اخبار "اہلحدیث" امرتسر۔ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ۔ اس نام کا ایک ادبی ماہوار رسالہ حیدرآباد دکن سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ پہلا نمبر جو دفتر میں موصول ہوا کیا بلحاظ لکھائی چھپائی اور کیا بلحاظ مضامین ہر طرح قابل قدر ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے۔

(باقی آئندہ)

فکر تازہ

(مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی)

اچھی نہیں یہ غفلت ہے وقت صبحگاہی
اے میکشو خدارا ھُبّوا بکاس راح

دنیا کی کب ہے پروا رندوں کو چاہئے کیا
اک جرعہ صبوحی اک لقمہ صباحی
ہمت کا اہل دل کی پہنچا ہے فیض سب تک
کالغیث فی جبال والسیل فی البطاح

اس وقت میں یہ جانوں میرا بھی داؤ نکلا
جب خود حریف کہدے قد فزت بالقداح

اٹھا سحر نے گھونگٹ اور سب نے لی نہ کروٹ
چمکا سحر کا تارا کالدر فی الاداح

صحرا گہر بداماں شبنم کے آنسوؤں سے
گلہائے بوستانی یبسمن عن اقاح

مرغ سحر کے نالے سنتے ہیں سننے والے
ہوتے ہیں زخم آرے کالطعن بالرماح

اے عندلیب سرمست سمجھیگا کون اس کو
ہیں تیرے ہر سخن میں سو رمز اصطلاحی

گر بزم مے ہے برہم چشم کرم ہے کیا کم
بن جائے ساغر جم ٹوٹے اگر صراحی

شاخوں پہ ہیں گل تر لبریز جیسے ساغر
کہتے ہیں ہاتھ اٹھا کر بُعدًا لکل صاح

سب دوستوں کی خاطر ہے نقد جاں بھی حاضر
منکر جو ہو تو کافر لسنا من الشحاح

مدت ہوئی کہ ہم ہیں اور آتش فسردہ
جھونکا ادھر بھی کوئی یا مرسل الریاح

اے کارواں والو اٹھو کہ گونج اٹھے
فریاد سے جرس کی دشت و در و نواحی

سب مخلصیں ہیں ابتر چلتے نہ دیکھا ساغر
سو دفعہ ہو چکی ہے گو رسم افتتاحی

آل اطہار نبی کا کوئی کیا وصف کرے واقفِ راہ خدا تھے وہی سب سے اچھے
جو پھرے اُنسے وہی راہِ ضلالت میں گئے ان کے پیرو جو ہوئے وہ سرِ منزل پہنچے
رہ گئے وہ جو نہ تھے راہ پہ آنے والے

کرتے ہیں بے سبب انکار نبوت نادان سیکڑوں اپنے دلیلیں ہیں ہزاروں برہان
شاہدِ شانِ نبوت نہیں تنہا قرآں لکھہ گئے پہلی کتابوں میں نبوت کے نشاں
علما موسیٰ و عیسیٰ کے زمانے والے

مال و دولت پہ نہ تھی شاہِ دو عالم کی نظر ورنہ ہو جاتے طلا سارے جہاں کے پتھر
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کبھی حضرت نے ادہر گنجِ پرویز کیجانب جو ہوا شہ کا گذر
کنجیاں لائے پئے نذر خزانے والے

سیکڑوں تیر کلیجے پہ لگے غم نہ کیا راہِ حق میں نہ تھی کچھ جان کی انکو پروا
انکی جرأت کا شجاعت کا بھلا کیا کہنا بھوک میں پیاس میں اک ایک ہزاروں سے لڑا
کیا بہادر تھے محمدؐ کے گھرانے والے

تو بہتر کے مقابل ہوئے اعدا لاکھوں سامنے شیروں کے روباہ تھے مہیا لاکھوں
اَب نظر میں ہوئے ظالم تہ و بالا لاکھوں کربلا میں جو ہوئے کور دل اک جا لاکھوں
یہ بہادر تھے کوئی آنکھ چرانے والے

تھامتے تھے کبھی ہاتھوں سے کلیجا پیاسے اور کبھی صبر دکھا دیتے تھے اپنا پیاسے
ایکدم بھی نہ رہے شاہ کے اعدا پیاسے حیف صد حیف رہے خود لبِ دریا پیاسے
حشر میں چشمۂ کوثر کے لٹانیوالے

نازشِ فخر سے کہتے تھے یہ اعدا باہم آج ہمنے کیا محبوبِ خدا کو پُرغم
گرچہ دنیا میں ہوئے اپنے کئے پر خرم کیسے پچتائینگے دوزخ میں جلینگے جسدم
خیمۂ آلِ محمدؐ کے جلانے والے

ہر زمانے میں رہی اسکی نمایش اعلیٰ دشمنوں میں بھی یہ اپنے کبھی کب نہ رہا
کوششیں لاکھ ہوئیں زور کسی کا نہ چلا آجتک نقشِ شریعت نہ مٹا پر نہ مٹا
مٹ گئے آپ ہی جتنے تھے مٹانے والے

غیب سے آئی ندا عاصیِ محزون و دلگیر چل مدینے کو سوئے بادشہِ عرش سریر
کیسی دلکش ہے یہ استادِ سخن کی تقریر تو بھی راہی ہو مدینے کی طرف جلد امیر
غول کے غول چلے جاتے ہیں جانیوالے

عاصی

اخلاق حمیدہ

ذکرِ اخلاقِ نبی سے نظم کو ہو افتخار اسلئے مذکور کرتا ہوں یہاں بالاختصار
وفد نجاشی نے بھیجا تھا جو پیغمبر کے پاس آپ اپنی ذات سے اُسکے ہوئے خدمتگزار
عرض کی اصحاب نے خدام کیا کافی نہیں واسطے خدمت کے انکے اے رسولِ کردگار
شہ نے فرمایا یہ تھے مکرم سارے اصحاب کے جب حبش میں کی تھی ہجرت سے سکونت اختیار
دوست کہتا ہوں کہ میں بھی آج کچھ خدمت کروں یہ تھا اکِ ادنیٰ سا خلق سرورِ عالی تبار
چادرِ بحرانی اکدن اوڑھکر نکلے رسولؐ تھی کناروں سے درشتی اور سطبری آشکار
راستے میں اتفاقاً ایک اعرابی ملا کھینچ لی چادر پکڑ کر زور سے بے اختیار
اس اذیت سے نہ آئی شہ کے ماتھے پر شکن اللہ اللہ یہ کرم یہ خلق یہ حلم و وقار
پھر کہا اُسنے مجھے دے مال اللہ کے اے محمدؐ جو ہے تیرے پاس بیحد و شمار
ہنس کے دیکھا سرورِ عالم نے اعرابی کی سمت درہم و دینار سے اسکو دیا یا کامگار
تہا مدینے میں یہودی عالموں میں ایک شخص چند دیناروں کے تھے اوسکے پیمبر قرضدار
ایکدن آکر کیا اُسنے تقاضائے شدید اپنے دیناروں کا طالب رہا تہا بار بار
شہ نے فرمایا نہیں ہے پاس میرے آجکل تا ادا کردوں ترے دینار آنیکو شعار
سن کے یہ پھر خشمگیں ہوکر یہودی نے کہا میں نہیں چھوڑونگا تم کو اے محمدؐ زینہار
آپ میرے قرض کے دینار ابھی دیدیجئے بیٹھئے ورنہ میرے پاس آ کر دو وقار
شہ نے فرمایا کہ اچھا بیٹھتا ہوں تیرے ساتھ بے تردد کہکے یہ بیٹھے جہاں کے شہریار
ظہر کا اور عصر کا اور شام کا اور رات کا شہ بجا لائے اسی حالت میں فرض کردگار
ساتھ اُسکے رات بھی کی سرورِ دیں نے بسر پڑھ لیا فرضِ سحر بھی باخشوع وانکسار

معین التواریخ

مؤلفہ

(منشی اقبال حسین صاحب بلگرامی)

یہ کتاب معلومات مفیدہ اور مضامین پسندیدہ کا مجموعہ ہے۔ اسمیں ان واقعات و حالات کا ایک کثیر ذخیرہ ہے جنکا جاننا اقوام و اہل ہند اور مختلف المذاق لوگوں کیلئے ضروری ہے۔ اسمیں تاریخی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور عمرانی مضامین کے علاوہ مشاہیر شعرا اور حکما متقدمین و متاخرین، مورخین اور تاجداران عالم وغیرہ کے حالات زندگی پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک جلد ہر علم دوست کے مطالعہ میں رہنا ضروری ہے۔ حجم تقریباً سات سو صفحہ اعلیٰ درجہ کے ایوری فنیش کاغذ مع ۳۰ تصاویر مجلد قیمت ... پیشگی اور مابعد ... زیر طبع۔ شائقین پیشگی فرمایش بھیجکر مولف کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔

ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ حیدرآباد دکن

تمدن ہند

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم ایم۔ اے۔ ڈی لٹ کی آخری تصنیف اور ان کے تبحر علمی و بے نظیر یادگار کی زندہ یادگار ہے۔ تمدن عرب کی طرح اعلیٰ درجہ کے ایوری فنیش کاغذ پر کثیر التعداد تصاویر کیساتھ شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسے قابل احترام فرد قوم کی آخری یادگار ہے جنکی نظیر صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ امید ہے کہ علم دوست اصحاب اور اولو العزم شائقین علم و فن اسکو ہاتھوں ہاتھ لیکر اپنی علمی قدردانی کا ثبوت دینگے۔ قیمت مجلد با تصویر ...

ملنے کا پتہ "ذخیرہ" بک ڈپو حیدرآباد دکن

صنمخانہ عشق

حضرت امیر مینائی رح کا عاشقانہ دیوان قیمت دو روپیہ خیابان آفرینش مع محامد خاتم النبیین تتمہ دیوان اسمیں غیر مطبوعہ کلام بھی شریک کیا گیا ہے قیمت ایکروپیہ چار آنہ۔ فرمایش میں اپنا پتہ صاف لکھیے۔

ملنے کا پتہ

منیجر دفتر امیر المطابع محلہ راؤ رنبھا حیدرآباد دکن

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں

فلسفۂ ازدواج

مولفہ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی ایم آر اے ایس

کی نسبت

مولانا حالی مولانا ذکاء اللہ اور مولوی عزیز مرزا کے خیالات اور انکا اقتباس

آپنے یہ کتاب لکھکر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے ہر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے اور اسکی ہدایتوں پر عمل کرے۔ — الطاف حسین حالی

"اسمیں تاہل و تجرد کے فائدوں اور نقصانوں کو میزان عدل میں تولکر تاہل کے پلڑے کو گراں اور تجرد کے پلڑے کو سبک ثابت کیا ہے جسمیں حکماء اور عقلا و فضلاء کی آراء ازدواج کے بارے میں لکھی ہیں خلاصہ یہ کہ جو شخص اپنی زندگی بالطف اور خالی عن الرذائل بنانا چاہتا ہو وہ اس کتاب کا باستیعاب مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اسمیں جواہر بے بہا ہیں جو تھوڑے سے خرچ سے اسکے خریدار کے ہاتھ آسکتے ہیں۔ — محمد ذکاء اللہ

"میں نے اس کتاب کا مطالعہ اول سے آخر تک کیا اسکا پیرایہ بیان نہایت دلکش اور عبارت چست اور بامحاورہ ہے مصنف نے جابجا مستند مصنفوں کے اقوال سے اپنے دلائل کو قوی کیا ہے جس سے کتاب کی قیمت اور بڑھ گئی ہے آخر میں انہوں نے فطرت پر بحث کرکے حکمت کے ایسے راز بیان کئے ہیں جو انسان کو کارزار ہستی میں سرخرو بنانے کیلئے کیمیا اثر ہیں — محمد عزیز مرزا

ضخامت ۲۰۰ صفحات تقطیع ۲۰×۲۲/۸ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجہ

قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

"ذخیرہ" بک ڈپو حیدرآباد دکن

تاج

اردو لٹریچر کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

اگر آپ گھر بیٹھے صرف ایک روپیہ سال بھر تک اعلیٰ مضامین نظم و نثر اچھے اچھے دلچسپ اخلاقی قصے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں تو

"منیجر تاج" کاچیگوڑہ حیدرآباد دکن سے درخواست کیجیے

چالیس سال میں ایک موقعہ

دسمبر ۱۵ء میں اخبار نیر اعظم مرادآباد کی عمر کا چالیسواں سال پورا ہوتا ہے اسکی خوشی میں خدا کا شکریہ ادا کرنے کیلئے شائقین ملک کو کوئی خاص رعایت دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ نیر اعظم بک ایجنسی کی تمام نایاب کتب علاوہ خرچ روانگی کے ایک تہائی قیمت پر بھیجی جائینگی صرف ان درخواستوں پر یہ رعایت دیجائیگی جو ۳۱ دسمبر تک ڈاک میں ڈالی گئی ہونگی تازہ فہرست کتب جسمیں اصلی قیمت درج ہے فوراً مع نمونہ اخبار طلب فرمائیے اسی کے ساتھ نیر اعظم بھی نصف قیمت دیا جائیگا اگر دو روپیہ پیشگی ... فرمائیں

المشتہر منیجر نیر اعظم بک ایجنسی مرادآباد یو پی

مفید دکن پریس سرکار عالی حیدرآباد دکن میں چھپا

جلد ۱ نمبر ۳ — اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ — دسمبر ۱۹۱۵ء

ذخیرہ

مرتبہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

تصویر منشی سید غلام حسنین قدر بلگرامی

فہرست مضامین

قیمت سالانہ للعہ

دفتر رسالۂ ذخیرہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

فی پرچہ ۶

تاریخ سن شبیہ ملی میر قدر کی پہلوئے دل میں چھپ گئی تصویر قدر کی

روشنانِ فلک

ذیل کا عالمانہ مضمون مسلم الثبوت انشاپرداز مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی پروفیسر نظام کالج کی پرواز فکر کا نتیجہ ہے جو آپ نے خاص ذخیرہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ کسی چیز کا خود سمجھ لینا آسان ہے مگر دوسروں کو سمجھانا دشوار کام ہے' نجوم السماء کی تفسیر حسن لپذیر پیرایہ میں کیگئی ہے' اور جس حد تک آپ کو اس مضمون کے معنی خیز بنانے میں کامیابی ہوئی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے' آپ نے اس مضمون میں غایت تحقیق' و جانکاہی کیساتھ کواکب مشہورہ کے حالات' ان کے محل وقوع اور طریقۂ امتیاز کو بعنوان احسن بیان فرمایا ہے اور یہ کہنا غالبًا بیجا نہ ہوگا کہ اردو میں اپنی طرز کا یہ پہلا مضمون ہے جسکے لئے ہم مولانا ممدوح کے نہایت منت گزار ہیں۔

ایڈیٹر

ہم لوگوں کو صحیفۂ کائنات کے مطالعہ سے ایسی بیگانگی ہے کہ اس کتاب کا زریں ورق جو ہر شب کو پیش نظر رہتا ہے اُس کے نقوش و صور کو کبھی نہیں پہچانتے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ علم نجوم سیکھتے ہیں وہ بھی اپنی کتاب ہی سے سروکار رکھتے ہیں اور یہ کہہ دینا جانتے ہیں کہ اسوقت فلاں ستارہ نے طلوع کیا یا اسوقت فلاں ستارہ فلاں برج میں داخل ہوا اور یہ حساب اونکا ایسا صحیح ہوتا ہے جیسا چاہیئے۔ مگر وہ نہ کسی ستارہ کو پہچانتے ہیں نہ کسی برج کو۔ اور یہ بے توجہی قدیم سے چلی آتی ہے۔ ابوریحان بیرونی کتاب الہند میں لکھتے ہیں'

والهند فی امر الکواکب الثابتة قلیلو المحصول لما ظهر
منهم بمن یعرف کواکب المنازل عیانا ویشیر الیها
بنانا یعنے ہند کے لوگ کواکب ثوابت کو بہت کم جانتے ہیں ان میں
مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو منازل قمری کو دیکھ کر پہچان لے اور
ہاتھ کے اشارے سے بتا سکے ۔ کوئی بیس برس کا عرصہ گزرا کہ میں
بعض احباب کی ملاقات کو گیا ۔ رات کا وقت تھا' کوٹھے پر صحن میں
کرسیاں بچھی ہوئی تھیں' مشرق کیطرف میری کرسی کا رخ تھا اُس
محفل میں ایک نئی صورت 'نئی ہیئت میں دکھائی دی صاحبِ خانہ
نے مجھے اُن صاحب سے یہ کہکر ملایا کہ آپ پنجاب سے آئے ہوئے
ہیں' بڑے کامل منجم ہیں' میں اُنکی ملاقات سے مشرف ہوا اور
کچھ باتیں کرنے لگا اسی اثنا میں سامنے سے مشتری نے طلوع کیا اور
یہ کلیہ ہے کہ سیارات میں سے جو ستارہ سرِ شام طلوع کرے وہ بہت
روشن ہوتا ہے' وجہ اسکی ظاہر ہے کہ وہ زمانہ آفتاب کے اور اسکے
مقابلہ کا اور زمین سے قریب ہونے کا ہوتا ہے' ستارہ افق میں وہ
عظمت وشان دکھارہا تھا کہ خواہ مخواہ نظر پڑتی تھی مینے اُن بزرگ
سے پوچھا کہ مشتری کو آپ پہچانتے ہیں کہا کہ نہیں ۔ مینے پوچھا کہ
ابھی اسنے طلوع کیا یا نہیں تو انہوں نے ذرا تامل کرکے بہت صحیح
جواب دیا کہ ابھی طلوع کیا ۔ مجھے بہت ہی تعجب ہوا کہ ستارہ سامنے
موجود ہے' علم نجوم سے یہ بھی معلوم ہے کہ ابھی ابھی طلوع کیا ہے
مگر یہ نہیں کہتے کہ یہی ستارہ مشتری ہے ۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب
میرے دوستوں میں ہیں نجوم کا بھی ان کو بہت شوق ہے لکھنو
سے یہاں آئے ہوئے تھے' اتفاق سے سرِ شام ایک صحبت میں
میں بھی تھا اور وہ بھی تھے' زمانہ استقبال زحل کا تھا مینے
یہی دونوں سوال انسے بھی کئے ۔ معلوم ہوا کہ زحل کو پہچانتے
نہیں ہیں مگر طلوع کا وقت ٹھیک ٹھیک بتا دیا ۔ مینے انہیں
زحل کو بتا دیا اور بے تکلف ہونے کے سبب سے یہ بھی کہدیا کہ
دیکھئے خدا کیسے صاحب کمال تھے کہ ایسے صحیح حساب لگا کر وقت طلوع
بتا دیتے ہیں کہ آپ سے بیخبر لوگ بھی بے تکلف بتا سکتے ہیں کہ
کون سا ستارہ کسوقت طلوع کریگا ۔ مگر اس زمانہ کی بیخبری اور بیشوقی
کا کسقدر اثر آپ میں موجود ہے کہ آجتک جناب نے یہ ارادہ ہی
نہیں کیا کہ آسمان کیطرف ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں تو سہی جسکو
یہ بات معلوم ہے کہ آج فلاں ستارہ نے شام کو طلوع کیا وہ سمجھنے
کا ارادہ اگر کرے تو یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ آدھی رات کو وہی ستارہ
ہمارے سر کے قریب کہیں ہوگا اور صبح ہوتے ہم اُسے افق غربی
میں ڈھونڈھ سکتے ہیں ۔ ان دونوں منجموں کے علاوہ ہندوستان
کے ہر شہر میں بہت سے جوتشی اور منجم موجود ہیں مگر سب کے سب
غالباً ایسے ہی ہیں کہ کتاب کے سوا آسمان کیطرف دیکھنا ہی
نہیں جانتے ۔ ایک اور میرے دوستوں میں فن ہیئت کے
بڑے ماہر ہیں خوب جانتے ہیں کہ مریخ کی رفتار کتنی ہے اور
مشتری و زحل کی بہ نسبت وہ سریع السیر ہے ۔ اون سے مینے
استفادۃً پوچھا کہ پانچ چھ مہینہ سے مریخ نہیں دکھائی دیا کیا
اتنے دنوں وہ آفتاب کے ساتھ رہتا ہے تو وہ حیران ہوگئے
اور میں سمجھ گیا کہ یہ اس بات سے بے خبر ہیں ۔ کہ مریخ کے احتراق
کا زمانہ کبھی بہت طولانی ہوجاتا ہے ۔ اور وجہ اسکی وہی ہے
کہ دیکھنے اور پہچاننے کا کبھی قصد نہیں کرتے ۔ یعنے حکایتہ سے
سے غرض سے محکی عنہ سے کچھ مطلب نہیں ۔

عرب کے شعرا میں زیادہ اور سخنوران فارس میں
کسی قدر کم اختر شناسی کا چرچا تھا ۔ ان کا کلام شاہد ہے کہ ہزاروں
مضامین انہوں نے صور فلکی سے اخذ کئے ہیں ۔ مگر جو شخص ستارہ شناس
نہیں ہے وہ ان مضامین کا لطف اٹھا نہیں سکتا مثلاً

شیخ شیراز فرماتے ہیں ؎

ہر کجا طلعت خورشید رخے سایہ فگند
بیدلے خستہ کمر بستہ چو جوزا برخاست

اس شعر کو اسی قدر سمجھنا کہ جوزا صور فلکی میں سے ایک صورت
ہے۔ کچھ لطف نہیں رکھتا۔ جس نے جوزا کو معدل النہار پر دیکھا ہے
اور اسکی ڈاب میں جو تین الماس جڑے ہوئے ہیں انکی چمک دمک
اسکی آنکھوں نہیں کبھی ہوتی ہے، وہ سعدی کے اس شعر کی داد دے
سکتا ہے اور بس وہی شاعر اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ سعدی نے
جوزا کو بے دیکھے یہ شعر ہرگز نہیں کہا ہے۔ کور مادر زاد بھی کسی
حسین کی تعریف میں کہہ سکتا ہے کہ اُس کے ہونٹ گلاب کی پتی
ہیں مگر اس تشبیہ کا لطف وہی اُٹھا سکتا ہے جس صاحب بصیرۃ
نے گلاب کا پھول دیکھا ہے۔

جو جو ستارے اور جو صور فلکی اہل قلم میں مشہور ہیں اُن کا جاننا اور
پہچاننا فن ادب کا ایک جزو ہے اور شاعر کے لئے اسی قدر کافی
ہے۔ ہاں جو ہیئت و نجوم کا ذوق رکھتا ہے، اُسے تمام بروج و
منازل و صور فلکی نہ معلوم ہوں تو اپنے فن میں ناقص ہے۔

شعر کا مدار مشہور چیزوں پر اور مشہور باتوں پر ہے

وجہ اُسکی یہ ہے کہ جو بات مشہور ہوتی ہے وہ مانوس بھی ہوتی
غیر مشہور چیزیں نامانوس ہوتی ہیں انکے ذکر سے شعر میں ثقل پیدا
ہو جاتا ہے، جو کواکب و صور غیر مشہور ہیں، شاعر کو اُنسے کام نہیں
تشبیہ و تمثیل میں اُنکا ذکر کلام کو نامانوس کر دیتا ہے۔ اسی سبب
سے یورپ کے اہل بلاغت نے یہ وصیت کی ہے کہ اصطلاحات فنون کا
تحریریں لانا عیب ہے کہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں تکلف ہوگا
جو کواکب و صور اہل ادب میں مشہور ہیں وہ اسقدر روشن اور واضح
ہیں کہ انکا پہچان لینا کچھ مشکل نہیں۔

ہر شخص کو آدھا آسمان ہر وقت دکھائی دیتا ہے اور اگر کوئی ساری
رات جاگے تو قریب قریب سارا آسمان اُسکی نظر سے گذر جائیگا
بس طلوع آفتاب سے ایک ساعت پہلے اور غروب سے ایک ساعت
بعد کا آسمان نہیں دیکھ سکیگا یعنے چوبیس ساعتوں میں سے بائیس
کا منظر ایک ہی شب میں ہر شخص چاہے تو دیکھ لے پھر مہینہ دو
مہینے کے بعد آفتاب دوسرے بروج میں چلا جائیگا تو جو ستارے
احتراق میں تھے انکو بھی پہچان سکتا ہے، ہاں جو بعض ستارے
عرض بلد کے سبب سے جنوب میں نہ دکھائی دیں وہ البتہ بے سفر
کئے ہوئے نہیں معلوم ہو سکتے۔ دہلی و لکھنو کے لوگ لنکا میں
میں جا کر بہت سے جنوبی ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں جن میں سے
تین ستارے بہت روشن ہیں مگر غیر مشہور ہیں۔

قطب نما کی سوئی خط جنوب و شمال کو بتاتی ہے اور ہر شخص اس سے
واقف ہے بس اُسی خط پر صحن میں دو کیلیں گاڑ کر ایک رسی باندھ
دو، جو ستارہ یا برج اس رسی پر سے گزرے اس کے پہچان
لینے کے لئے یہی وقت بہت مناسب ہے۔ تمہارے صحن میں جو یہ
الگنی خط جنوب و شمال پر بندھی ہوئی ہے سمجھو یہی خط نصف النہار
ہے اور ہر ستارے کا منتہائے عروج یہیں تک ہے اور عروج کے
وقت صور فلکی بہت مفصل اور صاف دکھائی دیتے ہیں۔

الغ بیگ نے خط نصف النہار نکالنے کا آسان طریقہ
یہ لکھا ہے کہ زمین کو ہموار کریں اور ایک آلہ مثلث متساوی الساقین
کی صورت کا بنا لیں قاعدہ مثلث کے بیچوں بیچ کچھ نشان
کر دیں اور راس مثلث سے ایک لنگر لٹکا دیں، لنگر کا بیچ والے
نشان پر رہنا زمین کے ہموار ہونے کی علامت ہے۔ اس زمین پر
ایک دائرہ بنا کر اسکے مرکز پہ کوئی سیدھی سی نوکدار شئے نصب
کر دیں۔ اس شاخص کی پرچھائیں صبح کو مغرب کی طرف دور تک

ہوگی جسقدر دن چڑھے گا چھوٹی ہوتی جائیگی ۔ یہانتک کہ پرچھائیں کی
نوک دائرہ کے خط پر آجائیگی یہ مدخل ظل ہے ۔ اس جگہ نشان کردیں پھر
جب پرچھائیں کا مشرق کی طرف پھیلنا بڑھنا شروع ہو یہانتک کہ
اسکی نوک دائرہ کے خط تک پہنچ جائے اس جگہ پر بھی نشان کردیں
یہ مخرج ظل ہے اور دونوں نشانوں کے بیچ میں جو قوس ہے اس کی
تنصیف کریں نقطۂ تنصیف سے مرکز دائرہ تک ایک لکیر کھینچیں
یہی لکیر خط نصف النہار ہے ۔

ایک بات پر میں اور تنبیہ کئے دیتا ہوں جسطرح آپکے منجم اور جوتشی
اپنی اپنی زیچ اور پوتھیوں میں اُلجھ کر بروج و منازل فلکی کی طرف
آنکھ اٹھاکر کبھی نہیں دیکھتے ۔ اسی طرح آپ حضرات اپنی جیب کی
گھڑی پر بھروسا کرکے آفتاب یا کسی ستارہ کی بلندی سے وقت کا
اندازہ کرنا بھول گئے ہیں ۔ جو لوگ بادیہ نشین و صحرا نورد ہیں اور گھڑی
بھی انکے پاس نہیں ہے وہ آفتاب کو یا کسی ستارہ کو دیکھکر خوب
وقت کا اندازہ کرلیتے ہیں ، گاؤں کے رہنے والے رمضان
میں سحری کے لئے جب اُٹھتے ہیں تو پچھلے کے ستاروں کو دیکھکر
وقت پہچان لیتے ہیں ، ہم لوگوں کو اسکی ضرورت نہیں ہوتی
توپیں چلتی ہیں سحری اور ترک کا وقت معلوم ہوجاتا ہے ، پھر کیوں
ستاروں کو دیکھیں ، مگر ایک ستارہ شناس کو اسکی سخت ضرورت
ہے کہ ستارہ کی بلندی سے وقت کا اندازہ کرسکے اور اسکے لئے
ذراسی توجہ کافی ہے اور یہ اچھی طرح سب کو معلوم ہے کہ مشرق سے
مغرب تک بارہ ساعت کا فاصلہ ہے ۔ اپنے سمت الراس سے
چھ ٹکڑے آسمان کے مشرق کی طرف فرض کرلو اور چھ مغرب کی
طرف ۔ اس مسافت کے ہر ہر ٹکڑے کو اہل فن ایک ایک ساعت
کہتے ہیں ۔ یہ بات بھی خیال میں رہے کہ جس ستارہ کو تم نے آج
ایک مقام پر دیکھا ہے کل یہی ستارہ کچھ پیشتر اسی مقام پر آجائیگا
اور یہ تفاوت چار دقیقہ سے زیادہ نہیں ہوتا ، مگر مہینہ بھر میں دوساعت
کا فرق ہوجاتا ہے اور پندرہ دن میں ایک ساعت کا ۔ مثلاً جنوری
کی پہلی تاریخ بارہ بجے جو ستارہ تم نے خط نصف النہار پر دیکھا ہے دوسرے
دن بارہ بجنے سے چار دقیقہ پیشتر یہی ستارہ نصف النہار پر دکھائی
دیگا ، اور جنوری کی پندرھویں کو ایک ساعت پیشتر اسی ستارہ کو
خط نصف النہار پر دیکھوگے اور فروری تک دوساعت کا فرق ہوجائیگا
یعنے دس بجے وہی ستارہ نصف النہار پر آجائیگا ۔

دوسرے اس بات کا بھی اندازہ کرلو کہ تم نقطۂ شمال کی طرف
رخ کرکے جس وقت کھڑے ہو تو تمہارے سر کی سیدھ پر جو نقطہ واقع
ہو اُس نقطے سے لیکر نقطۂ شمال تک جو ایک قوس ہے اس کو
نوّے حصوں میں تقسیم کرو ، ایک ایک حصہ ایک ایک درجہ کہلاتا ہے
پھر اسی قوس کو اپنے نقطۂ راس سے افق جنوبی تک کھینچ لیجاؤ
اور اسکے بھی نوّے حصّے کرڈالو ۔ یہ سمجھو کہ شمال سے جنوب تک
جو ایک نصف دائرہ تمہارے سر پر سے گزرتا ہے اسکی تقسیم ایک سو
اسّی درجوں میں ہے ۔ نوّے درجے شمال کی طرف ہیں اور نوّے
جنوب کی طرف اور یہی دائرہ دائرۂ نصف النہار ہے ۔ آفتاب شمال
میں ہو یا جنوب میں ، جب اس دائرے پر پہنچتا ہے تو دوپہر ہوتی
ہے ، جو ستارہ شمال میں ہو یا جنوب میں جب اس دائرہ پر پہنچتا
ہے وہی وقت اوس کی انتہائے عروج کا ہے اور وہی وقت
اس بات کے اندازہ کرنے کا ہے کہ یہ ستارہ افق شمالی یا افق
جنوبی سے کئی درجہ بلند ہے ۔ جو لوگ جدی کو پہچانتے ہیں انہیں
نصف النہار آنکھوں سے دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اس سبب سے کہ جدی
ہمیشہ نصف النہار پر رہتا ہے ۔ تمہارے سمت الراس سے جدی
تک جو خط ہے وہ گویا خط نصف النہار ہے ۔ پہلے جدی کو پہچاننا
ضرور ہے ۔

ستارۂ جُدَیّ جسے قطب کا تارا کہتے ہیں

اس کا پہچاننا بہت آسان ہے ٹہیک شمال کیطرف دیکھو ایک تارا سب میں ممتاز دکہائی دیگا یعنے گو وہ بہت روشن نہیں ہے اس پر بہی اسکے نیچے جتنے تارے ہیں وہ میٹے میٹے معلوم ہوتے ہیں اور بڑی شناخت تو اس تارے کی یہ ہے کہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا، شام کو تمنے جو تارے مشرق سے طلوع کرتے ہوئے دیکہے تہے وہ دو پہر رات گئے خط نصف النہار پر ہونگے اور اسے شام سے صبح تک دیکہا کرو اپنے مقام سے نہ سرکیگا۔ نظام بطلیموسی کے اعتبار سے یہ تارا گویا ایک کیل ہے جسپر کرہ فلک گردش کر رہا ہے، اور گردش ارض والے یہ سمجہتے ہیں کہ زمین کے محور کی سیدھ میں یہ واقع ہے کہ گردش ارض سے اسکی جگہ نہیں بدلتی بلکہ زمین گردش سالانہ میں کروڑوں کوس مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی طرف آتی جاتی ہے، اسپر بہی اسکی جگہ نہیں بدلتی، اس سبب سے کہ یہ بہت ہی دور ہے۔ ہاں جسقدر بلاد شمالی کی طرف تم جاؤگے یہ تارا بلند ہوتا جائیگا، اور جتنا جنوب کی طرف سرکوگے اتنا ہی پست ہوتا جائیگا، اور اس سے زمین کی کرویت کا ثبوت ہوتا ہے، مگر یہ ستارہ بہی اپنی جگہ سے سرکتا جاتا ہے یعنے ۶۶ برس ۲ مہینہ ۱۲ دن قمری میں ایک درجہ نیچے سرکتا ہے، کئی سو برس کے بعد اسے قطب کا تارا نہیں کہہ سکینگے یہ ستارہ مدراس والوں کو افق شمالی سے کوئی چودہ درجے بلند دکہائی دیتا ہے، حیدرآباد سے اٹھارہ درجے، بمبئی سے انیس اورنگ آباد سے تقریباً بیس، اور ناگپور سے اکیس، کلکتہ سے ساڑہے بائیس، احمدآباد بہوپال جبل پور سے تیئیس، مرشدآباد سے چوبیس، الہ آباد بہاگلپور بنارس آرہ پٹنہ مونگیر سے پچیس چھبیس کے بین بین، اجمیر گوالیار کانپور آگرہ لکہنو فیض آباد سے چھبیس ستائیس کے درمیان سمجہ لو، علیگڑھ شاہجہانپور بیکانیر سے اٹھائیس درجے، دلی رامپور پیلی بہیت سے انتیس لاہور امرتسر شملہ سے کوئی تیس اکتیس درجے قطب شمالی اونچا معلوم ہوگا، خلاصہ یہ کہ جتنا زیادہ عرض بلد ہوگا اسیقدر قطب شمالی اونچا ہوگا جتنا کم عرض بلد ہوگا اسیقدر پست دکہائی دیگا اور جسقدر قطب شمالی بلند ہوتا جائیگا اسیقدر جنوبی آسمان چہپتا جائیگا یعنے جنوب کے بعض روشن ستارے جو حیدرآباد و بمبئی و مدراس سے دکہائی دیتے ہیں وہ لاہور و شملہ سے نہ دکہائی دینگے

قوس نصف النہار کی نوے درجہ میں صحیح تقسیم کرنیکی ان لوگوں کو ضرورت ہے جو عرض بلد کی تحقیق کے درپے ہوں، تم کو ستارہ شناسی کے لئے کسی قدر اندازہ کرلینا کافی ہے۔ تم اس قوس کے دو ہی ٹکڑے کرو، پینتالیس پینتالیس درجے کے یا تین ٹکڑے کرلو تیس تیس درجے کے یا چھ حصے کرلو پندرہ پندرہ درجہ کے اور اس سے ارتفاع قطب کا اندازہ کرلینا کافی ہے، اسی اندازہ سے ہر شخص اپنے اپنے بلد میں قطب کے تارے کو پہچان سکتا ہے اور اس تارے سے سمت الراس تک جو لکیر ہے یہی خط نصف النہار ہے، پایونیر کے مطبع سے جو ایک کتاب صور فلکی کی شناخت کے لئے اہل ہند کے واسطے شایع ہوئی ہے اسمیں بیس درجہ کا عرض بلد مصنف نے ٹہیرالیا ہے اور اسی اعتبار سے سب نقشے بنائے ہیں میں اس مختصر تحریر میں اکثر اسی کتاب سے اخذ کرکے لکہونگا اور زیادہ تر مناط اعتبار اسی کو قرار دونگا

صورۂ جوزا یا باصطلاح مجسطی کوکبۂ جوزا

یونان اور انگلینڈ کے لوگ اسکو Orion کہتے ہیں یعنے شکاری انگن مجسطی میں اسکا نام اوریون لکہا ہے۔ عرب اسکو جوزا اور جبار فلک کے نام سے پکارتے ہیں اس میں کچہہ کچہہ

شکل انسان کی سی پائی جاتی ہے، سر شمال کی طرف، پاؤں جنوب کی جانب
جتنے روشن ستارے اس صورت میں واقع ہیں اتنے کسی صورت فلکی
میں نہیں۔ ایک ستارہ قدر اول کا اسکے دہنے شانہ پہ ہے اور ایک
ستارہ قدر اول کا بائیں قدم پر، شمشیر و کمر بھی اسکی مفصل معلوم ہوتی
ہے، تین ستارے قدر دوم کے کمر پر ہیں، ان تینوں میں کا جو
شمالی تارا ہے وہ ٹھیک معدل النہار پر واقع ہے۔ اس ستارہ کے
طلوع و عروج و زوال و غروب کو دیکھتے رہو تو تم کو معدل النہار
کا صحیح صحیح تصور ہو جائیگا، پھر تین ستارے جو بہت کم روشن ہیں
تلوار کے پیپلے پر واقع ہیں یعنے ان میں کا شمالی تارا قدر چہارم
کا ہے، اور جنوبی قدر سوم کا۔ اور درمیان والا بھی مجسطی میں قدر
چہارم کا ہے، مگر دوربینوں سے معلوم ہوا کہ یہ ستارہ نہیں ہے
بلکہ لطخہ سحابیہ ہے، یعنے کچھ اجسام ہوائی و دخانی ہیں جس سے
دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تازہ
نظام شمسی بن رہا ہے، دو ستارے اور قدر دوم کے اس میں ہیں
ایک بائیں شانہ پر ایک دہنے پاؤں پر اور تین ستارے جیسے
ث کے نقطے ہوتے ہیں بہت ہی ملے ملے سے سر کی جگہ پر ہیں
صاحب مجسطی نے ان تینوں نقطوں کو ستاروں میں نہیں شمار کیا اور
سر کو جوزا کے سحابی لکھا ہے، بس اتنے ہی ستارے اس شکل میں
قابل ذکر ہیں، ورنہ مجسطی کی جدول میں ۳۸ ستارے ہیں۔ یعنے
قدر اول کے ۲، قدر دوم کے ۴، سوم کے ۸، چہارم کے ۱۵ پنجم
کے ۳ ششم کے ۵ سحابی ایک، یہ شکل سر سے قدم تک کوئی بیس
درجہ کی ہے، اور تقریباً ایک ساعت تک نصف النہار پر سے
گزرتی رہتی ہے، پہلے اس کے بائیں شانہ اور قدم پر کا ستارہ نصف النہار
پر آتا ہے، تقریباً اسکے ساتھ ہی ستارہ عیوق بھی آجاتا ہے
شعری یمانیہ اسکے ایک ساعت بعد شعرای شامیہ خط نصف النہار
پر آجاتا ہے۔ اور اسی وقت مغرب کی طرف دیکھو تو ثریا اور
ستارۂ الدبران بھی مایل بغروب دکھائی دینگے غرض ستارہ شناسوں
کے لئے یہ وقت بہت مناسب ہے۔ ان سب کو اک کے دیکھنے
کا موقع ان ان تاریخوں میں ہوگا کہ خط نصف النہار کے قریب دکھائی
دیں گے کچھہ مشرق کی طرف کچھہ مغرب کی طرف۔

جنوری کی پہلی تاریخ		۱۱.۰ بجے
〃	۶	۱۱ بجے
〃	۱۳	۱۰.۰ بجے
〃	۲۱	۱۰ بجے
〃	۲۹	۹.۰ بجے

اسی طرح قیاس کرلو کہ ہر ہفتہ میں تقریباً نصف ساعت کا تقدم ہوگا

جنوری کی پہلی تاریخ		۱۱.۰ بجے
دسمبر کی چودھویں تاریخ		۱۲.۰ بجے
نومبر	۲۹	۱.۰ بجے
نومبر	۱۴	۲.۰ بجے
اکتوبر	۲۹	۳.۰ بجے
اکتوبر	۱۴	۴.۰ بجے
ستمبر	۲۹	۵.۰ بجے

یعنے پندرہ پندرہ دن میں ایک ایک ساعت کی تاخیر ہوگی

جنوری	۱۳	۱۰.۰ بجے
فروری	۱۳	۸.۰ بجے
مارچ	۱۵	۶.۰ بجے

یعنے ہر ہر مہینہ میں دو دو ساعت کا تقدم ہوگا۔ اسی حساب سے
اور تاریخیں تم خود نکال سکتے ہو۔

منکب جوزا

ان تاریخوں میں اور ان اوقات میں جنوب کیطرف رُخ کرکے کھڑے ہو، تم دیکھوگے کہ تمہارے سمت الراس پر کہکشاں ہے اور کوئی تیرہ درجہ کے فاصلہ پر کہکشاں سے متصل ایک روشن ستارہ ہے، یہ ستارہ شکل جوزا کے دہنے شانہ پر ہے اور قدر اول کے بیس ستاروں میں بارہواں ستارہ ہے، اسوقت ذرا نصف النہار سے مغرب کی طرف سرک چکا ہے، اسی کے مقابل ذرا اور مغرب کی طرف بائیں شانہ والا ستارہ جو اسقدر روشن نہیں ہے معلوم ہوگا، ان دونوں ستاروں کے شمال میں ٹمٹماتے ستارے جیسے ث کے نقطے ہوتے ہیں، دکھائی دینگے، یہ جوزا کا سر ہے جسے مجسطی وغیرہ میں ستارۂ سحابی شمار کیا ہے منزل ہقعہ اسی کو کہتے ہیں۔

نطاق جوزا

جوزا کے سر سے کوئی دس درجہ کے فاصلہ پر جنوب کیطرف تین روشن تارے قدر دوم کے دکھائی دینگے یہ نطاق جوزا ہے ان میں کا شمالی تارا معدل النہار پر واقع ہے۔ اب اندازہ کرلینا چاہئے کہ قطب کے تارے سے اس تارے تک جتنا فاصلہ ہے یہ نوّے درجہ کا ہے، یہ تارا جب مشرق سے مغرب تک حرکت کرتا ہے تو کرۂ فلک کے دو ٹکڑے شمالی اور جنوبی الگ الگ دکھاتا ہے، بائیں شانہ کے تارے سے دہنے پاؤں کے تارے تک اگر ایک لکیر کھینچو تو نطاق کے تینوں تارے بھی اسی لکیر میں آجائیں گے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے، یہ تین تارے کمر جوزا پر ہیں، کمر میں تلوار بھی لگی ہوتی ہے، جیسے کاف کا مرکز ہوتا ہے، اس مرکز میں بھی تین چھوٹے چھوٹے تارے ہیں اُن میں بیچ کا تارا کچھ اور ہی شئے ہے، تارا وہ نہیں ہے۔

رجل جوزا

یہ ستارہ بھی قدر اول کے تاروں میں ہے منکب ایمن سے زیادہ روشن ہے، شمار میں ساتواں ہے، منکب ایمن کو اور نطاق کو تم نے پہچان لیا ہے، اب منکب ایمن سے نطاق کے بیچ والے تارے تک ایک لکیر کھینچو اسی لکیر کو اسی قدر اور بڑھاؤ، تو ستارۂ رجل پر گذریگی۔ انگریزی میں بھی اسکو رجل ہی کہتے ہیں (Rigel) اور دہنے پاؤں پر جو ستارہ ہے اسے وہ لوگ سیف (Saiph) کہتے ہیں یعنے تلوار کا پیلہ دہنے پاؤں تک آیا ہوا ہے، جو سراسر خلاف قیاس ہے۔

عیوق

اب شمال کی طرف پھر کر دیکھو تو بہت ہی روشن ایک ستارہ تمہارے سمت الراس سے پچیس چھبیس درجہ کے فاصلہ پر مغرب کی طرف سرکا ہوا دکھائی دیگا، یہ تارا اور شانۂ چپ کا ستارہ اور ستارۂ رجل تقریباً ایک ہی سیدھ میں واقع ہیں۔ عیوق یہی ستارہ ہے افق شمالی سے چونسٹھ درجہ بلند ہم کو دکھائی دیتا ہے اور شمار میں چوتھا ہے۔ کہکشاں کے مشرقی کنارہ پر اسے ڈھونڈو، ایسقدر روشن ہے کہ آنکھ خود بخود اسی پر پڑیگی۔

سہیل

شعریٰ یمانیہ اور سہیل دونوں ستارے نہایت روشن ہیں، سہیل ہمارے سمت الراس سے دور ہے، اور شعریٰ قریب ہے، شاید اسی سبب شعریٰ کو پہلا، اور سہیل کو دوسرا سمجھتے ہیں، ان دونوں تاروں کی روشنی کے سامنے تمام ثوابت شرما جاتے ہیں، ہاں سیارات میں بعض بعض اوقات میں ایسی روشنی ہوتی ہے کہ ان دونوں سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور مشتری و زہرہ تو اکثر روشن تر دکھائی دیتے ہیں، شکل جوزا کے نصف النہار سے سرک جانے کے نصف ساعت

بعد سہیل اس خط پر آجاتا ہے، یہ تارہ افق جنوبی سے سترہ درجہ بلند دکھائی دیتا ہے۔

شعری یمانیہ

ثوابت میں سب سے اول تارہ یہی ہے، خط نصف النہار سے سہیل کے سرک جانے کے نصف ساعت بعد شعری یمانیہ اسی خط پر آجاتا ہے اپنے سمت الراس سے افق جنوبی کی طرف مائل کوئی ۳۵ یا ۳۶ درجہ کے فاصلہ پر دیکھو، یہ اسقدر روشن ہے کہ زیادہ پتہ دینے کی ضرورت نہیں، رجل جوزا و شعری یمانیہ و سہیل کے رنگ میں صاف سبزی معلوم ہوتی ہے۔

شعری شامیہ

تمہارے سمت الراس سے منکب آمین جب دو ساعت کے فاصلہ پر مغرب کی طرف پہنچ جائیگا تو خط نصف النہار پر اسی کے مقام پر کچھ جنوب کی طرف سرکا ہوا ایک روشن تارہ دکھائی دیگا، یہ شامی آٹھواں تارا ہے، عرب سمجھتے ہیں کہ شعری یمانیہ اور شامیہ دونوں بہنیں ہیں، ایک بہن ندی کے پار اتر گئی ایک اسی طرف رہ گئی کہکشاں ان دونوں تاروں کے درمیان ایک نہر سی معلوم ہوتی ہے

الدبران

اسے انگریزی میں بھی (Aldebaran) کہتے ہیں شمار میں تیرہواں تارہ ہے، جس وقت شعری شامیہ خط نصف النہار پر ہو تو یہ ستارہ ہمارے سمت الراس سے مغرب کی طرف تین ساعت کے فاصلہ پر دکھائی دیگا، رنگ اسکا سرخی مایل ہے، یہ برج ثور میں ایسے مقام پر ہے کہ اسے عین الثور بھی کہتے ہیں جامع بہادر خانی میں تصریح کر دی ہے کہ ثور کی جنوبی آنکھ کے مقام پر دبران ہے چند چھوٹے چھوٹے تاروں سے ایسی شکل بنگئی ہے جیسے ۷ کا ہندسہ اسکے ایک سرے پر دبران ہے اور دونوں سروں کا رخ شمال و مشرق کیطرف ہے، زیج الغ بیگ کے حاشیہ میں یہ عبارت ہے

"ہو کمقدم ثور مقطوع من سرتہ قد نکس راسہ للنطح
مقدمہ الی المشرق و موخرہ الی المغرب"

"یعنے برج ثور بیل کا اگلا دھڑ ہے ناف کے پاس سے کٹا ہوا سر اپنا جھکائے ہوئے ہے سینگ مارنے کے لئے مشرق کی طرف اسکا رخ ہے اور مغرب کی طرف پچھلا حصہ"۔

ثریا

دبران سے مغرب کیطرف تقریباً ایک ساعت کے فاصلہ پر کوئی آٹھ نو درجہ شمال کی طرف سرکا ہوا ایک گچھا تاروں کا دکھائی دیگا، جیسے جھمکا ہوتا ہے، لوگ اسے سات سہیلیاں کہتے ہیں، بڑی پہچان اسکی یہی ہے کہ آسمان بھر میں ایسا تاروں کا گچھا کوئی نہیں ہے، جو نظر باز ہیں انہیں غور کرنے سے چھ تارے اس میں دکھائی دیتے ہیں جو قدر پنجم کے ہیں، دوربین سے دیکھئے تو بہت سے تارے اور بھی دکھائی دیتے ہیں جو بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہیں، ثریا بھی برج ثور میں واقع ہے، عاشق لیلیٰ قیس عامری کا یہ مصرع مجھے نہیں بھولتا ع

ارعی الثریا والخلیون نوم

میں تارے گن رہا ہوں اور بے فکرے سو رہے ہیں میرے بعض احباب جو ماہرین فن ادب میں ہیں کچھ شعر کی فکر میں تھے کہنے لگے مصرع کہا ہے۔

ترفعت عما لفقتہ الخلائق

چاہتا ہوں دوسرے مصرع میں بھی ایسا ہی ترفع ہو جیسا اس میں ہے۔ بلکہ مجھسے فرمایش بھی کر دی کہ تم کوئی مصرع سوچو۔ میں نے یہ مصرع کہا۔

وفوق الثریا ثبتت لی نمارق

کہنے لگے تم نے تو مصرع اپنا کرلیا۔

راس التوامین

برج توامین جسے برج جوزا بھی کہتے ہیں اس میں دو ستارے دو بچوں کے سروں پر معلوم ہوتے ہیں ان دونوں میں کا مشرقی ستارہ بھی انہیں میں ستاروں میں شمار کیا گیا ہے' اور جس وقت شعریٰ شامیہ نصف النہار پر ہوتا ہے اوسی وقت یہ بھی عروج پر ہوتا ہے شعریٰ ہمارے سمت الراس کے جنوب میں ذرا فاصلہ پر اور یہ شمال میں بہت قریب دکھائی دیتا ہے' یہ چودہواں ستارہ ہے اسکو اسطرح یاد رکھتے ہیں کہ ایک لکیر اس ستارہ سے شعریٰ شامیہ تک تصور کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک لکیر شعریٰ شامیہ سے منکب ایمن تک۔ ان دونوں لکیروں میں زاویۂ قائمہ پیدا ہوگا دوسرے یہ کہ توامین کے دونوں تاروں سے منکب ایمن تک دو لکیریں برابر کی کھینچتی ہیں' اور مثلث متساوی الساقین بنجاتا ہے حاشیۂ زیج کی یہ عبارت ہے۔ "وہما کصبین عریانین معتنقین ورأسہما وسائر کواکبہما فی الشمال والمشرق علی طرف المجرۃ وارجلہما فی المغرب والجنوب" یعنے دو بچے برہنہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں دونوں کے سر بلکہ تمام تارے شمال و مشرق کی طرف کہکشاں کے واقع ہیں دونوں کے پانوں مغرب و جنوب کی جانب میں یعنے کہکشاں سے متصل ہیں۔

نثرہ

بہت سے اہل ادب اپنے شعر کو شعریٰ اور نثر کو نثرہ کہہ دیا کرتے ہیں مگر نہ شعریٰ کو پہچانتے ہیں نہ نثرہ کو۔ نثرہ کا پتہ لگانے میں مجھے بھی حیرانی ہوئی' مجسطی و زیج الغ بیگ و جامع بہادر خانی کی جدولوں میں کہیں نثرہ کا ذکر نہیں ہے کہ اوس کا مقام معلوم ہوتا' منازل قمری میں نثرہ کا نام ہونا کافی نہیں۔ صراح میں دیکھا تو لکھتے ہیں۔ "نام دو ستارہ نزدیک بیکدیگر از منازل ماہ در برج اسد۔" صاحب غیاث نے آئین اکبری کا بھی حوالہ دے کر یہی مضمون لکھا ہے مگر آخر میں ایک مفید فقرہ بڑھا دیا ہے کہ "در بعضے از رسایل معتبرۂ ہیئت و تنجیم نوشتہ کہ نثرہ چون پارہ ابر است بر سینۂ سرطان درمیان چہار کوکب بر شکل مربع منحرف۔" اب سرطان کے ستاروں کو زیج وغیرہ میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس میں ایک لطخۂ سحابی چار ستاروں کے درمیان واقع ہے' مغربی دو ستاروں کو عرب حمارین کہتے ہیں الغ بیگ نے دونوں حماروں کو روشنی کے اعتبار سے قدر چہارم کا لکھا ہے' نثرہ انہیں دونوں تاروں کے متصل ہے' ہمارے سمت الراس سے دو تین درجے شمال کیطرف سرکا ہوا ہے' مجسطی کے گیارہویں مقالہ فصل تصحیح حرکات العلویہ سے اسکی تائید ہوتی ہے' جہاں بطلیموس رصد مشتری کے ذکر میں کہتا ہے' "انہ ستر الحمار الجنوبی الذی عند النثرہ" نثرہ کے قریب جو ستارہ حمار جنوبی کہلاتا ہے مشتری نے اُسے ڈھانک لیا تھا۔ عرب کا یہ فقرہ مشہور ہے "طلوع النثرۃ علی اثر طلوع الشعریٰ" شعریٰ کے پیچھے پیچھے نثرہ طلوع کرتا ہے اور ٹھیک شعریٰ شامیہ کے ایک ساعت بعد نثرہ طلوع کرتا ہے نصف النہار پر جب پہنچتا ہے تو ہمارے سمت الراس سے کسی قدر مایل بشمال گزرتا ہے اور اسمیں بھی شک نہیں کہ عرب اسی کو نثرۃ الاسد کہتے ہیں۔ لسان العرب کا یہ مصرع شاہد ہے کہ عرب نثرہ کو شکل اسد میں شمار کرتے تھے۔ ع

کا والسماک بہا او نثرۃ الاسد

مگر مجسطی کے فقرہ سے ثابت ہے کہ حمار جنوبی نثرہ کے پاس ہے' اور حمار جنوبی و نثرہ دونوں سرطان میں ہیں۔ غرض نثرہ کوئی تارا نہیں ہے۔ لطخہ سحابی ہے جو حمارین کے قریب واقع ہے اور اہل تنجیم اوسے برج سرطان میں گنتے ہیں۔ یعنے جب نثرہ کو اور حمارین کو

اور دو اور اندھے تارے جو ذرا فاصلہ پر مشرق کی طرف ہیں
اُن کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ سرطان عبارت اسی سے ہے۔ دونوں
مشرقی تارے اُس کے ہاتھ معلوم ہوتے ہیں اور دونوں مغربی
تارے جو قریب قریب ہیں اُسکے پچھلے دو پاؤں ہیں۔ نثرہ کے
لغت میں لسان العرب کی عبارت جو تہذیب سے منقول ہے
قول فیصل ہے:

النثرۃ کوکب فی السماء کانہ لطخ سحاب
نثرہ آسمان کا ایک ستارہ ہے لطخہ سحاب کا سا
حیال کوکبین تسمیہ العرب
دو ستاروں کے بیچ میں عرب اُس کو
نثرۃ الاسد و ھی من منازل القمر
نثرۃ الاسد کہتے ہیں اور علم نجوم میں اُسے
قال و ھی فی علم النجوم من برج السرطان
برج سرطان میں شمار کرتے ہیں

یہ بھی خیال رہے

(۱) کہ عیوق سے رجل تک جتنا فاصلہ ہے تقریباً
اتنا ہی فاصلہ ہے رجل سے سہیل تک اور ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ یہ تینوں روشن ستارے ایک ہی سیدھ میں ہیں۔

(۲) دونوں شعریٰ اور منکب ایمن سے ایک مثلث متساوی
الاضلاع پیدا ہے۔

(۳) دونوں شعریٰ اور منکب ایمن و رجل سے لوزات کی
سی شکل پیدا ہے۔ جسے اصطلاح ہندسہ میں شکل معین کہتے ہیں

(۴) و بران و شعریٰ یمانیہ و منکب ایمن و رجل سے بھی لوزات
کی شکل پیدا ہے۔ آسمان کے اس قطعہ آٹھ ستارے قدر اول کے اور
برج ثور و برج جوزا و برج سرطان کو تم نے پہچان لیا۔ اب اس کی
اعانت سے بہت کچھ پہچان سکتے ہو۔

برج اسد

زیج الغ بیگی کے حاشیہ میں ہے کہ "وجہہ الی المغرب و ظہرہ
الی الشمال" شیر کا منہ مغرب کی طرف اور پشت شمال کی جانب ہے
اس شکل میں شیر سے بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دو ساعت
سے زیادہ دیر تک نصف النہار پر سے اسد گزرتا رہتا ہے۔ ان
اوقات میں دیکھو تو نصف النہار گزر چکتا ہے۔

	تاریخ	وقت
اپریل کی پہلی	تاریخ	گیارہ بجے کے ۲۵ دقیقہ
"	۶	۱۱ بجے
"	۱۴	۱۰ بجے
"	۲۲	۱۰ بجے
"	۳۰	۰۹ بجے
جنوری	۱۳	۰۴ بجے
فروری	۱۳	۰۲ بجے
مارچ	۱۵	۱۲ بجے
اپریل	۱۴	۱۰ بجے
مئی	۱۵	۰۸ بجے

ذنبال اسد

یہ ستارہ جو ہمارے سمت الراس سے کوئی دو تین
درجہ جنوب کی طرف سرکا ہوا ہے۔ قدر دوم کا ستارہ ہے مجسطی
و زیج وغیرہ کی جدولوں میں اسے قدر اول کا ستارہ شمار کیا ہے
اس تارے کو انگریزی میں Denebola کہتے ہیں ذنبالہ
کی خرابی ہے اور عرب اسی کو صرفہ کہتے ہیں۔ ذنبال اسد کا ستارہ
کوئی پندرہ بیس دقیقہ کے فاصلہ پر ہمارے سمت الراس سے
جنوب و مغرب کی طرف سرکا ہوا دکھائی دیگا۔

قلب الاسد

ستارہ دنبال سے مغرب کی طرف کوئی دو ساعت کے فاصلہ پر ایک
روشن ستارہ دکھائی دیگا۔ اسکو قدمانے بھی اور یورپ والوں نے
بھی قدر اول کے تاروں میں گنا ہے۔ یہ اُن بیس تاروں
میں کا سولھواں ستارہ ہے جو درازی فلک میں محسوب ہیں۔
قلب عقرب کے شمال میں تین تارے اور ہیں۔ چاروں تاروں
کی ایک لہر سی معلوم ہوتی ہے۔ جس میں قلب عقرب اور تیسرا
تارا بہت روشن ہے اور دوسرا اور چوتھا دونوں قدر سوم کے
ہیں۔

بنات النعش

یہ سات تارے ہمارے شمال میں ہیں۔ قلبۂ دہقان کی سی شکل ان
تاروں کی ہے ان میں سے چھ تارے قدر دوم کے ہیں۔ ایک
کے دو تارے جو اس وقت مغرب کیطرف خط نصف النہار
سے ایک ساعت یا کچھ زیادہ فاصلہ پر ہیں انہیں دونوں کی
سیدھ میں قطب کا تارا واقع ہے۔ یہ دونوں ستارہ قطب کے
بتانیوالے مشہور ہیں اور دو تارے اور نصف النہار کے متصل ہی
ہیں ان دونوں میں کا شمالی تارا قدر سوم کا ہے یہ چاروں
تارے ملکر نعش کی سی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اب خط نصف النہار
سے مشرق کی طرف دو ساعت کی مسافت تک تین روشن
تارے اور ہیں یہ ساتوں ملکر بنات النعش کہلاتے ہیں مگر انگلنڈ
والے غلطی سے ساتواں جو سب کے آخر میں جنوب و مشرق
کی طرف مائل ہے اُسی کو بنات النعش کہتے ہیں۔
(Benetnasch) یہ ساتوں تارے تین ساعت
تک نصف النہار پر سے گزرتے رہتے ہیں۔ انہیں تاروں کے
ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے تارے اور شریک ملکر کے دب اکبر
کی شکل کا کچھ تصور کر لیتے ہیں مگر مفصل نہیں معلوم ہوتی اس
سبب سے اُسکا بیان یورپ والوں نے ترک کر دیا ہے بلکہ تمام
اشکال فلکی میں سے بس روشن تاروں کو نقشہ میں دکھا دیتے
ہیں اور باقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ساتوں تارے ہمارے
سمت الراس سے کوئی تیس چالیس درجہ کے فاصلہ پر اور
افق شمالی سے پچاس ساٹھ درجہ کی بلندی پر ہیں۔

سُہا

یہ ستارہ بہت ہی ذرا سا ہے۔ اسی سبب سے تمام ثوابت میں ممتاز
عرب اس تارے پر قوت بصارت کا امتحان کیا کرتے تھے اہل ادب
کی نظر سے یہ فقرہ گزرا ہوگا۔ اُرِیہَا السُّہا وتُرِینی القمر۔ یعنے
یعنے عین اختلاط کے وقت اپنی معشوقہ سے مینے ستارۂ سہا کو
پوچھا وہ لذت وصل سے ایسی بیخود ہو رہی تھی کہ چاند کی طرف
اشارہ کرنے لگی۔ سہا کا پتہ تم کو آسانی سے ملسکتا ہے۔
بنات النعش کے تین روشن تارے جو مشرق کی طرف ہیں۔
ان میں سے بیچ والے تارے کے متصل ذرا مشرق کی طرف
دیکھو تعجب ہوگا کہ اتنا سا فتنہ چمک کسقدر رکھتا ہے، مگر
جوان آنکھیں ہونا شرط ہے۔

ستارۂ صلیب جنوبی

جن تاریخوں میں اوقات رصد کی تعیین اوپر کیگئی ہے انہیں
اوقات میں جنوب کی طرف افق سے آٹھ سات درجہ بلند
ایک روشن تارہ دکھائی دیتا ہے بلاد شمالی کے لوگ اُسے
دیکھ نہیں سکتے۔ اسی سبب سے بلاد اسلام میں اسکا نام کچھ
نہیں رکھا گیا۔ بلکہ مجسطی میں صلیب کوئی شکل ہی نہیں یہاں
ذکر اس تارہ کا اس سبب سے مناسب معلوم ہوا کہ یورپ کے اہل
رصد نے قدر اول کے بیس تاروں میں بیسواں اس کو قرار دیا ہے

چار روشن تارے صلیب کی شکل کے صاف معلوم ہوتے ہیں ان میں جو تارا کہ پائین صلیب میں واقع ہے یہ کوکب دُرّی ہے۔

سماک اعزل

برج سنبلہ کا روشن تارہ یہی ہے ایک ساعت اور چند دقیقے بعد خط نصف النہار پر آنے کو ہے' اپنے سمت الراس سے تیس درجہ کے فاصلہ پر جنوب کی طرف دیکھو۔ سماک اعزل دکھائی دیگا۔ ہمارے قدما سنبلہ بھی اسی کو کہتے ہیں۔ مگر منجمین اسے برج میزان میں گنتے ہیں ۶۸ برس ۳ مہینہ ۱۲ دن میں ایک درجہ حرکت کرتا ہے اسی طرح برج سنبلہ سے برج میزان میں آگیا' بنات النعش کا چھٹا تارا جس کی ردایف میں سہا ہے اسکے ساتھ ہی نصف النہار پر ہوتا ہے اب ذرا شمال کی طرف پھر جاؤ چند دقیقے بعد خود سہا نصف النہار پر ہوگا شاید اب نظر آجائے۔ سماک اعزل شمار میں پندرہواں ہے اس ستارہ اور اسد کے درمیان صورت عذرا ہے جو صاف نہیں معلوم ہوتی

سماک رامح

یورپ کے اہل رصد نے اسے پانچواں تارا شمار کیا ہے' سماک اعزل کے ایک ساعت بعد یہ ستارہ ہمارے سمت الراس پر آجاتا ہے بنات النعش کے ساتویں تارے سے سماک رامح تک اور سماک رامح سے سماک اعزل تک قریب قریب برابر کی مسافت پائی جاتی ہے۔ ان تینوں تاروں میں ایک بڑا سا مثلث متساوی الساقین بن سکتا ہے جسمیں زاویہ منفرجہ سماک رامح پر واقع ہوگا۔ آفتاب کی طرح اس تارے کے رنگ میں بھی زردی پائی جاتی ہے۔

قنطورس

قدیم زمانہ میں عجیب غریب پرندے تھے۔ سیمرغ و عنقا و موسیقار و ققنس و ہما انہیں کے ساتھ دواب میں یہ عجیب الخلقت جانور بھی یونانیوں کے اہل ادب میں مشہور ہے۔ زیج کے حواشی میں اسکی صورت کا بیان اسطرح ہے۔ ھو کحیوان من راسه الی ظهره مقدم انسان و من منشاء ظهره الی ذنبه مؤخر فرس یعنے سر سے کمر تک انسان ہے اسکے نیچے گھوڑے کا سا ڈیل ہے۔ اس کے تاروں میں تیسواں تارا جسے بطلیموس نے مجسطی میں قدر سوم کے تاروں میں شمار کیا ہے الغ بیگ اُس کو لکھتے ہیں کہ عبد الرحمٰن گفتہ است کہ اینجا ہیچ کوکبے مرئی نیست مگر جامع بہادر خانی کی جدولوں میں اسی تارے کو عبد الرحمٰن بن صوفی کے مرصودات میں قدر سوم کا لکھ دیا ہے یورپ والے اسے (centaurus) کہتے ہیں۔

رجل قنطورس

صاحب حاشیہ لکھتے ہیں والنیر الذی علی طرف ید الدابة المقدمة وھو من القدر الاول یسمی رجل قنطورس یعنے وہ روشن تارا جو گھوڑے کی ٹاپ پر ہے اور قدر اول کے تاروں میں ہے اُسے رجل قنطورس کہتے ہیں۔ نور و ضیا کے اعتبار سے سماک رامح کے بعد اس کا نمبر ہے۔ قدر اول کے بیس تاروں میں یہ چوتھا ستارہ ہے اور ہمارے نظام شمسی سے اقرب ثوابت یہی تارا ہے پہلے شعری یمانیہ کو تمام ثوابت میں زیادہ روشن دیکھکر گمان کرتے تھے کہ اقرب ثوابت یہی ہے مگر پیمایش صحیح سے یہ بات مقرر ہوگئی کہ اقرب ثوابت رجل قنطورس ہے

سماک رامح جب تمہارے سمت الراس پر سے گزر جائے تو جنوب کی طرف جہاں صلیب تھی وہاں دیکھو افق سے دس بارہ درجہ بلند دو روشن ستارے اس طرح سے دکھائی دینگے جیسے دور سے گاڑی کی دو لالٹینیں نظر آتی ہیں۔ ان دونوں میں مشرقی تارا اقرب ثوابت ہے اور مغربی تارا ہمارے قدما کے اندازہ میں قدر دوم کے تاروں میں تھا مگر اس زمانے کے اہل رصد نے اسے بھی نہیں

بیں تاروں میں گنا ہے۔ یہ شمار میں دسواں ستارہ ہے مشرقی تارا
فرس کے دہنے پاؤں پر ہے اور مغربی تارا بائیں پاؤں پر دونوں بھی
روشنی میں وہی نسبت ہے جو چھ اور دس میں ہوتی ہے بلاد اسلام
میں یہ دونوں تارے بھی مشہور نہیں ہیں مگر جنوبی اصطرلاب پر مشرقی
تارے کی تصویر ضرور ہوتی ہے۔

فرقدین

ان دونوں تاروں کو عرب نے یہ تصور کیا ہے کہ سفید سفید دو
بچے گائے کے بیٹھے ہوئے دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر
ثوابت کو تم پہچان چکے ہو جب یہ نصف النہار پر سے گزر جائے
تو شمال کی طرف پھر کر دیکھو۔ قطب کے تارے سے کوئی پندرہ
سولہ درجہ بلند دو تارے دکھائی دینگے ان میں کوکب جنوبی قدر
دوم کا اور شمالی قدر سوم کا تارہ ہے۔ مگر دونوں بہت ہی
ممتاز ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ قطب کے گرد پھرتے معلوم ہوتے ہیں
اور آسانی سے پہچان لئے جاتے ہیں انگریزی میں بھی انہیں
الفرکدین کہتے ہیں۔

آسمان کے اس قطعہ میں تم نے چھ تارے قدر اول کے پہچان لئے
اور برج اسد و سنبلہ کے مقامات بھی معلوم ہو گئے۔

یہ بھی خیال رکھو کہ ۱۔ رجل جوزا شعری شامیہ قلب الاسد ذنب
الاسد سماک رامح قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہیں۔
۲۔ سماک رامح سماک اعزل ذنب الاسد ایک مثلث
متساوی الاضلاع ہے

عقرب

اشکال فلکی میں بہت بڑی شکل عقرب کی ہے یہ
جنوباً و شمالاً کوئی تیس درجہ تک اور شرقاً و غرباً دو ساعت کی
مسافت تک پھیلی ہوئی ہے، اژدہے کے برابر بچھو ہے اور بہت
مفصل و ممتاز معلوم ہوتا ہے بچھو کے نیش میں جس طرح گرہیں گرہیں سی
میں ویسا ہی خم اور ویسی ہی گرہیں اسکے بھی دیکھ لو ہر ہر گرہ کے مقام
پر ایک ایک تارہ ہے آٹھ سات تارے قدر سوم کے اسکے نیش
میں ہیں یہ شکل ساری کہکشاں کے اندر واقع ہوئی ہے۔ مغرب
کی طرف اسکا منہ اور جنوب مشرق کی طرف اسکا ڈنک ہے۔ اسکے
دیکھنے کا رخ ہی بہت اچھا ہے جب نصف النہار پر سے گزر کر مائل
بغروب ہو۔ ان اوقات کی تفصیل یہ ہے۔

تاریخ		وقت
جولائی کی پہلی تاریخ		۱۱۰ بجے
〃	۷	۱۱ بجے
〃	۱۵	۰۱۰ بجے
〃	۲۲	۱۰ بجے
〃	۳۰	۰۹ بجے
جون	۱۵	۰۱۲ بجے
〃	۱	۰۱ بجے
مئی	۱۵	۰۲ بجے
〃	۲	۰۳ بجے
اپریل	۱۴	۰۴ بجے
مارچ	۳۱	۰۵ بجے
اگست	۶	۹ بجے
〃	۱۴	۰۸ بجے
〃	۲۱	۸ بجے
〃	۲۹	۰۷ بجے

قلب العقرب

عقرب کے قلب کے مقام پر ایک سرخ تارا ہے جسے عرب ثانی تیخ
کہتے ہیں کوکب دری ہے شمار میں سترہواں تارہ بھی ہے

دو ستاروں کے درمیان یہ تارہ بہت ہی تناسب و انتظام کیساتھ جڑا ہوا ہے، وہ دونوں تارے قدر سوم کے ہیں۔ تینوں ایک ہی خط میں واقع ہیں۔ خط کا ایک سرا شرقی شمالی ہے دوسرا غربی جنوبی۔ ہمارے سمت الراس سے افق جنوبی تک نوے درجے کا فاصلہ ہے، قلب عقرب درمیان اس مسافت کے واقع ہے اور کہکشاں کے شمالی کنارے پر ہیں۔ قلب عقرب و سماک اعزل و سماک رامح میں مجھے ایک مثلث متساوی الساقین سا معلوم ہوتا ہے، جسکی ساق شمالی کسی قدر بڑی ہے اور قلب عقرب و سماک اعزل و قلب اسد تقریبًا ایک ہی سیدھ میں معلوم ہوتے ہیں۔

شولہ

نیش عقرب کی سات گرہیں جہاں تمام ہوتی ہیں وہاں دو تارے اسطرح تلے اوپر ہوگئے ہیں کہ ڈنک کی نوک صاف معلوم ہوتی ہے انہیں دونوں تاروں کو شولہ کہتے ہیں۔ قلب عقرب کا اور شولہ کا شمار منازل قمر میں ہے۔ لیکن قلب عقرب سے تو چاند بہت ہی بچکر کے نکلتا ہے، اسکے منزل قمر ہونے میں شک نہیں۔ ہاں شولہ کے قریب چاند کو مینے کبھی نہیں دیکھا، بلکہ تمام سیارات کے مدار سے شولہ بہت فاصلہ پر جنوب کی طرف رہجاتا ہے، شولہ کا شمار برج قوس میں ہے۔

نسر واقع

یورپ کے اہل رصد نے جو قدر اول کے بیس تارے تجویز کئے ہیں نسر واقع انمیں کا تیسرا تارہ ہے، یعنے سہیل کے بعد اسکا نمبر ہے۔ اوپر جن اوقات کو معین کردیا ہے انہیں وقتوں میں نصف ساعت کے بعد نسر واقع خط نصف النہار پر آجائیگا اور ہمارے سمت الراس سے بیس درجے شمال کی طرف سرکا ہوا ہوگا۔ اور اسکے [illegible] کر [illegible] ساعت کے فاصلے پر نسر الفکہ ایک قدر دوم کا چمکتا تارہ دکھائی دیگا جو شکل اکلیل میں واقع ہے سماک رامح اور نیر الفکہ اور نسر واقع تقریبًا ایک ہی خط میں واقع ہیں اور جنوب شرق سے شمال مغرب کی طرف اس خط کا رخ ہے۔

نسر طائر

یہ تارہ بھی کوکب دری ہے، یورپ والوں کے شمار میں گیارہواں ہے، نسر واقع کے ایک ساعت چند دقیقہ کے بعد نصف النہار پر آجائیگا ہمارے سمت الراس سے کوئی دس درجہ جنوب کی طرف سرکا ہوا ہے، نسر واقع اور نسر طائر کے درمیان کہکشاں ہے۔ عرب کا یہ خیال ہے کہ ایک کرگس ندی کے اوس پار دونوں پروں کو سمیٹے ہوئے بیٹھا ہے، اور دوسرا اس پار دونوں پر پھیلا اُڑ رہا ہے، ان دونوں تاروں کے قریب جو چھوٹے چھوٹے تارے ہیں اُن سے سمٹے ہوئے اور پھیلے ہوئے پروں کا تصور بہت آسانی سے ہوجاتا ہے، جس طرح قلب عقرب کے دونوں پہلوؤں میں دو چھوٹے چھوٹے تارے قدر سوم کے تم نے دیکھے اسی طرح نسر طائر کی صورت میں بھی روشن تارے کے دونوں جانب قدر سوم کے دو تارے ہیں۔ تینوں ایک ہی خط میں واقع ہیں اسی خط کو شمال کی طرف اور بڑھاؤ تو نسر واقع تک پہنچتا ہے عقاب بھی اسے کہتے ہیں۔

نسر الذنب

انگریزی میں اس تارہ کو Deneb یعنے ذنب کہتے ہیں یہ بیس میں کا اٹھارواں ہے نسر طائر کو زوال ہوجانے کے ایک ساعت بعد یہ تارہ خط نصف النہار پر آجاتا ہے، مگر ہمارے سمت الراس سے شمال کی طرف ہے، جس مقام پر نسر واقع کو تمنے دو ساعت پیشتر دیکھا تھا اُس سے بھی کئی درجہ شمال کی طرف سرکا ہوا یہ تارا دکھائی دیگا، یوں سمجھو کہ نیر الذنب سی

نسر واقع تک اور نسر واقع سے نسر طائر تک جو دو خط کھینچے جائیں
تو زاویہ قائمہ پیدا ہوگا۔

ہمارے قدما نے قلب عقرب و نسر طائر و نیر الذنب کو
قدر اول میں شمار نہیں کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان تاروں میں
نسر واقع کی سی روشنی نہیں ہے۔

برج میزان

سماک اعزل و شکل عقرب کے درمیان جو خالی جگہ
دکھائی دیتی ہے یہی میزان ہے اس میں کوئی ایسا روشن
ستارہ نہیں ہے جس پر نظر اٹکے چھوٹے چھوٹے آٹھ تارے ہیں
جن میں کچھ ترازو کی ڈنڈی کچھ پلّوں کی سی صورت فرض
کر لیگئی ہے۔ اس کے بعض تارے تو آخر برج میزان ہی
تک ہیں اور بعض برج عقرب کے اول میں شمار کئے جاتے ہیں
سماک اعزل سے قلب عقرب تک ایک لکیر کا تصور کرو اسی خط
پر دو تارے قدر سوم کے دکھائی دیتے ہیں ان میں کا شمالی
تارا زبانائے شمالی ہے اور جنوبی تارا زبانائے جنوبی میزان
کے دونوں پلوں پر یہ تارے ہیں۔

برج قوس

یہ دوسرا قنطورس ہے۔ اسمیں اور اسمیں اتنا ہی فرق ہے
کہ اسکے ہاتھ میں تیر کمان بھی ہے، تیر کے پیکان کا رخ مغرب کی
طرف ہے اور کمان کے گوشے مڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
شولہ میں اور پیکان میں کوئی نصف ساعت کی مسافت ہے مگر
تیر کا پیکان نیش عقرب سے کئی درجہ بلند ہے۔ تیر اور کمان کے
اور اسکے شانوں پر کے ستارے کہکشاں میں چمکتے ہوئے دکھائی
دیتے ہیں جو قدر سوم کے ستارے ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے
چار آئینہ پہنے ہوئے ہے۔

آسمان کے اس قطعہ میں تم نے چار تارے قدر اول کے
اور تین برج بھی اور پہچان لئے۔ اب اس سبق کے تمام ہونے میں
دو تارے اور چار برج اور باقی ہیں۔

ذات الکرسی

مجسطی میں اسکا نام قاسیا (Cassiopeia) ہے
اس شکل میں چھوٹے چھوٹے بہت سے تارے ہیں انمیں کے
پانچ تارے قدر سوم کے کہکشاں میں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے
ہیں جنہیں انگریزی کے میم (M) کی سی صورت ( )
یا کرسی کی سی شکل معلوم ہوتی ہے یا اونٹ کے دو کوہان دکھائی
دیتے ہیں۔ بائیں طرف کا کوہان ذرا اونچا ہے جو زاویہ قائمہ پر
واقع ہے۔ دہنی طرف کا نیچا جسمیں زاویہ منفرجہ پایا جاتا ہے
چاروں لکیروں سے یہ میم بنا ہے۔ ہر لکیر کے دونوں سروں
پر قدر سوم کے تارے ہیں۔ یورپ کے علما اب انہیں پانچ
تاروں کو ذات الکرسی سمجھتے ہیں کہ یہ کسیقدر روشن ہیں باقی
تارے اس شکل کے بہت مٹے سے ہیں۔ بنات النعش میں
اور ذات الکرسی میں تقریباً دس بارہ ساعت کی مسافت کا فاصلہ
ہے یعنے بنات النعش کے غروب کا اور ذات الکرسی کے طلوع کا
قریب قریب ایک ہی وقت ہے۔ بنات النعش کے تارے زیادہ
روشن اور زیادہ بلند ہیں ذات الکرسی کے تارے ستارۂ قطب
سے کوئی تیس بتیس درجے کے فاصلہ پر ہیں اور بنات النعش
سے کوئی پانچ چھہ درجے شمال کی طرف زیادہ سرکے ہوئے ہیں
بنات النعش جب نصف النہار پر ہو تو سمجھو کہ ذات الکرسی کے
تارے افق شمالی کے نیچے ہونگے۔
یہ پانچوں تارے دو ساعت سے کم میں نصف النہار پر سے گزر جاتے
ہیں۔ ذات الکرسی کا پہلا تارا جسوقت نصف النہار کے قریب

پہنچتا ہے - یورپ کے نقشوں سے معلوم ہوا کہ نقطہ اعتدال ربیعی
بہی اُسی وقت نصف النہار پر ہوتا ہے اسی نقطے سے برج حمل
شروع ہے اور طول کواکب کی پیمایش کو بہی اہل رصد اسی نقطے
سے شروع کرتے ہیں - ان تاروں کے دیکہنے کی چند تاریخیں
یہ ہیں۔

اکتوبر کی چہٹی تاریخ	۱۱ بجے
〃 ۱۴	۱۰. بجے
〃 ۲۱	۱۰ بجے
〃 ۲۹	۹. بجے
نومبر کی چہٹی تاریخ	۹ بجے
〃 ۱۴	۸. بجے
〃 ۲۱	۸ بجے
〃 ۲۹	۷. بجے
جولائی کی پندرہویں	۴. بجے
〃 ۲۱	۴ بجے
〃 ۲۹	۳. بجے
اگست کی چہٹی	۳ بجے
〃 ۱۴	۲. بجے
〃 ۲۱	۲ بجے
〃 ۲۹	۱. بجے
ستمبر کی چہٹی تاریخ	۱ بجے
〃 ۱۴	۱۲. بجے
〃 ۲۱	۱۲ بجے
〃 ۲۹	۱۱. بجے

کف الخضیب

مجسطی میں ذات الکرسی کے تاروں میں کف الخضیب کو قدر
سوم کا تارا لکہا ہے اور پتہ اُسکا دیتے ہیں اس طرح سے کہ الذی
فی وسط المسند ھو کف الخضیب - تکیہ کرسی کے بیچ
میں کف الخضیب ہے اور وہ شمار میں بارہواں ستارہ ہے اس
شکل کا یہ ستارہ ۶۶ (۶۶) برس ۶ مہینہ ۱۴ دن قمری کی مدت میں
ایک درجہ حرکت کرتا ہے' - صورت ذات الکرسی میں اسکا مقام
دہونڈہو - حواشی زیج الغ بیگ کی عبارت یہ ہے۔
ھی کامرءۃ جالسۃ علی کرسی لہ مسند
جیسے ایک عورت دونوں پاؤں لٹکائے کرسی پر بیٹہی ہے
وقد ادلت رجلیھا - کواکبھا ثلاثۃ
کرسی میں بیٹہکے ٹانگے لٹکانے کا سہارا بہی ہے اس شکل میں تیرہ ستارے
عشر - منھا کوکب علی وسط المسند یسمی
ہیں - تکیۂ کرسی کے وسط میں جو ستارہ ہے
کف الخضیب وھو من الثالث ویعرف بسنام
کف خضیب اسکا نام ہے اور کوہان ناقہ کرکے معروف ہے
الناقۃ - ویقال انہ اذا وصل الی نصف النھار
اور کہتے ہیں جب کف الخضیب نصف النہار پر
کان الدعاء فی ذالک الوقت مستجاب الا
پہنچے تو ظالم کے سوا اور کوئی دعا کرے تو
من ظالم
مستجاب ہوتی ہے۔
حواشی کا بیان مجسطی کے ساتھ مطابقت رکہتا ہے اور کوہان
ناقہ کے لفظ نے کف الخضیب کا بہت صاف پتہ دیا ہے انگریزی
کتابوں میں جو ذات الکرسی کی تصویریں ہیں - اسمیں پہلا تارا
تکیۂ کرسی کے کنارے پر ہے دوسرا تارہ عورت کے سینہ پر ہے

اور ایک چھوٹا سا تارا اسکی بائیں کلائی کے پاس ہے۔ اس اعتبار سے
سینہ پر کا تارا وسط میں واقع ہے، اور یہی تارا اس شکل کا بہت مشہور
ہے۔ انگریزی میں اسے ستارہ الف کہتے ہیں اور اس کا شمار
رنگ بدلنے والے تاروں میں کرتے ہیں۔ بڑے پانچ تاروں میں کا
تیسرا تارا عورت کی رانوں پر ہے، چوتھا گھٹنوں پر ہے، پانچواں
پاؤں کے قریب گوشۂ دامن پر ہے، اس شکل میں سب یہی پانچ
بڑے تارے قدر سوم کے ہیں، ان میں کا دوسرا تارا جسے عرب
سنام ناقہ کہتے ہیں اور یورپ والے ستارہ الف کہتے ہیں، یہی
کف الخضیب ہے جو عورت کے سینہ پر اسکے قلب کی حرکت کیساتھ جھلملاتا ہے یا اسکو کف الخضیب
خط نصف النہار کے قریب آنے کو ہے اور دعا مانگنے کا وقت آگیا دیکھو وہ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے یا اللہ
اللہ کر رہی ہے۔ حدایق النجوم میں ہے۔ علامہ قطب الدین در نہایہ
الادراک آوردہ کہ چوں کف الخضیب بہ نصف النہار رسد دعا مستجاب شود
الا دعائے ظالم، اور زیج بہادرخانی میں کف الخضیب کے نصف النہار
پر منجنی کی جدولیں بنا دی ہیں، اُن جدولوں سے دن کے اوقات
میں بھی جسوقت یہ تارا نصف النہار پر ہو اُسکا استخراج آسانی سے
ہو سکتا ہے۔

برج حوت

دو مچھلیاں ہیں دھاگے میں دونوں کی دمیں بندھی ہوئی
مشرقی مچھلی میں آٹھ تارے قدر چہارم کے ہیں۔ مغربی مچھلی میں
بارہ تارے ہیں وہ بھی بعض قدر چہارم کے اور بعض قدر پنجم و ششم
کے، چودہ تارے دونوں دھاگوں میں ہیں۔ کوئی روشن تارا
اس شکل میں نہیں۔ جس مقام پر دونوں دھاگوں میں گرہ ہے وہاں
ایک ستارہ قدر سوم کا ہے اور دو تاروں کے بعد ایک اور تارا
قدر سوم کا ہے، یہ دونوں مچھلیاں معدل النہار کے شمال میں
اسوقت ہمارے سمت الراس سے بہت قریب ہیں اگر کوئی چھوٹی
سی معمولی دوربین سے دیکھا جائے تو کچھ تصور اس شکل کا ہو جائیگا

برج دلو

حاشیۂ زیج کی عبارت یہ ہے۔

وھو الدلو کواکبہ اثنان و اربعون
وہ برج دلو ہے۔ اوس میں بیالیس تارے ہیں
والخارج ثلاثۃ۔ و ھو کرجل قائم
اور تین تارے اس شکل سے خارج ہیں ایک شخص کھڑا ہوا ہے
راسہ فی الشمال و رجلاہ فی الجنوب
جس کا سر شمال کیطرف ہو اور دونوں پانوں جنوب کیطرف
باحدی یدیہ کوز قد قلبہ۔ وانصب
ایک ہاتھ میں کوزہ لئے ہوئے ہو اور اسے الٹ دیا ہو۔ کہ پانی بہہ کر
الماء الی مقام رجلیہ
اس کے پاؤں تک پہنچا ہے

بطلیموس نے مجسطی میں اسکی سب تاروں کا
طول و عرض جس جدول میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
اسکے بائیں ہاتھ میں کچھ کپڑا سا ہے اسے ساکب الماء بھی
کہتے ہیں۔ یورپ کے لوگ تمام صور فلکی کو عموماً اور اس شکل کو خصوصاً
محض اوہام و خرافات سمجھتے ہیں۔ وہ تاروں کا پتہ دینے کے
لئے اشکال ہندسے سے کام نکال لیتے ہیں مثلاً برج دلو میں
معدل النہار پر چھوٹے چھوٹے تین تاروں کا ایک چھوٹا سا مثلث
متساوی الاضلاع ہے اور مثلث کے بیچوں بیچ میں ایک ستارہ ہے
بطلیموس لکھتا ہے کہ ڈول جو الٹ گیا ہے تو پانی کئی جگہ بہکر
جنوب میں ایک مچھلی کے منہ تک پہنچا ہے۔ اس شکل کے بیالیس
تاروں میں آٹھ سات تارے قدر سوم کے ہیں۔ ان میں سے
داہنے شانہ کا روشن تارہ سعد الملک ہے بائیں شانہ کا ستارہ

سعد السعود ہے ۔ بائیں ہاتھ پر اور کپڑے پر جو تین ستارے ہیں
ان میں سے بیچ کے ستارہ کو سعد بلع کہتے ہیں ۔ دہنے بازو پر
جو تین ستارے ہیں انمیں سے شمالی تارے کو سعد الاخبیہ کہتے
ہیں اور یہی نام کچھ بگڑے ہوئے انگریزی میں بھی مشہور ہیں
باقی ستارے اس شکل کے قدر چارم و پنجم کے ہیں ۔ تمہارے
سمت الراس سے کوئی بیس بائیس درجہ کے فاصلہ پر اس
شکل کے ستارے دکھائی دینگے ۔ اسوقت نصف النہار پر سے
مغرب کی طرف یہ برج سرک گیا ہے اور دیکھنے کا یہی رخ کچھ
مناسب بھی ہے ۔

فم الحوت

یورپ کے اہل رصد نے بیس ستارے قدر اول کے جنمیں سے
دس معدل النہار کے شمال میں ہیں دس جنوب میں مقرر
کئے ہیں ۔ ان میں سے اٹھارہ تاروں کا پتہ تم کو بتا دیا ہے
انیسواں ستارہ فم الحوت ہے اسی کو بگاڑ کر انگریزی میں
(Fomalhaut) کہتے ہیں ۔ یہ ستارہ افق جنوبی
سے ۲۵ درجہ بلند دکھائی دیتا ہے ۔ اس وقت مغرب کی طرف
ایک ساعت سے کچھ زیادہ مسافت تک سرکا ہوا ہے ۔ یہ مچھلی
برج دلو کے جنوب میں واقع ہے ۔ منہ اسکا مغرب کی طرف ہے
ڈول کا پانی بہتا ہوا اسکے منہ تک پہنچا ہے ۔ فم الحوت سے
نسر واقع تک جسقدر فاصلہ دکھائی دیتا ہے اتنا ہی رجل جوزا
تک ہے ۔ اسوقت ان تین تاروں سے ایک بہت بڑا مثلث
متساوی الساقین معلوم ہو رہا ہے ۔ جس کا قاعدہ ساقین
سے بڑا ہے ۔ ستارہ رجل اس وقت افق شرقی سے بیچ اور
نسر واقع افق غربی شمالی کے قریب پہنچ چکا ہے ۔ مجسطی وغیرہ
میں فم الحوت کو برج دلو میں شمار کیا ہے ۔ یہ ستارہ بھی اول [illegible]
مشہور نہیں ہے اور کچھ بہت روشن بھی نہیں ہے مگر قدیم سے
قدر اول کے تاروں میں اسکا شمار ہے ۔

برج حمل

ذات الکرسی کا پانچواں تارا جہت مشرق میں جو واقع ہے جب
نصف النہار پر پہنچتا ہے تو اسکے ساتھ ہی حمل کے تین مشہور ستارے
بھی قریب سمت الراس آ جاتے ہیں یہ ستارے کچھ روشن تو نہیں ہیں
مگر ایک خاص ترتیب انمیں پائی جاتی ہے جو شاید آسمان بھر میں
اور کہیں نہ ہوگی ۔ شمالی تارا قدر دوم کا، بیچ والا تارا قدر سوم کا،
جنوبی تارا قدر چہارم کا ہے، اور تینوں تارے ملکر ایک گاؤدم
خط منحنی معلوم ہوتا ہے، حاشیہ زیج کی عبارت یہ ہے :-

هو على هيئة كبش ذى قرنين ۔ مقدمه الى
اس کی مینڈھے کی سی شکل ہے جس کے دو سینگ ہیں آگے کا دھڑ
المغرب و موخره الى المشرق و بطنه الى
اسکا مغرب کی طرف اور پچھلا حصہ مشرق کی طرف ۔ پیٹ
الجنوب وظهره الى الشمال ۔ وقد التفت
جنوب کیجانب ۔ اور پیٹھ شمال کی سمت ہے ۔ پشت کی طرف
الى خلفه ۔ فكانه يحك ظهره بفمه
منہ موڑے ہوئے ہے ۔ جیسے منہ سے پیٹھ کو کھجا رہا ہے ۔

اس شکل میں بھی روشن ستارے نہیں دکھائی دیتے ۔ بس یہی
تین تارے برج حمل کی پہچان ہے انہیں میں سے روشن دو
تارے شرطین کہلاتے ہیں ۔ منطقۃ البروج یعنے مدار سیارات
کا پہلا برج حمل ہے مگر نقطہ اعتدال ربیعی سے اسکے تارے
شمال کی طرف سرکے ہوئے ہیں ۔ انکی جگہ پر برج حوت ہے
یعنے بارہواں برج پہلے برج کی جگہ پر آتا جاتا ہے ۔

ستارہ آخر النہر

شعرا تک اس ستارہ کی ابھی شہرت نہیں پہنچی۔ انگریزی زبان میں آخر النہر
کو بگاڑ کر اکینار کہتے ہیں۔ اسی طرح اکثر عربی کے نام بگڑے ہوئے
اُن کی زبان پر ہیں۔ کہ اب اصل لفظ کا پتہ نہیں لگتا۔ مثلاً ایک
ستارہ البیرئو ہے۔ ایک کا نام الکیونی ایک الکور، الدابین
الجبہہ، الیوث المص، الناجد، النیلام، الفزاتز، آلتائین
الطیو، ان سب ناموں میں الف لام دیکھ کر یہ پتہ تو لگتا ہے
کہ سب عربی لفظ ہیں مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اصل کیا ہے۔ اکثر
ثوابت کے عربی نام ایسے بھی ہیں جن پر الف لام نہیں اُنکا
پہچاننا اور بھی دشوار ہے۔ اور ایک ادیب کو ان تاروں
سے بحث بھی نہیں، نہ ہماری کتب ادبیہ میں ان کا ذکر ہے،
ستارہ آخر النہر کا اس سبب سے یہاں کیا جاتا ہے کہ یہ بھی کوکب دری
ہے۔ افق جنوبی پر اسکی چمکیں تقاضا کرتی ہیں کہ میرا بھی کچھ
نام رکھو۔ ان ہیں ستاروں میں جو قدر اول کے یہ نواں ستارہ
ہے۔ پتہ اس کا یہ ہے کہ ذات الکرسی کے پانچ تاروں میں سے
جب تین ستارے نصف النہار پر سے گزر کر چوتھا ستارہ پہنچے
تو جنوب کی طرف پھر کر دیکھو اسی خط پر افق سے بارہ درجہ
بلند ستارہ آخر النہر چمکتا ہوا دکھائی دیگا۔ یہ برج حمل کے
محاذی واقع ہے، اسکو ستارہ آخر النہر اس وجہ سے کہتے ہیں
کہ رجل جوزا سے اس ستارہ تک ایک نہر سی تاروں کی برج ثور
کے نیچے ہوتی ہوئی آئی ہے جو علاوہ کہکشاں کے ہے۔ یہ نہر
بھی کئی جگہ کہا کر اکینار تک پہنچی ہے۔

برج جدی

یہ منطقہ کا دسواں برج ہے جو برج قوس و برج دلو کے درمیان
واقع ہے، جو شخص برج قوس کے تیر و کمان و زرہ کے اور برج دلو
کے مثلث کے ستارے پہچان چکا ہے، آسے اس برج کا مقام
اچھی طرح معلوم ہے۔ اسکے بہی اکثر ستارے اندھے ہیں
اور عجیب وغریب شکل بیان کیجاتی ہے۔

هو الى نصفه كالنصف المقدم من جدى

آدھا جسم اسکا بکری کے بچہ کا سا ہے جس کا سر اور دونوں

راسه ويداه الى المغرب. وظهره الى

آگے والے پاؤں مغرب کی طرف ہیں اور پشت شمال

الشمال. والنصف الآخر منه كمؤخر سمكته

کی طرف اور آدھا ڈیل مچھلی کا سا ہے آسکی

الى ذنبها

دُم تک

اسکے ستاروں میں جو تارا سب تاروں کے شمال میں قدر سوم کا ہے
اسکے نیچے ہی ایک اور چھوٹا سا ستارہ ہے۔ جیسے ت کے دو نقطے
سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی سعد ذابح ہے یہ زائد جب خط نصف النہار
کے قریب پہنچے تو اسے بہی جنوب کی طرف اپنے سمت الراس
سے کوئی ۳۵ درجہ کے فاصلہ پر ڈھونڈھو۔ ہے تو چھوٹا سا تارا مگر
نام بڑا رکھا ہے۔

راس الغول

ذات الکرسی کے پانچوں ستارے جب نصف النہار سے گزر کر
مغرب کی طرف مائل ہوں تو اسکے ایک ساعت اور چند دقیقہ بعد
ایک قدر دوم کا ستارہ تمہارے سمت الراس سے بیس بائیس
درجہ شمال کی طرف سرکا ہوا خط نصف النہار پر دکھائی دیگا۔ یہ بہت
مشہور تارا ہے، جو قدر دوم سے قدر چہارم کا ہو جاتا ہے، یورپ
کے اہل رصد نے اسکے گھٹنے بڑھنے میں ایک انضباط پایا ہے یعنی
دو دن اور تیرہ ساعت تک تو یہ قدر دوم کا ستارہ معلوم ہوتا ہے
اسکی روشنی قطب کے تارے کا مقابلہ کرتی ہے، اسکے بعد گھٹنا شروع

ہوتا ہے اور کوئی چار ساعت کے عرصہ میں قدر چہارم کے تاروں کی طرح دھندلا ہو جاتا ہے یہ حالت اسکی بیس دقیقہ سے زیادہ نہیں رہتی ۔ پھر روشنی بڑھنا شروع ہوتی ہے اور کوئی چار ساعت کے عرصہ میں پھر قدر دوم کا ہو جاتا ہے ۔ عرب بھی اس ستارے کے بھیس بدلنے سے بے خبر نہ تھے ۔ ورنہ راس الغول اُسے نہ کہتے انگریزی میں بھی اسے Algol کہتے ہیں برج حمل کے شمال میں ایک مشہور شکل مثلث متساوی الساقین کی پائی جاتی ہے جس کے تینوں تارے قدر سوم کے ہیں، اور اس مثلث مشرق وجنوب کی طرف ہے، قاعدہ شمال و مغرب کی جانب ۔ اس مثلث کے قاعدہ کا شمالی تارا اور ستارہ راس الغول اور عیوق ایک ہی سیدھ میں ہیں ۔ ذات الکرسی کے تیسرے اور چوتھے تارے کی جو سیدھ ہے، اُسی خط پر راس الغول بھی واقع ہے ۔ میں راس الغول کو اس طرح بھی ڈھونڈھ لیا کرتا ہوں کہ عیوق سے حمل کے روشن ستارے تک ایک لکیر کھینچ کر اسکے بیچ میں سے عمود جانب شمال میں فرض کرتا ہوں ۔ وہیں قریب راس الغول ملجاتا ہے، مگر اسکے گھٹنے بڑھنے کا تماشا میرے دیکھنے میں کبھی نہیں آیا ۔ یا ضعف بصارت کے سبب سے محسوس نہیں ہوا ۔

قدر اول کے بیسوں ستارے اور بارہ بروج پہچاننے کے علاوہ اس مختصر بیان میں تم نے بنات النعش و ذات الکرسی و صورت الفکہ و مثلث شمالی و قنطورس و صلیب و جبار فلک و فرقدین و سہا و کف الخضیب و جدی و سعد ذابح و راس الغول وغیرہ کو بھی پہچان لیا ۔ کتب ادبیہ کے سمجھنے کے لئے اسقدر جاننا ضرور ہے جو لوگ انگریزی نہیں جانتے اُن کے لئے تو یہ تحریر مختصر نہایت مفید ہے جو انگریزی سے واقف ہیں ان کو عربی ناموں کے معلوم کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے فقط

علی حیدر طباطبائی

تعلق حیوانی

ہمارے غائبانہ کرمفرما مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) جن کا پر لطف مضمون "تعلق حیوانی" کے عنوان سے اس مہینہ میں شایع ہوا ہے اُن جدت طراز انشا پردازوں میں ہیں جنکی شہرت محتاج تعارف نہیں ہے، آپ نے "ابن مسلم" کے عنوان سے حال ہی میں ایک ناول کو مکمل کیا ہے جو اب پریس میں ہے اور امید ہے کہ اواخر جنوری تک طبع ہو کر "ذخیرہ بک ڈپو" میں آجائیگا ۔ اردو کے بہترین اور مشہور ناولوں میں جو چیز قریب قریب عنقا ہے وہ "کیرکٹر" ہے آپنے "ابن مسلم" کا پلاٹ بنی امیہ کے فتوحات کے زمانے میں رکھا ہے اور اسلامی کیرکٹر کی عمدہ تصویر ناول کے ہیرو میں دکھانے کی کوشش کی ہے اس طلسم آشیانہ عنقا کو کہیں حد تک آپ اپنی عبارت کے دام میں پھانس سکے ہیں اسکا اندازہ پبلک اُسوقت باسانی کریگی جبکہ "ابن مسلم" شایع ہو کر قدردانوں کے ہاتھوں میں آجائیگا امید ہے کہ ناظرین ذخیرہ اسکے پر جوش خیر مقدم کے لئے چشم براہ رہینگے ۔

ایڈیٹر

انسانی زندگی' ایک روح کا انسانی قالب میں دنیا کے مشاہدات وتجربات سے بہرہ اندوز ہونا کیسی دلکش مگر مختصر چیز ہے' بچپن کے بے عل وغش زمانہ کا تو پوچھنا ہی کیا' جوانی بھی بجلی کیطرح آتی ہے اور ہوا کیطرح جاتی ہے' بڑھاپے میں البتہ گردن پھیر کر ماضیٔ پرلطف کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسقدر مرتبہ آفتاب عالمتاب مشرق سے نمودار ہو چکا یا اسکی جان نثار زمین اسکا طواف کرچکی! تجربات' کجروی کے ناگزیر نتایج' سب ایک ایک کرکے عالم خیال میں پیدا ہوجاتے ہیں' اور حواس انسانی پر اسقدر گہرا نقش ڈالنے لگتے ہیں کہ روح مقید کو متفکر دماغ اور آزارده قالب سے چارناچار کنارہ کرنا پڑتا ہے اور ایک ہنستی بولتی ہستی نامعلوم نیستی میں تبدیل ہوجاتی ہے'۔

انسانی زندگی کا سب سے پہلا' اور سب سے ضروری' حیوانی مقصد' افزایش نسل انسانی کے سوائے اور کچھہ سمجھہ میں نہیں آتا! اور اس حیوانی مقصد حیات کی تکمیل نفس واحد کی تنہا کوشش سے صورت پذیر نہیں ہوسکتی'! چارناچار۔ مذکر کو مونث کا یا مونث کو مذکر کا' ایک دوسرے کا' پابند ہونا پڑتا ہے! زندگی کے وہ لذائذ' وہ غیر محدود دلچسپ مشاغل' جو محض آزادی کے دم قدم سے وابستہ ہیں ایک خاص حدود میں مقید ہوکر ایسی روزانہ کی معمولی بات بنجاتے ہیں۔ بنجاتے ہیں اور جدت کا دلفریب لطف یکقلم زایل ہوجانے سے وبال جان ہوجاتے ہیں کہ ہر عرصۂ دراز تک مبتلا رہنے والا مریض شادی دل ہی دل میں کف افسوس ملتا ہے اور اس وقت کو نہیں پاتا جب وہ اس زاویۂ پابندی میں مقید ہوا تہا۔!

دو افراد انسانی کی باہمی کوشش' ایک تیسرے وجود کو پیدا کرنے میں اگر وقت نے ساتھ دیا تو ضرور کامیاب ہوجاتی ہے' لیکن دو بیش قیمت آزاد زندگیاں' پہول کی طرح خندہ زن رہنے والی صورتوں کو پرشکن اور کئی فٹ لمبے چہروں میں تبدیل کردیتی ہیں! باایں ہمہ' یہ پابندی۔ کم از کم آغاز سے پیشتر کچھہ ایسی جدت آمیز دلچسپی اور دلکش کشش رکہتی ہے کہ اس سے یک لخت پیچھا چھڑانا ننانوے فیصدی' ناگزیر ہوتا ہے'! فی الحقیقت اگر صناع کائنات اس حیوانی مقصد حیات میں ناقابل مدافعت جذبہ کشش نہ رکہتا تو دنیا کی آبادی آج سے ہزاروں برس پیشتر انسانی صورت کو کھو چکی ہوتی!

اس حیوانی مقصد حیات کی تکمیل حیوان بھی کرتا ہے اور انسان بھی حیوان کی کوشش اکثر وبیشتر انسان سے زیادہ بارآور ہوتی ہے لیکن پھر بھی انسان اس کوشش کی تکمیل کے لئے پابند ہوجاتا ہے اور حیوان سوائے اُن چند قسموں کے جو بدقسمتی سے انسانی آبادی کا تتبع کرتی ہوں بالکل آزاد رہتا ہے' معقول' یا نامعقول وجہ یہ نظر آتی ہے' کہ حیوان کو اپنے آشیانے کے چار تنکوں کا اپنے مسکن کی گز بھر زمین یا چلو بھر پانی کا اسقدر خیال نہیں ہوتا' کہ وہ اپنے بعد ورثہ کے صحیح طور پہ پہنچنے کا خیال خام پکائے' اپنے بعد اپنا نام چلنے کا سودا خواہ مخواہ مول لے اور اپنی اولاد کے صحیح النسب بنانے کے تصوں قصیوں میں مبتلا ہو یا وہ زندہ رہتا ہے' حسب حیثیت کائنات کا لطف اٹہاتا ہے' افزایش نسل کا فرض پوری آزادی کیساتہہ ادا کرتا ہے اور بلا کسی فکر فردا یا خیال مستقبل کے چلتا پہرتا نظر آتا ہے! حضرت انسان' زمین ومکان کا' نقد وجنس کا' خیالات و معاشرت کا' اور خدا جانے کس کس کا' ایسا طومار باندھتے ہیں کہ انہیں "حق بحقدار رسد" کا انوکہا خیال قطعی چین لینے نہیں دیتا' اور وہ اپنی حماقت کے اشارہ کرنا [illegible]

بطناً بعد بطناً منتقل ہوتے رہنے کے انتظام میں مجبوراً اپنی بیش بہا
آزادی کو پامال کر ڈالتے ہیں! خدا ہی جانے "حیوان کی بے خبری
و بیفکری زیادہ قابل قدر ہے یا انسان کی فکر فردا و مستقبل اندیشی!"

بہرحال انسان نے جس زندگی کا تانا بانا اپنے گرد
تن لیا ہے وہ انسان کو افزائش نسل کی غرض سے ایک دوسرے کا پابند
ہونے پر مجبور کرتی ہے"! انسان نے جسطرح اپنے تجربات و مشاہدات
کی بنا پر ہر شعبۂ زندگی کے اپنے عقل کیموافق قواعد مقرر کئے اسی
طرح اس پابندی کے بھی مقرر کئے! مگر غضب یہ ہے کہ انسان
کی آنکھ ایک ہی چیز کو مختلف آب و ہوا اور مختلف حدود و مقامی
میں مختلف طریقے سے دیکھتی ہے اور اسی وجہ سے ایک ہی فعل ایک
عینک سے خوشنما اور دوسرے سے بدنما نظر آتا ہے"! اسکا فیصلہ
دنیا ابتک نہیں کر سکی ہے۔ اور نہ غالباً کر سکیگی کہ فی الحقیقت
کونسی عینک صحیح ترین آلۂ نظر ہے! جو عینک جس آنکھ پر لگ جائے
وہی اسکو صحیح نظر آتی ہے" تاریخ کا بیان ہے کہ مذاق معاشرت
کی عینک تلوار کے زور سے فتح ہوتی اور رائج ہوتی رہی ہے" وہ
الناس علیٰ دین ملوکھم کا معیار صحیح مانتی ہے
اور کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخ کا یہ دعویٰ لغو ہے"۔ !

مشرق و مغرب کے خیالات اور نظریۂ تہذیب میں اسیقدر فرق ہے
جسقدر بڑھنے والی روشنی اور پھیلنے والی تاریکی میں ہوتا ہے!
ایک اس سرے پہ ہے ایک اُس سرے پر! مشرق مذکر کو نسبتاً قوی
اور غالب سمجھکر مونث کو ایک خاص حدتک اسکی نگرانی میں
دینا چاہتی ہے! اور مغرب صنف نازک کی نزاکت و لطافت
سے متاثر ہو کر مذکر کو مونث کا بالکل پابند کرنا چاہتی ہے!
افزائش نسل انسانی کا معاملہ بھی اسی لحاظ سے دونوں جگہ دو
مختلف پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے۔ مشرق میں رائج ہونے والے
مذاہب تعدد ازدواج کو جائز قرار دیدیتے ہیں اور مغرب میں
پھیلنے والی معاشرت وجود زوج کو "وحدت الوجود" کی حدتک
پہنچا دیتی ہے"! مشرق کا دعویٰ ہے کہ مغرب کا خیال محض
تحریری دنیا میں نہایت خوشنما ہے لیکن عملی دنیا میں نہ اُسکا
وجود ہوا نہ ہو سکتا ہے"۔ بلکہ بظاہر طور پر رک جانیوالا مادہ بعد
پوشیدہ طور پر ایسی ایسی جگہ پھوٹ کر نکلتا ہے کہ اُسکے بُرے
نتایج اکثر عزیز جانوں کو خودکشی پر مجبور کر دیتے ہیں یا ہمیشہ کے لئے
زندہ درگور بنا دیتے ہیں! مغرب تحریر میں اس اعتراض مشرقی
کا جواب ہزارہا دلایل کیساتھ دیتی ہے لیکن عمل میں...

... ! خیر عمل کے نازک مسئلہ کو چھوڑئیے!

مغرب کے تحریری جواب کو صحیح مان لیا جائے اور تسلیم کر لیا جائے
کہ فی الحقیقت قلت ازواج ایک کی تعداد تک عملی طور پر حقیقی معنی
میں موجود ہے۔ تو بھی یہ دیکھنا باقی رہجاتا ہے کہ کس کا طریقہ
نیچرل اصول کے موافق "حیوانی مقصد حیات کے موافق" اور
قابل عمل ہے "حقیقت یہ ہے کہ کسی ۱۰ گھوڑوں کی طاقت والے
انجن سے ہمیشہ ۵ گھوڑوں کی طاقت کا کام لینا اور نصف طاقت
کو عضو معطل بنائے رکھنا تضیع اوقات اور حماقت نہیں تو
اور کیا ہے؟

یہ بحث پیدا کیجاتی ہے کہ جسطرح ایک شوہر متعدد بیویاں کر سکتا ہے
اور سب میں انصاف رکھ سکتا ہے اسیطرح ایک عورت بھی متعدد
شوہر کر سکنے اور سب کو راضی رکھ سکنے کی قابلیت رکھتی ہے!
اعتراض تو ٹھیک ہے البتہ صرف ایک خفیف سی وقت وراثت
کے لحاظ سے پیش آتی ہے جو انسانی معاشرت کا جزو لاینفک
ہے! مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ ایک عورت جسقدر تعداد ذکور
کو امن چین سے رکھ سکنے کی قابلیت رکھتی ہے ایک مرد

اسقدر عورتوں کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ اگر عورت کو متعدد شوہروں کی اجازت دیدیجائے تو ورثہ کا سوال بھی اسطرح حل ہوسکتا ہے کہ ورثہ عورت ہی کے ذریعہ سے، یعنے صرف لڑکیوں پر، اُن کی بیٹیوں پر منتقل ہوا کرے! اس طریقہ سے گویا یہہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے، اور ورثہ محض ماں کی مونث اولاد پر صحیح طور پر منتقل ہوتا رہتا ہے، مرد محروم الارث قرار پاتا ہے، شادی ہونے سے پیشتر ماں اسکی کفیل رہتی ہے اور شادی کے بعد زوجہ کفیل ہوجاتی ہے!

یہ خیال ہے تو نہایت اچھوتا، مگر ماہرینِ فلسفۂ حیوانی اسکی بھی بیخکنی کر ڈالتے ہیں! وہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ یا بندئ تعلق زن و شو کو، اسی حیوانی مقصدِ حیات، یعنے افزائشِ نسل کے نقطۂ خیال سے دیکھنا لازمی ہے! ایک مرد چار بیویوں سے ایک سال کی مدت میں اگر اُسنے انصاف سے کام لیا اور قسمت نے بھی کسی کے ساتھہ ناانصافی نہ کی تو، چار اولادیں وجود میں لاسکتا ہے، اور ایک عورت چار مردوں کی چوگنی کوشش کے باوجود کسیطرح ایک سال میں ایک سے زیادہ بچہ نہیں جن سکتی۔ بلکہ اکثر ڈاکٹروں کو شبہ ہے کہ شاید ایسی حالت میں ایک کی کوشش دوسرے کی کوشش کے منافی نہ ہوجائے! اس طرح ایک مرد کا چند بیویاں رکھنا مقصدِ حیات کے موافق، اور ایک عورت کا چند شوہر کرنا اصولِ فطرت کے خلاف نظر آتا ہے۔ حیوانوں کی طرزِ عمل کے مشاہدے سے صاف نظر آتا ہے کہ ایک مادہ بچہ کش ہوتے ہی نر کی قربت سے متنفر ہوجاتی ہے، گویا وہ سمجھتی ہے کہ حیوانی مقصدِ حیات کا فرض ایک خاص عرصہ کے لئے۔ جہانتک اسکی ذات کو تعلق ہے، ادا ہوچکا! اب اگر ایک انسان کو ایک عورت کے لئے بلا کسی اور وجہ کے وقف کردیا جائے تو اسکے معنی حماقت آمیز، تضیع اوقات اور تخریبِ مقصدِ حیات قرار پائینگے! جس عرصہ میں وہ چار اولادیں پیدا کرسکتا، اُس میں صرف ایک وجود میں آسکیگی۔ اور خدا جانے کتنی کوششیں فضول اور تضیع مادۂ حیوانی ثابت ہونگی! اس دلیلِ حیوانی پر غور کرنے سے پھر وہ اچھوتا خیال اچھوتا ہی رہجاتا ہے!

پھر کیا وجہ ہے کہ ایک خاص تعداد تک ازواج کو محدود کیا جائے؟ کیونکہ تعددِ ازواج مقصدِ حیات کے موافق ثابت ہونے پر بہتر ہے کہ غیر محدود ہو۔ جسقدر ازواج کی تعداد زائد ہوگی اسیقدر ہر سال انسانی مردم شماری میں زیادہ اضافہ کی امید ہوسکتی ہے لیکن اسمیں بھی شک نہیں کہ انسان کی ہر طاقت محدود اور ایک خاص دائرہ کے اندر فطرتاً بند ہے! ورثہ، تمدن، معاشرت، کفالت ازواج، یہ سب اُس دائرہ کے حدود ہیں! ان حدود کو انسانی زندگی کے ساتھہ پیش نظر رکھکر افزائشِ نسل پر غور کیا جائے تو عقلِ سلیم خود تعددِ ازواج کو کسی نہ کسی تعداد پر محدود کردینا ضروری بتائیگی! اب یہ "کہ" چار کے عدد کو کیا خصوصیت حاصل ہے" کیقدر ناقابلِ فہم نظر آتا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ انسانی آبادی کا کوئی صحیح و مکمل نقشہ، جو تمام دنیا کے ذکور واناث کی صحیح تعداد بتاکر باہمی نسبت ظاہر کرسکے۔ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اکثر ملکوں میں اناث کی تعداد ذکور سے کئی گنی ہے، ! تمام دنیا کے ذکور واناث کی مجموعی نسبت کے سوال کو الگ ہی رکھہ دیا جائے تو چار کی تعداد کو واضعِ قانون کے مشاہدۂ زندگی کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے اور اسپر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا! ہر قانون کے وضع کرنے کے وقت واضع کو، عام اس سے کہ وہ تنہا ہو یا ایک جماعت ہو

ایسی اعداد اپنی رائے اور اپنے تجربے کیموافق مقرر کر دینے کا حق لازمی دینا پڑتا ہے! تعزیرات ہند کی واضع جماعت ایک جرم کی سزا چھ مہینہ کی قید با مشقت یا پانسو روپیہ جرمانہ مقرر کر دیتی ہے' اب اگر منطق فضول سے کام لیا جائے تو کوئی معقول وجہ اس چھ مہینہ یا پانسو کی تعداد کی نہیں بتائی جا سکتی' کوئی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی کہ چھ مہینہ کے بجائے کیوں پانچ مہینے چند دن اور چند گھنٹے نہیں رکھے گئے؛ حقیقت میں دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ واضع قانون ماہر فن متعلقہ اور واقف معاشرت انسانی ہے یا نہیں؛ اگر ہے تو تعداد کا تقرر اسکی واقفیت عامہ اور بلند خیالی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔! تعدد ازواج کی تعداد کو چار کی حد تک محدود کرنے والی ذات کو۔ صناع حقیقی نہ ماننے کی حالت میں۔ ایک ایسی حقیقت داں ذات ماننے میں مشکل سے انکار ہو سکتا ہے جو انسانی معاشرت' انسانی تہذیب' انسانی ترقی اور انسانی محدود قابلیت سے کماحقہ واقف تھی!

جہانتک تعدد ازواج پر انصافانہ غور کیا جائے وہ بہترین طریقہ نظر آتا ہے جو انصاف کی سخت شرط کی صورت میں پوشیدہ غیر محدود عیاشی کو' بڑی خوبی کے ساتھ معدوم کر دیتا ہے'! یہ واقعہ ہے کہ تعدد ازواج پر۔ اس حکم کے حقیقی معنی کے موافق۔ عمل کرنے والا شخص پوشیدہ ریاکاری سے صاف و پاک ہوتا ہے! اب صرف یہ سوچنا باقی رہجاتا ہے' کہ جائز طور پر تمام دنیا کے سامنے چار بیویوں کا کفیل بننا' ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنا' انکی اولاد کو دنیا کی نگاہ میں صحیح النسب بنا جانا' انکی عزت و حرمت قانون و سوسائٹی کی نگاہ میں برقرار رکھنا' اور پوشیدہ ریاکاری سے کنارہ کش ہو جانا" بہتر ہے۔ یا" بظاہر ایک بیوی کے لیئے وقف ہو کر متعدد عورتوں کو مشغلہ ناجائز بنانا' انکو دہوکہ دینا' انکی عزت کو برباد کر دینا' انکی اولاد کو مجہول النسب بنا دینا' اور انکو زندہ درگور کر دینا" اچھا ہے۔!

تعدد ازواج کے مسئلہ میں واضع قانون اسلام نے جس بے مثال حقیقت دانی اور رجز رسی سے کام لیا ہے وہ واقعی ایک بے نظیر واقفیت معاشرت انسانی کا اظہار کرتی ہے! لڑائی میں قتل ہونیوالی تعداد زیادہ تر مردوں کی ہو سکتی ہے' اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مفتوحہ ملک کی نرینہ آبادی فاتحین سے نسبتاً زیادہ مقتول اور پامال ہوتی ہے: اسلیئے جنگ کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بزور تلوار فتح شدہ ملک میں عورتوں کی تعداد بچے کھچے مردوں سے بہت زاید ہو جاتی ہے۔ اور ان بیچاریوں کے کفیل بننے والے عدم کو سدھار جاتے ہیں! ایسی صورت میں وہی بے نظیر واضع قانون فاتحین کو۔ لڑائی میں ہاتھ آنیوالی حرم کی صورت میں۔ انکا کفیل بناتا ہے اور اسطرح مفتوحین کی بے خانماں عورتوں کو کس مپرسی کی حالت سے نکال لیتا ہے!

فی الحقیقت تعدد ازواج کا مسئلہ مقصد حیات اور معاشرت انسانی دونوں پہلوؤں کو ہموزن رکھنے والا معیار ہے' اور مغرب کی عملی زندگی کا شاہد کرتے ہوئے پوشیدہ ریاکاری کو چھڑانیکا بہترین طریقہ ہے! عورتوں کو ذلیل اور زندہ درگور ہونے سے بچانیکا' اور بچوں کو مجہول النسب اور ننگ خاندان بننے سے محفوظ رکھنے کا' اعلیٰ ترین قابل عمل اصول ہے!

شاید بعض طبیعتوں کو۔ ایسی طبیعتوں کو جنکو میں تو نہیں اکثر تمسخر پسند حضرات زن مرید کے معزز لقب سے یاد فرماتے ہیں۔ میری تحریر ناپسند اور میرے دلائل لغو نظر آئیں؛ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں دنیا کو اپنی ہی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہوں اور وہی کہتا ہوں جو نظر آتا ہے! میری آنکھوں پر چڑھی ہونیوالی مذہبی عینک کہانتک قابل تسلیم ہے؟ اسکا جواب مغرب کی عملی زندگی کے مشاہدہ سے ہو سکتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ کے بعد نرینہ آبادی کے قتل ہو جانے پر بیشمار بیوہ عورتیں دیکھ کر بعد تعدد ازواج کا مسئلہ کبھی ور نظر دیکھے جانے کے قابل ہو جائے۔

سلطان حیدر جوش (علیگ)

کلام قدر بلگرامی

مختصر حالات حضرت قدر بلگرامی اور کلام قدر کے ایک جزو کا انتخاب گذشتہ اشاعت میں ناظرین بشوق تمام مطالعہ فرما چکے ہیں اب مابقی اشعار کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

قدر کی آمد دربار لکھنؤ (؟)

ساون کا مہینہ تہا۔ شام کا وقت حسب دستور قدر اپنے احباب اور شاگردوں کے مجمع میں بیٹھے تھے۔ شعر شاعری کا شغل ہو رہا تہا اتنے میں خبر آئی کہ محمد ظہیر الدین خاں مدرس کینگ کالج نے قضا کی۔ یہ وہ زمانہ تہا کہ قدر ہردوئی میں مدرس تھے۔ احباب ہنود کی رائے ہوئی کہ اُستاد قدر بہی درخواست بھیجیں۔ قدر نے عذر کیا۔ سب نے اصرار کیا۔ استاد راضی ہوئے۔ درخواست لکہی گئی۔ ڈاک کا وقت نکل چکا تہا مگر ڈاک بابو قدر کے شاگرد تہے۔ تہوڑی دیر کے لئے ڈاک رُک گئی۔ قدر کی درخواست اسی شب کو روانہ ہو گئی۔ اس جائداد کے لئے دو سو درخواست گذار تہے۔ چنانچہ ازانجملہ دس درخواستیں انتخاب ہوئیں جنمیں قدر کا بہی نام تہا۔ امتحان کی تاریخ مقرر ہوئی۔ قدر لکھنؤ گئے اور تہوڑی دیر میں جوابات لکہدئے وقت ختم ہونے کے لئے عرصہ تہا انہوں نے بیٹہے بیٹہے جوابات کو بزبان فارسی نظم کر دیا۔ اسکے بعد اور وقت بچ رہا انہوں نے جوابات کو پہلوی زبان میں بہی نظم کر دیا کہ ان ممتحنین میں بجز مفتی میر عباس اعلی اللہ مقامہ کے کوئی اس زبان سے آشنا نہ تہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب میں اول نمبر انہی کا رہا اور محمد ظہیر الدین خاں مرحوم کی جگہ قدر کو ملی۔

خواب مرگ

کیوں لاش پہ میرے روتے ہیں کیوں مفت میں آنکھیں کہوتے ہیں
چونکو نگا نہ خواب مرگ سے میں ہے شور عبث فریاد عبث

ــــہ

صیاد نے چمن میں قفس لاکے رکہدیا کیا پوچہتے ہو مرغ گرفتار کا مزاج

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں پہلے شعر میں خوش نفسی اور بے لوثی کی خوبی شان دیگر سمجہائی ہے یعنے روح کو کفن کی احتیاج بدن کے طور پر نہیں ہوتی۔ دوسرے شعر میں گلا کٹ جانے کا ثبوت ملاحظہ ہو۔ تیسرے شعر میں شام غربت میں صبح وطن ملاحظہ کیجئے:۔

خوش نفس رہتے ہیں دنیا کے علایق سے جدا روح کو ہرگز نہیں ہوتی کفن کی احتیاج
وحشی مجرم ہو تنگی گریباں کم نہیں خود گلا کٹ جائیگا کیا تیغ زن کی احتیاج
جاکر ان زلفوں میں اس رخسار کو ڈہونڈہ لیا شام غربت میں رہی صبح وطن کی احتیاج

سینے سے ہم لگائے رہے دل بہل گیا تصویر یار پاس ہی یار کی طرح

ہم بہی نکل کے قبر سے دیدار دیکہہ لیں عالم کو کیجئے تہ و بالا کسی طرح

بانٹ دے نام پہ اللہ کے حاتم بنکر سر پہ کیا لاد کے لیجائیگا قاروں کی طرح
چشم مخمور میں کیفیت جام مل ہے لال ڈورے ہیں کہ ہیں موج مئے گلگوں کی طرح

پہلے شعر میں سخاوت پر توجہ اور بخل سے نفرت دلوائی ہے۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ دیکھنے کے قابل ہے۔ چشم مخمور میں نہ کیفیت جام مل ہی نہیں دکہائی ہے بلکہ مست آنکہوں کے لال ڈوروں کو موج مئے گلگوں سے کیا اچہی تشبیہ دی ہے ــــہ

یہ شب ہجراں میں نکلی ہے دل گرم سے شعلہ آسا ہماری آہ آتشبار سرخ

غمِ صیاد

چمن میں خاک گل و بلبل اب ہنسیں بولیں
کہ بدنگاہ ہیں گلچیں تو بدگماں صیاد

دارِ عاشق

منصور تیری دار مبارک رہے تجھے
اپنا تو سر ہوا سرِ نوک سناں بلند

ہم خاک اڑاتے ہیں سحر و شب پر بچھے
اے قدر رہے غبار سرِ کارواں بلند

استادِ قدر

موسیاقی تھی کیا وہ چشمِ سیاہ
کھو دیا دل کا اک نظر میں درد

خدا کی ذات ہے دریا کے آبِ نامند
اٹھے ہیں حضرت آدم حباب کے مانند

کبھی ہنسے کبھی روئے فلک کے نیچے ہم
یہاں گذر گئی برق و سحاب کے مانند

میں کیا کہوں کسے آئیگا اعتبار اسکا
بہت کچھ آنکھوں نے دیکھا ہے خواب کے مانند

تینوں شعر اپنی معنی خیزی اور لطافت خیال کے لحاظ سے
قابل تعریف ہیں مطلع میں کیا لطف اور پرمعنی خیال ظاہر کیا ہے خدا
کی ذات کو دریا قرار دینا اور حضرت آدم کو حباب سے مثال دینا کتنا
بدیہی بات ہے۔ انسانی ہستی کی بے ثباتی اور ذات خدا کی پائندگی
کو کس حسن سے ثابت کیا ہے۔

معشوقانہ شوخی

قبر ٹھکرا کے مری کہتے ہیں کیا ناز سے وہ
تمہیں بے چین تھے اللہ رے آرام پسند

اسی طرح میں قدر کا شعر آتش کے شعر سے مذرۃً ملتا ہوا ہے
لیکن اسکی معنوی لطافت آتش کے شعر سے کم نہیں ہے۔

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

قدر کہتے ہیں۔

رمزِ الفت سے نہیں مست و لطافت ربا کو
کیوں کریں رسم وہ نامہ و پیغام پسند

اشعار ذیل کی رنگینی اور معنی خیزی ملاحظہ ہو۔ خمریات کا رنگ ان
اشعار میں جھلک دکھا رہا ہے شمع کے پھول سے بجلی بنائی ہے عجیب

پروانے پر اس بجلی کا گرنا عجیب حسرت ناک منظر ہے مضمون پرانا
مگر ترکیب بالکل نئی ہے باقی دونوں شعر بھی استادانہ ہیں۔

گرمیٔ حسن ٹھنڈی سرد ہو اے آتش زار
شمع کے پھول سے بجلی گری پروانہ پر

غش ہوا گردن ساقی پہ کبھی نغمہ پہ لوٹ
کبھی شیشے پہ گرا میں کبھی پیمانہ پر

رقص آتا ہے لٹا چھلکا دے ساقی
تیور ان رال ٹپکتی نہیں پیمانہ پر

رندانہ

پھر تا شیشہ بینا پہ ہے دیدہ مست
پھر آئی گھٹا جھوم کے مور و صدائیں

شیشے نکلتے ہیں سے صفت گلشن شداد
کیا نکہت گل ہے چمنستاں ہی ہوا ہے

قدر کے دونوں اشعار میں جو زور ہے اسکو سخن فہم سمجھ سکتا
قلقل مینا کی صدا پر رندوں کا چلنا اور موروں کی صدا پر گھٹا
کا جھوم کر آنا کتنا دلکش خیال ہے۔ جوش بہار میں زمین سے دوبارہ
گلشن شداد کا اٹھنا دوسرے مصرعہ میں کیا خوب ثابت کیا ہے۔

عاشقانہ محویت اور صبر پسندی

قاتل ترے دیدار میں یہ محو ہوئے ہم
محشر میں ہوا شکوۂ بیداد فراموش

لحد میں رکھ کے مجھکو میری بالیں پہ کہتی ہے
ابھی سے مرمٹے تم پہلی منزل آئی ہے کہتے ہیں

سامانِ محبت

دل میں درد آنکھوں میں آنسو جگر میں سوزش
عشق کیا دیتے ہیں اک روگ لگا دیتے ہیں

ذیل کے اشعار رنگ تغزل کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور مضامین کے لحاظ
سے بھی یہ شعر بہت بلند ہیں۔ وہ مکیش الخ انگوروں سے بند ہنے
کے بعد شراب ارغوانی کھینچنا عجیب دلکش خیال ہے۔ دوسرے
شعر میں جذب دل کی کمندیں کیا خوب بنی ہیں۔ تیسرا شعر کلیجہ ہمارا الخ
کتنا برجستہ ہے اپنے کلیجہ کو آہن ربا کہکر دوسرے مصرعہ میں ثبوت
کس بانکپن سے دے رہی ہیں۔ معشوق یا قاتل سے کہتے ہیں

کہ تم ہمارے سامنے صرف نشاں کھینچ کر آؤ ہم نشاں کو خود کھینچ
لیں گے تم کو نشاں لگانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ چوتھے شعر میں سحاب
کو کشتیٔ مے کا بادباں بنانا بالکل نئی تشبیہ ہے اور ثبوت کیا
دلنشیں ہے آخری شعر بھی اپنے رنگ میں بالکل نیا ہے:-

وہ میکش ہیں انگور دانے کا بند بھی ... یہی بادہ ارغواں کھینچتے ہیں
انہی جذب دل کی کمند سے عاشق ... جہاں چاہتے ہیں وہاں کھینچتے ہیں
کلیجہ ہمارا خود آ منہ کو رہا ہے ... وہ آئیں ہم انکے نشاں کھینچتے ہیں
غضب چل نکلتی ہے کشتی وہ جب ... سحاب آ کی جب بادباں کھینچتے ہیں
نکلتی ہے سر پہ عجب رنگ نیلی ... کمر پہ وہ اک کہکشاں کھینچتے ہیں

عشق گل رخسار کا کچھ حال نہ پوچھو ... دن رات پڑا رہتا ہوں بیہوش چمن میں
دکھلاؤں میں تجھکو گل و بلبل کا تماشا ... چل تو سہی آ وعدہ فراموش چمن میں

قدر نے اس شعر میں معشوق کو نئے رنگ سے شرم و ناکر
وصل عاشق پہ مایل کرایا ہے:-

بوٹیاں اکسیر کی کیونکر نہ نکلیں خاک سے ... مل گئی ہیں خاک میں ہر سیمتن کی ہڈیاں

قدر کا یہ شعر غالب کے اس شعر سے بلحاظ مفہوم لڑ گیا ہے
لیکن مذاق میں فرق ہے غالب کا شعر عاشقانہ اور قدر کے شعر
میں مضمون آفرینی ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ... خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اس شعر کی بندش نہایت صاف اور چست ہے:-

ہم وہ ہیں اللہ کے آگے کیا اقرار عشق
آسماں خم ہوگیا ہم نے اٹھایا بار عشق

باغ کا تھا چراغ گل، غم سے تھے داغ داغ گل
پا کے ترا سراغ گل ہو گئے باغ باغ گل

شور اٹھا جو آہ کا چہرہ بتوں کا فق ہوا
چلنے لگی جہاں ہوا ہونے لگے چراغ گل

مطلع میں رنگ توحید کی بھی جھلک نظر آتی ہے مگر دوسرا
شعر اپنی ترکیب معنوی کے لحاظ سے بالکل نیا ہے۔ آہ عاشق
سے معشوق کے چہرے کا فق ہونا خوب بات ہے۔ مگر آخری
مصرعہ میں مثال کیا اچھی دی ہے۔ کیا خوب مصرعہ لگایا ہے
درویش (دل) کی شب اور سرائے (زلف یار) کو قرار دیا ہے
کیا لطف کی بات موزوں کی ہے اور ثبوت کسقدر کامل ہے:-

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست ... کیونکر نہ زلف یار میں ہوتا قرار دل

خوف خدا

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو نہ میرے دل پہ جفا کرو تم
ہلیگا عرش خدا کا پایا ذرا تو خوف خدا کرو تم

موحدانہ

جو ہے عرش پر وہی فرش پر کوئی خاص اسکا مکاں نہیں
وہ یہاں بھی ہے وہ وہاں بھی ہے وہ کہیں نہیں وہ کہاں نہیں
جو سمجھ گیا وہ سمجھ گیا جو بہک گیا وہ بہک گیا
کہ عجیب حال ہے گو مگو وہ نہاں نہیں وہ عیاں نہیں

اظہار ناتوانی

مجھے کیا جو شور نشور ہو نہیں پوچھ لو جو ضرور ہو
میں لحد سے اٹھ کے چلوں وہاں مجھے اتنی تاب و تواں نہیں

نازکخیالی

تجھ میں عالم ہے فنا عالم میں تو موجود ہے۔
جس طرح گوہر میں ہو آب اور گوہر آب میں
رخ پہ خط آیا تو آئینے سے نفرت کیوں ہوئی
دیکھتے ہیں سب کسوف مہر انور آب میں

جدید تشبیہ

نافہٴ مشک بنجائیں گے دریا کے بھنور — دھوئیگا وہ گل اگر زلف معنبر آب میں

ذیل کا شعر قدر کے حصے کا ہے اور ایسے ہی شعر سے استادانہ
شان ثابت ہوجاتی ہے۔ ابروئے عرق آلو وہ خنجر بے آب
کہا ہے۔ حالانکہ وہ بظاہر بے آب نہیں ہے کیونکہ عرق آلود ہے
لیکن چونکہ وہ اصلی خنجر آہن نہیں ہے اسلئے اسکو بے آب
بھی کہہ سکتے ہیں مختلف خوبیوں سے مصرعہ کہنا بہت مشکل
کام ہے اور مصرعہ ثانی میں اور تڑپ پانے کا ٹکڑا کتنا پرلطف ہے
قدر کو شہادت ہے اور خنجر بے آب اسلئے غم شہادت میں تڑپ رہے ہیں

ہم نے ناحق ترے ابرو کا پسینہ پونچھا — اور تڑپائیگا یہ خنجر بے آب ہمیں

یاد احباب

دشت غربت میں گلے لوس سے لپٹ جاتے ہیں — یاد آتی ہے جو بربادئی احباب ہمیں
کل شب ہجر میں پیار اپنا جتایا نہ گیا — اے لحد آج بغل میں نہ بہت داب ہمیں

تھک گیا شب غم حشر میں پھر لیٹ رہے — کہ نمایاں ابھی آثار سحر کچھ بھی نہیں

ہے ستم ظلم وہ راتیں ہم ناتواں پر سو — بنایا ہے جنھیں کرکے امتحاں ہر سو
الٰہی آتش رخسار سے گھونگٹ جلے انکا — یہی پردہ رہا ہے میرے انکے درمیاں ہر سو
رہیگا جام کوثر سے نہ خالی ہاتھ واعظ کا — کہ ان ہاتھوں کی ہے بیعت پیر مغاں ہر سو
ملے کہکر بلا کا نشہ ہم کو چڑھ گیا یارب — نہ آئے ہوش میں ہم مست جام کن فکاں ہر سو

طرح ذیل بھی قدر نے خوب لکھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں
پہلے مطلع میں لب و دنداں یار کو یمن و عدن خوب بنایا ہے
اور باوجود قربت کے دونوں میں کیا شان بعد پیدا کی ہے
بجلی کا یمن میں چمک کر عدن میں گرنا بالکل نئی تلاش معنوی ہے
بغیر لب پہ ہنسی آئے ہوئے دنداں نہیں کھلتے دہن کو عدن
اور لب کو یمن قرار دیا ہے۔ اور دوسرے مطلع میں عرب سے ختن
میں کعبہ کا اٹھ آنا شاعرانہ مذاق ہیں قابل لحاظ بات یہ ہے باقی ستوں
شعر بھی بہت خوب کہے ہیں :-

لب پہ ہنسی جو آئی دنداں کھلے دہن کے — چمکی یمن میں بجلی جاکر گری عدن میں
دل رخ سے اڑ کے پہنچا گیسوئے پر شکن میں — کعبہ عرب سے اٹھ کر آخر ہوا ختن میں
کس رند بادہ کش کو یاد آ رہی ہے آنکھ — بجلی سی آگ بھڑکی شیشے کو انجمن میں
جولاں ترانیاں ہیں پہنچی کہاں نہاں ہیں — خالق پکار اٹھا خلقت کے پیرہن میں
پیکاں و زخم دل پر آتا ہے رشک مجھکو — اپنی زبان دیدو تم بھی مرے دہن میں

نئی چھری

نشانی کچھ تو رکھے اپنی سوائی کے پاس اپنے
چھری بنوائے کٹوا کے میرے طوق گردن کو

کچھ میں سایہ ہوں کہ چھپ جاؤنگا — زیر دیوار مکاں آنے دو
کھینچیے دو مجھے آغوش میں تنگ — آنے دو جسم میں جان آنے دو
تیغ کھینچے ہوئے فرماتے ہیں — قدر کو آج یہاں آنے دو

آتا ہے زلزلہ تو یہ کہتا ہوں دل میں — تیری طرح تپاں کوئی زیر زمیں نہیں
وحشت میں کچھ سوائے گریباں نہیں نہو — دامن ہو پائمال صفت آستیں نہو

گھر کی مثل نہ ثابت کبھی حباب رہے — جہاں میں سر جو اٹھا وہی خراب رہے
مری نگاہ میں یکساں ہیں ظاہر و باطن — کھلا ہے کہ رخ یار پر نقاب رہے
دہان یار کے مضموں عدم سے لاتے ہیں — ہمیشہ ہم تو اسی فکر میں خراب رہے

بڑے ناز سے دلمیں خیال جانانہ آتا ہے — یہ گھر جس نے بنایا ہے وہ صاحب خانہ آتا ہے
نکلتی ہو کسی پہ جھوم کر وہ مجھ پہ گرتی ہے — تمہاری تیغ کو کیا شیوۂ مستانہ آتا ہے

لب میگوں کے بوسے مجھکو اب تک یاد آئے ہیں میں رو دیتا ہوں جب ہونٹوں تلک پیمانہ آتا ہے

ہمنے مانا کہ تو نہیں کوئی شئے پھر یہ مشہور جا بجا کیا ہے
میرے پہلو میں دل ہوا نہ ہوا آپ کا اسمیں مدعا کیا ہے
آدمی آدمی پہ مرتا ہے نہیں معلوم یہ بلا کیا ہے

لطیفہ

پڑ گئی آپ پر نظر ہی تو ہے اک خطا ہو گئی بشر ہی تو ہے
گالیاں دیں رقیب کو تو کیا لاکھ باتیں ہیں اپنا گھر ہی تو ہے
پاؤں پھیلائے ہمنے مرقد میں چلتے چلتے تھکے سفر ہی تو ہے
شب فرقت میں آب آب ہوا کیا بلا اسکی ہے جگر ہی تو ہے
قدر نے کیا زبان پائی ہے لوگ کہتے ہیں یہ سحر ہی تو ہے

ذیل کے شعر میں کیا بات پیدا کی ہے۔ قدر نے لن ترانی کا یہ مضمون بالکل نئے ڈھنگ سے کہا ہے۔ شرم کا حد سے بڑھکر خود نما ہونا بدیہی امر ہے اسلئے کہ جذبات فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جس چیز کے دیکھنے کی ممانعت ہوتی ہے دل اور آنکھہ کو اسکی طرف زیادہ سیلان ہوتا ہے اسی طرح جب ایک حسین اپنے کو پردہ میں رکھکر لن ترانی کہتا ہے تو وہ گویا خود اپنے حسن کی خود نمائی کرتا ہے اور طالبان جمال کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا واقعہ کوہ طور بھی اسی خیال سے ملتا ہے اور دوسرے جذبات کی بھی قریبًا یہی حالت ہے:۔

یار تیری لن ترانی دیکھہ لی شرم بڑھ کر خود نمائی ہو گئی

غنچے چٹک گئے چمن روزگار کے پھوٹے حباب موج نسیم بہار کے

اچھا مطلع ہے مصرعہ اولیٰ میں چٹک گئے چٹک رہے ہیں کی جگہ پر ہے اور دوسرا مصرعہ بطور مثال یا شرح کے ہے۔ یعنے غنچے کیا چٹک رہے ہیں گویا موج نسیم بہار کے حباب پھوٹ رہے ہیں۔ مثال بہت نئی ہے:۔

تو ابھی شام ہوئی واہ چلے آپ کدہر نیندیں اُٹھے ہیں گھڑیال بجانے والے
قبر میں رکھتے ہی یہ آہ شرربار اٹھی بُجھ گئے شمع لحد میرے سرہانے والے

ہوئے کارواں سے جدا جو ہم رہ عاشقی میں فنا ہوئے
جو کرے تو نقش قدم بنے جو اٹھے تو بانگ درا ہوئے
کبھی داغ کھاتے ہی آہ کی کبھی آہ کرتے ہی رو دئے
کبھی ہم چمن کی ہوا ہوئے کبھی ہم ہوا کی گھٹا ہوئے
جو لہو تھا اسمیں بھرا ہوا تو ہر ایک زخم ہرا ہوا
یہ دل و جگر مرے کیا ہوئے کوئی تازہ برگ حنا ہوئے
انہی تنگیوں میں فشار ہے کہ تپش میں جسم نزار ہے
یہ قفس میں طائر باغ کیا کوئی مرغ قبلہ نما ہوئے
جو ابھار سینہ کا دم بدم ترے آنچلوں سے نمود ہے
تر و تازہ دونوں حباب گل تہ موج باد صبا ہوئے
اٹھے ہم جو خواب و خیال سے لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اُٹھے وہ کدہر گئے ابھی پاس تھے ابھی کیا ہوئے
جو نگاہ چشم سیاہ میں وہی برق طور ہے راہ میں
تری آنکھہ پر جو فدا ہوئے وہ شہید راہ خدا ہوئے
ہوا بعد وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جدا جدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہوا ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے
بنے قدر ایسے غبار ہم ہوئے گردشوں میں خوار ہم
کہ مثال دائرہ فلک جو اٹھے تو بے سر و پا ہوئے

قدر کی مذکورہ بالا غزل میں شاعری کی لازمی خوبیاں موجود ہیں مطلع میں ایک نہایت لطیف خیال پیدا کیا ہے

مصرعہ اولی میں آئے ہوئے کارواں سے الخ کیا خیال آفرینی کی ہے کہ ہم کو اپنے کارواں سے جدا ہونے کا افسوس ہے لیکن ہم اس سے جدا ہوئے تو راہ عاشقی میں فنا ہوئے مگر کیونکہ فنا ہوئے گر تو نقش قدم بنگئے راستہ میں نقش قدم بھی رہنمائی کرتا ہے اور رہنمائی عمدہ ترین کام ہے اور اٹھے تو بانگ درا ہوئے۔ بانگ درا سے بھی راہ کے بھولے بھٹکوں کو پتہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کی رہنمائی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ قدر کارواں سے جدا ہوکر بھی رہبری کر رہے ہیں۔ مطلع کا مفہوم کتنا اچھا ہے۔ علی ہذا ہر شعر میں معنی لطیف پائے جاتے ہیں۔ اٹھے ہم الخ والا شعر بھی خوب ہے۔ خواب وصال یار کا لطف اٹھاتے اٹھاتے جب آنکھ کھلی تو دل کی وحشت و اضطراب کی کچھ حد نہ تھی مصرعہ ثانی میں سراسیمگی اور توحش کی خوب تصویر اتاری ہے ہوا بعد وصل الخ اسمیں آتش شوق فرو ہونے کے بعد کی تصویر کھینچدی ہے۔ مقطع میں بھی خوب بات پیدا کی ہے۔ اپنے غبار کی ہیئت کذائی کو بیان کرتے ہیں کہ ہم غبار ہوکر بھی گردش سے نہ چھوٹے۔ غبار ہوکر ہم بلند ہوئے تو اسطرح جیسے دائرہ فلک اٹھکر بے سروپا ہے۔

سخن گو کے لئے سختی یہاں ہے — جبھی بتیس دانتوں میں زباں ہے

ذیل کے اشعار کی صفائی مصرعوں کی بیساختگی الفاظ کی چستی ملاحظہ ہو۔ ان اشعار میں نیچرل جذبات کی جھلک دکھا رہے ہیں۔ جوش موسم گل کی مصوری کی ہے ایسے جوشیلے موسم میں دلوں میں خاص وجدانی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور کم و بیش اسکا اثر ہر شخص پر ہوتا ہے:-

باغ سے جب ہوا چلی میکدے سے گھٹا چلی
دل کی کلی کھلا چلی، دل کی لگی بجھا چلی

تو نے نہ آکے دید کی بیٹھ کے گھر میں عید کی
لاش ترے شہید کی جانب کربلا چلی

واہ رے دورہ شراب خانقہیں ہوئیں خراب
جھوم رہے ہیں شیخ و شاب اسکی عجب ہوا چلی

شور اٹھا جو آہ کا صبر و قرار اڑ چلا
قافلے میں بجا درا ہونے لگی چلا چلی

وفاداروں نے سینچا تھا لہو سے — چھٹی مہندی نہ پائے خوبرو سے
گہر کی طرح سے بحر جہاں میں — بسر کی اب تلک کس آبرو سے
رگ گردن سے وہ نزدیک تر تھے — مگر پایا ہے کتنی جستجو سے

رندانہ شوخی

ساقی کہے تو دم نہ کوئی بادہ خوار لے — واعظ کی پگڑی کیا کہ کفن تک اتار لے

اسی زمین میں یہ شعر عاشقانہ رنگ میں کیا پُر مضمون نکال لیا ہے۔ کتنی اچھی گردش لیل و نہار اور ثبوت کتنا پیارا ہے معشوق پاس لیٹا ہے مگر انکی طرف کروٹ نہیں ہے فرماتے ہیں کہ وہ ادہر کروٹ لے تو انکی زلف و رخ دیکھوں اور مصرعہ ثانی تمنا یہ ہے کاش معشوق ادہر کروٹ لے اور گردش لیل و نہار میرے موافق ہو:—

کروٹ جو بدلے یار تو دیکھوں میں زلف و رخ — کروٹ کسی طرح سے یہ لیل و نہار لے

رندانہ رنگ میں یہ شعر بھی لاجواب کہا ہے مئے سرخ کو واعظ کے سبز عمامہ میں چھاننا عجب رنگ آمیزی ہے:-

ساقی جو چھانتا ہو مئے سرخ رنگ کو — واعظ کا سبز سبز عمامہ اتار لے

اسی زمین میں دوسری غزل کا یہ مطلع بھی خوب ہے کلام میں اس سے زیادہ صفائی و بیساختگی کیا پیدا ہو سکتی ہے

ان فصل گل میں مئے خوشگوار لے — چوری کرے کہ مانگ کے لے یا ادہار لے

کہاں ڈھونڈوں میں اُن لبروں کو یارب ہنسی ہے اسکی منہ ٹھونٹھ مروڑی ہے
نہیں کچھ آئینہ سازی پہ موقوف جو صاحب دل ہو اسکندر وہی ہے

قدر مرحوم نے ذیل کے عاشقانہ مطلع میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ جوانی کی اُمنگ کو کسطرح بیان کر گئے ہیں:-

لپٹ گئے میرے سینے سے مہربانی کی یہ سب اُمنگ تھی اُٹھتی ہوئی جوانی کی

معرفت

ملا جہاں سے جہاں آفریں کا ہمکو پتہ بنا ہے سارے حقیقت کہیں ہی یا مجازی تو

شکایت

رہے ہیں خاک نشیں اہل آرزو کے ہاتھوں ہمیں تو نہ ہے آفات آسمانی کی

رنگ تغزل، لطف بیان، معنی آفرینی، اور فصیحانہ رنگ میں اشعار ذیل قابل داد ہیں۔ یہ اشعار بظاہر رندانہ ہیں مگر انمیں صوفیانہ رنگ بھی ہے۔ مطلع کیا لطیف و معنی خیز ہے باقی اشعار کی خوبیاں بھی قابل داد ہیں۔ بہاریہ مضامین قدر نے ہر جگہ خوب لکھے ہیں:-

اٹھا میں جھومتا کہتا ہوا نشہ میں یا ساقی
ازل میخانہ میکش روح مے کُن تھی خدا ساقی
حباب جام لا ساقی مئے گلگوں پلا ساقی
مرے بحر عطا ساقی مرے بانی سخا ساقی
اُسے بھی لگ گئی شاید یہاں کی کچھ ہوا ساقی
جب آئی میکدے پہ جھومتے آئی گھٹا ساقی
سنا ہے چاند میں سورج سے ہوجاتی ہے ضو پیدا
چڑھا کر مئے چمک جاتا ہے میرا مہ لقا ساقی

میں کہوں یہ چوٹی ہے کیا کالی کالی کہ پیچھے پڑی ہے بلا کالی کالی
شب ماہ میں وہ پھرے بال کھولے ہوئی چاندنی جا بجا کالی کالی

یہ سجدے کو خود جھک پڑی گی چمن کہ قبلہ سے اٹھی گھٹا کالی کالی
مرے کعبۂ دل کے لٹنے کا غم ہے جو اوڑھے ہے کعبہ عبا کالی کالی
بچارے دن آہ پر چھا گئے ہیں گھٹا ہے بردے ہوا کالی کالی
یہ نامۂ قدر محشر میں نکلا اٹھی دھوپ میں اک گھٹا کالی کالی

قدر کی یہ ساری غزل فصیحانہ رنگ میں ہے یہ سجدے کو خود الخ والا شعر لاجواب ہے قبلہ سے گھٹا کا اٹھنا اور چمن پر سجدے کے لیے جھکنا عجیب و غریب رندانہ معنی آفرینی ہے اور مقطع میں تو بہت ہی لطیف معنی پیدا کئے ہیں۔ قدر اپنے سیہ نامہ سے (نامۂ اعمال) کو میدان حشر کی دھوپ میں گھٹا کا کام لے رہے ہیں۔ سیہ نامہ سے گھٹا بنا لی ہے اور گھٹا سے تمازت آفتاب کم ہوتی ہے اور اسلئے اُنکا سیہ نامہ اہل محشر کے لئے گویا مفید ہوا۔

تجاہل عارفانہ یا اغماز

گلی میں دیکھ کر اپنی وہ ہنسکے پوچھتے ہیں کسی سے کام ہے تم کون ہو کدھر آئے

اسی زمین میں یہ شعر کتنا پاکیزہ کہا ہے:-

تعلقات جہاں سے چھٹے ہیں قدر میں سفر تمام ہوا آج اپنے گھر آئے

نزاکت

فقط خیال ہی آیا تھا ہم کو بوسوں کا کہ ان کے عارض نازک پہ نیل اُبھر آئے

واعظ خبر اڑاتا ہے عرش الٰہ کی چھت گر پڑے نہ سر پہ کہیں خانقاہ کی
نالوں سے میرے سرمد و منصور مست ہیں یہ دونوں قمریاں ہیں میری سرو آہ کی
یہ چار عنصروں کا خلاف اور ایک روح جھگڑے ہیں یا ہمیں نہیں صورت نباہ کی
پھولی ہوئی شفق ہے شہیدوں کے خون سے ہے آسماں زمین مرے قتل گاہ کی
گاہے وہ گرمیاں کبھی یہ سرد مہریاں پھبتی کہو لگا آپ پہ ہیں مہر و ماہ کی
اے قدر تم بھی کتنے خوشامد پسند ہو دل انکو دیدیا جو ذرا واہ واہ کی

مطلع خوب کہا ہے دوسرے شعر میں سرمد و منصور کو اپنی سر آہ کا قمری بنانا جدید معنی آفرینی ہے شاید یہ مضمون کسی اور نے نہیں کہا ہے۔ باقی اور اشعار بھی لاجواب ہیں:-

اس شہ حسن پہ دم جسکا فنا ہوتا ہے　　طائر روح نکلتے ہی ہما ہوتا ہے
وصل میں وہ بت انکار نہیں کر سکتے　　واہ کیا سنگ ہٹانی میں مزا ہوتا ہے
ساتھ دیتا ہے شب تار جدائی میں کون　　یہ ہے وہ وقت کہ سایہ بھی جدا ہوتا ہے
ہم مناتے ہیں جب یار خفا ہوتا ہے　　یہ تو سب سچ ہے مگر رنج بڑا ہوتا ہے

تم اٹھ گئے اک نگاہ کر کے　　ہم گر پڑے آہ آہ کر کے
مٹی میں ملی مری جوانی　　کیا تم کو ملا تباہ کر کے

قدر گل بوٹے غضب کے گلشن ایجاد کے　　کیا کیا صورتیں ہیں صدقے آدم زاد کے
قدر صحرائے اعدام کو دشت وحشت سے چلا　　دیکھ لے دیکھ ذرا اس خانماں برباد کے

ذیل کا شعر قابل تحسین ہے خلش پسندی کا ثبوت کیا خوب دیا ہے:-

ہم دشت نوردی میں اگر خار نہ پاتے　　خود کو کھڑے پھوٹ آئیں بیمار کف پا سے

شمار میں نہیں موج جہان فانی کی　　جنون ہے اسے لہریں گنے جو پانی کی

بیٹھے بٹھلائے ہوئی الفت قامت کیسی　　سر پہ ٹوٹی مرے اللہ قیامت کیسی
کچھ نہیں سوجھتا ظلمت کدۂ عالم میں　　پڑے پڑ جاتے ہیں چھا جاتی ہے غفلت کیسی
چار فقروں میں نکیرین کو سمجھایا ہے　　ہم نے پائی ہے سر شام فراغت کیسی

امید مغفرت کی سیہ کاریوں میں ہے　　کالی گھٹا میں دیکھئے رحمت بھری ہوئی

اشک سے اگر سینچیں باغ طالب دیدار　　شاخ میں جو گل نکلے رو رہا ہو جائے

منکسر ہوتے ہیں ہنر والے　　نخل جھک جاتے ہیں ثمر والے
صبر تو یار ہم سے مشکل ہے　　اور جو چاہے کام کروا لے

آئینہ دل ہے کبھی عاشق کا　　جب تو حیران رہا کرتا ہے
خون اپنا تجھے بخشا میں نے　　کیوں پشیمان رہا کرتا ہے

اے ساقی تو اک جام میں آنکھیں چراتا ہے　　لٹاتے سارا میخانہ کہیں جو ہم ساقی ہوتے

قدر کے ان آخری اشعار میں ہندی شاعری کا سا رنگ پایا جاتا ہے مگر خیالات کی لطافت حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ آخر دیوان میں انہوں نے ایک غزل مسلسل لکھی ہے جسمیں یہ بیان کیا ہے کہ ہمیں خدا یہ بناتا تو یہ ہوتے اور یہ بناتا تو یہ ہوتے اور ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جو عضو باطن خدا بناتا تو ہم دل بے قرار ہوتے　　جو عضو ظاہر خدا بناتا تو دیدۂ اشکبار ہوتے
جو نقش ہم کو خدا بناتا تو بنتے ہم نقش پا کسی کا　　غبار ہم کو خدا بناتا تو اپنے دل کا غبار ہوتے

اب ہم حضرت قدر کی اس غزل کے چند اشعار درج کرتے ہیں جو اس دنیا میں انکی غزل آخری تھی ارباب نظر کو اس سے مرحوم کی قادر الکلامی اور پختگی مذاق کا با آسانی پتہ مل جائیگا۔

کب تک سہیگا تری جفا دل نالش کریگا روز جزا دل
پتھر ترا دل شیشہ مرا دل ہشیار بنا خالق ہی عادل
زخموں کی شدت داغوں کی کثرت کس کس کو روؤں ہے ایک آفت
کرنی تھی یارب میری جو خلقت دنیا تھا مجھکو سب سے بڑا دل
درد خدا کے یا ہاتھ آیا یا سوز دل نے پھونکا خدایا
آخر جگر کو کس نے اڑایا پہلو میں میرے یا وہ تھے یا دل

اعجاز لکھنوی

[1] مضمون ہذا میں یہ اور ابھی قسم کے اکثر تصرفات جو خاص معلومات پر مبنی ہیں ہمارے کرمفرما مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی کئے ہوئے ہیں جنکے لئے ہم انکے ممنون ہیں۔ ایڈیٹر

سوت

پنڈت دیودت کی شادی ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ مگر کوئی اولاد نہ ہوئی جب تک انکے ماں باپ زندہ تھے وہ ان سے ہمیشہ دوسری شادی کرنے کے لئے تقاضا اور اصرار کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کبھی اسپر راضی نہوئے۔ انہیں اپنی بیوی گوداوری سے سچی محبت تھی۔ اور اولاد کی آرزو میں وہ اپنی موجودہ عافیت و اطمینان کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے۔ اسکے علاوہ وہ کچھ نئے خیالات کے آدمی تھے اور اُن ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے جو اولاد اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جب تک انسان میں اتنی مقدرت نہو کہ وہ اپنی اولاد کی کما حقہ پرورش، تعلیم اور تربیت کا کفیل ہوسکے اسے شادی سے محترز رہنا چاہئے۔ اسے وہ خوب سمجھتے تھے۔ پہلے تو کبھی کبھی بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھکر ان کے جگر پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ مگر اب اپنے دیگر ہموطنوں کی طرح وہ بھی جسمانی عوارض میں مبتلا رہتے تھے اور اولاد کا خیال کرتے ہی انہیں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن گوداوری اتنی جلد مایوس ہونیوالی نہ تھی۔ پہلے تو وہ دیوی دیوتا، گنڈے تعویذ اور جنتر منتر پر معتقد رہی۔ مگر جب اُسنے دیکھا کہ اُن سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو اُسنے پنڈت جی کی دوسری شادی کرنیکا منصوبہ کیا۔ اسنے ہفتوں، مہینوں اس فکر میں کاٹے، دل کو بہت سمجھایا۔ مگر جو بات من میں سما گئی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ ہاں اسے بڑی زبردست قربانی کرنا پڑیگی۔ شاید شوہر کی محبت کا انمول رتن بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ پر کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ پندرہ سال تک لگاتار جس نخلِ محبت کو پالا اور سینچا۔ کیا وہ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکیگا۔

گوداوری نے آخر کار اولاد کی پرزور خواہش کے سامنے سر جھکا دیا اور سوت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔

۲

پنڈت دیودت گوداوری کی یہ تجویز سنتے ہی ہنس پڑے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ یا تو میری محبت کا امتحان لیا جارہا ہے یا میرا من لینے کی کوشش ہے۔ ہنسکر بات ٹالدی۔ مگر جب گوداوری نے متین انداز سے کہا "تم اسے ہنسی مت سمجھو۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ اولاد کا منہ دیکھنے کے لئے میں سوت سے چھاتی پر مونگ دلوانے کے لئے بھی تیار ہوں" یہ کہتے کہتے اسکی آنکھیں پر آب ہوگئیں۔ تب تو پنڈت جی کو کوئی شبہ نہ رہا۔ اتنے اعلیٰ اور بے نفس ارادہ سے بھری ہوئی گوداوری کو انہوں نے گلے سے لگالیا۔ اور بولے "مجھسے یہ نہ ہوگا۔ مجھے اولاد کی آرزو نہیں" گوداوری نے زور دیکر کہا "تم کو نہیں مجھے تو ہے۔ اگر اپنی خاطر سے نہیں تو تمہیں میری خاطر سے یہ کام کرنا پڑیگا"

پنڈت جی سیدھے سادھے آدمی تھے۔ حامی تو نہ بھری۔ مگر کچھ نیم راضی سے ہوگئے۔ بس اسی کی دیر تھی۔ پنڈت جی کو ذرا بھی تکلیف نہ کرنا پڑی۔ گوداوری کی دانشمندی نے ساری منزل آسان کردی۔ اُسنے صرف اپنے پاس سے روپے ہی نہیں نکالے بلکہ اپنے گہنے کپڑے بھی نذر کردیے۔ بدنامی کا خوف اس راستہ میں ایک بڑا زبردست کانٹا تھا۔ دیودت جی میں سوچتے کہ جب میں سہرہ مور سجا کر مونچھیں کٹوائے۔ دولہا بنا ہوا نکلونگا تو لوگ مجھے کیا کہینگے۔ میرے دفتر کے لوگ میرا مضحکہ اڑائیں گے اور میری طرف مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھینگے۔ انکی یہ نگاہیں چھری سے بھی زیادہ تیز ہونگی۔ اسوقت میں کہاں منہ چھپاؤنگا۔ مگر گوداوری نے اپنے گاؤں میں جاکر اس کام کو چھیڑا اور بخیریت انجام تک پہنچا دیا۔ نئی بہو گھر میں

سوت
آگئی۔ اسوقت گوداوری ایسی خوش تھی گویا بیٹے کا بیاہ کرلائی ہے وہ خوب گاتی بجاتی رہی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بہت جلد اس گانے کے بدلے رونا پڑیگا!

۳

کئی مہینے گذر گئے۔ گوداوری اپنی سوت پر اُسیطرح حکومت کرتی تھی گویا وہ اسکی ساس ہے تاہم اسے یہ بات اکرم کے لئے نہ بھولتی تھی کہ میں اصل میں اسکی ساس نہیں ہوں۔ اور پھر گومتی کو بھی اپنی حیثیت کا پورا خیال رہتا تھا۔ اسی لئے گوداوری کی حکومت، ساس کی حکومت کی طرح سخت نہ ہونے کے باوجود اُسے ناقابل برداشت معلوم ہوتی اسے اپنی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لئے بھی گوداوری کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی تھی۔

کچھ دنوں بعد گوداوری کے عادات میں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگا وہ پنڈت دیو دت کو گھر میں آتے جاتے بڑی تیز تجسس نگاہوں سے دیکھتی۔ اسکی فطری متانت غائب سی ہوگئی۔ ذرا سی بات بھی اسکے پیٹ میں نہیں پچتی۔ جب پنڈت جی دفتر سے آتے ہیں تب گوداوری گھنٹوں انکے پاس بیٹھی ہوئی گومتی کا ذکر خیر کیا کرتی ہے اس داستان میں اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ ختم ہوجاتی ہے تو پنڈت جی کے دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے گوداوری کیوں اتنی پرگو ہوگئی تھی اسکا راز سمجھنا مشکل ہے شاید وہ اب گومتی سے ڈرتی تھی۔ اسکے حُسن نے اس کے شباب نے، اور اسکی شرمیلی آنکھوں سے باندہ کو توڑ کر وہ اب پانی کا بہاؤ مٹی کے ڈھیلوں سے روکنا چاہتی ہے!

ایک دن گوداوری نے گومتی سے میٹھے چاول پکانے کو کہا شاید رکشا بندن تھا۔ گومتی نے کہا شکر نہیں ہے۔ گوداوری یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ اتنی شکر اتنی جلد کیسے اُٹھ گئی! جسے چھاتی پھاڑ کر کمانا پڑتا ہے اسے اکھرتا ہے۔ کھانے والے کیا جانیں!۔

جب پنڈت جی دفتر سے آئے تو یہ ذرا سی بات ایک طولانی داستان بنکر انکے کانوں تک پہنچی۔ تھوڑی دیر کے لئے پنڈت جی کو شبہ ہوا کہ کہیں گومتی کو غلبۂ اشتہا کا مرض تو نہیں ہوگیا۔

ایسا ہی واقعہ ایکبار پھر ہوا۔ پنڈت جی کو بواسیر کی شکایت تھی لال مرچ بالکل نہ کھاتے تھے۔ گوداوری جب کھانا پکاتی تو اس بات کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گومتی نے ایک دن سالنے کے مسالہ داں میں تھوڑی سی لال مرچ بھی ڈالدی۔ پنڈت جی نے دال کم کھائی۔ مگر گوداوری گومتی کے پیچھے پڑگئی۔ اینٹھ کر اس سے بولی "ایسی ارا ہمل کیوں نہیں جاتی"

۴

پنڈت جی سیدھے سادھے آدمی تھے ہی۔ دفتر گئے۔ کھانا کھایا پڑ کر سو رہے، وہ ایک ہفتہ وار اخبار منگواتے تھے، مگر اُسے کبھی بھی کھولنے کی نوبت نہ آتی تھی جس کام میں ذرا بھی تکلیف یا تردد ہو اس سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ کبھی کبھی انکے دفتر میں تھیٹر کے پاس مفت ملا کرتے تھے۔ مگر پنڈت جی انسے کبھی کام نہ لیتے اور ہی لوگ مانگ لے جاتے تھے۔ رام لیلا یا اور کوئی میلا تو انہوں نے شاید نوکری کرنے کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ گوداوری انکی عادت سے واقف ہوگئی تھی۔ پنڈت جی بھی ہر ایک معاملہ میں اُسی کی رائے پر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔

پر روئی جیسی ملایم شئے بھی دبکر سخت ہوجاتی ہے۔ پنڈت جی کو یہ آٹھوں پہر کی دیکھ بھال سخت ناگوار معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی وہ من ہی میں جھنجھلانے بھی لگتے۔ قوت ارادی، جو عرصہ دراز تک بیکار پڑے رہنے سے بالکل مردہ ہوگئی تھی، ازسر نو عود کرنے لگی۔

پنڈت جی یہ مانتے تھے کہ گوداوری نے سوت کو گھر لانے میں بڑا ایثار سے کام لیا ہے۔ اس ایثار کو بشریت سے کوئی مناسبت نہیں لیکن اُسکا

جو کچھ احسان ہے نجیبر ہے۔ گومتی پر اسکا کیا احسان؟ میگر باعث اسپر کیوں اس سیندوری کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہاں اُسے ایسا کونسا سکھ مل گیا ہے جسکے بدلے میں وہ یہ پھٹکاریں سہے۔ شوہر ملا ہے وہ بوڑھا، دایم المرض گھر ملا ہے۔ وہ ایسا کہ آج نوکری چھوٹ جائے تو کل ان شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں۔ ان حالات میں گوداوری کا ظالمانہ سلوک انہیں بہت ناگوار معلوم ہوتا۔

گوداوری کی آنکھیں اتنی کمبین نہ تھیں کہ پنڈت دیووت کے کیفیات قلب نظر آئیں، ان کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے وہ گوداوری کو انکے چہرہ پر موٹے حروف میں منقوش معلوم ہوتے۔ یہ علم اسکے سینہ میں ایک طرف تو گومتی کے خلاف حسد کی آگ بھڑکاتا تھا اور دوسری طرف پنڈت جی پر خود غرضی بیوفائی اور دغا بازی کا الزام عائد کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل کی کدورت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

۵

رفتہ رفتہ گوداوری نے پنڈت جی سے گومتی کا چرچا کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گویا اسکے نزدیک گومتی گھر میں تھی ہی نہیں۔ وہ اب نہ اسکے کھانے پینے کی خبر لیتی ہے، نہ کپڑے لتے کی۔ ایکبار کئی دنوں تک اُسے ناشتہ کرنے کو بھی نہ ملا۔ پنڈت جی آرام طلب آدمی تو تھے ہی وہ ان سب بےعنوانیوں کو دیکھتے مگر اپنی عافیت کے سمندر میں تلاطم پیدا ہونے کے خوف سے زبان نہ ہلاتے تھے تاہم اس آخری بیرحمی انکے غیر معمولی تحمل و برداشت کے لئے بھی قاتل ثابت ہوئی۔ ایک دن انہوں نے گوداوری سے ڈرتے ڈرتے کہا" کیا آجکل گھر میں ناشتہ کے لئے مٹھائی وٹھائی نہیں آتی"۔

گوداوری نے ترش رو ہوکر جواب دیا" تم لاتے ہی نہیں تو آئے کہاں سے۔ میرے کوئی نوکر بیٹھا ہے"۔

دیووت کے دلپر گوداوری کے یہ الفاظ تیر کی طرح لگے۔ آجتک گوداوری نے انسے کبھی ایسے لہجہ میں بات چیت نہیں کی تھی۔ بولے" آہستہ بولو جھنجھلانے کی تو میںنے کوئی بات نہیں کی"۔

گوداوری نے آنکھیں نیچی کرکے کہا۔ مجھے تو جیسا آتا ہے ویسے بولتی ہوں۔ دوسروں کی سی میٹھی چکنی باتیں کہانسے لاؤں؟

دیووت نے ذرا گرم ہوکر کہا" آجکل مجھے تمہارے مزاج کا کچھ رنگ ہی نہیں ملتا۔ بات بات پر الجھتی ہو"۔

گوداوری کا چہرہ غصہ کی آگ سے لال ہوگیا بیٹھی تھی، کھڑی ہوگئی ہونٹ پھڑکنے لگے۔ بولی" اب تمہیں میری کوئی بات اچھی نہ لگیگی اب تو سر سے پیر تک مجھہ میں عیب ہی عیب بھرے ہیں۔ اب اور لوگ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں گے مجھسے نہیں ہوسکتا۔ یہ لو صندوق کی کنجی۔ اپنے روپئے پیسے سنبھال لو۔ یہ آئے دن کی جھنجھٹ مجھسے نہیں برداشت ہوسکتی۔ جب تک نبھا نبھایا۔ اب نہیں نبھہ سکتا"۔

پنڈت دیووت کو سکتہ سا ہوگیا۔ جس شور و شر کا انہیں خدشہ تھا اسنے نہایت خوفناک صورت میں انکے گھر میں قدم رکھا۔ وہ اُس وقت کچھہ نہ بول سکے۔ اسوقت زیادہ بولنے سے بات بڑھ جانیکا اندیشہ تھا۔ وہ باہر چلے آئے اور سوچنے لگے کہ میںنے گوداوری کے ساتھ ایسی کون سی بےعنوانی کی ہے جسکا یہ پہل مل رہا ہے۔ انکی سمجھہ ہی میں نہیں آتا تھا کہ گوداوری کے ہاتھہ سے نکلکر گھر کا انتظام کیونکر ہوسکیگا۔ اس قلیل آمدنی میں وہ نہ جانے کون جگت کرتی تھی۔ اب ایشور کیسے پار لگائیں گے، کچھہ نہیں اُسے منانا پڑیگا، اور ہوہی کیا سکتا ہے، گومتی کیا کریگی! سارا بوجھہ میرے سر پڑیگا۔ مانیگی تو، مگر مشکل سے۔

مگر پنڈت جی کے یہ خیالات باطل نکلے۔ صندوق کی وہ کنجی زہریلی ناگن کی طرح وہیں آنگن میں تین دن تک پڑی رہی کسی کو اسکے نزدیک جانے کی جرأت نہوئی۔

چوتھے دن پنڈت جی نے گویا جان پر کھیلکر کنجی اٹھالی اسوقت انہیں ایسا
محسوس ہوا گویا کسی نے انکے سر پر پہاڑ اٹھا کر رکھدیا۔ آرام طلب تو تھے ہی
اپنے مقررہ راستے سے ایک تل بھر ہٹنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے اگرچہ
پنڈت دیودت جانتے تھے کہ میں اپنے دفتر کے باعث گھر کا انتظام
نہیں کر سکتا تاہم انسے اتنی ڈھٹائی نہو سکی کہ وہ کنجی گومتی کو دیدیں
مگر یہ محض دکھاوا تھا۔ کنجی دیکھنے کو پنڈت جی کے ہاتھ میں رہتی تھی
کام سب گومتی کو کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح خاندان پر حکومت کرنیکا
آخری وسیلہ بھی گوداوری کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہلیہ خانہ کے نام
کے ساتھ جو عزت اور وقار وابستہ ہوتا ہے وہ بھی اس کنجی کیساتھ
چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کی مہری، اور پڑوس کی عورتوں کے
برتاؤ میں فرق عیاں ہونے لگا۔ گوداوری اب معزول رانی
تھی جسکا اختیار صرف دوسروں کی ہمدردی ہی پر رہگیا تھا۔

۶

خانہ داری کے انتظام میں یہ تغیر ہوتے ہی گوداوری کے عادات میں بھی ایک
افسوسناک تغیر نظر آنے لگا۔ حسد دل میں رہنے والی شئے نہیں۔
ہمسایوں میں رات دن اسی خاندان کے چرچے رہتے دیکھو تو دنیا
کیسی مطلب کی ہے۔ غریب سے زبردستی دولھا بنایا، جان بوجھکر اپنے
پیروں میں کلھاڑی ماری۔ اپنے گہنے کپڑے تک اتار دیے۔ مگر اب روتے
روتے آنچل بھیگتا ہے۔ سوت تو سوت ہی ہے۔ شوہر نے بھی نظروں سے
گرا دیا۔ بس اب لونڈی کیطرح گھر میں پڑی پڑی پیٹ جلایا کرے
یہ بھی کوئی جینا ہے!

گوداوری یہ ہمدردانہ باتیں سنتی اور اسکی آتش حسد اور بھی تیز ہوتی
اسے اتنا نہ سوجھتا کہ یہ زبانی غمگساریاں زیادہ تر نفس انسان ہی کی
خباثت سے پیدا ہوتی ہیں۔

گوداوری کو جس امر کا پورا یقین تھا، اور پنڈت دیودت کو جس کا بڑا خوف،
وہ بات نہوئی۔ خانہ داری کے معاملات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی
ہاں تجربہ نہونے کے باعث پنڈت جی کے انتظام میں ویسی صفائی
کچھ خرچ زیادہ پڑ جاتا تھا۔ مگر کام چلا جاتا تھا۔ ہاں گوداوری کو
گومتی کے سبھی کام بے ڈھنگے نظر آتے تھے حسد میں آگ ہے۔ مگر آگ
کی خاصیت اسمیں نہیں ہے، وہ دلکو بہلانے کے بدلے اور بھی تنگ
کر دیتا ہے اب گھر میں کوئی نقصان ہو جانے سے گوداوری کو رنج
کے بجائے خوشی ہوتی ہے۔ برسات کے دن تھے کئی دن آفتاب
نہ نظر آیا۔ صندوق میں رکھے ہوئے کپڑوں میں پھپھوندی لگ گئی
تیل کے اچار بگڑ گئے۔ گومتی کو ان چیزوں کو دھوپ میں رکھنے
کا خیال نہ رہا۔ گوداوری نے یہ نقصانات دیکھے مگر اسے ذرا بھی
افسوس نہ ہوا۔ ہاں دو چار جلی کٹی باتیں سنانے کا موقع البتہ ہاتھ
آگیا "مالکن بننا ہی آتا ہے یا مالکن کا کام کرنا بھی"!

پنڈت دیودت کے عادات میں بھی ایک تبدیلی نظر آنے لگی۔ جب تک
گوداوری اپنے حسن انتظام سے گھر کا کام کاج سنبھالے ہوئے تھی
تب تک انہیں کسی چیز کی کمی نہیں کھلی۔ یہانتک کہ ترکاری سبزی
وغیرہ کے لئے بھی انہیں بازار نہ جانا پڑتا۔ مگر اب گوداوری انہیں
دن میں کئی کئی بار بازار جاتے دیکھتی ہے۔ خانہ داری کا انتظام
خراب ہونے کے باعث اکثر انہیں عین وقت پر بازار بھاگنا پڑتا
ہے۔ گوداوری یہ سب کایا پلٹ دیکھتی اور سنا سنا کے کہتی "یہی
مہاراج ہیں کہ ایک تنکا بھی نہ اٹھاتے تھے۔ اب دیکھتی ہوں سارے
بازار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنتی
کہ میرے لکھنے پڑھنے میں ہرج ہوگا"۔

گوداوری کو ایکبار اسکا ثبوت مل چکا تھا کہ پنڈت جی خرید و فروخت کے
معاملہ میں بہت ہوشیار نہیں۔ اسی لئے اسنے جب کپڑوں کی ضرورت
ہوتی تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی پنڈت جی

کو یہ بات بھول سی گئی تھی کہ گوداوری کو ساڑیوں کی بھی ضرورت
ہوتی ہے انکے سر سے تو جتنا بوجھ کوئی ہٹا دے اتنا ہی اچھا تھا خود
بھی وہی کپڑے پہنتے جو گوداوری منگا کر دیدیتی۔ انہیں نت نئے
فیشن اور نمونے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر اب کپڑوں کے لئے بھی
انہیں کو بازار جانا ہوتا۔ ایک بار گومتی کے پاس ساڑیاں نہیں تھیں
پنڈت جی بازار گئے تو ایک بہت نفیس جوڑا لائے۔ بزاز نے منہ مانگے
دام لئے۔ اور سودا لینے میں پنڈت جی کو مطلق پس وپیش نہ ہوتا
تھا گومتی نے وہ جوڑا گوداوری کو دکھایا۔ گوداوری نے دیکھا اور
منہ پھیر کر بولی" بھلا تم نے انہیں کپڑے لانا تو سکھا دیا۔ مجھے تو
سولہ سال گزر گئے انکے ہاتھ کا لایا ہوا کپڑا خواب میں پہننا بھی نصیب
نہ ہوا"

ایسے واقعے گوداوری کی آتش حسد کو اور بھی زیادہ مشتعل کیا کرتے
تھے جب تک اُسے یقین تھا کہ پنڈت جی فطرتاً روکھے ہیں تب تک
اُسے اطمینان تھا مگر اب انکی یہ نئی نئی امنگیں دیکھکر اُسے معلوم ہوا
کہ میں نے ہزار کوشش کرنے پر بھی جس محبت کو نہ پایا اُسے گومتی نے
محض اپنے حسن سے جیت لیا۔ اُسے اب یقین ہوا کہ میں جسے سچی
محبت سمجھتی تھی وہ فی الواقع ایک فریب تھی، وہ محبت نہ تھی نری
خودغرضی تھی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں گومتی بیمار پڑی، اُٹھنے بیٹھنے کی سکت
نہ رہی گوداوری کھانا پکانے لگی۔ مگر اُسے یقین نہ ہوا کہ گومتی واقعی
بیمار ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے کھانا پکوانے کے لئے یہ سوانگ
رچا گیا ہے۔ پڑوسنوں سے کہتی کہ لونڈی بننے میں اتنی ہی کسر
تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔
پنڈت جی کو آجکل کھانا کھاتے وقت بھاگا بھاگ سی پڑ جاتی ہے
معلوم نہیں کیوں وہ اکیلے گوداوری سے باتیں کرتے ڈرتے ہیں
جانے کیا لعن طعن کرنے لگے۔ اسی لئے کھانا کھاتے وقت وہ ڈرتے
سہتے تھے کہ کہیں وہ منحوس گھڑی آنہ جائے۔ گوداوری اپنی تیز
نگاہوں سے انکی یہ حالت دیکھتی اور دل میں اینٹھ کر رہجاتی۔
ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ بولی" کیا مجھ سے بولنے کی بھی ممانعت
کر دیگئی ہے۔ دیکھتی ہوں کہیں تو رات رات بھر باتوں کا تار
نہیں ٹوٹتا۔ پر میرے سامنے منہ نہ کھولنے کی بھی قسم کھالی ہے۔
گھر کا رنگ ڈھنگ تو دیکھتے ہو نہ۔ اب تو سب کام تمہاری مرضی
کے مطابق ہو رہا ہے"!

پنڈت جی نے سر نیچا کئے ہوئے جواب دیا" اُنھ جیسے چلتا ہے
ویسے چلتا ہے۔ اب اس فکر میں کیا اپنی جان دیدوں؟ جب
تم ہی چاہتی ہو کہ گھر مٹی میں ملجائے تو میرا کیا بس ہے"۔
اسپر گوداوری نے کچھ سخت باتیں کہیں۔ بات بڑھ گئی۔ پنڈت جی اُٹھ
گوداوری نے قسم دلا کر انہیں بٹھانا چاہا مگر وہ نہ بیٹھے۔ تب اُسنے
رسوئی اٹھا دی۔ سارے گھر کو فاقہ کرنا پڑا۔ گومتی میں ایک خاص
صفت یہ تھی کہ بات چاہے کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو وہ سہہ لیتی تھی
مگر بھوک کی برداشت اس سے نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ کبھی کوئی
برت (روزہ) نہ رکھتی تھی۔ ہاں بہت اصرار کرنے سے جنم اشٹمی
رکھ لیتی تھی لیکن آجکل بیماری کے باعث اُسے اور بھی بھوک
لگتی تھی۔ جب اسنے دیکھا کہ دوپہر ہونے آئی اور کھانا ملنے کی
کوئی امید نہیں تو اسنے مجبور ہو کر بازار سے مٹھائی منگوائی ممکن ہے
اُسنے محض گوداوری کو جلانے کے لئے یہ حرکت کی ہو کیونکہ کوئی بھی
ایک وقت بھوکے رہنے سے مر نہیں جاتا۔ گوداوری کے سر سے
پیر تک آگ لگ گئی اُسنے بھی فوراً مٹھائیاں منگوائیں اور آج
کئی برس کے بعد خوب پیٹ بھر کے مٹھائی کھائی۔ یہ سب حسد کے کرشمے تھے۔

جو گوداوری دوپہر ہونے سے پہلے منہ میں پانی ڈالنا گناہ سمجھتی تھی (سوت) وہی گوداوری اب روزانہ علے الصباح ناشتے کے بغیر تھیرا ہی جاتی ہے۔ سر میں وہ ہمیشہ میٹھا تیل ڈالتی تھی۔ اب شہد تیل سے سیر ہونے لگتا تھا۔ پان کھانے کا شوق بھی پیدا ہو۔ جسنے اُسے نئی نویلی بہو بنا دیا۔

جنم اشٹمی کا مبارک دن آیا پنڈت دیودت کی خلقی محبو ایت ان دو تین دنوں کے لئے رخصت ہو جاتی تھی۔ وہ بڑے جوش سے اسکی تیاریاں کرتے تھے۔ گوداوری یہ برت بے آب و دانہ رکھتی تھی اور پنڈت جی تو کرشن کے بھگت ہی تھے۔ انکے لئے بے آب و دانہ رہنا لازمی تھا۔ انکے اصرار سے ابکی گومتی نے بھی نرجل برت رکھنے کی جرأت کی۔ مگر اسے انتہا درجہ تعجب ہوا جب مہری نے کہا "بہو جی برت نہ رکھینگی انکے لئے بازار سے پوریاں منگوا دینا"۔

شام کے وقت گوداوری نے مان مندر جانے کے لئے یکہ کی فرمایش کی۔ گومتی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ مان مندر بالکل قریب تھا۔ اب یکّے والے آج سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہ چڑھکر بولی "فضول پیسے پھینکنے سے کیا فائدہ۔ مان مندر کون بڑی دور ہے۔ پاؤں پاؤں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ فرمایش کر دینا آسان ہے۔ کہلتا ہے اسکو جو چھاتی پھاڑ کر کماتا ہے"۔

تین سال پہلے گومتی نے اسیطرح کی باتیں گوداوری کے منہ سے سُنی تھیں! آج یہی باتیں گوداوری کو گومتی کے منہ سے سننا پڑیں۔ دنوں کا پھیر!

گوداوری ان دنوں بڑی بیدلی سے کھانا بناتی تھی۔ پنڈت جی کے پرہیز کے متعلق اُسے اب پہلے کی سی احتیاط نہ تھی۔ ایک دن اُسنے مہری سے کہا۔ کہ انداز سے مسالے نکالکر پیس لا۔ مسالے دال میں پڑے تو دال ذرا تیز ہو گئی۔ مارے خوف کے پنڈت جی سے کھائی گئی اور آرام طلب دمیونکی طرح چٹپٹی چیزیں انہیں بھی مرغوب تھیں لیکن مرض کے ہاتھوں مجبور تھے۔ گومتی نے جب یہ ماجرا سنا تو بہیں چڑھا لیوی "کیا تمہارے ہیں زبان گز بھر کی ہو گئی ہے" کچھ اسیطرح کی سخت باتیں آئندہ گوداوری نے بھی کہی تھیں۔ آج اسکی سننے کی باری تھی۔ نیرنگیٔ روزگار اسی کا نام ہے۔!

آج گوداوری گنگا سے ملنے آئی ہے۔ تین سال ہوے وہ ایک بار دولہن کو لیکر گنگا کو دودھ چڑھانے آئی تھی۔ آج وہ اپنی جان اُسے نذر کرنے آئی ہے۔ آج وہ اُسکے مسرت بار موجوں میں آرام کرنا چاہتی ہے گوداوری کو اب اُس گھر میں ایک ایک لمحہ رہنا شاق تھا۔ جس گھر میں رانی بنکر رہی اسی گھر میں لونڈی بنکر رہنا اُس جیسی خود دار عورت کے لئے محال تھا۔

اب اس گھر سے گوداوری کا تعلق صرف اُس پرانی رسّی کیطرح تھا جو بار بار گرہ دینے پر بھی کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ ہی جاتی ہے اُسے گنگا جی کے دامن میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی تدبیر نہ نظر آتی تھی۔ کئی دن ہوئے اسکے منہ سے بار بار جان دیدینے کی دھمکی سنکر پنڈت جی غصے سے بول اٹھے تھے "تم کسی طرح مر بھی تو جاتیں" گوداوری وہ زہریلے الفاظ ابتک نہ بھولی تھی۔ چبھنے والی باتیں اسکے دل پر پتھر کی لکیر بنجاتی تھیں۔ آج گومتی نے بھی وہی باتیں کہیں۔ اگرچہ اُسنے بہت کچھ سننے پر یہ الفاظ زبان سے نکالے تھے مگر گوداوری کو اپنی باتیں تو بھولگئی تھیں صرف گومتی کی باتیں کان میں گونج رہی تھیں آہ: اور پنڈت جی نے اُسے ڈانٹا تک نہیں! مجھپر ایسا غضب ڈھایا جائے اور وہ زبان تک نہ کھولیں!

آج سب لوگوں کے چلے جانے پر گوداوری گھر سے باہر نکلی۔ آسمان پہ کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ پانی کی جھڑی لگی ہوئی تھی

اسکی آنکھوں سے بھی آنسو کی دھار جاری تھی۔

محبت کی زنجیر کتنی مضبوط ہے۔ اور پھر کتنی نازک! نازک ہے دنیا کے سامنے، مضبوط ہے جوگ کے سامنے۔ گوداوری چوکھٹ پر کھڑی کھڑی گھنٹوں روتی رہی۔ کتنی ہی پچھلی باتیں اُسے یاد آتی تھیں۔ کبھی اسی گھر میں اسکے لئے محبت ہی تھی، عزت بھی تھی، زندگی کا سکھ بھی تھا، مگر اب نہیں ہے! فوراً پنڈت جی کی وہ محبت آمیز باتیں یاد آ گئیں۔ آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ گوداوری گھر سے چل کھڑی ہوئی۔

اسوقت اگر پنڈت دیودت ننگے سر ننگے پاؤں پانی میں بھیگتے دوڑتے آتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گوداوری کو پکڑ کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے سینے سے لگا لیتے اور کہتے پیاری! اسکے سوا انکی زبان سے اور کچھ نہ نکلتا۔ کیا اب بھی گوداوری اپنے ارادے پر قایم رہتی؟

کوار کا مہینہ تھا۔ رات کو گنگا کے لہروں کی گرج بہت خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ ساتھ ہی جب یکایک بجلی کوند جاتی تو اچھلتی ہوئی لہریں روشنی میں ایسی معلوم ہوتیں گویا روشنی خود مست ہاتھوں کے جسم میں کلیلیں کر رہی ہیں۔ نزاع ہستی کا ایک خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

گوداوری کے سینہ میں بھی اسوقت خیالات کی پر شور لہریں اٹھتی تھیں، وہ آپس میں ٹکراتی اچھلتی ہوئی غائب ہو جاتی تھیں۔ کہاں؟ تاریکی میں جہاں کچھ نہیں تھا۔

کیا یہ گرجنے اور امڈنے والی گنگا گوداوری کے دل بیقرار کو تسکین دے سکتی ہے؟ اسکی لہروں سے نغمۂ شیریں کی صدائیں نہیں آتیں۔ اسکی آنکھوں میں چہرہ کی بھیانک نہیں ہے۔ وہ اسوقت غضبناک اور پر جوش ہیں۔

گوداوری تو کنارے پر بیٹھی کیا سوچ رہی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کیا اب بھی اُسے یہ امید نہیں تھا کہ پنڈت دیودت آتے ہوں۔ پریم کی رسی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

اُسی تاریکی میں حسد، یاس اور بے مہری کے ہاتھوں ستائی ہوئی یہ دکھیا گنگا کی گود میں گر پڑی۔ لہریں چاروں طرف سے جھپٹیں اور اُسے نگل گئیں۔

سویرا ہوا۔ گوداوری گھر میں نہیں تھی۔ اسکی چارپائی پر یہ خط پڑا ہوا تھا:

"سوامی جی! دنیا میں آپکے سوا اور میرا کون تھا۔ مینے اپنا سب کچھ آپ کے سکھ کے نذر کر دیا۔ اب آپکا سکھ اسی میں ہے کہ میں اس دنیا میں نہ رہوں۔ اسی لئے یہ جان بھی آپکے نذر ہے۔ مجھ سے جو کچھ خطائیں ہوئی ہوں انہیں معاف کیجیگا۔ ایشور آپکو سدا سدا سکھی رکھے۔" پنڈت جی اس خط کو پڑھتے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ گومتی رونے لگی۔ مگر معلوم نہیں کیا سوچکر؟

پریم چند

توسیع اشاعت

ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنے ان عنایت فرماؤں کا شکریہ نہ ادا کریں جنہوں نے ذخیرہ کی توسیع اشاعت میں خاص طور سے مدد دیکر متعدد خریدار بہم پہنچائے ہیں اسلئے دلی شکر گزاری کیساتھ ان معاونین ذخیرہ کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔ مولوی سید محمد ادریس ۱۴ خریدار۔ مولوی سید علی اکبر بلگرامی ۶ خریدار۔ مولوی سید وارث حسین بلگرامی عدیل ۴ خریدار۔ مرزا برکت علی شوقی ۴ خریدار۔ مولوی سید فیض حسن ۵ خریدار۔ مولوی سید خورشید علی ۴ خریدار۔ مولوی نظیر حسین جنون صدیقی ۴ خریدار۔ مولوی سید فخر اللہ ۴ خریدار۔ نواب عنایت حسین خانصاحب بہادر ۳ خریدار۔ مولوی سید مسلم علی بلگرامی ۳ خریدار۔ مولوی سید علی اصغر بلگرامی ۲ خریدار۔ مولوی سید مصطفےٰ بلگرامی ۲ خریدار۔ قاضی محمد غوث قضا ۲ خریدار۔ ابوالیانع عمر بن صلاح صاحب ۲ خریدار۔ ماسٹر باسط سوانی ۱ خریدار۔ ابوالنثار رضا صدیقی ۱ خریدار۔ سید شاہ ولی الدین چشتی ۱ خریدار۔

خوشی

تختۂ گلہائے گلزار فنا کچھہ بہی نہیں
یہ چمن دہوکے کی ٹٹی کے سوا کچھہ بہی نہیں
اڑ گیا تخت سلیماں کٹ گئی پر یونکے پر
گر گئے چارونں بانہیں ہوا کچھہ بہی نہیں

اصلی خوشی جسکا روحانیت سے تعلق ہے وہ شاید ہی آجکل ہم لوگوں میں دکہائی دے۔ کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس دنیا کے دہندوں میں رہکر اُسکو حاصل کرسکے۔ بہت سے اکابرین نے اس کو بڑی بڑی مشقتوں سے حاصل کیا مگر انہیں بہی ایسے الجہاؤ حایل ہوئے کہ بہت کم اصحاب ایسے رہے جنہوں نے پایۂ ثبات کو قایم رکہا اور استقلال کو ہاتھ سے ندیا اور ہر مشکل کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا اور یہ ثابت کر دکہایا کہ ؎

ہم معتقد دعوئی باطل نہیں ہوتے
سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

سچی خوشی جسکو اکثر عیش پرست اور دین دنیا کے بے فکرے دہونڈہتے ہیں انکو وہ خواب میں بہی نصیب نہیں ہوتی۔ میرے ناقص خیال میں سچی خوشی اُنہیں لوگونکو حاصل ہوتی ہے۔ اور دراصل وہی ایک حد تک اسکے مستحق بہی ہوتے ہیں جو اپنا کام وقت پر کرلیتے ہیں۔ سچائی نیکی۔ ہمدردی اور قوم کی خدمت اُنکا شعار ہے قرض سے انکو ہمیشہ نفرت' اسراف پر انکی ہر وقت نظر حقارت جو کچھہ آمدنی ہے اسمیں سے کچھہ پس انداز کرنے کے خواہاں وعدہ خلافی انسے ہو نہیں سکتی' کسی کی آواز غیبت انکے کان میں آ نہیں سکتی اپنے اقرار کے پابند جو بات زبان سے نکالتے ہیں اسپر عمل کیئے بغیر نہیں رہتے' کاربند' مکان میں نفاق کا ہرگز گزر نہیں' دولت کی کمی کیوجہ سے کسی چور کا ڈر نہیں۔ آپ ایسے ہی لوگوں سے پوچہئے کہ سچی خوشی کہاں رہتی ہے؟ میں تو یہی کہونگا کہ

سچی خوشی دراصل لطف زندگی کی دیوی' انکے دل میں انکے جگر میں' انکے رگ و پے میں' انکے مکان میں' انکے ڈیننگ روم میں' اور انکے ڈرائینگ روم میں رہتی ہے ؎

جہاں دیکہا نئی انداز سے وہ شوخ لیٹا تہا
نگہ میں نور تہا پہلو میں دل تہا دل میں ارماں تہا

ایک غریب جو اپنی محنت سے روزانہ کچھہ روزی پیدا کرلیتا ہے اسکو اپنی جہونپڑی اور اپنے بال بچوں میں باہم اتفاق سے زندگی بسر کرنے میں جیسی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ایک بڑے سے بڑے دولتمند و تونگر کو بہی ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔ اسکو ہر وقت اپنے مال کی حفاظت کی فکر اور اسمیں کچھہ اور اضافہ کا خیال رات دن لگا رہتا ہے۔ ہمیشہ اسکی زندگی اپنی فکر کی زنجیر میں جکڑی رہتی ہے۔ اطمینان نام کو نہیں کسی فقیر کے ایک پیسے کا سوال اسکے لئے باعث ملال۔ ایسی صورت میں بہلا اس غریب کو سچی خوشی کہاں سے نصیب ہوسکتی ہے دولت جو وہ جمع کرتا ہے وہ یا تو غیروں کی نذر ہوجاتی ہے یا خود انکے صاحبزادے جو اس درد و مشقت سے ناآشنا ہیں دل کہولکر صرف کرنے لگتے ہیں۔ اور چند ہی روز میں برسوں کا جمع شدہ سرمایہ مثل پانی کے بہ جاتا ہے۔ اور وہ اسطرح سے مفلسی کے رفیق بنجاتے ہیں جنسے خوشی تو کوسوں دور بلکہ اطمینان قلب کی بہی قربت نہیں۔ ماں باپ کے دولت کی وجہ سے جو نہ تو خود اس سے خوشی حاصل کرسکا اور نہ اپنے سپوت کو سچی خوشی حاصل کرنیکا سبق سکہایا یا موقع دیا افسوس ایسے شخص کی زندگی پر جس سے دولت کے خوشی کی

کچھ امید بن سکتی ہو اور وہ یوں تلف ہو جائے ؎

یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک — عشرت بھی ہوئی تو پھر جوانی کب تک
ہو یہ بھی اگر قیام دولت ہے محال — دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک

مندرجہ بالا بیان سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صحیح خوشی نہ دولتمندوں کے دولت سراؤں میں ہے، نہ بادشاہوں کے محل سراؤں میں، نہ امیروں کے عالیشان بنگلوں میں، نہ عیش پرست نشہ بازوں کے، نہ مئے نوشوں کے میخانوں میں، بلکہ اگر ہے تو کم مایہ غریبوں کے جھونپڑیوں میں، ایک محنتی کسان کی گرسی میں، ایک مفلس و نادار کی چارپائی میں، اور ایک جنگل میں گھومنے والے بے لاگ انسان کے دلمیں ہے لہذا ہم جہانتک تلاش کریں۔ ایسی ہی جگہ صحیح خوشی یا صرف خوشی کا حاصل ہونا ممکن ہے، جہاں دولت کی کمی، اتفاق، وعدہ وفائی، قول کی سچائی، غیبت سے پرہیزگاری، مفسدوں کی صحبت سے آزادی، اور اقرار کی پابندی کا گذر ہے، اس خوشی کی تلاش میں سینکڑوں اپنی جان عزیز گنوا بیٹھے اور یہ کہتے کہتے سارا جہاں چھان مارا مگر آخر کار محروم چل بسے ؎

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ — خلقے بتو مشغول و تو غائب ز میانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد — یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ

دنیا میں بہت سے ذرائع خوشی حاصل کرنے کے ہیں جنمیں سے ایک ارفع و اعلیٰ، بہتر سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے اوقات کا ایک معتدبہ حصہ مطالعہ کتب میں وقف کر دے، جس سے ہر جگہ ہر طرح اور ہر حالت میں خوشی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اچھے ہیں وہی لوگ جنہوں نے اپنی زندگی اسکی نذر کی ہو اور ہر ترکیب سے اسی میں خوشی کے متلاشی ہوں، دوسرا طریقہ وقت کے اچھے استعمال پر منحصر ہے۔ یعنے ہر کام کو اُسکے وقت پر انجام دیا جائے۔ ہرگز آج کا کام کل پر اور اسوقت کی تکمیل ہم کو کسی اور وقت پر نہ اٹھا رکھیں جس سے ذلت و ملامت کے علاوہ ہمیشہ ایک طرح کا خار ملال دل پر کھٹکتا رہتا ہے۔ بہر حال حصول خوشی کے لئے وقت کے استعمال کا بھی لحاظ ہے۔ تیسرا اور آخری طریقہ یہ ہے کہ وعدہ و اقرار کا از حد لحاظ ہمیشہ پیش نظر رہے۔ کبھی اسکے خلاف نہونے دیں اور جسقدر اپنے ملاقاتی ہوں اُنسے بمروت و اخلاق پیش آتے رہیں۔ ان صورتوں میں شاید خوشی ایک حدتک انسان کا ساتھ دے ؎

دیکھیے کھلتا کیا گل آخرش اے رشک گل
سینے دلمیں تخم الفت کا تری بویا تو ہے

آہ خوشی! پیاری خوشی!! آرزو کی دیوی!!! محبوب لوگی پری!!!! آ! آ!! آ!!! میں تیری تلاش میں مدت سے سرگرداں ہوں، تیری تلاش نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ آ اور جلد آ! اور مجھ سے لپٹ جا!! جو کچھ اب میں تیرے جوش مسرت میں کر گزروں وہ بجا اور اولیٰ ہے۔

قاضی محمد غوث فضا

طوطا

ہز اکسلنسی راجا یا مہاراجا سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ شاد بالقابہم

دیکھا پسِ آئینہ ترا روپ ۔۔۔ سب روپ جدا ہیں یہ جدا روپ
اُستادِ ازل نے دی ہے تعلیم ۔۔۔ کہتا ہے وہی ہوئی جو تفہیم
صانع کی ہے تو بھی ایک صنعت ۔۔۔ ہے نقشِ ازل کی ایک صورت
تصویر ترا ہے یہ سراپا ۔۔۔ بے مثل بنا ہے نقشا تیرا
تجھ میں ہے شان دلبری کی ۔۔۔ صورت تیری ہے پیاری پیاری
گویا نہیں پھر بھی بولتا ہے ۔۔۔ کیا نطق کلیم نے دیا ہے
سبزی جو پروں میں ہے نمودار ۔۔۔ ہے شوخ جو سرخ رنگِ گلنار
پہلا ہے سبزہ زارِ امید ۔۔۔ ثانی ہے شفق بہارِ امید
دونوں میں اُسی کی اک جھلک ہے ۔۔۔ جن ہے نہ بشر نہ کچھ ملک ہے
نغموں میں ترے ہے ایسی تاثیر ۔۔۔ باتوں میں تری بھری ہے تسخیر
دلگیر ہیں یا دلپذیر ادائیں ۔۔۔ لیتا ہے ہر اک تری بلائیں
بچے ہوں جواں ہوں یا ہوں بوڑھے ۔۔۔ سب ہیں تجھ پر نثار دل سے
معشوقوں کا ہے تو ہی محبوب ۔۔۔ ہر طالب کا ہے تو ہی مطلوب
ہیں دل سے فدا حسین سارے ۔۔۔ عاشق ہیں مہ جبیں سارے
قصوں میں ترا ہے ذکر مذکور ۔۔۔ افسانے سارے تجھ سے بھرپور
شاہوں کے ہاتھوں پہ ہے مسکن ۔۔۔ گلشن میں اگرچہ ہے نشیمن
سب کچھ ہے مگر کہو یہ مجھ سے ۔۔۔ طوطے مرے میرے دل کے پیارے
آنکھوں میں تری نہیں وفا کیوں ۔۔۔ مشہور تو بے وفا ہوا کیوں
ہے تجھ پہ بہت برا یہ الزام ۔۔۔ ساری دنیا میں تو ہے بدنام

لیکن اُستاد کیا شکایت
یہ بھی ہے خدا کی ایک قدرت

نہیں

اے "نہیں" تجھ کو عجب فتنۂ دوراں دیکھا ۔۔۔ کیا ستم ہے تجھے زیبِ لبِ جاناں دیکھا
خرمنِ حسرت و ارماں کی جلانے والی ۔۔۔ بجلیاں ہر دلِ سوزاں پہ گرانے والی
سننے والے کو سدا سر بہ گریباں پایا ۔۔۔ تجھ کو پیغامِ اجل موت کا ساماں پایا
کبھی ظاہر ہوئی تو تیر و سناں کی صورت ۔۔۔ کبھی در پردہ نمایاں ہوئی "ہاں" کی صورت
جنبشِ ابرو سے وہ ظاہر ہوئی شمشیر بنی ۔۔۔ غمزۂ چشم کی صورت میں کبھی تیر بنی
ہاتھ اٹھایا جو حسینوں کا تجھے جان گئے ۔۔۔ جنبشِ سر سے مقرر تجھے پہچان گئے
کون کہتا ہے سدا نوکِ زباں ہوتی ہے ۔۔۔ لبِ لعلیں کے تبسم میں نہاں ہوتی ہے
جان لی قیس کی قاتل بنی سفاک بنی ۔۔۔ ماہِ کنعاں کے تو دامن میں کبھی چاک بنی
کبھی پنہاں ہوئی تو جانِ حزیں کی صورت ۔۔۔ کبھی ظاہر ہوئی تو چینِ جبیں کی صورت
خونِ دل کرتی ہے جس طرح سے تقریر میں تو ۔۔۔ جان لیوا ہے "نہیں" پردۂ تحریر میں تو

آج ہاں آخرِ فکرِ حسن رقم سے نکلی
گل کھلاتی ہوئی باسط کے قلم سے نکلی

باسط بسوانی

شکوۂ روزگار

میں کون ہوں اک دل ہوں جسے ضبط نے مارا ۔۔۔ کر دیگی فنا مجھ کو مری کوششِ خاموش
یوں ہے مرے دل کی فضا میں اشراقِ محبت ۔۔۔ جس طرح کہ لو صبح کو دے دُرِّ بنا گوش
وہ دل ہوں عبارت ہے جو نظمِ ابدی سے ۔۔۔ اک خون کا نقطہ ہوں پئے معنیٔ پر جوش
جبریل مرے ساتھ رہے روزِ ازل سے ۔۔۔ میخانۂ عرفاں میں شب و روز قدح نوش
دل کیا مری آنکھوں کا ہے ٹوٹا ہوا سوتا ۔۔۔ طوفان اٹھا دیں گے یہی چشمۂ خس پوش
وہ نغز بیاں جس کی فصاحت نے شب و روز ۔۔۔ سرچشمۂ اُردو میں ترقی کا بھرا جوش
خود مجھ کو خداداد طبیعت نے سنوارا ۔۔۔ خود میرا معلم ہے مرا نفسِ صفا کوش

ہم سنگ جواہر کبھی پتھر نہیں ہوتا — گو لاکھ تراشے کوئی صناع سخن گوش
ترکش میں ہیں ہر تیر بہت کم ہیں مگر ایسے — ایسے کہ اڑا دیں قدر انداز کے جو ہوش
کچھ منہ سے نکلتی ہیں نہ سمجھی ہوئی باتیں — رہنے دو مجھے مجلس مے میں مجھے نہیں ہوش
خود وصل میں سمجھا کوئی مجھ کو تو سمجھو — میں بھول گیا ہوتے ہیں کس طرح ہم آغوش
سر سبز ہوں ظاہر ہیں مگر اے دل خوں گرم — کس طرح حنا میں ہو نہاں آتش خاموش
دلبر پہ ستم کیوں نہ ہو ہم جنس پہ تاثیر — کعبہ اسی غم میں نظر آتا ہے سیہ پوش
ایوب نہیں ہوں کوئی معصوم نہیں ہوں — تا چند مظالم پہ رہوں ساکت و خاموش
ہیں جتنے اقارب وہ عقارب ہیں بتر — احباب ہیں خود غرض و زود فراموش
کہتے ہیں جسے دوست وہ دشمن ہیں عنقا — سمجھے ہیں جسے مہر وہ دشمن ہے عہد فروش
کس دور میں آئے ہیں ہم اے مجلس ساقی — جب رند خرابات نشیں ہو گئے مدہوش
پندار خدائی ہے کسی کو تو ہمیں کیا — ہم عشق کے بندے ہیں وفا کیش و وفا کوش

عزیز لکھنوی

جمال یار

مجھ سے اچھا چاہنے والا ترا ممکن نہیں — قدر داں تیرا کوئی میرے سوا ممکن نہیں
نقش اول سے ہوں میں والہ تیرے انداز حسن — دے کوئی اس طرح سے تیرا پتا ممکن نہیں
کئے جو انداز عالم سوز ہیں تجھ میں بھرے — اور میں یہ غمزہ و ناز و ادا ممکن نہیں
چاہنا تیرا اگر آساں ہے تو مشکل بھی ہے — ابتدا ممکن ہے لیکن انتہا ممکن نہیں

دل کے بہلانے کو مشق پائمالی چاہئے
باعث تسکین تصویر خیالی چاہئے

حسن لیلیٰ بنکے تو نے قیس کو مجنوں کیا — اور شیریں کی جھلک میں کوہکن کا خوں کیا
واہ کس انداز سے ظاہر ہوئی دریا دلی — قطرۂ اشک دہن ۔ دل کیلئے جیحوں کیا
پردہ داری میں دکھائی خوب ہی پردہ دری — شکل یوسف میں زلیخا کے لئے افسوں کیا
نکہت گل بن گئی ۔ صیاد کی باسودم شبیہ — باغ میں بلبل نے جبدم نالۂ موزوں کیا

وحشت دلمیں خیال عقل بھی بیہودہ ہے
وسعت داماں محشر عرصۂ محدود ہے

طور کو سرمہ ۔ کلیم اللہ کو حیراں کیا — ہستی پروانہ پھونکی شمع کو گریاں کیا
پردہ پوشی بھی تری رسوائی سے کچھ کم نہیں — جامۂ ہستی شمس الدین کو عریاں کیا
لگگئی منصور کو لفظ انا الحق کی سزا — دار کے پردے میں کیا اظہار کو پنہاں کیا
رونق حسن بتاں ہے دوسرا تیرا ہی نام — تو نے ہی عشاق کو وقف شب ہجراں کیا

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ
پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ
(جامیؒ)

عشق کہتے ہیں جسے کیا جانے وہ ہے بھید کیا — ہم تو یہ سمجھے ہوئے ہیں اسمیں ہے تو ہی چھپا
تو ظہور سنت کنز اً مخفیاً کی اصل ہے — لفظ کن کہتے ہی سب کچھ آشکارا ہو گیا
ابتدائے خلقت آدم کی تو تحریک ہے — عرصۂ محشر میں ہر اک بات کی تو انتہا
تیری ہی تعلیم پر عشاق ہیں سب کاربند — انکو کیا معلوم محشر نام ہے کس چیز کا

روز محشر عاشقاں را با قیامت کار نیست
کار عاشق جز تماشائے جمال یار نیست

صبر دہلوی

عندلیب

حسرت افزا ہے ستم کی داستان عندلیب — رنگ روئے گل نیاز رنگ فغان عندلیب
لب کھلیں کیا خاک عرض مدعا وصل پر — خامشی غنچوں کی ہے قفل دہان عندلیب
چاک ہے گل کی قبا آوارہ ہے باد صبا — دیکھئے کیا کیا ستم ڈھائے فغان عندلیب
عاشقوں کے واسطے سیر گلستاں ہے یہی — حسن گل کی بے نیازی اور فغان عندلیب
نکہت گل ہو گئی اگر شریک بیکسی — کر گیا کچھ کام تو درد نہان عندلیب
وصل گل ہو یا نہ ہو گلزار تو چھٹتا نہیں — واہ شان عاشقی اللہ رے آن عندلیب
روئیے اس بیکسی بے بال و پر کے حال پر — پوچھئے خالی قفس سے بھی نشان عندلیب

نالہ کش ہوں ہر گھڑی یادِ گل رخسار میں مجھسے لیتی ہے سبق آکر فغانِ عندلیب

اے رضا جب تک ہے حسنِ گل میں شانِ دلبری

مٹ نہیں سکتا کبھی نام و نشانِ عندلیب

رضا صدیقی

خزاں

تونے کیا فصلِ خزاں رنگ جما رکھا ہے ڈھانچ کیطرح درختوں کو بنا رکھا ہے

ہر طرف پتوں کا قالین بچھا رکھا ہے مخملی فرش کو سبزے کے چھپا رکھا ہے

کسقدر زور کی چلتی ہے ہوا طوفانی

اور برستا ہی چلا جاتا ہے پیہم پانی

رہ گئے ٹھنڈ شجر برگ نہیں بار نہیں کچھ بھی اب انمیں کہیں شادابی کے آثار نہیں

غنچہ و گل ہے وہ اب رونقِ گلزار نہیں تازگی بخش نظر منظرِ کہسار نہیں

باغِ عالم ہے کہ پژمردہ نظر آتا ہے

دیکھئے جسکو وہ افسردہ نظر آتا ہے

غم کو ہمراہ لئے دورِ خزاں آیا ہے ہر طرف جس سے اداسی کا سماں چھایا ہے

فرطِ اندوہ نے ہر شخص کو گھبرایا ہے رنگ موسم نے عجب طرح کا دکھلایا ہے

ایک حسرت سی برستی ہے زمانہ بھر پہ

کثرتِ حزن مسلط ہے دلِ مضطر پہ

شادمانی کے جو اسباب ہوئے ہیں معدوم کر دیا لطفِ مسرت سے ہی بالکل محروم

آرزوؤں کی ہے کثرت نہ امیدوں کا ہجوم ہو گئے آہ یہ جذبات سراسر مسموم

دل ہے ٹھٹھرا ہوا اس بارشِ سرمائی سے

گویا آنسو ہیں رواں چشمِ تمنائی سے

زندگانی کو ہے احساسِ الم نے گھیرا روح کرتی ہے مری عالمِ غم میں پھیرا

منظرِ عام ہے اوسکے لئے ماضی میرا پر میں ممنوں نہیں دورِ گذشتہ تیرا

چند روزہ کبھی حاصل ہو فراغت ہوتی

رنج میں بھی مجھے امید مسرت ہوتی

ارشد تھانوی

غنچۂ خیال

چند روزہ زندگی کا ہے ملاپ عارضی رشتہ ہے بھائی ہو کہ باپ

نیکی کرنا ہے شریفوں کو روا کیونکہ نیکی ہے خدا کی اک ادا

نیکی میں جسنے گزاری عمر ہے حقتعالیٰ کو وہ پیاری عمر ہے

ملتے ہیں اکثر ستارے تاروں سے جس طرح ملتے ہیں پیارے پیاروں سے

بعد مردن ہوں گے ہم تنہا سبھی رنگ دنیا پھر نہ دیکھیں گے کبھی

چند روزہ ہے یہ عالم کی بہار زندگی کا کچھ نہیں ہے اعتبار

کام سب کے کر رہا ہے خود خدا چاہیئے ہمت کا لیکن آسرا

کٹ ہی جاتی ہے غرض یہ زندگی مالدار امیر ہو غریب انسان کی

جز بھلائی اور نیکی ساتھ کچھ جاتا نہیں

جو گزرتا وقت ہے لاغر وہ پھر آتا نہیں

لاغر شروانی

غزلیات

جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل

ساقیا صحبت دیرینہ جو یاد آتی ہے چشمِ تر صورتِ پیمانہ چھلک جاتی ہے

تیغِ قاتل نے شگوفہ یہ نیا چھوڑا ہے دل جو روتا ہے تو زخموں کو ہنسی آتی ہے

پوچھتا ہے جو کوئی حال دلِ بسمل کا آنکھ سے خون کی اک بوند ٹپک جاتی ہے

تیرے بسمل کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا اب تو تلوار بھی منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے

قتل عشاق کو ہر چند زمانہ گزرا — دست قاتل سے ابھی خون کی بو آتی ہے

محفل عیش دم صبح جو برہم ہوگی — شمع کو فکر ہے ایسی کہ گھلی جاتی ہے

کیا مصیبت ہے کہ جبدن سے چھٹی ہے نوشی — دل جلانے کے لئے روز گھٹا آتی ہے

اور نشتر تو فقط ہیں رگِ سودا کے لئے — نگہ یار رگِ جاں میں اتر جاتی ہے

کس کا سر سامنے قاتل کے نہیں خم ہوتا — جھک کے تلوار بھی آداب بجا لاتی ہے

یہ نہ سمجھو خلشِ دل سے تڑپتا ہے جلیل

ناوکِ ناز کی لذت اُسے تڑپاتی ہے

(منشی لطیف احمد صاحب اختر مینائی)

کیا تیغ میں رکھا ہے جو باندھیں وہ کمر میں — سو سو کو لٹا دیتے ہیں ایک ایک نظر میں

اب دل کی تڑپ مجھکو مزا دینے لگی ہے — ڈرتا ہوں کمی ہو نہ کہیں دردِ جگر میں

دیدار سے کچھ تہو مقصود ہے آنا — تو میری نظر میں ہے میں تیری نظر میں

گیسو جو بڑھے جاتے ہیں دیوانے ہوئے ہیں — پائینگے یہ کیا ہاتھ جو ڈالینگے کمر میں

کچھ اور ہے لطف جوانی نہیں در کار — اک داغ مرے دلمیں ہو اک زخم جگر میں

مستانہ ادائیں تو سبھی ہوش ربا ہیں — پر ہائے وہ مستی جو ہو انداز نظر میں

قاتل تری اس شوخیِ رفتار کے صدقے — بجلی سی تڑپ جاتی ہے تلوار کمر میں

تسکین ہو کیا خاک جہاں رشک ہو ایسا — وہ ہاتھ دہریں دلپہ لگے آگ جگر میں

مایوس کریگی مجھے کیا طرز تغافل — آنکھیں تری کہتی ہیں کہ سب کچھ ہے نظر میں

آنکھوں سے لگی دل کی بجھائی نہیں جاتی — اے خون جگر آگ لگا دیدہ تر میں

صدقہ دل پر خوں کا یہ ہے ورنہ تمگر — کیا ایسے ہیں سرخاب کے پر تیر نظر میں

کوتاہیِ شب وصل حقیقت تھی جدا کی — دیکھا تو کوئی فرق نہ تھا شام و سحر میں

یاں شعر میں مضمون کمر بندھ نہیں سکتا — وہ باندھ لیا کرتے ہیں تلوار کمر میں

مشتاق ترا ہوں کہ قیامت کا ہے عالم — کچھ سوچکے بیٹھا ہوں تری راہگذر میں

عشوہ تھا نہ غمزہ نہ یہ باتیں نہ یہ گھاتیں — ابتک وہ زمانہ تھا پھرتا ہے نظر میں

قایل ہوں میں اس حسن خدا داد کا اختر

جو دلمیں سما جائے جو کھپ جائے نظر میں

(منشی محمد صدیق خاں صاحب رعد جونپوری)

کیوں جاں دوں نہ زندگی مستعار پر — جینا ہے تیرے وعدۂ بے اعتبار پر

عالم شباب میں ہے وہ رخسار یار پر — جسطرح فصل گل میں چمن ہو بہار پر

زلفیں بکھر کے کہتی ہیں رخسار یار پر — سمجھو ہمیں گھٹا چمن پُر بہار پر

کیا پوچھتے ہو کیسی کٹی رات شمع کی — روتی رہی غریب ہماری مزار پر

ششدر ہیں دیکھکر گل رخسار یار کو — سمجھے ہوئے تھے پھول ہمیں ہیں بہار پر

زلفو نکے بال کرتے ہیں کس لطف سے بسر — بادل کی طرح چھائے ہوئے دوش یار پر

نزدیک آگیا ہے جو موسم بہار کا — بلبل قفس میں تولتی ہے بار بار پر

اچھا کیا کہ بادِ صبا نے بجھا دیا — بھاری تھی رات میرے چراغ مزار پر

ایسا ہے کون اب کہ جسے وہ گلے لگائیں — یہ بات ختم ہوگئی پھولوں کے ہار پر

واعظ کو احتراز اگر ہے ہوا کرے — اپنی تو زندگی ہے مئے خوشگوار پر

ملتا نہیں ہے دشت نوردی میں کچھ مزہ — جبتک پڑے نہ پاؤں کبھی نوک خار پر

صرف ایک پھول اسنے چڑھایا تھا پیار سے — گویا چمن کھلا ہے ہمارے مزار پر

روندی ہوئی زمیں میں کیا کیا کھلائے گل — اے رعد شاعری ہے ہماری بہار پر

(سید محمد کاظم حسین صاحب شیفتہ کنتوری)

ہونٹوں پہ ہے دم سسک رہے ہیں — مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں

ملتی نہیں راہ کوچۂ یار — الیاس و خضر بھٹک رہے ہیں

اللہ رے سوزش تپ ہجر — سب آبلہ دل کے پک رہے ہیں

دیکھیں گیسو بڑھیں کہانتک — ایڑی پہ ابھی لٹک رہے ہیں

پانی برسا بہار آئی — گلزار میں گل مہک رہے ہیں

دیکھی ہے پری جبیں کی افشاں — تارے آنکھیں جھپک رہے ہیں

ہر بار صبا جو چھیڑتی ہے — سبزان چمن لچک رہے ہیں

اے بت صدہا خدا کے بندے — دہلیز پہ سر ٹپک رہے ہیں

دیوانے ہیں شیفتہ کسی کے

مجذوب کی طرح بک رہے ہیں

سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی

یہ نیا خبط ہوا ہے ہمیں سودا ہو کر — ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر بادیہ پیما ہو کر

کیا مزہ کوئی کہ جینے کی حلاوت نہ رہی — زندگی تلخ ہے مایوس تمنا ہو کر

منع ہم کرتے ہیں کیوں غیر سے ملنے کیلئے — سوچنا تم کبھی اس بات کو تنہا ہو کر

کس کی تقدیر کبھی کس کا مقدر چمکا — وا ۔ دیدۂ یار ہے آغوش تمنا ہو کر

مر مٹے ہم اسی ارمان میں لیکن تم نے — کوئی اعجاز دکھایا نہ مسیحا ہو کر

کم نصیبی ہے مری بات بھی پوری نہ ہوئی — رہ گیا بزم میں انکی ہوا چرچا ہو کر

کھلکے غیروں سے عجب تم ہمیں ملتے ہو — آپ اٹھ جائیے ناکام تمنا ہو کر

تجھ سے ملنے کی دعا کی ! نہیں امید تو پھر — کیا کریگا ترا بیمار غم اچھا ہو کر

شیوۂ ضبط نے آہ رسا کی اجازت بھی نہ دی — دل کا دل ہی میں رہا درد بھی پیدا ہو کر

مرچکا تھا غم فرقت سے یہ مایوس وصال — تیرے وعدے نے جلایا مگر ایفا ہو کر

پاس ناموس نہیں کچھ بھی انہیں احسن کی طرح — ہو چکے عشق میں بدنام جو رسوا ہو کر

سید فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی

قرب میں ہے نہ بعدِ یار میں تھا — جو مزا اسکے انتظار میں تھا

ناوک نازِ چشم یار میں تھا — تیر جسکا دلِ فگار میں تھا

فردِ اعمال سے روزگار میں تھا — دخل جسکو مزاجِ یار میں تھا

مجھ پر اب طعنِ اضطراب ہے کیوں — دل انہیں کے تو اختیار میں تھا

دلربائی کا اک نیا عالم — اس نگاہ کرشمہ بار میں تھا

تھی اسی کی تو جانِ شوق اسیر — خم جو اس زلف تابدار میں تھا

نذر جاں بھی نہ تھی قبول وہاں — دلِ بیچارہ کس شمار میں تھا

آج آئی ہے مرحبا اے مرگ — کب سے میں تیرے انتظار میں تھا

ہاں اسی کا تو سحرِ حسن ہے نام — وہ جو چشم سیاہ یار میں تھا

درمیانِ ہجوم حسرت و یاس — میں بھی اک گوشۂ مزار میں تھا

ہم بھی آخر ہلاک شوق ہوئے — یہی دستور اس دیار میں تھا

تھا وہی حسن میں بہ شکل نیاز — ناز جو حسن فتنہ کار میں تھا

اب نہ گل ہیں نہ عندلیب نہ شور — وہ جو ہنگامہ بہار میں تھا

ملگیا عاشقی کا وہ حصہ — جو مرے بخت کی منگار میں تھا

اب وہی میرے عشق میں ہے کمال — جو ترے حسن بیقرار میں تھا

لوث عصیاں سے پاک تھا وہ خیال — گرچہ قلب گناہگار میں تھا

سرمۂ طور میں کہاں وہ اثر — دشت یثرب کے جو غبار میں تھا

نشۂ عشق جسپہ ملک کو ہے ناز — وہ بھی اُس چشم پُرخمار میں تھا

آجتک بیقرار ہے حسرت — کیا وہ افسوں نگاہِ یار میں تھا

نعتی سید معراج رسول صاحب معراجؔ تعلقدار سندیلہ

گو جلوہ گر وہ صورت زیبا کدھر نہیں — دل کا تقاضا ہے کہ تاب نظر نہیں

مانا کہ داغ دامن شمشیر پر نہیں — کیا تیری آستیں بھی بخوں سے تر نہیں

پھیلائے اور شوق شہادت نے لب ہائے — حسرت یہ ہے کہ اب تن بسمل پہ سر نہیں

دیدار حسن ہوشربا نے ستم کیا — اب اپنے اختیار میں اپنی نظر نہیں

کچھ اپنی اپنی جا ہیں یہ محو تلاش دوست — دل کو مری خبر مجھے دل کی خبر نہیں

اک خستہ دل غریب کی سنتا ہی کون ہے — نالے کئی ہزار وہاں کچھ اثر نہیں

اس انتہا پہ جوش جنوں کا بھی ہو برا — کسکے لیئے مٹے اب اسکی خبر نہیں

صیاد کی نظر میں کھٹکتے ہیں بارہا — بازوئے ناتواں میں یہ کاوش پیدا نہیں

گو صرصر فنا سے بجھی شمع زندگی — گل ہونیوالی مشعل سوز جگر نہیں

اک جان مضطرب سے تا لب ہے آگئی — دل بھی نہیں ہے پھر غم الفت اگر نہیں

مستی میں مدعا ہے مری چشم شوق کا — جلوہ نظر بھی آئے تو تاب نظر نہیں

کیا دیتا ساتھ تیز آہنگی خیال — میں اس جگہ ہوں وہم کا جس جا گذر نہیں

ہیں ہونٹ خشک بال پریشان منہ اداس — کیا پھر کھوگئے نالہ دل میں اثر نہیں

جانے سے انکے آنکھ میں دنیا سیاہ ہے — یہ بھی ہے ایک شام جدائی سحر نہیں

معراج میکدہ میں فلک کشتہ شبانہ روز — دور قدح ہے گردش شمس و قمر نہیں

مولانا سید محمد صاحب صدر دہلوی ایڈیٹر رسالہ شعلہ

کس کا ہو کر وہ رہے تابِ شکیبا نہ رہا — ہے دنیا میں کوئی دوست بھی اپنا نہ رہا

وصل میں بھی ہے وہی شورش ہنوز دل کو | کیا مرے درد کا دنیا میں مداوا نہ رہا
آپ ہی آئینہ سے پریشاں ہو گئے | لطف ہوگا جو مجھے زلف کا سودا نہ رہا
آپکے حسن کی رونق ہے کہ دم تک گیا | آپکے کلام کے جب بیچنے والا نہ رہا
غمزدہ آج وہ بیٹھے ہیں عدو کے گھر میں | کیا خبر کس نے کہا آپ کا شیدا نہ رہا
آپکے آنے سے بڑہ جاتی ہے دلکی دہڑکن | اب کوئی وقت مقرر ہے غم کا نہ رہا
مجھکو یہ لطف کہ میرا ایک بلا سے چھوٹا | اُن کو یہ عیش کہ اب غیر کا کھٹکا نہ رہا
کہتا ہے لاش کو ٹھکرا کے ادا سے وہ شوخ | میں عیادت کو جو آیا تو یہ زندہ نہ رہا
نقش دلبر ہیں جفا کار یا تیرے ظالم | مجھکو اب حوصلہ عرض تمنا نہ رہا
چھٹ گیا مخمصۂ عشق سے میں جان دیکر | اُن کو جس بات کا کھٹکا تہا وہ کھٹکا نہ رہا

سخت بیدرد تہا ناصر کہ جہاں سے گذرا
ناز اٹھانے کے لئے آپکے جیتا نہ رہا

(سید محمد جعفر صاحب قدسی جائسی)

چھیڑتا ہے سرِ نشتر سرِ مژگاں ہو کر | رگِ سودا تڑپ اُٹھتی ہے رگِ جاں ہو کر
آئینہ خانہ میں چہرے سے ہٹاؤ نہ نقاب | دیکھتا ہے یہ ادائیں کوئی حیراں ہو کر
اے بتو ہم کو تمہیں پوچھ کے کچھ بھی نہ ملا | دیر سے جاتے ہیں کعبہ کو مسلماں ہو کر
قتل میں تم نہ کرو میرے تڑپنے کا خیال | سر اٹھاؤنگا نہ شرمندہ احساں ہو کر
حیرت انگیز یہ ہے جلوہ آرائش حسن | دیکھتا ہے تمہیں آئینہ بھی حیراں ہو کر
بجلیاں مجھپہ گرائیگی یہ گھنگھور گھٹا | زلف چہرہ پہ نہ بکھراؤ پریشاں ہو کر
تازہ پھر نوح کے طوفان کا فسانہ ہو جائے | دیدۂ تر مرے کہتے ہیں کہ گریاں ہو کر
تمکو میری شب فرقت کی قسم کچھ بولو | بال بکھرائے ہیں کیں غم میں پریشاں ہو کر

ملگیا خاک میں قدسی نہ خبر لی تمنے
آہ یہ بے خبری عیسیٰ دوراں ہو کر

ایڈیٹوریل

علامہ جرجی زیدان

گذشتہ اشاعت میں علامہ جرجی زیدان مرحوم کی تصویر دیکر ہمنے وعدہ کیا تہا کہ اس پرچہ میں انکے سوانح زندگی پر روشنی ڈالی جائیگی۔ علامہ موصوف کا آفتاب زندگی ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء کو ایک غریب گھرانے میں طلوع ہوا سن شعور کو پہنچنے کے بعد جرجی زیدان دن بہر اپنے باپ کے ہمراہ فکر معاش میں مشغول رہتا اور راتوں کو مدرسہ میں تحصیل علم کیا کرتا انگریزی زبان اسنے اسیطرح حاصل کی۔ ۱۸۸۱ء میں لاطینی زبان کیمیا طبعیات اور فلسفہ سیکھہ کر کچھہ ڈاکٹری کو تحصیل کیا من بعد مصر میں آکر اخبار "الزمان" کی ایڈیٹری شروع کی۔ ۱۸۸۴ء میں جبکہ جنرل گارڈن کی خلاصی کے لئے انگریزوں کیطرف سے سوڈان میں مہم روانہ کیگئی تہی تو ۱۰ ماہ تک مترجم کی حیثیت سے یہ وہاں کے معرکوں میں شریک رہا۔ ۱۸۸۵ء میں بیروت آکر ایشیاٹک ایسوسی ایشن میں عبرانی اور سریانی زبانوں کو تحصیل کرکے ایک سال بعد لندن چلا گیا وہانسے ۱۸۸۶ء میں مصر واپس آکر المقتطف کا ایڈیٹر رہا۔ اسکے بعد مدرسۃ العبیدۃ الکبریٰ میں پروفیسر رہا۔ ۱۸۹۲ء میں اپنا مشہور رسالہ الہلال نکالنا شروع کیا اور علمی تصانیف کی جانب متوجہ ہوا اور اس کام کی انجام وہی میں نہایت محنت وجانکاہی کے ساتھ مرتے دم تک مصروف رہا۔ تقریباً تین درجن کتابیں اسنے تصنیف کیں۔ ازانجملہ چند مشہور کتب کے نام یہ ہیں

(۱) تاریخ مصر دو جلد (۲) تاریخ العام (۳) تاریخ یونان و روم (۴) تاریخ تمدن الاسلامی ۵ جلد (۵) مشاہیر الشرق (۶) العرب قبل الاسلام (۷) الفلسفۃ اللغویہ (۸) تاریخ آداب اللغۃ ال

(۹) علم الفراسة العرب (۱۰) فتاة غسان (۱۱) الحجاج ابن یوسف (۱۲) فتح الاندلس (۱۳) ابو مسلم الخراسانی (۱۴) الامین والمامون (۱۵) الانقلاب العثمانی (۱۶) عروس فرغانہ (۱۷) استبداد المملیک

تمدن الاسلامی اور تاریخ آداب اللغة العربیہ۔ جرجی زیدان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مہتم بالشان ہیں۔ پہلی کتاب میں مسلمانوں کے عروج اور فتوحات کے اسباب اور انکی فوجی طاقت اور مالی ثروت کا حال بیان کیا ہے۔ پھر انکے علوم و فنون، ایجادات و مخترعات کا تذکرہ کرکے انکے تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں۔ دوسری کتاب میں عربی علوم و فنون کی تاریخ اور مصنفان اسلام کا تذکرہ ہے۔ ان تصانیف کو شرق و مغرب میں اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ انگریزی، فرانسیسی، المانین، ترکی، اور اردو زبانوں میں انکے ترجمے ہوگئے ہیں۔

سر فیروز شاہ مہتہ

گذشتہ مہینے میں مشہور محب وطن سر فیروز شاہ مہتہ کی وفات حسرت آیات سے ملک کو ایک ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ یہ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ پبلک کے ہر کام میں شریک غالب تھے۔ اہل ہند کی فائدہ رسانی میں عموماً اور صوبہ بمبئی کی ترقی میں خصوصاً انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا۔ اس سال مسٹر گوکھلے اور سر ہنری کاٹن کے بعد یہ تیسرا موقع ہے کہ مادر ہند کو اپنے ایک نہایت سپوت فرزند کے لئے صف ماتم بچھانی پڑی۔ ہمارے لئے بزرگان رفتہ کا ماتم کرنے سے یہ بہتر ہے کہ انکے نمونے پر چلیں اور ملک کی سچی اور بے لوث خدمت کرنیکی کوشش کریں۔ سر فیروز شاہ سچے محب وطن اور صاف گو مقرر تھے اور بمبئی کے پولیٹیکل قلمرو میں وہ بے تاج کے بادشاہ کہے جاتے تھے۔ اس گرانمایہ شخص نے ۷۰ برس کی عمر میں ملک کو داغ جدائی دیا۔

اس نمبر کیساتھ ذخیرہ کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے۔ ماہ آئندہ سے دوسری جلد کا آغاز ہوگا۔ آئندہ ہر جلد ۶ نمبروں پر ختم ہوا کریگی۔ ہم ان تمام معاونین کے بیحد شکر گزار ہیں جنہوں نے اس علمی کام میں ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہمنے سال آئندہ کیلئے جو ضابطۂ عمل مرتب کیا ہے۔ اسکا عملی نتیجہ ناظرین باوقار کے ملاحظہ میں آتا رہیگا۔ خداوند عالم سے امید ہے کہ وہ ہمارے ارادوں میں برکت دیگا۔

جے ٹیبلٹس طاقت کی دوا

قیمت فی شیشی کلاں للعہ — قیمت فی شیشی خورد عہ

ہمیشہ ہا شیخ فانی کی صورت وہی قد کہ سید ہا تہا ہو شکل ناوک چھپاتا ہے کیوں شوق درد نہاں کو
نہ دیکھی کبھی نوجوانی کی صورت ہوا خم کمانی کمانی کی صورت کہیں چھپتی ہے ناتوانی کی صورت

مریضان بیاحتیاج مایوس العلاج لوگ جو بچپن کی خرابیاں یا ایام جوانی کی غلط کاریوں اور بے اعتدالیوں کی وجہ سے یا کثرت شراب چانڈو اور افیون کی مضرتوں کے سبب اپنی قوت کاملہ سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہوں اور مایوسی کے باعث زندہ درگور ہونے کو غنیمت شمار کرتے ہوں انکو بصدائے کوس جتلایا جاتا ہے کہ وہ اگر دائمی اور اصلی قوت کو حاصل کرنا چاہتے ہوں تو بہت جلد ہماری ایجادہ (**جے ٹیبلٹس**) جو بڑی کوشش و محنت اور برسوں کی جانفشانی سے تیار ہوئی ہے جو آب حیات کا اثر رکھتی ہے منگواکر استعمال کریں یہ ایک دوائی اور سیکڑوں بیماری کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اندرونی اور بیرونی غلاظتوں سے پاک و صاف بناتی ہے۔ اعضائے رئیسہ اور شریفہ کو راحت بخشتی ہے۔ بوڑھے کو جوان اور جوان کو جوانمرد بناتی ہے۔ اطبائے قدیم اسکی تعریف میں متفق اللسان ہیں ڈاکٹران یورپ و امریکہ اسکی تعریف و توصیف میں ہمزبان ہیں۔

۱	جے ٹیبلٹس۔ دماغ اور دیگر اجزا کو نزول سے بچاتی ہے اور مقوی ہے	۱۰	جے ٹیبلٹس۔ مقوی باہ و ممسک ہے
۲	جے ٹیبلٹس۔ مقوی و محافظ بصارت ہے۔	۱۱	جے ٹیبلٹس دافع گٹھیا و عرق النسا و نقرس ہے۔
۳	جے ٹیبلٹس۔ خالص خون بڑھا کر چہرہ رخسار کو سرخ کرتی ہے	۱۲	جے ٹیبلٹس ہڈیاں اور پٹھوں کو طاقت پہنچاتی ہے۔
۴	جے ٹیبلٹس دل جگر و معدہ کو جدید قوت پہنچاتی ہے۔	۱۳	جے ٹیبلٹس کاہلی و جسم کے لوٹنے کو دور کر دیتی ہے۔
۵	جے ٹیبلٹس۔ ہاضم ہے اور اشتہا کو زیادہ کرتی ہے	۱۴	جے ٹیبلٹس۔ ریاحی دردوں کے لیے نہایت مفید ہے۔
۶	جے ٹیبلٹس۔ دافع قبض اور قاطع ریاح ہے۔	۱۵	جے ٹیبلٹس۔ عضلات کو قوت پہنچاتی ہے۔
۷	جے ٹیبلٹس درد کمر اور درد گردہ کے لیے اکسیر ہے	۱۶	جے ٹیبلٹس۔ استعمال سے ملیریا فیور نہیں ہوتا۔
۸	جے ٹیبلٹس مقوی مثانہ اور دافع کثرت بول ہے	۱۷	جے ٹیبلٹس۔ عورتوں اور مردوں کو یکساں
۹	جے ٹیبلٹس مغلظ منی و دافع جریان و کثرت احتلام ہے	۱۸	جے ٹیبلٹس۔ مفید ہے! مفید ہے!! مفید ہے!!!

یہ ایک عجیب الاثر ہے جسکے فوائد کی صداقت امتحان پر موقوف ہے۔

سول ایجنٹ اے ستار جال کمپنی رنگون — **کلکتہ کا ایجنٹ** حاجی محمد حاجی ابوبکر نمبر ۲ ملا ذکریا لین کلکتہ

ایک نظر ادھر بھی

تمدنِ ہند ۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی کی آخری تصنیف اور انکے تبحر علمی اور بینظیر زباندانی کی زندہ یادگار ہے مجلد و با تصویر قیمت صہ۔ علاوہ محصول ڈاک

فلسفۂ ازدواج ۔ مولفہ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی ایم۔ اے۔ ایس آر۔ اے۔ کی نسبت مولانا حالی کی رائے۔

"آپنے یہ کتاب لکھکر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے ہر متاہل اور غیر متاہل شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے اور اسکی ہدایتوں پر عمل کرے" قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک

فغانِ ایران مترجمۂ سید محمد حسن صاحب بلگرامی۔ گورنمنٹ آڈیٹر ریلوی و معدنیات سرکار نظام کی نسبت علامۂ شبلی نعمانی کی رائے۔

"وہ کتاب اکثر جگہ سے دیکھی دلچسپ اور پر اثر ہے خصوصاً عورتوں کے جلسے پارلیمنٹ میں جانے اور ممبروں کے مقابلے میں پستول چلانے کا جہاں ذکر ہے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ بہرحال دلچسپ کتاب ہے" اور ہندوستانی خدمت کے کارنامے کی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ ہر جلد میں ۱۲ نایاب عکسی تصویریں ہیں۔ شائقین جلد طلب فرمائیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا ہوگا قیمت مجلد للعہ ر علاوہ محصولڈاک۔

روئیداد امیری ۔ ترجمہ مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی گورنمنٹ آڈیٹر ریلوے و معدنیات سرکار نظام یعنے سوانح ضیاء الملت والدین امیر عبدالرحمن خان غازی مرحوم والی دولت خداداد افغانستان کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں اسکی مقبولیت کا صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلا اڈیشن انگریزی کا جو چھپا تھا جسمیں سے اب صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں اگر ناظرین جلد طلب نہ فرمائینگے تو طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ مجلد و با تصویر قیمت للعہ ر علاوہ محصولڈاک

پریم پچیسی حصۂ اول مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی پچیس بہترین قصوں کا مجموعہ۔ مرتبہ ایڈیٹر صاحب زمانہ و آزاد کانپور کے متعلق اردو کے زندہ جاوید شاعر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور کی رائے"

"میرے نزدیک آپنے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید لٹریچر کا اختراع ہیں میرے خیال میں ہندوستان میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس دقیق راز کو سمجھا اور سمجھکر اسسے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک نہایت دلکش زبان میں ادا کر سکتا ہے" قیمت مجلد ۱۲ر کلدار علاوہ محصولڈاک

سوانحِ عمری پیغمبرِ عالم جسمیں آنحضرت کے متعلق بشارات مندرجہ توریت و انجیل حسب و نسب و خاندان، شجرہ۔ عہد طفولیت، بعثت، غزوات، معراج وغیرہ اور اسلام سلسل ترقی کی تاریخ۔ تاریخ مکہ معظمہ وغیرہ قیمت عہ کلدار علاوہ محصولڈاک

علمی کہانیاں اور علمی مکالمات ۔ مولفہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی جسمیں علمی مسائل کو کہانیوں اور مکالموں میں بیان کیا گیا ہے قیمت ہر کلدار علاوہ محصولڈاک

عطرِ سخن یا حذبات اسلام مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی قومی نظموں کا بہترین مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ر کلدار مع محصولڈاک

تاریخی جواہر مولانا شبلی۔ حضرت اقبال۔ اظہر دہلوی کی تاریخی نظموں کا دلکش مجموعہ قیمت مجلد ۳ر کلدار علاوہ محصول

علمی تماشے مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی قیمت ۸ر کلدار علاوہ محصو

جملہ خواہشمند بنام منیجر ذخیرہ بک ڈپو اندرون چادر گھاٹ حیدرآباد دکن لکھیں

جلد ۲ نمبر ۱ و ۲ اردو علم ادب کی دلچسپ و مصور رسالہ جنوری و فروری ۱۹۱۶ء

ذخیرہ

مرتب

سید ناظر الحسن ہوش ملیح بلگرامی

تصویر: سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ ہند

فہرست مضامین

سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ ہند

آثار قدیمہ دکن

سر جان مارشل صدر ناظم آثار قدیمہ ہند نے چند روز قبل "انجمن آثار قدیمہ حیدرآباد" واقع ٹاؤن ہال میں عنوان بالا پر ایک پر مغز اور عالمانہ تقریر فرمائی تھی جو تاریخی دلچسپیوں اور فصاحت و بلاغت کی خوبیوں کے لحاظ سے بہت اعلیٰ پایہ کی تھی۔ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی کے زور قلم نے اس محققانہ اور بلند پایہ مضمون کو جو معلومات جدیدہ سے مالا مال ہے اردو کا جامۂ زیبا پہنایا ہے۔ ترجمہ میں اصل مضمون کی خوبیاں اور زور بیان پیدا کرنے میں مولوی صاحب ممدوح کو جو غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے اس سے ارباب نظر لطف اندوز ہوں گے۔ امید ہے کہ ناظرین ان قابل قدر خیالات کو جن سے اردو لٹریچر میں ایک مفید اور بیش بہا اضافہ ہوا ہے نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کرینگے۔

ایڈیٹر

میرے لئے یہ بات نہایت مسرت خیز ہے کہ آج مجھے اس جلسہ میں شریک ہونے اور آثار قدیمہ دکن پر مختصراً تقریر کرنے کا موقعہ ملا۔

حیدرآباد کے قدیم عمارات و آثار سے اوس قسم کی کسی گہری واقفیت کا میں مدعی نہیں ہوں جیسے کہ حاضرین میں سے اکثر افراد کو حاصل ہے

لہٰذا میں بہ آمادگی تمام اس بات کا مقر ہوں کہ آپ لوگوں کے
سامنے اس عنوان پر تقریر کرتے ہوئے مجھے بہت کچھ تامل ہوتا ہے
مگر گزشتہ چودہ برس کی مدت میں مجھے کشور ہندوستان کے بعض
ہتم بالشان تاریخی یادگاروں سے ذاتی طور پر واقف ہونے کے
غیر معمولی مواقع میسر ہوئے ہیں اور اون میں سے اکثر کے تفصیلی حالات
بہ امعان نظر مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ از آنجملہ چند مشہور ترین
یادگاریں ممالک محروسہ سرکار عالی میں واقع ہیں جنکی تحقیق میں میرا
ارادہ ہے کہ زمانہ مستقبل میں اپنے اوقات کا بیشتر حصہ صرف کروں
اُمید ہے کہ آپ مجھے اس امر کی اجازت دینگے کہ وقتاً فوقتاً نتیجہ
تحقیقات سے انجمن ہذا کو مطلع کرتا رہوں۔

اس ملک کی تاریخی یادگاروں کے متعلق جو کچھ میں نے براے العین
مشاہدہ کیا ہے اور جس قدر معلومات اس بارہ میں مجھے حاصل ہیں
اُن وسایل کی بدولت میں اس قابل ہوں کہ ان کی بابتہ ایک
صحیح اندازہ قایم کرسکوں اور ہمسایہ ریاستوں اور صوبہ جات کے
آثار عتیقہ سے ان کا موازنہ کر کے تصویر کا واقعی منظر نمایاں
کروں۔ اس موقعہ پر دکن کی تاریخی یادگاروں کے جن خصوصیات
کا میں بطور خاص تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ آثار دکن کا عجیب
غریب تنوّع اور دلفریبی ہے علی ہذا میدان تحقیق کی وہ غیر معمولی
وسعت ہے جو یہاں پر پائی جاتی ہے۔

جنوب کے دراوڑی ملکوں اور ہندوستان کے باقیماندہ
حصص کے درمیان خطۂ دکن ایک حد فاصل قایم کرتا ہے نہایت
ابتدائی زمانہ سے یہ سرزمین بہ لحاظ تقسیم نوع انسانی نسلی تمدنی
اور لسانی اختلافات کی آماجگاہ رہی ہے۔ جس سمت کو اختیار
کیا جائے اور ممالک محروسہ کے جس جانب نگاہ ڈالی جائے
[illegible] کی گوناگوں یادگاروں کا نامتناہی سلسلہ چلا گیا ہے

یہ آثار و عمارات زمانہ "حجریہ قدیم" سے لیکر بیسویں صدی تک
کی یادگاروں پر مشتمل اور اقوام و مذاہب مختلفہ کے آثار باقیہ کی
حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاست میں زمانہ "ماقبل تاریخ" کی یادگاروں
کی بھی بہتات ہے۔ علی الخصوص جنوبی اور مشرقی حصص ملک
میں "حجریہ قدیم" اور "حجریہ جدید" کے علاوہ مدوّر پتھروں کے
سرادیب اور ایک ڈال کی ستون نما قبور کے نہایت دلچسپ علامات
پائے جاتے ہیں۔ میں ان سرادیب کا شمار زمانہ ماقبل تاریخ میں
اس لئے کرتا ہوں کہ بالعموم اُن کی تقسیم اسی حساب سے کیگئی ہے
مگر ممکن ہے کہ اون میں سے اکثر کا تعلق زمانہ مابعد سے ہو۔
میری رائے میں تقسیم آخرالذکر ہی قرین صحت معلوم ہوتی ہے۔
لیکن عام اس سے کہ انکا تعلق "تاریخی زمانہ" یا عہد
"ماقبل تاریخ" سے ہو دونوں صورتوں میں اون سے یکساں
طور پر دلچسپی برقرار رہیگی اور جبکہ تدریج اون کے متعلق مزید
معلومات حاصل ہوں گے تو اس دلچسپی میں روز افزوں اضافہ
ہوتا رہیگا۔ فی الحال ہمارے معلومات اس قدر ناقص ہیں کہ
اس بارہ میں ایک معمولی سے معمولی سوال کا بھی ہم تشفی بخش
جواب دینے سے قاصر ہیں۔ مثلاً اگر ہم سے دریافت کیا جائے
(یہ سوالات ایسے ہیں جو مجھ سے اکثر کئے گئے ہیں) کہ "حجریہ قدیم"
اور "حجریہ جدید" کا صحیح زمانہ کیا ہے؟ شمالی ہند کا وہ تمدنی
دور جس میں اول مرتبہ تانبے کا استعمال ہوا، دکن پر اوس کے
تاثیر کی کیا نوعیت تھی؟ لوہے کے استعمال کی کب اور کس زمانہ
سے ابتدا رہوئی؟ ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہیں ہے
جس کا قطعی طور پر کوئی صحیح جواب دیا جاسکے۔ حالانکہ حصول
معلومات کا مواد، دکن اور علاقہ جات ملحقہ میں بہ مقدار کافی
موجود ہے اور ضرورت صرف اسی بات کی ہے کہ مسلسل

اور باقاعدہ تحقیقات آغاز کرکے نتایج اور ماخذ کی ترتیب میں احتیاط اور دانشمندی سے کام لیا جائے۔ یہ کام اس نوعیت کا ہے جس کا سرانجام وہ پرجوش اصحاب (یہی دستور انگلستان میں رایج ہے) باحسن اسالیب کرسکتے ہیں جنھیں مبدء فیاض سے ان مسایل کے مطالعہ کا ذوق سلیم عطا ہوا ہے۔ دکن کے متعلق ہمارے معلومات میں جو سقم واقع ہے اوس کے ارتفاع کی عملی کوششیں انجمن ہذا کے دو ارکان (ڈاکٹر ہنٹ اور مسٹر مِن) نے شروع کردی ہے۔ مگر ابھی بہت سے کارفرماؤں کی ضرورت ہے لہٰذا اس میدان عمل کی جانب میں ارباب ذوق و شوق کی توجہہ کو اس لئے منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ اس خصوص میں اون کے مساعی کے بارآور ہونے کا بڑے حد تک امکان ہے۔

اب میں عہدِ ماقبل تاریخ" سے "تاریخی زمانہ" کی طرف عود کرتا ہوں۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر کوہ مسکی پر راجہ اشوک کے عہد کا ایک حکم نامہ آپ نے دریافت کیا ہے جو اس لحاظ سے بالکل لاثانی ہے کہ اس میں اس بادشاہ کا نام واضح طور پر "اشوک" مندرج ہے جس سے راجہ اشوک کی شخصیت کے متعلق نزاعی امور کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ ہو جاتا ہے۔ راجہ اشوک کے زمانہ کے یہ کتبے ایسے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم تمدن کی بابت کوئی دوسری شہادت ایسی موجود نہیں ہے، جو اون کی دیرینہ قدامت کا مقابلہ کرسکتی ہو، بجز اوس ایک آرامی[1] زبان کے کتبہ کے جو مجھے حال ہی میں بمقام ٹیکسلا دستیاب ہوا ہے۔ اس کے بعد زیر زمین مندروں اور خانقاہوں کی صورتیں میں جو پیتل کھورہ اجنٹہ اورنگ آباد اور الیورہ کے پہاڑوں کے دامن کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ آپ کے پاس اس قسم کی یادگاروں کا عمدہ ترین ذخیرہ موجود ہے جس سے گزشتہ ہزار سال بلکہ اس سے زاید مدت کے سنگ تراشی کی صنعت کا حال ہم پر ظاہر ہوتا ہے اور جنکے اندر ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کے فنون بت تراشی و تصویر کشی کے کمال کی تحقیق کا نہایت بیش قیمت مواد پنہاں ہے۔ یہ یادگاریں اور بالخصوص اجنٹہ کے قلمکار تصاویر نہایت دیرپا خوبیوں سے معمور ہیں ان سے صرف ملکی فنون لطیفہ پر روشنی نہیں پڑتی۔ بلکہ چین و جاپان ایسے دور دراز ملکوں میں ان فنون کے نشو و نما اور اون کی تدریجی ترقیوں کا حال بھی ہم پر منکشف ہوتا ہے۔ اجنٹہ کے قلمی تصاویر کی خصوصیات ذاتی کا کماینبغی اندازہ ہنوز نہیں کیا گیا ہے۔ میری رائے میں (جو کافی غور اور مغربی فن تصویر کی گونہ واقفیت پر مبنی ہے) اجنٹہ کے تصاویر ایسے نادر ہیں جنکی نظیر اٹلی کے صنعتی انقلاب[1] تک دنیا کے پردے پر موجود نہیں تھی۔ صرف یہی بات نہیں ہے کہ عصر قدیم کی تاریخ میں ان تصاویر کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ رہا ہے بلکہ فی زماننا وہ اپنی نظیر آپ ہیں صرف ریاست گوالیار میں باغ کے غاروں اور علاقہ سیلون کے ... سیگری میں اسی قسم کی چند تصاویر ناقص حالت میں پائی جاتی ہیں اجنٹہ کے تصاویر میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اوس ... دور کی تنہا باقیات ہیں جس کا حلقہ اثر طول و عرض ہندوستان سے متجاوز ہوکر وسط ایشیا اور اقصائے مشرق کے فنون و صنایع پر اپنے خصایص ذاتی کی مُہر کرچکا تھا جن جن ممالک میں

---

[1] پندرھویں صدی عیسوی میں تمدنی ترقی اور علم و دولت نے خیالات اور محسوسات کو بدل دیا جس سے یورپ کی صنعت کے طرز میں پھر تغیر واقع ہوا اور یونان و روم کی قدیم طرز کو موجودہ ضروریات اور جذبات سے مطابقت کرنے کے بعد "نشاۃ الثانیہ" کی طرز تعمیر پیدا ہوئی۔ (مترجم)

[1] قدیم شامی زبان۔ م

بودھ مذہب داخل ہوا اس کے فنون و صنایع بھی اس کے ہمراہ
گئے جو تخیلات کی رفعت اور روحانی عظمت کا ایک ایسا
پیغام اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ کوئی قوم مادۂ صناعی کی قابلیت
میں اس کی ہمسری نہیں کرسکتی تھی۔ جن اقطاع ملک میں اس
مذہب کا گذر ہوا، ہر نئے مرز بوم سے اوس نے نئے محرکات
اور نئے تصورات کو اخذ کیا۔ برہما ہو یا سیام، کوہستان
تبت ہو یا صحرائی ترکستان جس مقام پر تلاش کی جائے۔
اس کا وجود ایک لحہ کیلئے بھی اوس عمیق روحانی معنویت
سے خالی نہیں پایا جاتا جس کا فیضان اس نے اپنے وطن مالوف
ہندوستان سے حاصل کیا تھا۔ فنون و صنایع انسانی کے حق
میں بودھ مذہب کا یہ عظیم ترین احسان ہے اور اسی احسان عام کا
نتیجہ ہے کہ دنیوی مال و منال کی کوئی مقدار اجنٹہ کی تصاویر کے
قدر و قیمت کی برابری نہیں کرسکتی ہے۔ ایسے عجائبات پر ریاست
حیدرآباد جتنا فخر کرے بجا ہے اور اون کو دست برد ایام سے
محفوظ رکھنے میں جس قدر اہتمام کرے کم ہے۔

ایلورہ کے وہ تصاویر جن سے کسی زمانہ میں ان عماروں
کی زینت تھی اور جن میں وہی صناعیاں موجود تھیں جن سے
اجنٹہ کی تصاویر معمور ہیں، بدقسمتی سے وہ سب انقلاب لیل و نہار
کا شکار ہوچکی ہیں اور اب صرف اون کا وہ پائدار حصہ باقی
رہ گیا ہے جو مورتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ہندوستان قدیم کے
فن بت تراشی میں کبھی وہ صنعتی خوبیاں جمع نہیں ہوئی تھیں
اور نہ تشریح خط و خال میں وہ ید طولیٰ حاصل ہوا تھا۔ جو فن
مصوری کو حاصل تھا با ایں ہمہ ان مورتوں کی ساخت میں وہی
کاریگری اور تخیلہ میں وہی جدت و ذکاوت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے
ایلورہ کے مندروں اور خانقاہوں کی آرایش میں
ہندوستان کے تین بڑے مذاہب بودھ، ہندو اور جین مت نے
رسدی حصہ لیا ہے۔ یہ مندر ان مذاہب مختلفہ کے خصایص کا
ایسا اثر رکھتے ہیں جو ہر قدم اور ہر غلام گردش پر اوس تفوق کو
نہایت جلی حرفوں میں ظاہر کر رہا ہے جو تدریج ایک تمدن نے
دوسرے تمدن پر حاصل کیا تھا۔ میری دانست میں بجز ایلورہ
کے ہندوستان میں کوئی مقام ایسا موجود نہیں ہے جہاں پر
ان مذاہب کے مطالعہ کے ایسے دلچسپ مواقع مہیا ہوں۔

ابتدائی مندروں کا چندر گپت کے زمانہ سے آغاز ہوتا ہے،
جو ہندوستان کی صناعی کا وہ انقلابی زمانہ ہے جبکہ فنون و تخیلات
میں اعلیٰ درجہ کی جدت اور ذکاوت پیدا ہو چلی تھی۔ ان ابتدائی
مندروں میں بودھ زمانہ کے صنایع اپنے انتہائی نقطۂ
ترقی پر پہونچے ہوے نظر آتے ہیں۔ ان میں نقش و نگار کی
لطافت، بوقلموں مگر محدود آرائشیں، لطیف مطابقت
اور سب سے بڑھکر امن و سکون کی خصوصیت ممتاز طور پر جلوہ گر
ہے۔ دوسرے مندروں میں یہی صنعت نامعلوم طریقہ پر
مرور دہور کے ساتھ حضیض تنزل کی طرف مایل نظر آتی ہے
اوس کی قوت خلاقی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصنع اور آورد سے معمور اور تخیل سے
خالی ہے۔ اس چٹان سے گذر کر دوسرے ایوان میں داخل
ہونے کے بعد اوس کا کالبد خیالات اور محسوسات کی
اوس روح سے بالکل خالی نظر آتا ہے جو ابتدائی طرز تعمیر میں
پائی جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گرد ہستی کا
مجسموں کا ایک انبوہ کثیر چٹانوں میں سے خروج کر رہا ہے
جن میں سے بعض خموش اور شاندار انداز کے اور بعض کریہہ
اور نفرت انگیز ہیں۔ مگر بہیئت مجموعی اون کے اوضاع،

اضطراب آمیز۔ تحیر انگیز اور ہیبت ناک ہیں۔

بودہ زمانہ سے عہد ہنود کی جانب عود کرتے ہوئے واضح ہوگا کہ ان کے مابین ایک وسیع خلیج حایل ہوگئی ہے اور اگرچہ اس عہد میں بودہ طرز کی بین طور پر نقل اتاری گئی ہے مگر اُس کے محاسن اصلی مفقود ہیں۔ آمد کی جگہ آورد نے لے لی ہے اون میں حرکت وحیات کی برقی رَو سرایت کرگئی ہے اور دایم فطرت کی وہ تمام حالتیں رونما ہیں جن کے اندر رہوا و ہوس نفسانی اور اذیت و موت کی مختلف کیفیتیں نظر آتی ہیں ایک ایوان سے دوسرے ایوان میں گذرتے ہوئے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مہیب اور مکروہ صورتیں اپنی تاریک گوشوں سے جھانک رہی ہیں اور اگرچہ خود کو بادلِ ناخواستہ محیط تاریکی کے حوالہ کردینا پڑتا ہے مگر سابقہ غاروں کی دلکش صنعت کاری ناقابل فراموش ہو جاتی ہے۔ اور یہ خیال کرکے انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ اس دَور کے لوگوں کو کیا ہو گیا تھا جو انھوں نے شیو کے پرخطر عقاید کی خاطر بودہ مذہب کو خیرباد کہہ دیا۔

اس کے بعد جینی مندروں میں گذر ہوتا ہے جو بہ ہیئت مجموعی بالکل مکمل، نہایت پرتکلف اور غیر معمولی مشقت کا نتیجہ ہیں با ایں ہمہ اون میں قوت خلاق کا پتہ نہیں ہے ان میں جو پرتکلف نقش کاریاں پائی جاتی ہیں انسان اونکی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا مگر تنگیٔ خیال، سرد مہری اور جمود کے منظر مبصرانہ نگاہ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ جینی طرز میں یہی سقم ہر جگہ موجود ہے۔ منادرِ دلوارا واقع کوہ آبو کی طرح اکثر عجیب و غریب عمارتیں ان کے تمدنی دور کی یادگار ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود اعلیٰ ہے۔ مگر پرتکلف اور گوناگوں آرائشوں کے ساتھ ان کے طرز تعمیر میں زورِ تخیل اور پختگی کی شان نہیں پائی جاتی ہے۔

جینی مورتیں جس طرح ازمنہ متوسطہ اور زمانہ مابعد میں فطرتی خوبیوں سے خالی تھیں۔ سنہ عیسوی کی آغاز تک بھی اون کا یہی حال رہا۔ ان کی حیثیت ایک معمولی پتھر سے زیادہ نہ بڑھی۔ جنکی تراش میں نہایت درجہ تکلف ہونے کے ساتھ بودہ طرز کی پوری پوری تقلید کی جاتی تھی با ایں ہمہ وہ نقایص سے معمور بے لطف اور بے جان رہیں۔ اور ان مورتوں کے جس رُخ پر نظر ڈالی جائے انحطاط کے وہ جملہ آثار صاف طور پر ظاہر ہوتے ہیں جن کے باعث بودہ طرز تعمیر بتدریج مسخ ہوگئی تھی مگر یہ انکشاف کچھ ہی عرصہ قبل ہوا ہے کہ جینی طرز کی عمر کے تلاش کے لئے بودہ زمانہ کی طرز تعمیر کو اساس قرار دینا ایک خطرناک غلطی ہے علی ہذا بودہ طرز کے زمانہ کی تلاش جینی طرز میں کرنا بالکل لاحاصل ہوگا۔

اب میں زمین دوز مندروں کی دلکشی کے تذکروں کو زیادہ طول نہ دونگا اسلئے کہ ان کے مقابلہ میں ریاست حیدرآباد کے دوسرے عمارات اگرچہ زیادہ مشہور نہیں ہیں مگر کیا بلحاظ کثرت تعداد اور کیا بلحاظ استحکام و شان و شوکت اُن کا درجہ نہایت وقیع ہے مثلاً مقام تیر ضلع عثمان آباد میں چیتیہ طرز کا ایک مہتم بالشان ایوان موجود ہے جس میں ان چوبی ایوانوں کی نقل اتاری گئی ہے جن کی تقلید میں اجنٹہ۔ ایلورہ اور دوسرے مقامات کے مندر تعمیر ہوئے ہیں۔ اور اس سے ہم کو ابتدائی زمانہ کے چوبی عمارات کے طرز کے مشخص کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عالم پور میں ازمنہ متوسط کے باقیات ہیں جنھیں دیکھنے کا مجھے ابھی تک اتفاق نہیں ہوا ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے ابھی کسی نے ان کی کوئی تصویر بھی نہیں اتاری ہے مگر انجمن ہذا

کے معتمد[1] کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ان کے مطالعہ سے ابتدائی بودہ
زمانہ کے استوپا (گول گھر) اور قرون آیندہ کے مندروں کی طرز
تعمیر کے قرار واقعی اور ان کے باہمی اختلافات کی نسبت نتایج نکالنے
میں بہت آسانی ہو جائیگی جو اس کے بعد آئیگی۔ ورنگل۔ پالم پور
اور انوامیں چالکیہ طرز کی بعض نہایت مکمل اور دلکش
عمارتیں پائی جاتی ہیں۔

تھوڑی دیر قبل میں نے دکن کی جس غیر معمولی جغرافیائی
خصوصیت کی جانب اشارہ کیا تھا وہ چالکیہ اور ڈراویڈی
طرز میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ ڈراویڈی طرز تعمیر کی بڑی
خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روشنی اور سایہ متوازی طور پر
تقسیم کیا جاتا ہے اور انڈو آریائی (یعنے شمالی) طرز میں
یہ تقسیم عمودی طور پر ہوتی ہے۔ جو شہر شمالی اور جنوبی خط
کے درمیان واقع ہیں (مثلاً حیدرآباد میسور اور بمبئی کے جنوبی
اضلاع) ان میں یہ طرز مخلوط طور پر پائی جاتی ہے یعنے ان میں
روشنی اور سایہ عمارت کے وار پار گزرنے کے علاوہ اوپر سے
نیچے کو بھی داخل ہوتا ہے۔ اسی اختلاط کا نام چالکیہ طرز ہے
اور اس کی شکلیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ یہ بات کہ چالکیہ
طرز کا آغاز کب سے ہوا اور اس کی تاریخ کی ابتدا کی نسبت
ہمیں کچھ معلوم نہیں مگر جدید اکتشافات کے ساتھ پردہ اخفا
اس پر سے بتدریج ہٹتا جاتا ہے اور مجھے اس بات کا یقین
ہے کہ جب حیدرآباد کے عمارات اور یادگاروں کی کما حقہ تحقیقات
ہو کر اون کا حال ضبط تحریر میں آجائیگا تو یہ پراسرار حقیقت
پوری طرح بے نقاب ہو جائیگی۔ باوجود اس کے کہ دکن میں
اس طرز کی سیکڑوں عمارتیں موجود ہیں مگر ہمارے پاس ان میں
سے دس فیصدی کی تصاویر یا پانچ فیصدی کے نقشے بھی
طیار نہیں ہیں۔ ڈراویڈی عہد کی عمارات کا بھی یہی حال ہے
جہاں کہیں ان کے حالات مذکور ہیں اون میں نہایت اجمال و اختصار
پایا جاتا ہے حالانکہ فی زمانا جبر نقصان کا مصالحہ افراط سے دستیاب
ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد میں آپ لوگوں کی عنان توجہ کو ریاست ہذا
کے اون کثیر التعداد عمارات کی جانب منعطف کرانا چاہتا ہوں جو
عربی تمدن کی یادگار ہیں۔ وہ مساجد جو ابتدائی فاتحین اسلام یعنے
قطب الدین خلجی اور محمد تغلق نے قدیم منادر کے ملبے سے تعمیر
کرائیں۔ گلبرگہ کے بہمنی بادشاہوں کی بنائی ہوئی شاندار مسجد
جس کا صحن اون کے ہمتوں کی طرح نہایت فراخ وکشادہ ہے
دولت آباد کا سر بفلک چاند مینار۔ مقبرۂ احمد شاہ واقع بیدر
محمود گاوان کا رفیع الشان مدرسہ جس میں کارکاشی کی اینٹیں
استعمال کی گئی ہیں۔ علی برید کا گنبد حیدرآباد کی تناسب کے
سانچہ میں ڈھلی ہوئی مکہ مسجد اور شاہان گولکنڈہ کے مقابر
صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے قابل دید ہیں۔ خصوصاً گلبرگہ کی مسجد
اور بیدر کا مدرسہ مشرق کی بہترین صناعیوں میں شمار کرنے
کے لایق ہے۔ یہ اور دوسرے بے شمار باقیات الصالحات
جنکی شہرت ان سے کم ہے مسلمانوں کے عمارتی مذاق کی ترجمان
اور ملوک دکن کے گزشتہ عظمت وجلال کا نشان ہیں مگر عہد سلف
کی ان یادگاروں کے حالات ہنوز ہمارے لئے ایک سر مخفی
ہیں۔ اگر آپ فرگسن کی تاریخ تعمیرات کے آخری اشاعت کی
ورق گردانی کریں تو ان تمام عمارات کی کیفیت صرف دو ایک صفحوں
میں قلم بند پائینگے اور اس کتاب کی اشاعت اولی کے دیکھنے
سے معلوم ہوگا کہ نصف صدی قبل بھی اس سے زیادہ کچھ حال

---

[1] مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی۔

معلوم نہ تھا لہذا تعمیرات ہند کے مروجہ جزو میں دکھنی طرز کی حیثیت
کے متعلق ہمارے معلومات محض قیاسات پر مبنی ہیں مثلاً بیدر
کی عمارات کے مطالعہ سے ہم صاف طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ
وہ بیجاپور کی طرز کا پیشرو ہے اور از روے مشاہدہ (اگرچہ
یہ مشاہدہ فرگسن میں مذکور نہیں ہے) ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی
اور مغربی ایشیا کا اثر دہلی کے مقابلہ میں دکن پر زیادہ غالب
تھا۔ مگر وہ تصاویر نقشے اور اسناد جن سے ان مشاہدات
کی تطبیق ہوسکتی ہے یہاں پر اون کا وجود خال خال ہے۔
علیٰ ہذا اطلاع و معلومات کے اون لوازم کا ایک جزو بھی یہاں
نہیں پایا جاتا جن کی مدد سے ان مایہ ناز عمارات کے حالات
بالتفصیل حوالۂ قلم ہوسکیں۔

خاتمہ پر میں ان از یادہ رفتہ اسلاف کے یادگاروں کی
قدر و منزلت کے متعلق مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں
جنکے حفاظت و صیانت کی تدابیر میں سرکار عالی کی قابل
تحسین فیاضیاں کارفرمائی کر رہی ہیں اور جن کی دریافت
و تحقیقات میں انجمن آثار قدیمہ بھی مدد دے رہی ہے وہ کیا
چیز ہے جو اس خصوص میں ریاست ہذا کی دلچسپیوں کو ہر سمجھدار
شخص بہ نظر استحسان دیکھتا ہے اور اس کام میں شریک ہونے
پر آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ "آثار قدیمہ" کا
لفظ نہایت خشک اور نمایشی مفہوم رکھنے کی وجہ سے صرف
عالمانہ مذاق کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جاے تو
بزرگان سلف کی یہ یادگاریں بجائے مجلسی حیثیت رکھنے
کے ہمارے لئے ایک "عظیم الشان قومی میراث" ہیں۔ ان
یادگاروں کی تعلیمی وقعت، اون کے خط و خال اور نقش و نگار
کی خوبصورتی، اون کی وضعداری، اون کا قابل قدر استحکام،
اون کی بلند دیواریں اور فصیلیں، اون کے [illegible]
اون کے سر بفلک مینار۔ اون کی تراشیدہ اور [illegible]
اون کا دلکش حسن جس کا ظہور زمانہ کے صنعت آفرین قلم سے
ہوا ہے ان سب خوبیوں کے لحاظ سے میرا یہ کہنا بالکل [illegible]
ہے کہ اس "قومی میراث" کی تحفظ و بقا اور احتیاط و نگہداشت
میں ریاست اور رعیت دونوں کو ہم آہنگ رہنا چاہیئے۔ [illegible]
حاصل ہے اس قسم کی صوری و معنوی خوبیوں کے تصور سے
دل میں شریفانہ جذبات اور اعلیٰ خیالات پیدا ہوتے ہیں
اور ان یادگاروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی تاثیر حسن
سے زیادہ قوی اور حیات بخش ہے ان ہی کی بدولت ہم
قرون ماضیہ کے وقعتوں کا زمانہ حال میں [illegible] کرسکتے ہیں یہی
کے سینہ میں گزشتہ اقوام کے عروج و زوال۔ اون کے مذہبی عقائد
اور آرزوں اور حسرتوں کی تاریخ پنہاں ہے یہی کے باعث اہل
ہند کے مادۂ صناعی کی ذکاوت اور اون کے مساعی موفور کا
حال ہم پر منکشف ہوتا ہے یہ اوس زمانہ کے لوگوں کے خصائل کو
ہم پر ظاہر کرتے ہیں اور اُن میں اُن کے اعلیٰ تخیلات اور [illegible]
روایات محفوظ ہیں۔

زمانہ گزشتہ کے متعلق جس طرح ان یادگاروں سے تعظیم و افتخار کے
جذبات کو تحریک ہوتی ہے اسیطرح آئندہ کی بابت یہ بہت کچھ امید افزا
ہیں اور ان سے قوم کے اخلاق کو بنانے اور مستحکم کرنے میں مدد ملیگی۔
ہندوستان اپنے طول طویل اور گوناگوں تمدن پر جس قدر فخر کرے
بجا ہے اور اس کا ان باقیات الصالحات کی صیانت و نگہداشت
پر مباہات کرنا بھی حق بجانب ہے جو اس کی تمدنی ترقی میں دلیل راہ
کا کام دے رہے ہیں۔ فقط

سید علی اصغر بلگرامی

ترقی سائنس

یعنی

علوم جدیدہ کی مجمل تاریخ

شیخ فیروزالدین صاحب مرآد اسسٹنٹ پروفیسر علیگڈھ کالج ان برگزیدہ افراد میں سے ہیں جن کو مبدء فیاض سے وجدان سلیم اور ذہن نکتہ آفریں عطا ہوا ہے اگرچہ آپ نے ابھی اپنی عمر عزیز کی صرف ستائیس منازل طے کئے ہیں مگر آپ کی علمی زندگی نے قبولیت کے وہ تمام مراحل طے کرلئے ہیں جو اکثر کہنہ مشق اساتذہ فن کے حصہ میں آتے ہیں آپ نے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ فزکس میں ایم یس سی (ماسٹر آف سائنس) کا امتحان بھی پاس کرلیا ہے۔ پروفیسر صاحب کو سائنٹیفک مضمون نگاری سے طبعی مناسبت ہے اور اس شعبہ میں آپ کو کامل انہماک حاصل ہے۔ آپ کی ذات سے ملک کی بہترین توقعات وابستہ ہیں ہم کو امید ہے کہ اصحاب دانش و بینش آپ کے فلسفیانہ انداز کو بہ نظر استحسان دیکھیں گے۔

ایڈیٹر

تمہید مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر اردو میں ایک مختصر رسالہ شایع کیا جائے تاکہ عوام الناس کو سائینس کی عہد بعہد ترقی اور علوم جدیدہ کے طریقہ تحقیقات سے مجملاً واقفیت ہو جائے۔ لیکن مشکل امر یہ ہے کہ اردودان اصحاب سرے سے سائینس سے ناواقف ہوتے ہیں اور سائینس کی موٹی موٹی باتوں کا بھی ملک میں ابھی چرچا نہیں ہوا اس لئے ایک مجمل تاریخ کو عام فہم بنانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے پھر اگر تفصیل کے ساتھ مسایل علمی کی تشریح کی جائے تو غیر مانوس طبایع شروع شروع میں اکتا جاتی ہیں یہی متضاد خیالات اور مشکلات آج تک اس قصد کو عملی جامہ پہنانے میں سدراہ رہے ہیں اور شاید جب تک راستہ صاف نظر نہ آجائے چندے اور مانع رہیں گے لیکن اب میں نے خیال کیا کہ ایک مستقل تصنیف پیش کرنے سے پیشتر اسی مضمون کے بعض حصوں کو ایک مرود مضمون کی شکل میں قلم بند کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اگست ۱۹۰۸ء میں میرا ایک انگریزی مضمون ہندوستان ریویو میں بعنوان پروگریس آف سائینس یعنے ترقی سائنس

(Progress of science) شایع ہوا تھا مفصلۂ ذیل سطور ایک حد تک اسی قدیم مضمون کا ملخص ہیں دراصل یہ مضمون مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے ایک ہونہار سائنس کے طالب علم علی بہادر خاں نے میرے مقدم الذکر مضمون ترقی سائنس (انگریزی) سے ترجمہ کیا ہے گو کہ ترجمہ کرنے میں انھوں نے ترتیب مضامین کو بہت کچھ ردوبدل کر دیا ہے اور بعض جگہ نفس مطلب کو واضح کرنے کی بجائے مبہم بنا دیا ہے۔ انگریزی مضمون موجودہ اردو ترجمہ سے تین چار گنا زیادہ لمبا تھا یہ اختصار علی بہادر خاں نے محض اپنی شخصی راے کے مطابق کیا ہے جس کے لئے میں ذمہ دار نہیں ہوں البتہ میں نے تمام مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور جہاں تک ممکن تھا اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور گو اب بھی بہت سی جگہ سے مضمون بے ربط رہ گیا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی علی بہادر خاں کی یہ پہلی کوشش قابل ستایش ہے اور ہر ایک طرح کی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے بالآخر علی بہادر خاں اور ایڈیٹر صاحب ہندوستان ریویو کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ موخر الذکر نے بکمال عنایت اپنے رسالہ میں سے میرے انگریزی مضمون کے اردو ترجمہ کی اجازت فرمائی اور مقدم الذکر نے نہایت جانفشانی سے ترجمہ کیا۔

فیروز الدین مراد

ابتدا میں جبکہ حضرت انسان نے جہالت کی تاریکی سے تہذیب کی روشنی میں قدم رکھا اور تمدن کو اپنا طرز معاشرت قرار دیا تو اسے مختلف ضروریات پیش آگئیں اور فطرتاً انسانی دماغ کو انھیں حل کرنا پڑا۔ مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور عقلاً اور تواریخاً بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بڑی حیرت انگیز ایجادوں اور عالمگیر علوم و فنون کی بنیاد اسی ایک اصول پر مبنی ہے۔ پیمائش زمین کی ضرورت سے علم ساحت پیدا ہو گیا۔ ہندوؤں کو انکے مذہبی رسموں اور تیوہاروں کی ساعت دیکھنے کی ضرورت نے علم نجوم سے ماہر کر دیا۔ کون جانتا تھا کہ نیوٹن کا اپنے باغ میں سیب گرتے دیکھنا دنیا کے لئے کیسا بابرکت ثابت ہوگا غرضکہ علوم نے زمانہ کی رفتار کے ساتھ بتدریج ترقی کی ہے صدہا جانیں ان کی تحقیقات میں نثار ہو گئیں نیوٹن اور افلاطون سے عالی دماغ اس بحر ناپیدا کنار میں غوطہ کھاتے رہے کچھ شک نہیں کہ عقل و تہذیب کے ہیرو تھے۔ لیکن بہت سے ایسے غلط اصول بھی صحیح ثابت کر گئے کہ آج کل کے ابجد خواں بھی ان کو سنکر مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ان اصولوں کو اس وقت صرف اس وجہ سے آمنّا صدقنا کہا گیا کہ وہ نیوٹن یا افلاطون نے بنائے تھے۔ وہ اہل یونان جن کو موجد ریاضی کہنا چاہیئے۔ برسوں تک ایک بڑی چٹان سے ایک مکعب فٹ کا سہ گنا نہ کاٹ سکے۔ غرضکہ بہت باتیں جو ارسطو اور سقراط کے سے دماغوں کے لئے مافوق الادراک تھیں۔ آج کل کے بچہ بچہ کی زبان زد ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ متقدمین کو یہ غلط فہمیاں کیوں واقع ہوئیں۔

قوانین قدرت کا مطالعہ کرنے کے صرف دو طریقے ہیں (۱) مشاہدہ (۲) تجربہ۔ طریقہ اولین کا دارومدار قانون استدلال پر ہے (یعنے ایک قسم کے اسباب سے ایک ہی قسم کے نتیجے نکلتے ہیں) یہ ہی قانون ہے جو منطق کی جان ہے اور جس کے بغیر استدلال ناممکن ہو جاتا ہے کسی واقعہ کے مشاہدہ کرنے میں ہم اس واقعہ کو ان حالتوں میں دیکھتے ہیں جو اس کے ظہور میں آنے کے لئے ناگزیر ہیں مثلاً بارش کا مشاہدہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیئے پہلی ضرورت بادلوں کا وجود ہے دوسرے یہ کہ بادلوں میں پانی کا ہونا لازمی ہے لیکن فوراً سوال پیدا ہوگا کہ بادلوں میں پانی آیا کہاں سے اور قطرے زمین ہی کی طرف کو کیوں آتے ہیں آسمان کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے ؟ غرضکہ ایسے ایسے بہت سے سوال پیش آینگے اور انھیں سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیدینا قوانین قدرت کا سمجھ لینا ہے اب ایسے مشاہدے ہر وقت ناممکن ہیں ہم کو قوائے فطری پر کوئی اختیار نہیں۔ ہماری مرضی پر کسی خاص وقت میں آسمان سے بارش نہیں ہوگی لیکن اگر ہم ان حالتوں کو جو مشاہدے اور نیز عقل سے بارش کے لئے ناگزیر معلوم ہوتی ہیں اپنے کمرے میں چھوٹے پیمانہ پر جمع کر سکیں۔ یعنے پانی سے بخارات اٹھائیں اور ان کو ایک سرد طبقہ میں پہونچایں جہاں سے کہ یہ نقلی بارش ہو اور پھر اس سے نتیجہ حاصل کریں تو یہ تجربہ کرنا کہلائیگا اور درحقیقت یہی طریقے ہیں جنکی بدولت آج علوم طبیعات اور علم کیمیا نے یہ رتبہ حاصل کیا ہے اور ان کے بہت سے مسئلے حل ہوگئے ہیں لیکن متقدمین نے ان پر کافی عملدرآمد نہیں کیا بلکہ قیاس کو زیادہ کام میں لائے بہت سی باتیں جنکی کوئی کافی شہادت موجود نہ تھی صرف قیاس کے بھروسے صحیح مان لی گئیں۔ ظاہر ہے کہ قیاس ہر جگہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ دو سو برس پہلے کون گمان کر سکتا تھا کہ پانی کے اجزا دو گیس ہونگیں جن میں سے برخلاف پانی کے ایک خود جلتی ہے اور دوسری چیزوں کے جلنے میں مدد دیتی ہے ان کے نزدیک پانی کی عنصر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی تھی کہ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا تھا غرضکہ اسی طرح متقدمین نے بغیر یہ دیکھے کہ ان کے ناکافی اور محدود مشاہدات اور عقلی ڈھکوسلے واقعات کے مطابق بھی ہیں یا نہیں بہت سے کلیے قایم کردئے جنھوں نے سالہا سال سائینس کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کردیں جن لوگوں نے ان غلط العام قوانین کے خلاف سر اٹھایا بھی تو اس وجہہ سے ان کی بات قابل سماعت نہ سمجھی گئی کہ وہ نیوٹن جیسے فلسفی اور افلاطون جیسے حکیم کے خلاف تھیں لیکن کہاں تک آخر کار سچ کا آفتاب چمکا۔ اور جہالت کے چہرے سے نقاب اٹھگیا۔ لوگوں نے متقدمین کی غلطیوں کو مان لیا اور نہ کیسے مانتے۔ موخرین نے تو طریقہ ہی جدا گانہ اختیار کیا واقعات کو قیاس پر ترجیح دی۔ جب تک مشاہدہ اور تجربہ کی تطبیق نہ ہو جاے یہ کوئی کلیہ یا قانون قایم ہی نہیں کرتے۔

سائینس کی پیدائش کا فخر قدیم یونان کو حاصل ہے۔ وہاں کی تجارت پسند سلطنت اور آزاد خیال رعایا نے اس کو بہت ترقی دی۔ اب سائینس کا تقاضا ہوا کہ توہمات اور خلاف عقل مراسم کا استیصال ہو اور صرف قانون قدرت پر بھروسہ کیا جائے۔ پہلے ہی سبق کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے استیصال کا خیال دل میں پیدا ہوگیا اول اول تو اس مذہبی اور تمدنی انقلاب کو عوام نے کفر خیال کیا اور بہت سی جانیں اس اصلاح میں ضایع ہوئیں۔ لیکن آخر کو فتح نصیب ہوئی

اور لوگ سائنس کی روشنی میں آنے لگے۔

آفتاب سائنس کے طلوع کے بعد متقدمین کے سامنے ایک بڑا اہم سوال درپیش ہوا کہ آخر یہ دنیا کس چیز کی بنی ہوئی ہے۔ جمہور متقدمین تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ دیتے تھے کہ دنیا چار عنصر آب۔ آتش۔ خاک۔ باد سے بنی ہے لیکن اب وہ زمانہ کہاں کہ ایسے لایعنی جواب سنکر لوگ چپ ہو جائیں لہذا بال کی کھال نکالنی پڑی۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سالمات[1] اور ذرات[2] کی حقیقت کھلی۔ ڈیماکریٹس پہلا شخص تھا جس کے خیال میں یہ بات آئی اور اس نے ذیل کے اصول قایم کئے۔

(۱) کسی غیر موجود چیز سے کوئی چیز نہیں پیدا ہو سکتی کوئی موجود چیز برباد نہیں ہو سکتی۔ تمام تبدیلیاں ذرات کے ملنے اور جدا ہونے سے ہوتی ہیں۔

(۲) بغیر سبب کے کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔

(۳) سالمے یا ایٹم لاتعداد ہیں اور مختلف شکل کے ہیں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور نئی نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

فی زمانہ انھیں اصولوں پر فلسفہ سالمات[3] کی شاندار علمی تعمیر بنی ہے اس کے بعد ایپیکورس نے جو کہ ۳۴۲ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کو بہت ترقی دی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ احسان فلاسفی سالمہ پر لوکریٹس کا ہے جس نے سالمات کو اپنی مشہور و معروف نظم میں جگہ دیکر جامۂ جاودانی پہنا دیا۔

۱۔ سالمات نام ہے مادہ کے اجزائے بسیط کا جنھیں اجزائے لاتیجزی بھی کہتے ہیں۔
۲۔ ذرات سالمات سے بڑے ہوتے ہیں اور اشیا کی طبعی خواص کا انحصار ذرات پر ہوتا ہے ایک ذرہ میں کئی سالمے ہوتے ہیں انگریزی میں ذرات اور سالمات کو مالیکولز molecules اور ایٹم Atoms کہتے ہیں۔
۳۔ فلسفہ سالمات مرادف ہے Atomic philosophy کی۔

اس کے بعد فیثاغورس نے اس میدان میں قدم رکھا۔ اس نے علم ریاضی کا ایک مدرسہ قایم کیا اور اپنی متواتر کوششوں اور تحقیقاتوں سے سائنس کو بہت فائدہ پہنچایا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ان جھوٹے منطقیوں[1] .... کا زمانہ جو جھوٹ کو سچ دکھاتے تھے خاتمہ پر آچکا تھا۔ ایتھنس میں سقراط افلاطون اور ارسطو سے حکما پیدا ہو گئے تھے انھوں نے ان کی کافی بیخ کنی کر دی اور سائنس پر ایسا اثر ڈالا کہ ان کے دماغ کو آج تک دنیا مانتی ہے اسی زمانہ میں اسکندریہ کے مدرسہ کی بنیاد پڑی اقلیدس نے اپنی ابتدائی شکلیں لکھیں اور علم مناظر و مرایا[2] میں بھی معتدبہ ترقی کی۔ ارشمیدس نے اپنا لیور یا اہرم کا نظریہ پیش کیا اور علم مائیات[3] میں مختلف تحقیقاتیں کیں علم ہیئت کا سہرا ہپارکس کے سر بندھا جسکی تائید نہایت زور کے ساتھ مشہور معروف ہیئت دان بطلیموس نے تائید کی۔ جس کا نظام بطلیموس پندرہ سو برس تک باوجود غلط ہونے کے دنیا پر حکمرانی کرتا رہا۔ اسی زمانہ سے علم تشریح نے بھی زور پکڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قدمائے یونان کا ستارہ اوج پر تھا انھوں نے سائنس کے پودے کو نہایت جانفشانی سے پرورش کر کے ایک بارور درخت بنا دیا۔ دنیا سے خیالی بتوں کی پرستش نیست و نابود ہو گئی۔ پہلے تو کسی تحقیقات یا مشاہدہ کا ہونا امر اتفاقی تھا لیکن اب لوگوں کا اس طرف رجحان ہوا۔ اور ہزاروں نے اپنی زندگی کا یہی مقصد قرار دے لیا کہ وہ سائنس کو کسی طرح ترقی دیں۔ انسانی حواس کو مشاہدات میں دو

۱۔ جھوٹے منطقی یعنے کم بحث فلسفی جنھیں (sophists) کہتے ہیں۔
۲۔ علم مناظر و مرایا Theory of vision & optics
۳۔ علم مائیات Hydrostatics

دینے اسکے لئے مختلف قسم کے آلات ایجاد کئے اور استقرا اور تجربہ نے ملکہ سائنس کو درجہ کمال پر پہونچایا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کمال کو ایک دم زوال کیوں آیا۔ سائینس کا وہ آفتاب جو میدان عالم میں ہر طرف اپنی شعاعیں پہنچا رہا تھا ایکدم کیوں گھن میں آگیا کونسی باد مخالف چلی۔ جس نے اس سرسبز زمین کو ایسا خشک کیا کہ سالہا سال تک کوئی پھل اوگ نہ سکا؟ تواریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل روم عیش پرستی میں مبتلا ہو گئے یونان کا طبقہ الٹ گیا چاردانگ عالم میں عیسائیت کا ڈنکہ بجا۔ مذہبی جوش نے اس قدر زور پکڑا کہ بائبل کے سامنے کسی نے سائینس کی نہ سنی چونکہ بائبل میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا لہذا کسی نے نہ مانا کہ زمین گول ہے اور تھالی کی طرح چپٹی نہیں ہے بہشت بریں کا شوق ایسا دل میں سمایا کہ عجائبات عالم کی تحقیقات ہی کرنی چھوڑ دی غرضیکہ یہ مذہبی جوش سائینس کی بڑھتی ہوی موج کے لئے سد سکندری کی طرح حائل ہو گیا۔ اور سالہا سال کے لئے اس کی ترقی کو روکدیا اور زمانہ متوسط میں لوگوں کے دلوں کو توہمات کے بادل نے پھر تاریکی میں سلا دیا۔ بجائے اس کے کہ علوم و فنون کو کچھ ترقی دیتے اونھیں سحر و افسون اور کیمیا کا مرض پیدا ہو گیا کیمیا کے جاننے کے لئے پہلے اس بات پر توجہ کی گئی کہ چیزوں کے جلنے کی کیا وجہہ ہوتی ہے اور اسی کوشش میں نظریہ فلاجسطی[1] کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس نظریہ کے مطابق ہر ایک جلنے والے جسم میں ایک مادہ محرقہ (جسے اصطلاح میں آگ کا اصول یا فلاجسطن کہتے ہیں) کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور جلنے کی تشریح یہ کی جاتی تھی کہ جلتے وقت فلاجطن جلنے والے جسم سے خارج ہوتی ہے ہم اس غلط نظریہ کی تفصیل یہاں پر بحث نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ نظریہ سنہ ۱۶۵۰ء کے بعد کامل ایک سو برس تک تمام علمی دنیا میں مسلمہ رہا۔ بالآخر ڈیوی اور رمفورڈ کے تجربات نے اسے ناممکن ثابت کر دکھایا اور پریسٹلے کے تجربات سے سنہ ۱۷۷۴ء میں آکسیجن کا وجود ثابت ہو گیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کیمیا کا شوق قدمائے مصر کو بھی تھا کیونکہ اہرام مصری کی چٹانوں سے ایسے نسخے ہات آئے ہیں جو اس بات کا ثبوت دیتے ہیں غرضکہ تمام تیزی اور جودت طبع اسی کوشش میں خرچ کر دی گئی کہ کسی طرح پیتل سے سونا یا سیسے سے چاندی بن جائے لیکن آخر کار جبکہ یونان اور اٹلی پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوی تھی عربوں نے سائنس کے مردے میں نئی روح پھونکی ارسطاطالیس کی فلاسفی اور علم کیمیا کو مصر سے سیکھ کر شمالی آفریقہ فتح کرتے ہوے ہسپانیہ میں سلطنت قایم کی اور ان کے عہد حکومت میں وہاں پر سائنس کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قرطبہ کا دارالعلوم علوم و فنون کا مرکز بن گیا ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں نے وہاں جاکر علم حاصل کیا۔ جرمن انگلستان۔ فرانس۔ یونان۔ غرضکہ سبھی ان سے فیضیاب ہوے خدا کی قدرت ہے کہ وہی قومیں جو کل ہمارے خوشہ چینوں میں شمار کی جاتی تھیں آج ہم سے آگے سبقت لے گئی ہیں کہ ہم ان کے سامنے کاسئہ گدائی لئے پھرتے ہیں کہ کاش ان کے ذخیرہ علم سے ہم کو بھی کچھ مل جائے۔ زمانہ حال کی سائینس کی اصطلاح میں بہت سے لفظ ہم کو ایسے ملتے ہیں جو عربی زبان کے ہیں اور اس زمانہ کو یاد دلاتے ہیں ابن ہیثم بصری معروف بہ الحیزن (Alhagen) ایک عرب سائینس داں نے افلاطون کے اس خیال کو کہ روشنی کی کرنیں آنکھ سے نکلتی ہیں۔ غلط ثابت کیا۔ اس نے تحقیق کیا کہ

[1] نظریہ فلاجسطی

ہوا کے درمیان ہونے کی وجہ سے سورج کی شعاعیں منحرف ہو جاتی
ہیں اور دکھا دیا کہ ہم آفتاب اور ماہتاب کو اس حالت میں
بھی دیکھتے ہیں جبکہ وہ واقع میں غروب ہو جاتے ہیں اس نے
یہ بھی بتایا کہ افق کے نزدیک چاند اور سورج بڑے کیوں
معلوم ہوتے ہیں اس کو کشش مرکز کا اصول بھی معلوم تھا۔ اور
جو نتیجے اس سے نکالے وہ ہمارے تجربوں کے نتیجوں سے بہت
ملتے جلتے ہیں۔ ایسی ایسی باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے
ڈاکٹر ڈریپر کا اس بات پر افسوس کرنا حق بجانب ہے کہ
"یورپ والوں نے مسلمانوں کے احسان کو سائنس کے بارہ
میں نہایت خوبی کے ساتھ فراموش کر دیا ہے۔"

خیر اس معترضہ بحث کو چھوڑ کر پھر اپنے مسئلہ کی طرف
رجوع ہوجیئے تو دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے زمانہ متوسط میں دنیا
کے قوانین قدرت کو آسمانی خیالی باتوں کے سامنے بیکار سمجھکر
چھوڑ دیا لیکن آخر کار برسوں کی دبی ہوئی آگ بھڑکی اور
ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ ارسطاطالیس کے خیالی
قوانین یا آبا و اجداد کی روائتیں یا چرچ یا بائبل دنیا کا حال
نہیں بتا سکتے بلکہ عالم کی تحقیقات صرف مظاہر قدرت کے
مشاہدے سے ہو سکتی ہے۔ سنہ ۱۵۴۳ء میں کوپرنیکس نے سیاروں
کے راستے معلوم کئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ نظام بطلیموسی جسکی رو سے
زمین عالم کا مرکز تھی خاک میں مل گیا اور زمین کی گردش کا
سبق ہر تعلیم یافتہ فرد و بشر کی زبان زد ہو گیا۔ لیکن مذہبی قیود
اور سختیاں اس آزاد خیالی کے بہت سد راہ ہوئیں۔ گیلیلیو کو
سنہ ۱۶۳۳ء میں پاپائے روما کے سامنے حلف اٹھا کر کہنا پڑا کہ
نظام شمسی کا مرکز آفتاب نہیں ہے اگرچہ دل میں اس کو
حق الیقین تھا کہ یہ قانون بالکل سچ ہے اور صرف یہی نہیں

بلکہ اس کو بقیہ عمر اس عقیدے کے گناہ سے نجات پانے کیلئے
گوشۂ تنہائی میں بیٹھکر مجبوراً توبہ و استغفار میں گذرانی پڑی۔
گیلیلیو کے بعد کیپلر گذرا اس نے اپنے اصول سیاروں کی رفتار
کے متعلق پیش کئے۔ انھیں سب منتشر باتوں کو جمع کر کے نیوٹن
نے ایک عالمگیر قانون تجاذب مادی کا بنا دیا۔ زمانہ متوسط
میں نظریہ سالمہ کو بالکل عام طور سے بھلا دیا گیا تھا وہ مذہب
کی رائے میں کفر اور لوگوں کی رائے میں خبط تھا لیکن سنجیدہ
مزاج اور سلیم الطبع مبصرین کے دماغ میں یہ خیال ضرور جاگزیں
رہا۔ اور بیکن۔ ڈیکارٹس۔ ہابس۔ لاک۔ نیوٹن اور بائل وغیرہ
سمجھدار لوگ اس کو مانتے رہے حتی کہ ڈالٹن Dalton
نے اس کو درجہ یقین پر پہنچا دیا اور علم کیمیائے جدید کا سنگ بنیاد
رکھدیا۔ گو اس سے پہلے لے وائے زیر نے ترازو کی مدد سے قانون
عدم فنائے مادہ بیان کرنے سے علم کیمیا میں ایک نئی روح پھونکدی
تھی۔ اس زمانہ سے قبل علم کیمیا کی بابت لوگوں کے کیا
خیالات تھے وہ قابل غور ہیں بجائے اس کے کہ وہ اس علم
کے ذریعہ سے قوانین قدرت کا مطالعہ کرتے انھوں نے اپنا
اصلی مقصد یہ بنا رکھا تھا کہ کسی طرح پارس پتھر تلاش کریں
وہم کا بھوت سر پر سوار تھا۔ سوچتے تھے کہ ہم اس پتھر کے
ذریعہ ہر دھات کو سونے میں تبدیل کر سکیں گے۔ دوسرے ان
کی کوششیں آب حیات کیلئے ہوتی تھیں مشہور تھا کہ آب
حیات جو پی لیگا جوان ہو جائیگا اور ہمیشہ عالم شباب میں
رہیگا بلکہ یہ زندگی بھی زندگی ابدی ہو جائیگی۔ اس وقت
میں لوگوں کے عجیب و غریب عقائد تھے۔ مذہبی جوش سے
ایسے اندھے ہو گئے تھے کہ ہر وہ بات جو ان کے موافق ہو ماننے
کیلئے تیار ہو جاتے تھے خواہ وہ عقل کے کتنی ہی خلاف کیوں نہ

بلکہ ان کے نزدیک کسی بات میں عقل کو دخل دینا اور دلایل
پیش کرنا فعل عبث تھا۔ عقل سے کام لینے کے بجائے توہمات
اور ضعیف الاعتقادیوں پر عمل درآمد تھا لیکن اسی فضولیات
اور توہمات کے زمانہ میں بہت سی حقیقتیں بھی معلوم ہوتی رہیں
گو یہ حقیقتیں بھی اسی زمانہ کی رنگ میں رنگی ہوی تھیں ہر سچ
پر جھوٹ کا ملمع تھا اور ان کو ان عیبوں سے پاک کرنے اور قاعدہ
کام میں لانے کے لئے ایک مدت دراز کی ضرورت تھی۔

آخرکار وہ زمانہ آیا کہ یورپ میں تعلیم کا چرچا ہوا۔
علوم وفنوں پر بحث کی گئی۔ ہر بات پر کافی روشنی ڈالی گئی۔
وہ طریقے معلوم کئے گئے جو کہ ان کی بہبودی کے لئے ناگزیر تھے
کسی بات کے ماننے کے لئے سب سے پہلے عقل و دلیل سے کام لیا گیا
متقدمین تو زمین کی بات سمجھنے کے لئے آسمان سے تحقیقات شروع
کرتے تھے لیکن اب آسمان کی باتیں معلوم کرنے کے لئے زمین سے
تحقیقات کرنا شروع کیا۔ بیکن نے جو انگلستان کا ایک مشہور
فلاسفر گزرا ہے حکمائے اسلام کے اس نسیاً منسیا فلسفہ کو از سر نو سکھلایا
کہ حقیقت کا راستہ بغیر نیچر کا مطالعہ کئے نہیں کھل سکتا۔ اور قوانین کا
دارومدار مشاہدات اور تجربات پر ہونا چاہئے اعلی خیالات کے
لئے گرد و پیش کے واقعات سے نتیجے حاصل کرنے چاہئیں اس طرح سے
سائنس کا ستارہ دن بدن عروج پر آتا گیا۔ سترھویں صدی کے
درمیان میں علوم ریاضی اور طبیعات کے لئے زمین کے ہر شایستہ
حصہ سے لوگ غیر معمولی جوش کے ساتھ اٹھے اور بڑے بڑے جلسے
اور انجمنیں صرف اسی مقصد کے لئے اٹلی انگلستان اور فرانس میں
قایم ہوئیں۔ ان جلسوں میں ہر قوم کے بڑے بڑے نامی گرامی اور
سائنس پسند علما اور فضلا ملے۔ اور ایک نے دوسرے کے خیالات
اور محنت میں حصہ لیا۔ بہت سے علم دوست لوگ نئی نئی باتوں
اور تجربات کے حاصل کرنے کے لئے دامے درمے قدمے سخنے
اس مبارک کام میں مدد دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ سنہ ۱۶۶۲ء میں
لندن میں رائل سوسایٹی اور سنہ ۱۶۶۶ء میں پیرس میں سائنس کی
رائل اکیڈمی قایم ہو گئی۔ نیوٹن کے فلسفہ نے برقی اثر دکھایا فاضلین
زمانہ نے اس کو سر آنکھوں پر لیا۔ اور اس کے مبارک مقاصد کے
سامنے سر تسلیم خم کیا اس کے بعد سائنس کی تاریخ میں ایک اور
انقلاب پیش آیا یعنے سنہ ۱۷۷۴ء میں ڈاکٹر پریسٹلی نے دکھا دیا کہ
پارہ کے سرخ اکسائڈ کو کافی گرم کیجیے تو ایک گیس یا غاز نکلتی ہے
جس کو کہ اس نے فلاجسٹن نہ رکھنے والی گیس کے نام سے یاد کیا کیونکہ
وہ جل نہیں سکتی تھی یہ زمانہ حال کی آکسیجن تھی جو کہ ہوا کا پانچواں
حصہ بناتی ہے اور پانی سطح زمین کے وزن میں ۸/۹ اور ۱/۲ کی
نسبت سے شامل ہے جس کے بغیر نہ آگ جل سکتی ہے نہ آدمی زندہ
رہ سکتا ہے فلاجسٹن کے قانون کا موجد اسٹال ایک معاصر نیوٹن
تھا۔ عرصہ دراز تک لوگ اس کو سچا مانتے رہے لیکن جبکہ کیونڈش
ڈیوی اور کاونٹ رمفورڈ نے پانی کے اجزا کو الگ کر دکھایا تو
فلاجسٹن کا نام بھی صفحہ ہستی سے کالعدم ہو گیا۔ ڈاکٹر پریسٹلے کے
آکسیجن کے انکشاف نے نور علی نور کا کام دیا آکسیجن کا وجود سویڈن
کے ایک کیمیا داں شیول نے بھی تین سال کے بعد بغیر پریسٹلے کی مدد
کے بذات خود ثابت کیا اس کے بعد سوا آزیر نے جس کو علم کیمیا
کا باپ کہنا چاہئے اپنی کیمیا کی ترازو پیش کی اس آلہ کی قدر و
منزلت اور اس احسان کو کیمیا داں ہی خوب جان سکتے ہیں۔
سچ تو یہ ہے کہ بغیر اس آلہ کے علم کیمیا نا مکمل تھا اس نے آتے ہی
اس قانون قدرت کو ثابت کیا کہ جس پر علم کیمیا کا دار و مدار ہے
یعنے مادی دنیا میں کسی شئی کو کبھی نہیں نہ کوئی موجود چیز فنا
ہو سکتی ہے نہ کوئی نئی پیدا ہو سکتی ہے داس حقیقت کو قانون علم

فنائے مادہ یا قانون بقائے مادہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ،
جب ترقی کے میدان میں ہم سائنس کی یہ پیش قدمی دیکھتے ہیں
اور اس کے ان حیرت انگیز نتیجوں پر نظر ڈالتے ہیں جنکو دیکھکر آنکھیں
چکا چوندہ ہوتی ہیں اور جن سے تمام دنیا جگمگا رہی ہے تو تعجب
حیرت طاری ہوتی ہے۔ دماغ چکرا آتا ہے کہ آخر اس علم نے انسان
کی طاقت کو کتنے حصہ بڑھا دیا ہے اور اس روز افزوں ترقی
کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے تخت سلیمان اور اڑنے والے کھٹولے
کے قصے ہوائی جہازوں کی ایجاد سے صحیح ہوگئے۔ زمین کی طنابیں
بھی قریب قریب کھنچ چکی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ دن بھی آجائے
کہ دو تین منٹ میں کرہ زمین کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر
پہونچ جایا کریں یہ ترقی صرف علم کیمیا پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ہر علم
کے ہر شعبہ میں ایسی ہی نمایاں ترقی نظر آتی ہے علم ہیئت کی طرف
نظر دوڑائے تو اس سے زیادہ عجائبات نظر آتے ہیں جبکہ گلیلیے
اپنے تجربات دکھا کر نظریہ فلاسطن کا قلع قمع کر رہا تھا نظام شمسی
میں صرف ماہتاب و آفتاب اور پانچ ستارے شامل تھے سنہ ۱۷۸۱ء میں
ہرشل کی دوربین نے ایک اور سیارہ کا اضافہ کیا جس کا نام اب
یورے نس مشہور ہے۔ نیوٹن اعظم کا تجاذب مادی کا قانون ہر شخص
کے مقبول ہوگیا تھا لیکن پیرس اور کیمبرج کے دو ریاضی دانوں نے
اس ہی قانون کی بنا پر حساب لگایا کہ یورے نس سے بھی زیادہ دور
ایک اور سیارہ ہونا چاہئے اور انھوں نے نہ صرف یہ ہی تبلایا بلکہ
اوس کی جسامت بُعد اور وزن سب کچھ تبلا دیا یہ واقعہ سنہ ۱۸۴۵ء
میں پیش آیا اور یہ پچھلی بھی نظام شمسی میں داخل ہوگیا اس واقعہ نے
نیوٹن اعظم کے قانون کو حق الیقین تک پہونچا دیا سنہ ۱۸۶۱ء میں
کرچاف اور بنسن نے سپکٹر اسکوپ یعنے آلہ منشور مثلثی کی مدد سے
ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی جس کی وساطت سے ہم زمین پر بیٹھے
اجرام سماوی کی ماہیت دریافت کرسکتے ہیں۔ ہیلیم کا وجود پہلے
آفتاب میں ثابت ہوا اس کے بعد زمین پر بھی اس کا وجود ثابت
کیا گیا اور یہ ہی وجہ ہے کہ اس کا نام آفتاب کے نام پر رکھا گیا

علم طبقات الارض کی ابتدا علم ہیئت سے بہت عرصہ کے
بعد ہوی اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ طبقات زمین
کی تبدیلیاں نمایاں اور دلنشیں نہیں تھیں۔ اور بہ مقابلہ اور
علوم کے پیچیدہ بھی تھیں اسی وجہ سے انسانی اعتنا سے بھی بچی
رہیں علاوہ اس کے علمائے مذہبی کی مخالفت اور منازعت نے
بھی اس کی ترقی میں بہت خامی ڈالی نیوٹن کے مخالفین کو جس
سے یہ شکایت تھی کہ ایک اچھے خاصے دیوتا کی بجائے اس نے
ایک پُر حماقت قانون بنایا ہے لیکن اس علم کے محققین کو بڑی
آفت کا سامنا تھا ہر طرف سے الزام لگایا جاتا تھا کہ بائبل
کے قصے کے خلاف کیوں کہتے ہیں ایک آسمانی کتاب جھوٹی
نہیں ہوسکتی۔ لیکن بغیر اس کے کہ علم طبیعات اور کیمیا میں
ترقی ہو عرصہ دراز تک علم طبقات الارض کسی باقاعدہ اور
با ترتیب علم کی شکل میں نہیں آسکتا تھا سنہ ۱۷۸۰ء میں جوزف
بلیک نے لیٹنٹ ہیٹ یا حرارت باطنی کو معلوم کیا اور سنہ ۱۸۳۰ء
میں لائل کی تحقیقاتوں کے سبب علم طبقات الارض باقاعدہ
طور پر مدون کیا گیا اس ہی زمانہ میں گیٹے[1] علم تشریح میں تحقیقات
کر رہا تھا اس کے بعد ڈارون نے جو لائل کے قدم بقدم
چلا مسئلہ ارتقا پیش کیا۔ اس مسئلہ میں اس نے بتایا کہ حیوانات
و نباتات کی مختلف قسمیں کس طرح رفتہ رفتہ پیدا ہوگئیں اور ان
دونوں میں آپس میں کیا تعلقات ہیں۔

---

[1] گیٹے (Goethe) جرمنی کا شہرۂ آفاق شاعر ہے اور زمانۂ
حال کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں علوم طبیعیات نے بھی بہت تیز ترقی کی اٹھارویں صدی کے آخر تک روشنی کو مادی چیز سمجھا جاتا تھا اگرچہ ہیوجنس نے اس خیال کی تردید ۱۶۹۰ء میں ہی کی تھی لیکن نیوٹن سے عالی دماغ کے مقابلہ میں اسکی ایک نہ چلی آخرکار انیسویں صدی کے شروع میں فرنیزل اور ٹامس ینگ اس غلط نظریہ کی مخالفت کو کھڑے ہوے اور نہایت استقلال کے ساتھ ثابت کر دیا کہ روشنی کوئی مادی چیز نہیں ہے اسی زمانہ میں کاونٹ بمفرڈ اپنی مسلسل تحقیقاتیں کر رہا تھا جنکا کہ بہت مفید اور مبارک نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر جول نے گزشتہ صدی کے وسط میں بتایا کہ جو کام ہم کرتے ہیں اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے کام ہو سکتا ہے اور حرارت اور کام کی مقدار میں ایک خاص تناسب ہے اس سائنس داں نے اس نسبت کو بھی ٹھیک ٹھیک معلوم کیا اس محسن کا ہم جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہوگا۔ اس نے علم طبیعیات کے سب سے زیادہ اہم نظریہ کو ثابت کر دیا یعنے کہ اینرجی یا قوت ضایع نہیں ہو سکتی بلکہ صرف ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جاتی ہے[1] اسٹیڈ نے ۱۸۲۰ء میں ثابت کیا کہ قوت برقی اور مقناطیس میں خاص مناسبت ہے اور اس ہی اصول پر فیرڈے نے معلوم کر لیا کہ برقی رو کے ذریعہ سے لوہے میں مقناطیسی قوت آسکتی ہے میکسویل نے اس حیرت انگیز طاقت کے ساتھ علم النور کا تعلق معلوم کیا لیکن سب سے عجیب ترین معجزہ بے تار کی خبر رسانی ہے جسکو کہ مارکونی نے ایجاد کیا۔ آخر میں یہ ثابت کیا گیا کہ روشنی حرارت قوت کہربایہ یا برق وغیرہ سب ایک ہی چیز کی مختلف شکلیں ہیں جس کا نام اینرجی یا قوت ہے اور یہ اینرجی کبھی ضایع نہیں ہوتی اور زیادہ علوم پر بحث کرنے سے ہمارا مضمون ضرورت سے زیادہ طول طویل ہو جایگا اور ہمارے مقصد کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ ہمارا مطلب اس مضمون کے لکھنے سے صرف سائنس کی ترقی کا زمانہ سلف سے آج تک کا خاکہ کھینچنا ہے۔

سائنس کی اس مختصر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کس طرح آہستہ آہستہ ترقی کرکے درجہ کمال پر پہونچ گئی ہے بیسویں صدی کی ابتدا اور انیسویں صدی کے کارنامے سب سے زیادہ حیرت انگیز ہیں اس کی وجہہ یہ نہیں ہے کہ متقدمین میں عقل وجودت کا مادہ کچھ کم تھا بلکہ دنیا کسی زمانہ اور کسی وقت میں بڑے بڑے عالی دماغ اور جید عقل کے لوگوں سے خالی نہیں رہی ہے صرف فرق اتنا ہے کہ کسی چیز کا ایجاد کرنا اس کے مکمل کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے دوسرے قدیم زمانہ کے لوگ مذہبی قید میں مبتلا آزادی کی خوبیوں سے کم واقف تھے وہ لکیر کے فقیر کسی نئی بات کو پرانی پر ترجیح نہیں دیتے تھے تیسرے حقیقت معلوم کرنے کے لئے انھوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ عملی کارروائی کم کی خیالی گھوڑے زیادہ دوڑائے زمین کی بات آسمان سے معلوم کرنا شروع کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ انکی محنت ومشقت وجودت طبع زیادہ تر رایگاں ہو گئی برخلاف ان سب باتوں کے اس زمانہ میں خلق نے آزادی کا سبق پڑھا تحقیقات اور انکشافات کرنے کا مناسب طریقہ اختیار کیا اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہوے ہیں لیکن اس حالت پر بھی یقین کے ساتھ

---

[1] یہی نظریہ عدم فنائے قوت یا نظریہ بقائے قوت ہے موجودہ علوم طبیعیات اسی نظریہ پر مبنی ہیں اس اجمال کی تفصیل ایک مستقل عنوان کی محتاج ہے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ سائنس کا میدان اس کے مخالفین سے خالی ہوگیا ہے ایسے آدمیوں کی ابھی کمی نہیں ہے جو تجربات سے کم کام لیتے ہیں اور غلط نظریہ محض خیالی نتیجوں کے بھروسے پر بنا دیتے ہیں ابھی تک زمین کے گول ہونے کا خیال صرف شائستہ اور اور تعلیم یافتہ اصحاب پر محدود ہے اور ان جھوٹے مدعیان سائنس کی بھی کمی نہیں ہے جنہیں جوہر کم اور ملمع سازی زیادہ ہے لیکن باوجود ان تمام سدراہوں کے ہمیں امید ہے کہ سائنس کی بڑھتی موج ان سے نہ رکیگی بلکہ روزافزوں ترقی ہوگی حتیٰ کہ سائنس دنیا کو ہر چہار طرف سے محیط کر لیگی۔

فیروزالدین مراد

حُسن

در ازل پرتو حسنت ز تجلے دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد

پانی میں بھی سردی ہے اور برف بھی سرد ہے۔ کاسنی میں بھی سردی ہے اور مہندی (حنا) بھی سرد ہے اگرچہ بنسبت برودت کے اعتبار سے ان تمام اشیار متذکرہ میں ایک ہی وحدت پائی جاتی ہے لیکن عمل یا کیفیت برودت کے اعتبار سے ان سب میں فرق یا امتیاز خاص ہے پانی کی سردی کچھ اور کیفیت رکھتی ہے۔ برف کی ٹھنڈک کچھ اور ہو برودت حنا میں اور بات ہے تو کاسنی کی سردی میں اور کچھ۔ اگر کوئی شخص صرف حنا کی سردی پر سب سردیوں کا خاتمہ کردے تو وہ اشیاے باردہ کی کیفیتوں سے قریباً نا آشنا رہیگا اور اُسے بوجہ اس فریب نابلدیت کے دوسری برودتوں کی نسبت غور کرنے کا موقع ہرگز نہیں ملیگا نہ کسی حالت میں اُن نادر کیفیات سے واقف ہوسکیگا جو دیگر اجسام یا اشیار باردہ میں موجود ہیں۔

اسی طرح وہ شخص جو صرف آگ کی حرارت سے ہی واقف ہے دیگر اجسام یا اشیاے حارہ کی حرارت سے کیونکر واقف ہوسکتا ہے یا اُسے کیسے یقین ہوسکتا ہے کہ حرکت یا رگڑ سے بھی حرارت پیدا ہوسکتی ہے۔ ورنہ اصل حرارت کی کیفیت ایسی ہے کہ جب دو جسموں کی رگڑ سے آگ پیدا ہوگی تو وہ بہت مشکل سے یہ یقین کریگا کہ حرکت یا رگڑ سے بھی آگ پیدا ہوجایا کرتی ہے۔

یہ علمی نقص اکثر مرتبہ انکشاف حقایق سے لوگوں کو باز رکھتا ہے جس سے لوگوں کو عمر بھر ترقی حاصل نہیں ہوتی جب ہم ایک محدود عمل پر اپنی معلومات کا خاتمہ کردیتے ہیں اور اپنی گرد و پیش کے اشیا کا معائنہ اور مشاہدہ نہیں کرسکتے تو معلوم ہوا کہ ہم بالکل محدود حالت میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے وہ باتیں اور حقیقتیں جو زیادہ تر مفید ہوتی ہیں ہمارے حیطۂ عمل سے بہت دور جا پڑتی ہیں اور ہم بالکل اس کنوئیں کے

منڈک کی طرح ہو جاتے ہیں جو ساری دنیا کو اپنے مسکن چاہ
کے دائرے کے برابر سمجھتا ہے۔ علمی ترقیات میں محدود خیالی
ایک ایسی بری رکاوٹ ہے جس سے اوس کا دائرہ دن بدن
تنگ اور تاریک ہو جاتا ہے جس گروہ میں یہ تنگ خیالی رفتہ
رفتہ پیدا ہو جاتی ہے وہ کیا امید ترقی کر سکتا ہے؟

اے در طلب کمال سرگرم شتاب
در صورت کس مبین و معنی دریاب

خوبصورتی اور بدصورتی کے بارہ میں بھی بعض افراد کے خیالات
اور معلومات بالکل محدود پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علمی
دائرے میں اگر یہ رنگ اور محدود ہو جاتا ہے عوام ہی پر منحصر نہیں
بلکہ خاص لوگ بھی اسی قدر جانتے ہیں جو بالکل ابتدائی مرحلہ
کہا جا سکتا ہے اکثر لوگوں نے خوبصورتی اور بدصورتی کو صرف
انسانوں کے نقوش اور خوشنما رنگ یا سڈول موزوں اعضا
پر منحصر کیا ہے حالانکہ حسن یا خوبصورتی اس قدر محدود نہیں ہے
بعض خیالات ایسے موید ہیں کہ محبت، دلچسپی، کشش، نفرت، کراہت
صرف اس خوبصورتی یا بدصورتی سے تعلق رکھتی ہے جو بولتی
چالتی یا جاندار مخلوق ہو اور عشق صرف اس شئے سے ہو سکتا
ہے جو ذی روح ہو یہ محدود خیالی اس وجہ سے ہے کہ اکثر لوگ
خوبصورتی کے مفہوم واقعی سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اس کی
نسبت جو کچھ جانتے بھی ہیں تو صرف اسمی طور پر۔ علمی رنگ
میں انھیں کبھی غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مسٹر جان کیٹس
یورپین شاعر اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے کہ خوبصورتی
ہمیشہ کے واسطے ایک فرحت بخش شئے یا سماں ہے اس تعریف
سے پایا جاتا ہے کہ خوبصورتی بذاتہ ایک وجود یا ایک ہستی
رکھتی ہے اگرچہ یہ وجود یا ہستی ایسی نہیں ہے جسکو کوئی
گرفت کر سکے ہاں وہ قوت نظری یا قوت سماعی سے مختص ہے
جو اسی کے لئے ودیعت کی گئی ہے اور جو ہر ایک کے پاس
موجود ہے اس وجود یا ہستی کا ایک سماں ہے جس کا لطیف
مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ خوبصورتی ایک
کیفیت ہے جو کسی نہ کسی شئے وجود یا ہستی سے وابستہ ہوتی
ہے یا اس سے پیدا ہوتی ہے۔ شئے وجود اور اس کے سماں کیفیت
میں فرق ہے جیسے گلاب، گل گلاب، کیفیت گلاب میں فرق
ہے گل گلاب میں ایک ایسی کیفیت یا ایک دلچسپ سماں پایا
جاتا ہے جو گلاب سے عارض ہوتا ہے ہمیں گلاب اپنے طرف
نہیں کھینچتا بلکہ اسکی وہ کیفیت اور وہ سماں جو اس طرح رنگ
و بو پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سماں اڑ جاتا ہے تو گل
گلاب میں وہ کیفیت ہی باقی نہیں رہتی نہ وہ کشش ہوتی ہے
نہ وہ جذبہ جب کبھی لوگ کہتے ہیں کہ فلاں چیز میں وہ آب ہی
نہیں رہی تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے
کہ اس میں وہ سماں باقی نہیں رہا یا وہ لطافت و نفاست
اوڑ گئی اور اب نرا ڈھانچ ہی ڈھانچ باقی رہ گیا ہے اس لحاظ
سے خوبصورتی یا حسن کے واسطے بہ مقابلہ لفظ شئے کے لفظ سماں
یا کیفیت کا اطلاق کیا جانا زیادہ تر موزوں معلوم ہوتا ہے
اس صورت میں یوں کہا جائیگا کہ خوبصورتی ایک ایسی کیفیت
یا سماں ہے جو اشیا میں پایا جاتا ہے یا اشیا کے رنگ ہائے
گوناگوں میں محسوس ہوتا ہے یا ایک ایسی کیفیت ہے جو ذہنی
یا وجدانی طریقہ سے محسوس ہوتی ہے۔ دنیا میں جس قدر اشیا ہیں
جس قدر وجود، اور جس قدر ہستیاں پائی جاتی ہیں خواہ
وہ وجودیہ ہوں خواہ وجدانی کچھ نہ کچھ کیفیت اور سماں ضرور
رکھتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ کیفیت یا وہ سماں خوبصورت ہو

ہو یا بدصورت برا ہو یا بھلا، کامل ہو یا ناقص، مفید ہو یا مضر
جامع ہو یا غیر جامع، لازمی ہو یا عارضی، بہرحال کچھ کیوں نہ ہو
کیفیت سے خالی نہیں۔ جو اشیا ہماری نظر سے دور ہو جاتے
ہیں اون کا احساس صرف ذہن اور حافظہ ہی کرتا ہے اور اس
وقت ہم یہ کہنے کے مجاز ہوتے ہیں کہ فلاں شئے ہمارے ذہن میں ہے
یا فلاں شئے وجدانی رنگ میں ہمارے سامنے ہے حالانکہ اس وقت
درحقیقت کوئی شئے ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی ہاں پیش ذہن
یا پیش وجدان ضرور ہوتی ہے اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں
تو ہم اس کے اظہار سے بھی قاصر ہیں ہم جب کسی قسم کی خوشی
محسوس کرتے ہیں تو اس وقت کون سی شئے ہمارے پیش نظر ہوتی
ہے کوئی نہیں حالانکہ خوشی سے ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی
کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم ایک یقینی کیفیت اپنی ذات میں
پاتے ہیں یہی حال ذہنی یا وجدانی کیفیتوں کا ہے جن پر ہم
خوبصورتی یا بدصورتی کا اطلاق کرنے کے عادی ہیں۔

ہم اکثر مرتبہ کہتے ہیں کہ کیا عمدہ شعر ہے، یا کیسا اچھا فقرہ
ہے، یا کیا خوب استدلال ہے، یا کیا خوبصورت خیال ہے،
یا کیا خوبصورت "لازمہ" ہے، یا اسی کے برعکس بدصورت کہہ لیجیے
کیا ان صورتوں کے آنکھ کان ناک ہاتھ پاؤں ہیں۔ یا
ان کا کوئی مجسمہ ہے جسکو سیدھا ٹیڑھا یا سڈول کہہ سکتے ہیں۔
یا ان سب صورتوں اور ان تصرفات میں کون سی ایسی شئے
پیش نظر ہوتی ہے جس کا کوئی وجود ہو۔ یہ سب خیالی نقشے
ہوتے ہیں لیکن ان پر ایسا یقین واثق ہوتا ہے کہ ان سے انکار
کرنا گویا کسی ایسے وجود یا ایسی شئے سے انکار کرنا ہے جو شکل
بہ شکل خاص ہمارے احساس میں آچکی ہو۔

جب ہمارے تصرفات کی یہ حالت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ
ہم ذہنیات یا وجدانیات پر شئے وجود یا ہستی کا اطلاق نہ کر سکیں
یہ عقل۔ نور ضمیر جنکی نسبت بڑی بڑی بحثیں ہوتی ہیں اور جن پر
بہت کچھ دنیا و مافیہا اور معاش و معاد کا انحصار ہے کیا دنیا میں
کوئی ان کا وجود بھی ہے قدرت کے کھیل دیکھو کہ کل کا بچہ بھی
عقل کا دعویٰ کرتا ہے جو ایک حد تک صحیح ہے اس لئے کہ
وہی جوہر عقلی جو ہمارے پاس ہے وہی اس میں بھی موجود ہے
گرحسب مدارج ہر شخص اپنی ہی عقل کی تعریف کرتا ہے اگر سارے
جسم اور قالب کو ٹٹول ڈالو تو کہیں بھی عقل ہاتھ نہیں آسکتی
ایک شخص زبان رکھتا ہو مگر منہ سے بات نہ کرے تو سوائے
اس کے چارہ نہیں کہ قیافہ سے چند اٹکل پچو کلیے قایم کر لیے جائیں
جیسا کہ ہم کو اکثر گونگوں سے سابقہ پڑتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ
اس میں عقل ہے یا نہیں ہم ایسے شخص کی نسبت یہ کہنے کے مجاز
نہیں ہوتے کہ وہ بے عقل یا جاہل ہے جب تک وہ اپنی قوت
بیانیہ سے کام نہ لے کیا ہم کوئی دھواں ایسے شخص کے منہ سے
نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کچھ نہیں۔ صرف چند الفاظ ہی سنتے
ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں یہ استدلال کیا ہے؟
ذہنی اور وجدانی۔ فرض کیجیے جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ
فلاں شخص بڑا دانا بڑا عقیل اور بڑا فہیم ہے تو کیا اسکے
کندھوں پر یا جسم کے کسی حصہ پر نشان دانائی یا نشان فراست
وغیرہ کندہ ہوتا ہے کچھ بھی نہیں صرف چند تصرفات کی
وجہ سے ذہن اور وجدان میں ایک خاص کیفیت مستقل
ہو جاتی ہے جس پر دانائی عقل یا فراست کا اطلاق کیا جاتا
ہے اور یہ ایک ایسا بار عظیم ہے کہ اسی پر سب کچھ انحصار ہے [illegible]

(۱) خوبصورتی کیا ہے۔

(۲) خوبصورتی سے کیا مراد ہے۔

(۳) اس کی وسعت کہاں تک ہے۔

خوبصورتی کی تعریفیں بہت کچھ مختلف ہیں یہ اختلاف
کچھ تو بہ اعتبار مذاق، خیالات، مفاد، تصرفات، مسلمات،
رواج ہوتا ہے اور کچھ بہ اعتبار عادات وغیرہ

خوبصورتی یا حسن کی جس قدر کم و بیش تعریفیں کی گئی
ہیں ان کی مختصر سی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) خوبصورتی یا حسن ایک ایسی چیز ہے جو بہ اعتبار خوبی
دیکھنے والے کے دل و دماغ پر نرالے رنگ میں موثر ہو سکتی ہو

(۲) وہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بہ اعتبار دلچسپی ایک
جذبہ اور ایک کشش ہو

(۳) وہ ایک ایسی کیفیت یا سماں ہے جو بوجہ تناسب
زیبائی و رعنائی اپنی ذات میں ایک کشش یا ایک اثر رکھتی ہو۔

(۴) ایک ایسی کیفیت جو بہ مقابلہ اپنے نقصوں کے
اپنے خوبیوں کا اعلان پہلے کرتی ہو۔

(۵) ایک ایسا سماں یا ایک ایسی کیفیت جسکی تائید میں باعتبار
تعریف عامہ عام رائے پائی جائے۔

(۶) ایک ایسا سماں یا ایک ایسی کیفیت جو ایک بدصورت
شئے میں نہ پائی جائے۔

(۷) خوبصورتی یا حسن ایک ایسے سماں یا ایک ایسی
دلچسپ کیفیت کا نام ہے جس کو دل شاید ہی جان سکتا ہو

(۸) خوبصورت اصل میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی صرف
ایک مذاقی انتخاب ہے ؎

شمس و قمر سے روشنی دہر میں ہو ہوا کرے
مجھکو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

یا بقول حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام — بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(۹) خوبصورتی ایک وہم یا تصور محض ہے۔

(۱۰) خوبصورتی یا حسن ایک تخیل دماغی ہے۔

(۱۱) خوبصورتی یا حسن اپنی اپنی پسند ہے گو ایک دوسرے
کے مذاق میں کسی پہلو سے مطابقت پائی جاتی ہو لیکن یہ
نہیں کہا جا سکتا کہ تمام مذاق آپس میں ایک ہی قاعدے
یا ایک ہی جذبے کے پابند ہوتے ہیں۔ بقول ؎

حور جنت سے اگر آئیں تو یہ ناز کہاں
ہم جس انداز کے مارے ہیں وہ انداز کہاں

مذاق ایک ایسی طاقت یا ایک ایسی عادت ہے جو اکثر
اپنا ہی پہلو غالب رکھتی ہے چونکہ اسی طاقت یا اس جذبے
میں باہمی اختلاف ہوتا ہے اس واسطے معیار حسن یا معیار
خوبصورتی میں بھی اختلاف ہونا لازمی ہے بیشک بہت سی
اشیا ایسی بھی ہیں جنھیں لوگ ایک ہی پیمانہ پر خوبصورت تسلیم
کرتے ہیں۔ مگر کسی خوبصورت شے کے چاہنے میں بھی بہ سبب
اختلاف طبایع ہمیشہ ایک نوع کا فرق رہتا ہے مثلاً بہتیرے
لوگ گل گلاب یا عطر گلاب کی نفاست لطافت اور خوبی
کے دلدادہ ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال ان کے مذاق یا
طبیعت کے خلاف ہوتا ہے بہت سے لوگ گیس کی روشنی کو
پسند کرتے ہیں اور بہت سے لوگ کڑوے تیل کی قدیم روشنی
کو اچھا جانتے ہیں آخر الذکر اشخاص کا خیال ہے کہ گیس کی
روشنی اگرچہ تیز اور شفاف ہے لیکن اس میں آنکھیں چندھیا
جاتی ہیں جب کسی مذاق یا کسی رنگ کی خوبصورتی کا معیار
معرض بحث میں آجاتا ہے تو اس بارے میں ہمیشہ لوگوں کی
رائیں مختلف ہو جاتی ہیں اسی طرح مفاد، تصرفات، خیالات،

اور عادات کے اعتبار سے بھی خوبصورتی کے معیار میں فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک شخص ہمیشہ وہی چیز خوبصورت سمجھتا ہے جو اس کو پسند ہوتی ہے حالانکہ اگر بہ اعتبار حقیقت الامر دریافت کیا جائے تو یہ معیار معیار عادی ہوتا ہے نہ معیار کلی۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ عادت انتخاب اشیاء میں بڑی کارکن ثابت ہوئی ہے۔ اگر ہم پہلے پہل ایک حبشی جماعت میں شامل ہوں تو اس میں شک نہیں کہ سب حبشی بدصورت ہی معلوم ہوں گے لیکن رفتہ رفتہ انھیں میں سے ہم بھی اچھے حبشی انتخاب کرنے لگیں گے اور پھر ہماری نقادانہ نگاہوں میں ان میں سے بھی چند حبشی یقیناً خوبصورت ثابت ہونگے یہ بتانا مشکل ہے کہ ہماری نقادانہ نگاہ نے اس بدصورتی میں کونسی خوبصورتی یا کونسا حسن دیکھا ہے یہ ایک ایسی رائے ہے جس کی کوئی کلیہ قایم نہیں ہوسکتا۔ وسعت خوبصورتی کی بابت مختلف رائیں ہیں۔ بعض کے خیال میں خوبصورتی اپنے دائرے میں محدود ہے وہی ان کی وسعت اور وہی ان کی حدیں ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ ہر شئے میں خوبصورتی اور بدصورتی پائی جاتی ہے یہ وصف گویا اضافی ہے ایک جہت سے اگر شئے خوبصورت ہے تو دوسری جہت سے وہی شئے بدصورت بھی ہے بعض چیزیں دیکھنے میں اچھی اور استعمال میں بری ثابت ہوتی ہیں بعض کی رائے میں خوبصورتی یا بدصورتی صرف ناظر یا مبصر کے مذاق کے مطابق ہوتی ہے۔

ایک صوفی منش حکیم کہا کرتا تھا کہ دنیا کے ہر منظر میں خوبصورتی ہے لیکن چشم بینا چاہیے واقعی اگر حقیقت بیں نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت آشنا کی نظر میں کوئی ایسی خلقت نہیں جس میں عجائبات قدرت کا جلوہ نہ ہو ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے حالانکہ صرف۔ برگ درختان سبز۔ کے فقرے سے شعر کے معنے کو محدود کر دیا ہے اسی فقرے کے بجائے جس چیز کو متصف کیا جائے موزوں ہوتا چلا جائیگا۔ ایسی کوئی چیز نہیں جس میں حسن خلقت کی جھلک موجود نہ ہو کہیں مناظر قدرت ہمیشہ خوشنما نظر نہیں آتے تو وہ یا تو ہمارے مذاق کا قصور ہے یا قصور نظر

دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

(۱) وہ جو ہمیشہ اشیاء اور مناظر کے نقص ہی دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

(۲) وہ جنکی نگاہیں ہمیشہ خوبیوں کو ہی دیکھتی ہیں جو لوگ عیب شناس یا عیب بیں ہوتے ہیں ان کی نگاہوں میں خوبصورتی اور کیفیت حسن جچتی ہی نہیں جو لوگ حقیقت آشنا اور محاسن پرست ہیں وہ ہر رنگ ہر آن اور ہر شان میں رخ صواب ہی دیکھتے ہیں ؎

بہر سو جلوۂ دلدار دیدم — بہر چیزے جمال یار دیدم
ندیدم ہیچ شئے را خالی از وے — پر از وے کوچہ و بازار دیدم

اس بحث کے متعلق حکماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خوبصورتی بہ اعتبار تاثیر دو قسم کی ہے (الف) صنعتی خوبصورتی (ب) تناسبی خوبصورتی۔ اول الذکر کے اعتبار سے کوئی شے ایسی خیال میں نہیں آسکتی جس میں بہ اعتبار ساخت کوئی نہ کوئی خوبی، حسن یا خوبصورتی نہ ہو۔ ایک بدصورت سے بدصورت جانور۔ یا ایک خراب سے خراب پودہ یا پھول کو لیکر دیکھو اس میں بھی قدرت نے ایسی خلقی خوبیاں رکھی ہیں اور اسکی

ترکیب ایسی نفیس اور موزوں ہوتی ہے کہ عقل و فراست دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک نکتہ رس یا نکتہ چیں حکیم بھی ایسی صنعتی خوبیوں کا احصاء نہیں کرسکیگا اس اعتبار سے کوئی شئے دنیا میں بدصورت نہیں ہے البتہ قسم آخرالذکر صرف چند اعتبارات سے معرض بحث میں آتی ہے جیسے بہ اعتبار تناسب اعضا، تناسب نقوش، تناسب وضع، تناسب بُو تناسب ذائقہ، تناسب اثر، وغیرہم اِن تمام تناسبات کی جہت سے مختلف اشیا میں خوبصورتی کا تماشا ہوتا ہے۔

جس تناسب سے کسی کا مذاق نسبت رکھتا ہے یا نسبت دیا جاتا ہے وہی تناسب اس کے واسطے بجائے خود ایک معیار حسن یا معیار خوبصورتی ہو جاتا ہے جب انسان موجودات کے بعض اجزائے یا بعض اشیا کی جانب دیکھتا یا کسی منظر کا ذہنی تحریکات سے معائنہ کرتا ہے تو اس وقت اس کے دل میں پسندیدگی کی لہریں اٹھتی ہیں اور یہی لہریں تاثیرات حسن یا تاثیرات خوبصورتی کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ ایسی تاثیرات یا ایسا مذاق خوبصورتی ہی سے خاص نہیں ہوتا۔ بلکہ بدصورتی سے بھی ایسی تاثیرات وابستہ ہوتی ہیں اس مسئلہ پر دو شقیں اور زیر بحث آجاتی ہیں (۱) تاثیرات متعلق بہ حُسن (۲) تاثیرات خوش آیند۔ بعض نے کہا ہے کہ مراحل یا تصرفات یا تاثیرات خوش آیند میں کوئی فرق نہیں ہے جو خوش آیند کیفیات یا نمونے ہوتے ہیں وہی تعلقات تاثیرات حسن سے بھی وابستہ ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں سلسلۂ مراحل خوش آیند میں تاثیرات حسن نہیں لائی جاسکتی صرف اس خیال سے یہ دقت بہ تفریق پیش آتی ہے کہ جتنی خوش آیند اشیا یا خوش آیند سماں ہیں ان سب کی قیمت اعتباری ہے یا اضافی اور حُسن یا خوبصورتی کی حقیقت محض حسن ہی نہیں ہوتی اور اس کیفیت کے اظہار کے واسطے لفظ خوش آیند کافی نہیں سمجھا جاتا۔ ایک دردناک آواز سے بعض لوگوں کے دلوں پر جو اثر ہوتا ہے اور اس اثر سے اُن کے دماغ میں جو لہریں اٹھتی ہیں ان کا اعلان صرف لفظ خوش آیند نہیں کرسکتا۔

ہم ایک اچھی کتاب کے پڑھنے سے جو ایک خاص کیفیت پاتے ہیں اس کے اظہار کے لئے ہمیں اکثر اوقات مناسب لفظ نہیں ملتے یا بعض اوقات ایک شعر کے پڑھنے سے ایک ایسی بےخود کرنے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم اس کے بیان کرنے سے عاجز ہوتے ہیں حالانکہ اس شعر کی تڑپا دینے والی کیفیت کو ہمارے صبر کے موافق ہمارا دل محسوس کرتا ہے مگر وہ کیفیت جس کے بیان کرنے کو ہمارا دل بہت چاہتا ہے معرض بحث میں بہ مشکل آسکتی ہے مگر چپ بھی نہیں رہا جاتا۔ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل۔

صبر - دہلوی

قومی اِعتبار

اگر تم قومی اعتبار کی ڈگری لینا چاہتے ہو تو حضرت اقبال کی مثنوی اسرار خودی پڑھو۔ سیرت یا کیریکٹر کا ایک بڑا حصہ یا بڑا عنصر اعتبار بھی ہے جس سیرت یا جس کیریکٹر میں اعتبار نہیں ہوتا وہ سیرت یا کیریکٹر صحیح معنوں میں سیرت

اور کیرکٹر نہیں سیرت اور کیرکٹر وہی ہے جو اعتبار رکھتا ہو
اگر ایک طرف سیرت اور کیرکٹر نظام دنیوی کے واسطے ایک
جزاعظم ہے تو دوسری جانب اعتبار بھی ایک عنصر غالب ہو
اگر ایک طرف قومی ترقی اور قومی عروج کی بنیاد فارغ البالی
علوم وفنون اور اقتصادیات ہیں تو دوسری طرف اعتبار ہو
تمام تمدنیات اور سوشیل نظام کا انحصار قومی اعتبار پر ہے۔

قومیں بہ مقابلہ دوسری قوموں کے ایک شخصیت کی حیثیت رکھتی
ہیں جس قوم کا دوسری قوم کے مقابلہ میں اعتبار نہیں ہوتا۔
وہ قوم مقابلتاً کوئی امتیاز اور کوئی نسبت نہیں رکھتی جس طرح
ایک شخصیت دوسری شخصیت کے مقابلہ میں بے اعتباری کی
صورت میں ہمیشہ ذلیل اور خوار رہتی ہے اسی طرح ایک قوم
دوسری قوم کے مقابلہ میں اعتباری حالت میں کم زور ہونے
کی صورت میں ذلیل اور خوار رہتی ہے۔

جو قومیں اور جو شخصیتیں حس رکھتی ہیں وہ بھانپ جاتی
ہیں کہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ان کی اعتباری حالت کا
وزن اور پیمانہ کیا ہے جو قومیں اور جو شخصیتیں ایسی حس
نہیں رکھتی ہیں انھیں مدتوں تک یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کی اعتباری
حالت اور اعتباری عنصر کا وزن اور پیمانہ کیا ہے ایسی ہی
قومیں ہیں جنھیں مردہ اور مسلوب الحس کہا جاتا ہے اور جنکا
دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کوئی عزت اور کوئی احترام
نہیں ہوتا۔

یہ نہیں کہ دوسری قومیں اور دوسری شخصیتیں ہی ان کا
اعتبار نہیں کرتیں بلکہ خود انھیں بھی اپنا اعتبار نہیں ہوتا یا وُہ
اپنے اعتباری عنصر پر بھروسہ کرنا جانتے نہیں یا نہیں کرسکتے
جب قومی اعتبار کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو اوس وقت
ایک فرد دوسرے پر اور ایک شخصیت دوسرے پر نہ تو اعتبار
کرسکتی ہے اور نہ سیرت یا کریکٹر اعتباری عنصر سے کوئی نسبت
رکھتا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آجاتی ہو کہ اسی قوم میں اعتبار کی
کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہتی۔ عوام الناس کیا خواص بھی
اعتبار کی عظمت اور ضرورت سے بے خبر اور بے حس ہوجاتے
ہیں۔ تجارت۔ بیوپار۔ اقتصادیات۔ معاملات میں اکثر حصہ
یا عنصر غالب بے اعتباری کا رہ جاتا ہے۔

زید بکر پر اعتبار نہیں کرتا اور بکر زید کو بے اعتبار سمجھتا
ہو جب کوئی قوم بدقسمتی سے اس مرحلہ پر پہونچ جاتی ہے تو
اس کی عزت واحترام ذلت وادبار سے بدل جاتا ہو اور اس
کا اعتبار بے اعتباری اور شکوک سے دوسری قومیں اوس کے
ہر فعل اور ہر عمل میں شک کرتی ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض افعال
اور بعض اعمال راستی بھی رکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کا اعتبار
اٹھ چکا ہوتا ہے اس واسطے ان کی صداقتیں بھی پایۂ صداقت
سے گرجاتی ہیں۔ اگرچہ جھوٹ اور بے اعتباری سے کوئی قوم
خالی نہیں اور ہر قوم میں کمزوریاں ہیں۔ لیکن قومی اعتبار
کا کسی قوم میں قومی اعتبار کی جہت سے پایا جانا باوجود اس کے
کہ اس قوم میں کمزوریاں بھی ہوں قومی اعتبار کی وقعت کم
نہیں کرتا۔ جس قوم کو قومی اعتبار کی ڈگری حاصل نہ ہو اوسکی
صداقتیں اور سچائیاں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتیں ایک بدنام
آدمی کی نیکیاں بھی بعض وقت برائیوں کے ساتھ ہی شمار
ہوتی ہیں قومی اعتبار ایک ایسا وزنہ ہے جس پر عملی پہلو سے
ایک مصدقہ یقینی مہر لگ چکی ہے باوجود اس کے کہ کبھی کبھی
اوس وزنہ سے بھی کم وزن ہوتا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس
مصدقہ وزنہ کی صداقت میں کوئی شک نہیں لایا جاسکتا

اور نہ اسے کم و بیش کیا جا سکتا ہے وہ وزن نہ ہمیشہ بازاری
کاروبار میں تسلیم کیا جاتا اور اسی کے مطابق داد و ستد ہوتی ہے
اس کے مقابلہ میں ایک کم وزن کرنے والی دوکان باوجود بعض
دفعہ پورا وزن کرنے کے بھی بدنام ہوتی ہے اور خریدار اس پر
اعتبار نہیں کرتے اگرچہ بعض دفعہ اس سے سودا بھی لے لیتے
ہیں ایک مشہور مقولہ ہے کہ

دانا اور دور اندیش دوکاندار ہے جو اپنا
اعتبار جمائے جس دوکاندار کا اعتبار جم جاتا ہے جس دوکاندار
کی راستی کی شہرت ہو جاتی ہے وہ باوجود غلط کاریوں کے
بھی تسلیم اور احترام کیا جاتا ہے اور لوگ اس پر اعتبار کرتے ہیں۔

عوام الناس اور خواص ہمیشہ شہرت کے دلدادہ ہیں شہرت
کے اندر بھی اگرچہ کمزوریاں اور غلطیاں ہوتی ہیں لیکن
میلان انسانی ہمیشہ اسی طرف جاتا ہے اور وہی ایک معیار
ہوتا ہے جب بری شہرت ہو جاتی ہے تو باوجود بعض اچھی
باتوں کے ہونے کے بھی لوگ اعتبار نہیں کرتے اور جب اچھی
شہرت ہو کر نام نکل جاتا ہے تو باوجود بعض کمزوریوں اور
برائیوں کے بھی لوگ اسے پایۂ اعتبار سے ساقط نہیں کرتے
بہ مصداق   چور بھلا بدنام برا

جو شخصیتیں جو قومیں بدنام ہو چکی ہیں ان پر نہ تو اندرونی اعتبار
ہوتا ہے اور نہ بیرونی نہ اپنے افراد اعتبار کرتے ہیں نہ باہر کی
قومیں بلکہ اندرونی رنگ میں ان کی سخت بے اعتباری ہوتی ہے
جو قوم اس درجہ تک بدنام اور بے اعتبار ہو چکی ہو وہ اپنی
حالت پر غور کرنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اندرونی
رنگ میں اس کے اعتبار اور وثوق کی کیا کچھ کیفیت ہے اس
بحث کے ختم کرنے کے لئے ہمیں ہندوستان کی قوموں کی
اعتباری حالت پر غور کرنے کا اچھا موقعہ ہے اگرچہ ہندوستان
میں بہ لحاظ مختلف مذاہب رکھنے کے مختلف قومیں ہیں لیکن ہم
ہندوستان میں رہنے کے اعتبار سے انھیں ایک ہی قوم کے
ماتحت لا کر دیکھتے ہیں کہ اس وقت انکی اعتباری حالت کیسی ہے۔

ہمیں صاف طور پر یہ کہنا چاہئے کہ
ہندوستان کی قوم یا قوموں میں قومی اعتبار یا تو بالکل
ہی نہیں رہا اور یا اس پر بہت کچھ بے اعتباری ہو چکی ہے
یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی حقیقت ہی سلب ہو چکی
ہے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ ہندوستان کی شخصیتیں اور قومیں
جانتی بھی نہیں کہ اعتبار کی ضرورت کہاں تک ہے اور اعتبار
کا عنصر قوموں کی عزت اور احترام کے لئے کہاں تک لازمی ہے
اور قومی اعتبار کی حیثیت سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں
اون کا مرتبہ کیا ہے اور انھیں کیا نسبت ہے نہ صرف دوسری
قوموں ہی کی نظروں اور مقابلہ میں بلکہ اپنی بھی نگاہوں اور
اپنے ہی مقابلہ میں۔

ہر اچھی اور بری کیفیت جیسے خود اپنے پر موثر ہوتی ہے
دوسروں پر نہیں ہوتی ایک بے اعتبار فرد یا بے اعتبار
شخصیت سب سے اول خود ہی اپنی بے اعتباری کا احساس
کرتی ہے مدت کے بعد دوسرے افراد کو اوس کا علم ہوتا ہے
خبیث طبیعت دیر کے بعد دوسروں پر کھلتی ہے اور ایک عرصہ
کے بعد دوسرے اوس سے آگاہ ہوتے ہیں۔

ایک فریب دہ طبیعت مدتوں دوسرے لوگوں کے
واسطے فریب دہ ہوتی ہے لیکن لوگوں پر اس کا رویہ اس
کا عمل ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے بہت سے لوگ سابقہ
اعتبار پر اعتبار کر کے ایسی فریب دہ طبیعت کی کارستانیوں

سے واقف نہیں ہو سکتے لیکن دوسروں کے مقابلہ میں ایا فیر ہر ایک
شخص خود اپنی چالاکیوں اور کارستانیوں سے واقف ہوتا ہے
جو اقعہ پر وہ اپنی چالاکی کو جانتا اور سمجھتا ہے آؤ ہم غور کرنے کے بعد کہیں کہ

ہمیں اپنے آپ پر کہاں تک اعتبار ہے۔

ہم ایک دوسرے پر کہاں تک اعتبار کرتے ہیں۔

ہمیں دوسری قومیں اعتباری رنگ میں کیسا سمجھتی ہیں۔

اور ہمارا اعتباری نمبر اور اعتباری نسبت کیا ہے۔

پہلے دو سوالوں کا یہ ایک کھلا کھلا جواب ہے کہ ہمیں اپنے
آپ پر کوئی اعتبار نہیں اور ہم ایک دوسرے پر بڑی حد
تک اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت خود ہمارے اعمال
ہی دے رہے ہیں۔ ہمارے معاملات میں اگرچہ اعتباری صورتیں
ہی خال خال موجود ہیں۔ لیکن اس میں شک کرنے کی گنجایش
نہیں رہی کہ ہم قومی اعتبار نہیں رکھتے ہیں کیونکہ ہم میں قومیت
کا احساس باقی نہیں رہا۔ غلطیاں اور فروگزاشتیں ہر قوم سے ہوتی
ہیں اور کمزوریوں سے کوئی قوم خالی نہیں لیکن جو قوم قومی اعتبار
سے خالی ہے جس قوم کا قومی اعتبار پایۂ اعتبار سے گر چکا ہے۔
اس کی کمزوریاں اور اس کی غلط کاریاں اور ہی رنگ رکھتی
ہیں۔ وہ ایسی قوم کی عمدگیوں۔ خوبیوں کو بھی کھا جاتی ہیں۔
ایک مشہور مقولہ ہے۔

نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔

لیکن جس قوم کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔ اوس قوم کے مقابلہ
میں یوں کہنا چاہیئے۔

برائیاں نیکوں کو کھا جاتی ہیں۔

جس عنصر یا جس خلط کا زور ہوتا ہے وہ دوسرے پر
غالب آتا ہے اور اس پر حکم لگایا جاتا ہے چونکہ ایک بے اعتبار
قوم کی غیر معتبری مسلّم ہوتی ہے اس واسطے اوس کی خوبیاں
عمدگیاں اور صداقتیں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتیں دیکھو جب
کسی ہندوستانی۔ پنجابی۔ مدراسی وغیرہ وغیرہ دکاندار سے کوئی
سودا لیتا ہے تو دوکاندار کے قیمت بتلانے کے ساتھ ہی خریدار
اس بات کے کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ قیمت صحیح نہیں کبھی اس کی
وجہ بھی سوچی۔ یہ خیال اور یہ شک فوراً ہی اس واسطے دل و
دماغ میں متوجہ ہوتا ہے کہ ہم کوئی قومی اعتبار نہیں رکھتے ہم نے
ہر ایک فرد کو فریب دہ خیال کرتے ہیں اگرچہ وہ قسم کھا کر بھی
کہے تب بھی ہمیں اعتبار نہیں آتا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا
چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتے۔

ذرا یورپ میں جا کر دیکھو۔

اگر کسی دوکاندار کی نسبت کوئی یہ کہے کہ تم نے جھوٹ کہا ہے
تو وہ ازالہ حیثیت عرفی سمجھے گا نہ دوکاندار ایسا گوارا کر سکتا ہے
اور نہ کسی خریدار کو ایسی جرات ہوتی ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے
پر اعتبار کرتے ہیں یہ قومی اعتبار کی وجہ سے ہے دونوں جانب
یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی قوم معتبر ہے اور اُن کے افراد قوم جھوٹ
نہیں بولتے اور نہ فریب دیتے ہیں۔

یہ نہیں کہ یورپ میں جھوٹ اور فریب نہیں جھوٹ اور
فریب تو ہے مکاری اور غداری سے یورپ کے بھی بعض افراد
خالی نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی قومی اعتبار کی وہ
دھاک پڑ چکی اور ایسا چوکھا رنگ آ چکا ہے کہ عملی رنگ میں
اس کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا ایک شخص جھوٹ بھی کہتا ہے تو
حتی الامکان اس پر یقین کرنے ہی کی کوشش کی جاتی ہے
اگر کسی خریدار کو کوئی کہے کہ دوکاندار نے تمھیں دھوکہ دیا ہے
تو وہ قومی اعتبار قومی احترام قومی ساکھ کی ضمانت پر ایسا

یقین کرنے کو بہت ہی مشکل سے تیار ہوگا اس کا پہلا جواب
یہہ ہوگا کہ

"ہماری قوم میں ایسا ہونا مشکل ہے۔

اگرچہ وہ دل میں جانتا بھی ہو کہ کچھ کسر ضرور ہے۔ گر
قومی اعتبار کی عزت و احترام کی خاطر فرد قوم کو جھوٹا ثابت
کرنے کی کوشش نہیں کریگا۔ انگلستان کی سرزمین میں قومی
اعتبار کی ساکھ اس قدر مضبوط اور وسیع ہے کہ دوسرے شخص
یورپ میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک مجسٹریٹ اور ایک
جج کے عدالت میں چند گواہ پیش ہوتے ہیں اور مجسٹریٹ یا جج
ان پر شروع ہی سے یقین کی توقع رکھتا ہے اس کے دل و دماغ
میں یہ مرتسم ہوتا ہے کہ اوس کی قوم میں جھوٹ بہت کم دخل
رکھتا ہے اور قوم کے افراد اس سے نفرت رکھتے ہیں وہ اس کے
ساتھ جانتا بھی ہے کہ اوس کی قوم اور اوس کے بعض قومی افراد
بھی کمزوریوں سے خالی نہیں ہیں لیکن دوسری طرف اوس کا
یہ خیال بھی ہے کہ قوم جھوٹ سے سخت نفرت بھی کرتی ہے اور
جھوٹے کو قوم کے لوگ عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے ہیں
کیا یہ خیال اور یہ بھروسہ ہندوستان کی سرزمین میں رہ کر
عدالتوں کو ہوسکتا ہے اور کیا ہم اس درجہ تک لوگوں پر
اعتبار اور بھروسہ کرسکتے ہیں۔ اور کیا ہم اس کوچہ میں
خود اپنی ہی نگاہوں میں ایک حد تک بے اعتبار اور ذلیل
نہیں ہیں۔

ایک شریف آدمی بھی جب کبھی کسی ریلوے اسٹیشن پر
یہہ کہتا ہے کہ اس کا ٹکٹ گم ہوگیا ہے یا کھو گیا ہے یا اوس نے
جلدی کی وجہہ سے لیا نہیں یا غلطی سے ایک دوسرے اسٹیشن
کا لیا گیا ہے تو کیا ہمارا تجربہ یہ شہادت دیگا کہ ایک
ٹکٹ ماسٹر یا ٹکٹ بابو ہندوستان میں رہ کر ان بیانات پر
آسانی اور کشادہ دلی سے یقین کرنے کو تیار ہوگا ہمیشہ ایسے
بیان کرنے والے پر شک کیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ
وہ جھوٹ بولتا یا خودغرضی سے فریب دیتا ہے ایک جانب
بابو یا ٹکٹ ماسٹر مسافر پر یہ شک و شبہہ کرتا ہے اور دوسری
طرف مسافر ٹکٹ ماسٹر کو ظالم اور جابر جانتا ہے یورپ میں
بھی بعض دفعہ اگرچہ اس قسم کے فریب اور چالاکیاں ہوتی
ہیں لیکن وہاں جانبین میں اس قدر بے یقینی نہیں ہوگی جب
ایک جنٹلمین ایسا بیان کریگا تو اوس کی شکل و شباہت
اور شرافت اوس کے بیان کی ضامن ہوگی اور لازمی ہے کہ
اس پر ٹکٹ بابو اعتبار کرے یہ کس بات کی دلیل ہے اوس
قومی اعتبار قومی احترام کی جو سرزمین انگلستان میں پایا جاتا ہے
اور جس کی ہر رنگ میں عزت کی جاتی ہے۔ وہ سرزمین کیسی
مبارک ہے جس میں قوم اور افراد قومی کا اعتبار اس درجہ
تک ہو جس کی ضمانت ایسی قوی اور ایسی زبردست ہو۔
جو کسی صورت میں بھی تحلیل نہ ہوسکے اور جس کا فیل ہونا قومی
نکبت اور قومی ذلت خیال کی جاتی ہو۔

ایک خریدار باوجود ناواقفیت اور ناشناسی کے ایک
روپیہ سے لیکر صدہا روپیہ تک کا مال دکاندار کو اس غرض
سے سپرد کردیتا ہے کہ اس کے مکان پر پہنچا دیا جائے دکاندار
پر اعتبار کرتا ہے اور اس اعتبار کی ضمانت سوائے اس کے
اور کچھ نہیں ہوتی ہے کہ وہ قومی اعتبار پر آخیر تک اعتبار کرنے
کو تیار ہوتا ہے اور وہ یقین جو اوسے قومی اعتبار پر ہے
کسی حالت میں بھی زائل نہیں ہوتا۔

ان مثالوں سے یہ نہ خیال کرو کہ یورپ میں جھوٹ

اور فریب نہیں ہے آخر وہ بھی انسانی بستیاں اور انسانی آبادیاں ہیں اون میں بھی ایک حد تک کمزوریاں ہیں وہ بھی منہیات سے خالی نہیں ہیں لیکن چونکہ ان قوموں میں قومی اعتبار کی ساکھہ پڑ چکی ہے اس واسطے باوجود ان کمزوریوں اور غلط کاریوں کے بھی ایک دوسرے کا اعتبار معرض زوال میں نہیں آتا باوجود بعض وقت کی بدطینتیوں کے بھی نیک طینتی قایم رہتی ہے ایک بدطینتی ہمیشہ نیک طینتی کی تاویل میں آکر کچھہ نہ کچھہ خفیف ہو جاتی ہے کیا ہم اپنے ملک و قوم میں اس قسم کی نیک طینتی اور اس پایہ کا وثوق قومی اعتبار کے رنگ میں پاتے ہیں اور کیا ہمیں ایک دوسرے پر اس رنگ میں اعتبار ہے کیا ہم قومی اعتبار کی ضمانت پر بہت کچھہ اٹھا رکھتے ہیں یہ وہ باتیں ہیں جو قومی اعتبار کی بحث میں ہمیں ہمیشہ سوچنی چاہئیں اور ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ ہماری نسبت دوسری قوموں سے اس رنگ میں کیسی ہے۔

تمدنی پہلو سے ہم اس وقت ترقی پذیر ہو سکتے ہیں جب ہمارا قومی اعتبار قایم اور ثابت ہو قومی اعتبار کے قیام سے ہماری بعض غلطیاں اور کمزوریاں اگرچہ غلطیاں اور کمزوریاں ہی رہتی ہیں لیکن اون پر قومی اعتبار کی رنگ کی وجہ سے قوم کی وہ بے حرمتی نہیں ہوتی اور وہ مسلسل نکتہ چینی اور بے اعتباری ساری رہتی ہے جو فلاکت زدہ قوموں کے حصے بخرے میں آچکی ہوتی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم قومی عروج اور قومی ترقی کے واسطے ساعی ہوں لیکن اس کے ساتھہ ہمیں قومی اعتبار پر بھی زور دینا چاہئے قومی اعتبار قوم کی نصف ترقی سے بھی زیادہ ہے بلکہ قوم کی اصل ترقی اس وقت متصور ہے جب کوئی قوم قومی اعتبار رکھتی ہو۔ قومی اعتبار نہ ہونے کی صورت میں بہ قول حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

قوم کی قوم ہی معرض نکتہ چینی میں آکر بے اعتبار ہو جاتی ہے قوم کا اعتبار کب بنتا ہے جب قوم خود اپنے آپ پر اعتبار کرے اپنے آپ پر کب اعتبار ہوتا ہے جب قوم اور قوم کے افراد خودداری کے عظیم الشان فلسفہ سے آگاہ ہوں۔ جو قوم فلسفہ خودداری سے آگاہ نہیں وہ مردہ ہے ہم دوسری قوموں کی نگاہوں میں قومی اعتبار نہیں رکھتے۔ یہ تیسرے سوال کا مختصر جواب ہے فقط

سلطان احمد

منطق
اوس کی تاریخ و وسعت

حور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہ دوست
اندکے اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اگرچہ اس امر کی نسبت ایک حد تک اتفاق عام ہو گیا ہے کہ فن منطق کی تدوین سب سے پہلے ارسطو ہی نے کی اور وہی اس کا موجد اول ہے لیکن اکثر صاحبان نظر اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ منطق کا سب سے زیادہ قدیم اور باقاعدہ مصنف زینو ہے

جو ۴۶۹ - ۳۹۹ قبل مسیح گزرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ علوم و فنون کی نسبت یہ بتانا کہ فلاں علم نے وجود کے جامہ سے کب اور کس کے ہاتھوں زینت پائی دشوار ہی نہیں بلکہ سخت دشوار ہے خصوصًا وہ علم جس کی بنیاد استدلال اور اثبات مدعا پر رکھی گئی ہو۔

دنیا کے تمام علوم و فنون نے ایک خفیف مادّہ سے جسمیت تک ترقی کی ہے اور یہی حال اس علم کا بھی ہے۔ زینو کی وہ تصنیف جسے علم منطق کی تصنیف اولین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تین حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ نتائج پر ہے اوس کی نسبت سقراط نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بالکل پیچیدہ اور مغلق ہے۔ اور صفائی اور وضاحت سے کوسوں دور۔ دوسرا حصہ قاعدۂ استفہام پر مشتمل ہے۔ اس قاعدہ کو سقراط نے اختیار کیا تھا۔ تیسرا حصہ طوبیقا یعنے فن جدل پر ہے۔ اس حصہ میں بحث و مباحثہ کرنے والوں کے لئے ایک کافی ذخیرہ ایسے کج بحث سوالات کا مہیا کر دیا گیا ہے کہ کسی نہ کسی نقطۂ بحث کا جو بہ ظاہر ناگزیر معلوم ہوتا ہو اختیار کر لینا ہی کسی نہ کسی بین و معروف غلطی میں پھنسا دیتا ہے۔

کتاب کی ان خصوصیات پر غور کرتے ہوئے ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زینو کو فن منطق کا سب سے زیادہ قدیم اور باقاعدہ مصنف قرار دئے جانے کی رائے کچھ زیادہ وقیع نہیں اور ہم مجبورًا اسے اس سے زیادہ منطقی نہیں خیال کر سکتے کہ اس نے بحث و مباحثہ میں محصور مقامات سے گریز کرنے کیلئے چند ایسی فرضی شکلیں وضع کر دی تھیں جو بہ آسانی قضیوں میں منتقل ہو سکتی تھیں۔

زینو کے بعد اقلیدس میگروی اور انطس تھینیس شاگردان سقراط کا نمبر رہا۔ اول الذکر نے اپنے پیش رو کی تصنیف کے تیسرے حصہ طوبیقا کو رواج دیا اور کئی مغالطہ ہائے منطقی کا جواب مذہب رواقیئن سے منسوب کی جاتی ہیں مصنف ہوا۔ موخر الذکر کی تصانیف کے متعلق زیادہ یقینی معلومات حاصل نہیں ہوئیں اگر رواقیئن اس فن میں اس کے تلامذہ مان لئے جائیں جیسا کہ اکثروں کا خیال ہے اور انھوں نے اس کے اصول کو برقرار بھی رکھا ہو تو فی الحقیقت نفس منطق کے متعلق اس کے خیالات اقلیدس سے زیادہ واضح رہے۔

رواقیئن نے ہر کلام کے تین حصہ قرار دئے تھے۔ اشکال مفردہ قضایا اور قیاس لیکن یہ قیاس صرف حملیہ ہی تک محدود تھے اس کے بعد ارقمیطاس آیا۔ جس نے اصول قاطیغوریاس کو جاری کر کے دنیا کو زیر بار احسان کیا لیکن ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدود و وسعت منطق کی بابت اس کے معلومات کچھ زیادہ وسیع نہ تھیں اس نے مابعد الطبعیات کو جسے منطق سے کوئی خاص تعلق نہیں اس سے بالکل خلط ملط کر دیا تھا اشکال اور مقدمات کی دریافت ماہیت میں اصول مباحثہ و مناظرہ کو نظر انداز کر جاتا تھا۔ حالانکہ یہ تمام اصول کے ماتحت نہیں ہو سکتی جا۔

اس لئے جس حالت میں ارسطاطالیس نے فن منطق کو پایا۔ (بشرطیکہ اس کے عہد سے پیشتر منطق کا وجود بحیثیت منطق تھا بھی) وہ غالبًا اس سے زیادہ نہ تھی کہ تقسیم اشکال۔ قضایا اور قیاس کا دھندلا سا خاکہ موجود تھا۔ اصول قاطیغوریاس اور شاید تناقض اشکال کے قواعد بھی مقرر کر دئے گئے تھے۔ یا جیسا کہ بعض کا یقین ہے انواع کا استقصاء جنس و فصل بھی سقراط جاری کر چکا تھا۔

لیکن یہ تمام نظام منطق کی داغ بیل بھی بنیاد ارسطاطالیس ہی نے ڈالی اور اسی نے یہ مستحکم عمارت اٹھائی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔

جنگ ہائے فارس میں سرغنائی کی تلوار یونان کے قبضہ میں تھی۔ اس واقعہ نے جو سیاسی نمو اور مادی ترقی اسے بخشی۔ اس نے ملک کی خارجی نموداری۔ باشندوں کے خیالات اور ان کی طرز معاشرت میں ایک فوری تغیر پیدا کر دیا تھا۔ سیاسی اور معاشرتی دائرہ کی وسعت کا تقاضا تھا کہ قدیم طرز تعلیم کسی اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ دستور تربیت سے مبدل ہوجائے۔ اس ضرورت نے اساتذہ کا ایک گروہ پیدا کر دیا جن کے ائمہ کبار پروطوغوراس غورجیس اور زینو ہوے ہیں۔ یہ سوفسطائی کہلاتے تھے۔ وہ نوجوانوں کو زندگی کے عملی کاروبار کی تعلیم دیتے تھے خصوصاً مجامع عام میں تقریر کرنے کا فن یا علم کلام جیسا کہ وہ اس زمانہ میں کہلاتا تھا۔ سکھلاتے تھے ان سوفسطائیوں کا مدعا اپنے تلامذہ کو صداقت کی تعلیم کرنا یا کم از کم ان میں راستی و صداقت کی محبت و عزت پیدا کر دینا نہ تھا بلکہ ان کی تعلیم کی علت غائی یہ تھی کہ ان کے تلامذہ چالاک دنیا دار بن جائیں۔ علم کلام اور فن مباحثہ کے سکھلانے میں انھوں نے انتاج حقیقی کے ذرایع حصول بتانے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ منصفوں کو مرعوب کرنے اور مخالفین کو شکست دینے کے رمزوں سے بھی آگاہ کیا۔

بالفاظ دیگر سوفسطائین کا علم کلام علم مباحثہ و مناظرہ نہ تھا بلکہ کٹھ حجتی اور دوسروں کے احساسات کو راغب کرنے کا فن تھا ان کے نقطۂ خیال سے مباحثہ کے لئے مضمون زیر بحث کے حقیقی علم سے آگاہی کوئی ضروری شئے نہ تھی بلکہ صرف دوسروں کو اپنے نفس بحث پر متوجہ کرنے اور مخالف کی اغلاط سے فوری منفعت حاصل کرنے کی مہارت درکار تھی۔

نظریہ جس پر ان سوفسطائیں کی تعلیم کا انحصار اور دارومدار تھا عموماً لاادریت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنے سوفسطائی اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ ان کی تمام معلومات محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں نہ تو صداقت کا کوئی اندازہ مقرر کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی حقایق حقیقی معنی میں حقایق کہے جاسکتے ہیں ان کے نزدیک اشیا کا ذاتی حسن و قبح محض ایک بے معنی لفظ تھا۔ صحیح و غلط کے واسطے بھی مثل حق و دروغ کے کوئی حد اندازہ مقرر نہیں ہوسکتی تھی۔ ہر شخص اپنے مفید مطلب اشیا کے منتخب کرلینے کا استحقاق رکھتا تھا اپنے فوائد پر نظر رکھنا اور اپنے تفوق کے مواقع تلاش کرنا ان کے نزدیک جزو عقل تھا۔

سوفسطائیوں کے ان ملحدانہ عقاید کا گراں پایہ اور بزرگ ترین مخالف سقراط تھا جس نے اُن کے خیالات کی نہایت شد و مد سے تردید کی۔ مباحثات اخلاقی میں انفرادی آرا کے تخالفات و تناقضات کو دیکھ کر سوفسطائن نے یہ نتیجہ اخذ کر رکھا تھا کہ صدق و کذب حق و دروغ کے مابین کسی حقیقی و خالص امتیاز کا وجود نہیں سقراط کہتا تھا کہ "اگر کوئی شخص مختلف اشخاص کے فیاصل کو بہ نظر تعمق دیکھے تو اسے مشترک و متفق علیہ خیالات و عناصر بھی ملیں گے لیکن یہ عناصر مشترکہ حیات یا احساسات انقباض و انبساط میں دریافت نہیں کئے جاسکتے یہ خالصتہً انفرادی ہوتے اور قوائے عقلیہ کا کام نہیں دیکھتے لیکن حس و احساس کے اختلاف کی تہ میں تخیل یا تصور بھی موجود ہے۔ جو تمام انسانوں میں مشترک ہے" اس کا اعتقاد تھا کہ "جب حیوانات ذی عقل باہم دیگر واقفیت حاصل کرسکتے ہیں تو انصاف۔ زہد۔ شجاعت وغیرہ وغیرہ اصلی و حقیقی نیکیوں میں انسان کا متفق ہوجانا ضروری ہے یہ سچ ہے کہ شاذونادر اشخاص نے ان واقعات میں غور کرنے اور سوچنے کی زحمت برداشت کی ہوگی لیکن یہ بنیادی خیالات ہر انسان کے دماغ میں بہ حیثیت ذی عقل ہونے کے موجود ہیں" چنانچہ

سوفسطائین کے منکرات اخلاقی کے بطلان کے لئے اس نے قاعدہ استفہامیہ کو رواج دیا۔ یعنے مفید سوالات کے ذریعہ سے لوگوں کو نیکیوں کی دریافت و ماہیت میں مدد کرتا تھا اور اس طرح اخلاقی تصورات کو دماغ انسانی کے احاطہ سے باہر لاکر روشناس کرادیا تھا۔

سقراط کی اس مشن کو اقلیدس میگروی۔ انطس تھینیس اور افلاطون وغیرہ اسکے شاگردوں نے جاری رکھا لیکن خیالات اور وقت کی قوت کچھ ایسی زبردست کشش مقناطیسی رکھتی ہے کہ دونوں اول الذکر فلاسفہ کا دامن بھی رائج الوقت سفسطہ سے آلودہ ہوئے بغیر نہ رہا اور وہ بھی زینو اور اس کے شاگردان معنوی کی طرح طوبتھا کی پرپیچ زنجیروں سے نہ بچ سکے فی الحقیقت منطق ان لوگوں میں ایک ایسا کھلونا تھا جو محض تفریح طبع کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ حقیقت اشیا کا انکشاف۔ قوت ذہنیہ کا جائز استعمال اور تہذیب اخلاق کا حصول اس کی سرحد میں داخل نہ تھا۔ اب بھی سیاحان یونان کی نظروں سے اسکی نشانیں قہوہ خانوں یا پرفضا میدانوں میں گزرہی جاتی ہیں۔

ہاں افلاطون کے قدم استقامت کے ساتھ اپنے استاد کے رستہ پر چلتے رہے بلکہ درمیان ترقی کا ایک زینہ اور طے کر گئے۔ یعنے اس کی توجہ اخلاقی تصورات سے بڑھکر سوفسطائین کے منکرات دماغی کا بھی بطلان کرنے لگی۔ گویا اس کی کوششوں نے ثابت کر دکھایا کہ تصورات میں برخلاف حیات کے اندازہ حق و ناروا اخلاق دونوں پائے جاسکتے ہیں اس کی تصانیف خصوصًا "مکالمہ" میں بہت سے حقیقی منطقی مباحث جستہ جستہ پائے جاتے ہیں لیکن ان کی ترکیب و تدوین کرکے ان کو ایک خاص علم کی شکل میں لانے کا کام پھر بھی باقی تھا۔ اور اس کامیابی کا طرہ اس کے شاگرد ارسطو کی دستار فضیلت پر لہرایا۔ اس نے طریق استدلال کی کامل تحقیق و تفتیش کی اور دنیا کو بتلادیا کہ حصول حقیقت کے لئے در اصل فلاں فلاں اصول و شروط لابدی ہیں۔

ارسطو اسطاغین (اسٹیگیرا) میں حضرت عیسٰی سے ۳۸۴ برس قبل پیدا ہوا تھا اسطاغین ایک یونانی نوآبادی کا نام ہے جو تھریس میں واقع تھی ارسطو کی والدہ کا نام افسطا تھا اس کا باپ نیقوماخس* جو مقدونیہ کے بادشاہ امنطس کے دربار میں طبیب تھا اسکولاپیس کی نسل سے خیال کیا جاتا ہے حکیم جالینوس نے لکھا ہے کہ یہ خاندان اپنی اولاد کو علم تشریح کی تعلیم دینے میں خاص طور پر ممتاز تھا اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ ارسطو نے ترکیب اجسام حیوانات و نباتات میں بہت ترقی حاصل کی لیکن اس کے شوق کے اصلی میدان فلسفہ اور معقولات ہیں۔

شباب کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ اس کے باپ نے ۳۶۷ قبل مسیح میں انتقال کیا اور اس کے محافظ و سرپرست نے اسے اتھینز (مدینۃ الحکما) میں تکمیل تعلیم کی غرض سے بھیجدیا۔ یہاں وہ کامل بیس سال تک اس اسکول میں پڑھتا رہا جو افلاطون کی سرپرستی میں باغ اکادیمیا میں قایم تھا یہاں کی تعلیم نے اس کے فلسفیانہ مذاق کو جو اس میں فطرتًا موجود تھا اور راسخ کردیا۔

ارسطو کی زندگی کو ہم تین دوروں پر تقسیم کرسکتے ہیں۔ دور اول یعنے اس کی اتھینز کی پہلی سکونت جو ۱۷ سے ۳۸ سال تک کا زمانہ ہے۔ دور ثانی یعنے ۳۸ سے ۵۰ سال تک کا زمانہ جو اتھینز سے باہر بسر ہوا۔ اور ثالث یعنے اس کی اتھینز کی دوسری

---

*نیقوماخس (nicomachus) ارسطو کا باپ بہت بڑا ریاضی داں تھا جبر و مقابلہ اور حساب پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ارثماطیقی ہے اور جو دو مقالوں پر مشتمل ہے۔

سکونت جو پچاس سے ترسٹھ سال تک کا زمانہ ہے۔

دور اول کی تصانیف وہ ہیں جو اس نے اپنی مکتبی زندگی میں لکھی تھیں۔ یہ تقریباً تمام مکالمہ ہی مکالمہ ہیں جنہیں جا بجا افلاطون کے مسئلہ تصور پر تنقیدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ فلسفہ کے مسائل بھی جستہ جستہ بیان کئے گئے ہیں علم تمدن سے بھی روشناس کرایا گیا ہے اور اخلاقی نیکیوں پر رائے قایم کی گئی ہے۔

دور ثانی میں وہ تمام تصنیفیں شامل ہیں جو اس نے مدرسے کی علیحدگی پر تیار کی تھیں۔ اسی دور میں اس کی بے فکری و فارغ البالی نے اسے مختلف علوم و فنون پر غور و فکر کرنے کے کافی مواقع دیئے تھے اور چونکہ قوائے داغیہ کا ارتفاع اور نشو و نما بھی کامل طور پر ہو چکا تھا اس لئے اس زمانہ کی تصانیف۔ تنوع جدت مضامین اور تحقیق و تدقیق سے مالا مال ہیں۔

دور ثالث میں اس کی عقل و نقل کا آفتاب نے انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ چکا تھا لیکن اس دور کی تصانیف کا حصہ کثیر نامکمل رسائل پر مشتمل ہے جو نظری بھی نہیں ہوئے۔ اسکے ظاہرا دو وجوہ ہیں ایک یہ کہ اس کی رائے دن بدن بلند ہوتی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ مضامین کی بہتات اور کثرت معلومات استقلال سے ایک مضمون پر قایم نہ ہونے دیتی تھیں یا ابھی ایک رسالہ زیر تصنیف ہے کوی وجہہ اس کے اختتام میں سد راہ ہوی اور دوسرے کا آغاز ہو گیا۔

تصانیف منطقیہ زیادہ تر انھیں دونوں آخری دوروں کا سرمایہ ہیں اس نے منطق کو آٹھ حصوں پر تقسیم کیا تھا۔ اور ہر ایک پر ایک رسالہ لکھا تھا۔

(۱) قاطیغوریاس (Categoriae) مقولات عشر یعنے جوہر۔ کم۔ کیف وغیرہ

(۲) باری مینیاس (Enterpretation) یعنے متواطی مشکک۔ حیات قضایا تناقض عکس وغیرہ وغیرہ کے مباحث۔

(۳) انالوطیقا اول (Prior Analytics) یعنے قیاس استقرا۔ تمثیل کے مباحث۔

(۴) انالوطیقا ثانی (Posterior analytics) اقسام قضایا یعنے مشہورات و متواترات وغیرہ۔

(۵) سوفسطیقا (Sophistical Elenches) یعنے مغالطہ یا سفسطہ

(۶) طوبیقا یعنے (Topic) یا فن جدل

(۷) ریطوریقا (Rhetoric) خطابت یعنے وعظ لیکچر۔ اسپیچ وغیرہ

(۸) بوطیقا (Poetry) یعنے شاعری۔

ان میں کی سب سے زیادہ معرکۃ الآرا چھہ تصانیف یعنے قاطیغوریاس۔ باری مینیاس۔ انالوطیقا اول۔ انالوطیقا ثانی سوفسطیقا اور طوبیقا ارگے نن یعنے آلہ سائنسیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے پہلے دو مضمونوں پر جو رسالہ ہے وہ تقریباً ۱۰۴ صفحوں کا ہے لیکن اسی کی سب سے زیادہ قدر کی گئی اور از منۂ وسطی میں ان کی سیکڑوں شرحیں لکھ ڈالی گئیں۔

ارسطو کی وفات کے بعد اس کا سارا کتب خانہ اس کے جانشین شاگرد تھیوفرسطس کے قبضہ میں آیا اور تھیوفرسطس کے انتقال پر جو وفات ارسطو کے (۳۵) ہی سال بعد ہوی اس سارے ذخیرہ کا مالک اس کا عزیز شاگرد نیلیوس ہوا۔ نیلیوس یہ تمام کتابیں اپنے وطن سیپس میں لایا یہاں پرگاس کے خود سر بادشاہ اپنی علمی کی نایاب کتابیں جبراً حاصل کر کے شاہی کتب خانہ کو معمور کر رہے تھے اس خوف سے یہ عزیز خزانہ ایک پختہ غار کو سونپ دیا گیا۔

اس طرح ارسطو کے بعد اس کی اور تصانیف کی ساتھ منطق بھی
تقریباً ۵ صدی کے طویل عرصہ تک فراموشی کے قعر میں پڑی رہی
حکیم سسرو کے زمانہ یعنے حضرت عیسے کی پیدایش سے کچھ ہی قبل
تک دنیا اس سے بالکل ناآشنا تھی۔ عوام کا کیا ذکر اچھے اچھے
فلاسفہ بھی آگاہ نہ تھے۔ لیکن انیڈرونکس کی کوششوں سے
پیدایش مسیح کے ساتھ یہ کنز مخفی بھی دنیا کے سامنے آیا پھر بھی مدت
تک لوگوں کو اس کی جانب توجہ نہ ہوی۔ بیشک سسرو کی
تصانیف فلسفہ میں منطق یونانی کے حوالے جستہ جستہ پائے جاتے
ہیں اور علم بدیع میں بھی اس کی تلخیص وتشریح ایک حد تک موجود
ہے لیکن اس کی وجہہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ قواعد فصاحت و بلاغت
کی تطبیق قواعد منطق سے کرنا چاہتا تھا۔

ہاں وفات ارسطو کے ۳½ صدی بعد یعنے دوسری تیسری
صدی عیسوی میں البتہ اس کی منطق گمنامی کے گوشہ سے نکل کر
شہرت کی کرسی پر بیٹھی۔ اور اسکندر افرودسی[1] دمشقی کی بدولت
قاطیغوریاس۔ انالوطیقا اور طوبیقا وغیرہ کی شرحیں جریدہ
عالم پر ثبت ہوئیں۔ یہی زمانہ گیلن۔ امونیس[2] اور فرفوریوس[3]
مصری وغیرہ کو جو ارسطو کے بعد آسمان منطق کے تابندہ
ستارے ہیں ہمارے سامنے لاتا ہے۔ لیکن یہ دور صرف
تشریح و تلخیص کا دور رہی۔ پانچویں صدی کے اواخر اور چھٹی
صدی کے آغاز تک تصانیف ارسطاطالیسی کا کوئی باقاعدہ
ترجمہ نہوا تھا اس وقت "مشہور عالم" بوتھیس (Boethius)[4]
نے انھیں لاطینی پوشاک پہنائی لیکن خاص نظریہ میں اب
بھی کوئی نمایاں ترقی یا قابل یادگار اضافہ نہوا صرف قاطیغوریاس
اور باری مینیاس کا ترجمہ ہوا۔ گیلن کی منطقی جانفشانیاں
تاریکی میں پڑی ہیں۔ اس کی نسبت اس سے زیادہ کچھ نہیں
معلوم کہ اس نے اشکال ثلاثہ میں ایک کی زیادتی کر کے چار
کردیا۔ فرفوریوس کی خاص تصنیف ایساغوجی یعنے کلیات
خمس کی ترتیب تک محدود رہی۔

"صُدیقی"

---

[1] اسکندر افرودسی دمشقی سنہ ۱۲۹ء میں پیدا ہوا۔ فلسفہ ارسطاطالیسیہ
کا رکن اعظم خیال کیا جاتا ہے بعض بعض اصول خود بھی ایجاد کئے
چنانچہ خدا کے عالم کلیات و جزئیات ہونے پر اول اسی نے دلیل قائم
کی اور ارسطو کے برخلاف یہ مسئلہ بیان کیا کہ نفس کو مفارقت بدن
کے بعد کسی قسم کا ادراک و احساس نہیں ہوسکتا۔

[2] (Ammonius) نے جو سنہ ۲۴۳ء میں تھا ایک نئے
طریقے کی بنیاد ڈالی جس کا نام (New platonism) یعنے جدید
فلسفہ افلاطونی ہے اس کے اصول اولین چار تھے (۱) خدا میں تین اقنوم
ہیں۔ وحدت۔ فہم۔ (ب) نفس میں حصول وحدت
کی قابلیت موجود ہے باین حیثیت وہ خدا کی برابری کرسکتا ہے (ج)
زندگانی موجودہ کے تصورات تمامتر وہم و خیال ہیں۔ (د) مادہ نہایت
قابل حقارت شئے ہے۔

[3] (Porphyrius) فلسفہ جدید افلاطونی کے مشاہیر
حکما سے ہے سنہ ۲۳۳ء میں پیدا ہوا فن بلاغت کی تکمیل ایتھنز میں کی عیسائیت
کا سخت مخالف تھا اور اس کے رد میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں
کلیات خمس کی ترتیب دی۔ اور حکما کے حال میں ایک مفصل و مفید
کتاب لکھی۔ رسایل شبلی۔

[4] بوتھیس۔ ۴۷۵ عیسوی میں پیدا ہوا۔ اور ۵۲۴ عیسوی میں وفات پائی۔

ظریف الطبع

۱

حامد ان خوش طبع اور زندہ دل نوجوانوں میں سے تھا جنھیں اس وقت تک لطفِ صحبت نہ ملتا جب تک یار باش دوستوں میں دو گھڑی ٹھٹھا کر ہنسی مذاق کی نوک جھونک نہ کر لیتا۔

روتے کو ہنسانا افسردہ دلوں کو شگفتہ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا گویا اس کے خمیر میں دایۂ ازل نے ظرافت کی روح پھونک دی تھی اس کے دل میں انوکھے مذاق نرالی شوخیاں یوں پیدا ہوتی رہتی تھیں جس طرح بہتے ہوئے دریا میں مسلسل لہروں کا سلسلہ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ ہوئی تھی لیکن عدیم المثال خوش طبعیٔ اور ظرافت کا آوازہ کوچہ و بازار میں گونج رہا تھا خصوصاً دوست احباب اس کی اچھوتی ظرافتوں اور زندہ دلی پر فدا تھے اور اس کی پر لطف صحبت کی قدر کرتے تھے۔

حامد روٹھے ہوئے دوستوں اور رنجیدہ جلسوں کو رضامند کرنے میں خاص کمال رکھتا تھا کیونکہ بعض اوقات اس کی روانیٔ طبع تیزیٔ زبان کسی سیدھے سادھے سادہ لوح دوست کو آزردہ کر دیا کرتی تھی لیکن وہ آن کی آن میں چلتے ہوئے فقروں اور خوش آئند لگاوٹوں سے لبھا کر راضی کر دیا کرتا اُسے ان وقتی شکر رنجیوں میں شکر ریزیوں کا لطف حاصل ہوتا جیسے موسم برشکال میں ہوا کے خوش گوار جھونکے دلوں میں تازگی پیدا کرتے ہیں اسی طرح یہ وقتی رنجش صلح کے بعد فرحت افزا ہو جاتی تھی۔

جھکی ذرا چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

حامد اپنی طبیعت سے مجبور تھا جب اسے کوئی دوست مذاق اڑانے کے لئے نہ ملتا تو اپنی نیک نہاد زوجہ پر دو چار انچھ مار کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔

۲

اگرچہ حامد کو گھر میں ان باتوں کا کم موقع ملتا کیونکہ اس کی زوجہ طبعاً مغلوب الغضب اور زود رنج تھی لیکن در اصل یہ اس کا قصور نہ تھا وہ اپنی سادہ لوحی سے مجبور تھی جب شوہر کی زبان سے خلاف شان کلمات سنتی تو رنجیدہ ہو جاتی لیکن کبیدگی نافرمانی کے اسباب نہ پیدا ہونے دیتی۔

اس نے پانچ برس کی مدت میں شوہر کے رنگ مزاج کا اندازہ کر لیا تھا اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میاں کو بغیر دو دو چونچیں لڑے ہوئے رات کو نیند نہیں آتی اس لئے کبھی کبھی عمداً خفا ہو جایا کرتی مگر اس کی محرور المزاجی نے اس عنوان شایستہ کو بجائے مصلح بنانے کے اپنا پیرہ سمجھ لیا اکثر بناوٹی غصہ ہنسی ہنسی میں حد سے گزر جاتا اور دو دو چار چار دن تک بات چیت کی نوبت نہ آتی۔

اس کی یہ عادت حامد کو گراں نہ گزرتی تھی کیونکہ اُسے بھری ہوئی نگاہیں سرشار آنکھوں سے بدرجہا بھلی معلوم ہوتیں اور دلربایانہ بے نیازیاں باہمی اخلاص کی گرم جوشیوں سے دلفریب

معلوم ہوتیں چین جبیں سے آئینہ دل کی صفائی جھلکتی اور بدلے
ہوئے تیور سچی لگاوٹوں کا نمونہ پیش کرتے۔

جس طرح مینہ برس کر کھل جانے سے مطلع صاف ہو جاتا ہے
اور سطح افلاک پر ہلکی ہلکی روشنی کی فضائیں دل لبھانے والی ہوتی
ہیں اسی طرح معمولی تکرار کے بعد دل ہلکا ہو جاتا ہے اور خالص
جذبات کی ولولہ انگیز ہوائیں طبیعت میں خود رفتگی پیدا کردیتی ہیں

وہ ہے بے ذائقہ شربت نہ ترشی جس میں شامل ہو
وصال یار میں بھی چاہیئے تکرار تھوڑی سی

۳

حامد اپنی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے ہر دلعزیزی کا سارٹیفکیٹ
حاصل کرچکا تھا اور اب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ریلوے آفس سے
واپس آنے کے بعد خوش باش یار دوست گھر پر آکر پکڑ لیجایا
کرتے جہاں سے گیارہ بارہ بجے شب سے پہلے پیچھا چھڑانا دشوار
ہو جاتا کبھی ایک ایک بجے تک بے تکلف صحبت کا انہماک
گھر کی فکر سے بے پروا کردیتا اور یہ بزم احباب میں خوش خلقیوں
کے مسرت خیز تماشے دکھایا کرتا کچھ ان جلسوں میں ایسی دلچسپی
ہوتی کہ مہینوں بیوی سے بات چیت کرنے کی نوبت نہ آتی۔ اکثر
کھانا بھی بے فکر دوستوں کے ساتھ ہی کھا لیا کرتا تھا جو اسی سادہ
لوح نیک خاتون کو نہایت شاق گزرتا اس نے دو تین ہفتوں
سے غیر معمولی تغیر دیکھکر خیال کرلیا کہ شوہر ضرور کسی بات پر رنجیدہ
ہو گیا ہے۔

یہ خیال اس کے واسطے کچھ کم درد انگیز نہ تھا اس لئے کہ اسکی
خوشیوں کا معدن اس کی مسرتوں کا مدار اور اس کا راج سہاگ
صرف شوہر کی خوشنودی مزاج پر منحصر تھا اس نے قصد کرلیا آج
ان سے یہ معاملہ صاف کرلیا جائے اگر میری تقصیر ثابت ہوئی
تو مجرموں کی طرح اپنے سرتاج کے سامنے دست بستہ کھڑی ہو کر عفو
گناہ کی التماس اور اپنی گزشتہ خطاؤں کے لئے معذرت کرونگی
منت خوشامد سے ان کا دل رحم و الطاف کی طرف مائل کرونگی
اگر ان کی خطا ثابت ہوئی تو جھوٹ موٹ روٹھ جاؤنگی۔ وہ
مجھے منائیں گے میل کرنے کی کوشش کرینگے لیکن میں ضرور پریشان
کرونگی کیونکہ کئی ہفتوں سے چھ بجے شام سے بارہ بجے رات
تک دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے انتظار کی جانگسل تکلیفیں برداشت
کرتی ہوں لیکن انھیں ذرا خیال نہیں آتا۔

جب خوب جی بھر کے ستالونگی تو مسکرا کر کہدونگی کہ تمھاری گزشتہ
بے اعتقادیوں کا بدلہ ہے۔ کیونکہ بے نیو کی دیوار ہوا کے ادنیٰ
جھونکے کی متحمل نہیں ہوسکتی کاغذ کی ناؤ کیلئے پانی کا ایک تھپیڑا
کافی ہے بے رت کی گھٹائیں برسنے کی قابلیت نہیں رکھتیں ایسا
ہنسی ہنسی میں خفا ہو جائیں تو الٹے منانا پڑے۔

۴

ہفتہ کی رات کو ایک دوست کے یہاں شادی کی تقریب
میں حامد کو جانا پڑا لیکن وقت کی تنگی اور دوستوں کے تقاضوں
نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ ریلوے آفس سے آنے کے بعد گھر میں
جاسکتا اس نے بہت کچھ عذر و معذرت کی تبدیل لباس کا بہانا
کیا لیکن دوستوں نے ایک نہ سنی زبردستی پکڑ دھکڑ کرلے گئے اور
بیچارے حامد کو ع

پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

جانا پڑا۔

اس نے اپنے خلاف معمول طریقوں سے سمجھ لیا تھا کہ آج ہی
کل میں ان کم التفاتیوں کا زہریلا اثر رنجش کی روح فرسا صورت
میں نمایاں ہونے والا ہے گو اسے منانے میں مہارت حاصل تھی

اور اپنی جادو بیانی سے دم کی دم میں رفع ملال آسان سمجھتا تھا لیکن اپنی غفلت آب زوجہ کو رنج پہونچانا گوارا نہ تھا اسے تھوڑی سی تکرار میں لطف وافر آتا لیکن بدمزگی کا طول بھی خون خشک کر دیتا۔ خود چھیڑ خوانی کرتا لیکن ان امور سے کوسوں بھاگتا جن میں بے اعتنائیوں کی شان پائی جاتی اس نے دل میں تہیہ کر لیا جس طرح ہو بارہ بجے کے قبل ہی چپ چھپا کر بھاگ چلنا بہتر ہے۔

۵

دولھا کے گھر میں بڑی دھوم دھام تھی دروازے پر برقی روشنی سے روز روشن کی کیفیت پیدا تھی مستعد مہتمم انتظام میں مشغول تھے گھر پر سفیدی کی گئی فرش فروش جھاڑ۔ کنول پردے اور دیگر سامان آرائش سے مکان دلھن بنا ہوا تھا ایک سمت ارباب نشاط جمع تھے محفلِ رقص و سرود آراستہ تھی خوش طبع حضرات کا مجمع تھا قمریاں جنت کی سریلی پاٹ دار آواز سے در و دیوار جھوم رہے تھے آسمان سے سرور کی بارش اور زمین سے شور شادمانی بلند تھا اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ ہمارے ہیرو حامد کی غیر حاضری تھی یار آشنا منتظر تھے گھڑی گھڑی منتظموں سے دریافت کیا جاتا تھا ابھی تک حامد نہیں آئے کہ دفعتاً حضرت نازل ہوئے انھیں سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دولھا کی مسند کے قریب بٹھائے گئے لوگوں نے مذاق کا سلسلہ آغاز کیا۔ چاروں طرف سے پھبتیوں کی بوچھار پڑنے لگی۔

زندہ دل حامد اکیلا ہی محفل بھر کے لئے کافی تھا ایسے ایسے چست جواب دئے کہ حضار جلسہ کے دانت کھٹے ہو گئے لیکن اُسے ان باتوں کے ساتھ گھر کا خیال گھڑی گھڑی خاموش کر دیتا تھا اور وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتا۔ آج خلاف عادت چپ ہو جانا لوگوں کی نظر میں کھٹکا۔ بعض معاملہ فہم تہہ تک پہنچ گئے۔

مدت کے بعد آج لوگوں کو اپنا عوض لینے کا موقع ملا ایک نے دوسرے سے کانا پھوسی کر کے سمجھا دیا چاروں طرف سے پھبتیاں اڑنے لگیں۔

ان باتوں سے حامد کے حواس باختہ ہو گئے ساری خوش طبعی رفو چکر ہو گئی جواب دیتے نہیں بنتا تھا گو اس نے اپنے دماغ پر بہت اثر ڈالا ہزارہا تدبیریں سوچیں لیکن کوئی فقرہ کارگر نہ ہوا نہ ان لوگوں سے چھٹکارے کی صورت پیدا ہوئی نہ انکی کھری باتوں کا ٹکرلیس جواب بن پڑا۔

جب اس نے دیکھا مجھ پر زن مریدی کی چست پھبتیاں شروع ہو گئیں جس سے زیادہ مرد کے واسطے ہتک آمیز کلام نہیں تو مجبوراً تھوڑی دیر زیادہ قیام کی ٹھہرالی ساتھ ہی یہ بھی قصد کر لیا کہ بعد فراغت طعام منتظموں کی آنکھ میں دھول جھونک کر غائب ہونے کا موقع ملا تو یہاں سے رفو چکر ہو جاؤنگا۔

گیارہ بجے دسترخوان چنا گیا شرکائے بزم ہاتھ دھو دھو کر شریک طعام ہوئے غذائیں نہایت لطیف تھیں شہر کے نامی باورچیوں نے پورے اہتمام سے تیار کی تھیں جس کی ہر شخص نے تعریف کی۔

ایک گھنٹے تک کھانا ہوتا رہا پھر دسترخوان بڑھا گئے ہاتھ دھوئے اور محفل نشاط میں جانے لگے حامد نے بہت بچنا چاہا فرار ہونے کے راستے تلاش کئے مگر مفر کی صورت نظر نہ پڑی لوگوں کے حلقہ میں چار و ناچار جانا پڑا۔

اب اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی اس نے بخوبی سمجھ لیا آج ان بھوں کے چنگل سے نکلنا دشوار ہی کھینچ کھانچ کر برات کے ہمراہ لیجائیں گے تاوقتیکہ رخصتی نہ ہو چھٹکارا نہیں اور

حقیقت میں ایسا ہی ہوا رات بھر سب نے سختی سے نگہداشت کی علی الصباح برات روانہ ہوئی سارا دن صیغہ نکاح اور دیت رسم کی نذر رہا دو گھڑی دن رہے رخصتی ہوئی شام سے کچھ قبل دولہا دولہن کو لیکر گھر پہونچا براتی مبارکباد و تہنیت دیکر اپنے اپنے مکان سدھارے حامد بھی اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچتا ہوا گھر کی سمت روانہ ہوا۔

۶

حامد کی زوجہ دلی جذبات میں الجھی ہوئی بارہ بجے تک حامد کا انتظار کرتی رہی۔ آج اس کے ملال کی حد و انتہا نہ تھی کیونکہ حامد بغیر ملے دوستوں کے گھر چلا گیا تھا حالانکہ کئی ہفتوں سے غیر حاضر رہا کرتا تھا لیکن ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا کہ آفس سے آنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے بغیر چلا گیا ہو۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا اسے اٹھا کر انگاروں پر رکھا کہ پتیلی نہ گرا دے اس خیال سے خود چولہے کے پاس بیٹھنا پڑا آج اس نے کیری کی نہایت لذیذ چٹنی بنائی تھی کیونکہ حامد کو اپنی بی بی کے ہاتھ کی پیسی ہوئی چٹنی بہت مرغوب تھی اچار دانی سے پیاز کا اچار نکال رکھا تھا اس خیال سے کہ کئی دن سے اُن کے کھانے میں گرم روٹیاں نہیں آتیں چولہا گرم کرکے بڑے پراٹھے پکائے لیکن ابھی تک حامد کا پتا نہ تھا ہوا زور سے چلی گھر کے سامنے پیپل کا درخت تھا اس کے پتوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی آ رہا ہے معاً دل میں حامد کے آنے کا شبہ ہوا نظر اٹھا کر دیکھا در زندان کی طرح دروازہ بھڑا ہوا تھا داہمہ سمجھ کر پھر نظر جھکا لی اب پراٹھے پک کر تیار ہوگئے چنگی کی وال کا بھرتا بن چکا۔ سالن گرم ہو چکا حامد ابھی تک نہیں آیا انتظار نے دل میں الجھن پیدا کی الجھن نے بڑھکر طبیعت میں اشتعال کے شعلے بھڑکائے آدھی رات کو سناٹا دنیا پر محیط ہو گیا تاریکی نے ہر سمت عمل دخل کیا نیند کے ماتے اور دن بھر کے تھکے ماندے خواب راحت میں مشغول ہوئے لیکن اس غریب کی آنکھوں کی نیند خدا جانے کہاں چلی گئی۔

چولھے سے لکڑیاں نکالیں ان کے کوئلے جھاڑ کر برابر رکھے ہوئے گڑھے میں بند کئے لکڑیوں پر پانی چھڑکا جس طرح آگ بجھنے سے دھواں اٹھتا ہے بعینہ اسی طرح اس کے دل سے بھاپ اٹھنا شروع ہوئی برتن ٹوکری میں پتیلیاں نعمت خانے میں رکھکر بند کیں غم و غصہ کی وجہ سے خود بھی کچھ نہ کھایا دروازے کی کنڈی بند کرکے پلنگ پر زخم خوردہ دل لئے ہوئے منہ لپیٹ کر پڑ رہی لیکن اس خیال سے نیند اچاٹ ہو گئی ایسا نہ ہو میں سو جاؤں اور حامد کو دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا پڑے۔

خیالات نے قلب و دماغ کو پریشان کرنا شروع کیا گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے اب اسے حامد کے آنے سے یاس ہو گئی معلوم ہوتا ہے یار دوستوں کی ہنسی دل لگی اور بے تکلفی کے دل آویز ذائقوں نے آنے کی اجازت نہ دی ہوگی یہ سب کچھ سہی لیکن آنکھوں میں نیند کا نشان نہیں۔

ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی آسمانی لیمپ (تارے) ایک ایک کرکے بجھنا شروع ہوئے سقف نیلی پر سپیدہ سحری نمودار ہوا۔ طیور خوش الحان وحدانیت کے ترانے الاپتے ہوئے آشیانو سے نکل نکل کر دانے چارے کی فکر میں روانہ ہوئے شوالوں سے آواز ناقوس اور مسجدوں سے شور اذان بلند ہوا حامد کی زوجہ بصد رنج و تعب آنکھوں آنکھوں میں رات کاٹ کر پلنگ سے اٹھی وضو کیا نماز پڑھی مگر ابھی تک حامد نہیں آیا۔

برتن تو مانجھنا ہی نہ تھے کیونکہ وہ جھوٹے نہ ہوئے تھے۔

البتہ جھاڑو دینا اور پمپ سے گھڑوں میں پانی بھرنا ضروری تھا
ان کاموں کے انصرام کے بعد حوائج ضروری سے فراغت حاصل
کی میاں سے سینے کی بقچی آتاری آج پاجامے کی کلیاں جوڑنا
تھیں سوئی میں تاگا پرو کر کلیاں جوڑیں گوٹ تراش کر ٹانکنے لگا۔
دن نکل آیا کپڑا بقچی میں باندھکر احتیاط سے رکھدیا۔
باہر نکلکر چولھا گرم کیا۔ رات کی طرح پھر کل کھانے گرم کئے مگر اس
وقت کی محنت بھی ضایع ہوی حامد نہ آیا۔

اس کا ملال حد سے بڑھ گیا دل سے دھواں اٹھ رہا تھا۔
آنکھوں سے سیل جاری تھا خدا جانے کس جرم پر شوہر ناراض ہوا۔
اس غریب کو یہ بھی نہ معلوم تھا وہ حامد کو تغافل شعار سمجھتی ہو تو
سمجھتی ہو بیوفا نہ جانتی تھی اس کے نازک دل پر غم کا پہاڑ پھٹ
پڑا اس وقت بھی شدت غم سے کچھ نہ کھایا منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔

۷

برات سے چھٹی پا کر اتوار کی شام کو حامد گھر پہنچا راہ سے دو
پاجاموں کی نفیس چھینٹ ایک دولائی کے واسطے عمدہ نینو اور
ولایتی ساخت کی خوشنما چمکدار چوڑیوں کا جوڑا زوجہ کے واسطے
خرید لیا وہ اپنی لمبی چوڑی غیر حاضری کا انجام سمجھ چکا تھا لیکن
زوجہ نے ان اشیا پر غلط انداز نظر تک نہ ڈالی گویا ان چیزوں
سے دل سیر ہو گیا تھا وہ وقتہ فاقوں نے شاداب چہرہ کمہلا دیا
تھا ہونٹ خشک اور عارض مصفا پژمردہ ہو کر زرد پڑ گئے
تھے آنسوؤں کے سیلاب نے آنکھوں کو بے رونق کر کے ان میں
سیاہ حلقے ڈال دئے تھے اگر چلتے وقت حامد اطلاع دیجاتا تو شاید
یہ حال نہ ہوتا رخصت طلبی کی آواز کانوں میں گونج کر تسلی
دیتی رہتی اور انتظار کی کند چھری سے اس کے ارمان ذبح نہ
ہو جاتے وہ حامد کے نہ آنے کو اتفاق پر مبنی کر کے بے چین لکم

تسکین دے لیتی اس کے دل کو تقویت رہتی کہ جس وقت وہ
فرصت پائیں گے تو "اپنا مسکراتا چہرا دکھائیں گے لیکن حامد
کی یہ کج خلقی اس کے نازپروردہ دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی
تھی اور یقین ہو گیا تھا کہ میں ان کے واسطے اپنی جان تک دیدونگی
تو بھی ان کے سخت دل پر اثر نہ ہوگا دوستوں کا بیجا اسرار صرف
ایک فقرہ ہے جو دفع الوقتی کے لئے تراشا گیا ہے اگر یہ آنا چاہتے
تو کوئی باندھ نہ رکھتا میں تو پہاڑ سی رات تڑپ تڑپ کر بسر
کروں یہ رفیقوں کے ساتھ محفل نشاط میں بیٹھکر رنگ رلیاں
منائیں میں ان کے فراق میں بجائے آب و غذا خون جگر کھاؤں
یہ دعوتوں میں شریک ہو کر پلاؤ زردہ اڑائیں۔

حامد کو بگڑی ہوی طبیعتیں راضی کرنے میں کمال حاصل تھا۔
خصوصاً اس موقع پر اس نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تحفہ
تحائف اسی غرض سے لایا تھا لیکن ان کا جادو نہ چلا خوشامد
کی ہاتھ جوڑے گدگدایا شوخیاں کیں ظرافت آمیز حکایات سے
ہنسانا چاہا لیکن کچھ نہ ہوا ہزاروں کوشش کیں لیکن سعی بے حاصل
سے زیادہ وقعت نہ ہوی۔ انھیں باتوں میں کھانے کا وقت
آگیا بی بی نے اسی طرح چپ چاپ اٹھکر کھانا گرم کیا سلیقہ
مندی سے برتنوں میں نکالا سینی میں قاعدے سے لگا کر سامنے رکھدیا۔
حامد نے آج خوراک کی مقدار سے کسی قدر زیادہ کھایا
بی بی کی بھی صلاح لی۔ لیکن جواب نہ ملا۔ ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھانا چاہا۔
مگر جھٹک دیا گیا نوالہ بنا کر زبردستی منہ میں ٹھونس دیا اس
بھی بی بی نے زبان نہ ہلائی مجبوراً اسے تنہا ہی کھانا پڑا۔ اسنے
ایک ایک چیز کی تعریف میں اپنی پوری لیاقت صرف کردی۔
طرح کا پل باندھ دیا۔ لیکن بی بی کچھ ایسا بے طرح روٹھی تھیں کہ
انھوں نے خبر تک نہ لی۔

حامد سچ تو یہ ہے اگر انسان کا دل ٹھکانے ہو تو جنگل میں
منگل نظر آتا ہی اگر یہ نہیں تو سب سچ ہو گلزار خاروں سے
زیادہ پرخطر اور ہنسی رونے سے بتر بدنما تم یقین مانو یا نہ مانو
لیکن حقیقت میں اتنی بڑی محفل آنکھوں میں ہو کا مقام معلوم
ہوتی تھی وہ گھر کاٹے کھاتا تھا۔ یہی دل چاہتا تھا پر لگ جائیں
اور میں اوڑ کر تم تک پہنچ جاؤں مگر کچھ بس نہ تھا چپ کر
بھاگ آنے کی کوشش کی مگر لوگوں کی نگہداشت نے بھاگنے کا
موقع نہ دیا۔ خواہ میرے اس بیان کو لغو خیال کرو کیونکہ میں
تمہارا گنہگار ہوں تمھیں اختیار ہے جو چاہے سزا تجویز کردیو یا
مکار حیلہ ساز کہو لیکن اصلیت اسی قدر ہو جو بیان کی۔

الغرض حامد نے لفاظیوں کے ذریعہ سے بہت کچھ پھڑکتے
ہوے فقروں سے دیوار قہقہہ کی تصویر کھینچی کیونکہ پہلے یہ باتیں بڑی
کارگر ہو چکیں تھیں لیکن آج ان سے کچھ کام نہ نکلا بی بی کے
سر پر ایسا جن نہیں سوار تھا جو سہولیت سے اتر جاتا ظریف الطبع
حامد کی حیلہ لگاوٹیں بیکار گئیں۔

انھیں کارروائیوں میں رات کا اگلا حصہ گزر گیا برابر
برابر دو پلنگ بچھائے گئے میاں بی بی اپنے اپنے بستر پر
دراز ہوے حامد رات کا جاگا ہوا تھا نیند نے غلبہ کیا اور وہ
ملاپ کی ترکیبیں سوچتے سوچتے غافل سو گیا لیکن اس کی زوجہ کو
فاقہ کشی کی وجہ سے نیند نہ آتی تھی پچھلی رات تک پلنگ پر
تڑپا کی پچھلی رات کی مفرح ہوا اور نقاہت جسمانی نے اسکی
حالت پر ترس کھاکر بدقت تمام غافل کردیا۔

۸

دوسرے روز صبح سویرے حامد کی آنکھ کھلی حوائج ضروری
سے فراغت کرکے کپڑے پہننے اتنی دیر میں اس کی بی بی جاگ چکی تھی
میاں کو نوکری پہ جاتے دیکھکر جلد جلد کھانا گرم کرکے سامنے رکھا
اس وقت کوئی بات ایسی نہ ہوی جو ضبط تحریر میں آنے
کے قابل ہو وہی معمولی میل ملاپ کے دو چار جملے کہے گئے کہ
کھانا کھاکر حامد آفس چلا گیا وہاں کاموں کی کثرت سے ان
بھر اسے سوچنے کا موقع نہ ملا چار بجے چھٹی پاکر سیدھا گھر کا رخ کیا
لیکن ان راہوں سے نہ آیا کیونکہ اسے کسی دوست کے مل جانے
کا خوف تھا وہ بحر محبت کے ہلکے ہلکے تلاطم کا لطف اٹھانے کا
خوگر تھا لیکن دریا کی طغیانی اور ہلاک کردینے والی موجوں سے
ڈرتا بھی بہت تھا ذراسی ان بن سے تفریح قلب ہوتی تھی لیکن
لڑائی کا طول زندگی تلخ کردیتا تھا وہ پیچ و خم کھاتی ہوی گلیوں
سے گزرتا ہوا مکان پہنچا بی بی کو سابق کی طرح خاموش پایا
قریب بیٹھکر پان کی فرمائش کی حکم کی تعمیل ہوی پاندان کھلا
گلوریاں بنیں اور تھالی میں رکھکر پیش کردی گئیں زبان سے کچھ
نہ کہا اس وقت پھر حامد نے تالیف قلوب کے جتنے منتر یاد تھے
پڑھے جس طرح پرانی دوائی تاثیر سے خالی ہوجاتی ہو یہ منتر بھی
بے اثر نکلے۔ مختصر یہ ہے۔

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

اب تک فن رضاجوئی پہ غرہ تھا مگر اس وقت کی ناکامیابی
نے آنکھیں کھولدیں سارا گھمنڈ مٹ گیا اب تک وہ اپنے زعم
باطل میں خود کو نہیں معلوم کیا سمجھے ہوے تھا لیکن آج آستان
بے نیازی پر سر عجز خم کرتے ہی بنا عمر بھر کی مشاقی آن کی آن میں
جاتی رہی سرمایہ نازش میں جس کا نام تھا جس طرح خالی ترکش
بار دوش ہوتا ہے وہی اس وقت حامد کی خوش طبعی کی تھی۔

ای روشنئ طبع تو بر من بلا شدی

حامد "لجاجت سے بے بسی کے لہجہ میں" آخر تمہارا مطلب کیا ہے

دو روز سے نہ منہ سے بولتی ہو نہ سر سے کھیلتی ہو پانی بھی
ترک ہے اگر جان دینے کی ٹھانی ہے تو یوں ہی سہی تم سے پہلے
ہی اپنا فیصلہ کر لوں گا چلو چھٹی ہوئی خس کم جہاں پاک روز
روز کا قصہ چکا اب تو ایک قصور ہو گیا اس کی معافی چاہی
توبہ کی ہاتھ جوڑے لیکن جواب نہ ملا کاش کچھ سنکر دل کی بھڑاس
نکال لو اس گم صم سے میرا دم گھٹتا ہے۔

اسی قسم کی صدہا باتیں کیں کبھی نرمی سے معذرت کی گاہ
سختی سے دھمکایا لیکن بی بی پر اسی طرح خاموشی رہی لبوں کو جنبش
تک نہ ہوئی کھانے کا وقت آیا آج حامد نے بھی سیر ہو کر نہ
کھایا مگر اثر نہ ہوا۔

کئی روز یونہی گزرے میل کی صورت نہ پیدا ہوئی پاس
پڑوس کی عورتوں سے سفارش اٹھوائی روپ بدل بدل کر
بی بی کو خوش کرنا چاہا مگر اس کا غصہ نہ کم ہوا ضعف نے اسے
دہان پان کر دیا تھا آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں فاقہ کشی کی
وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلف ہونے لگا تھا۔

اس درمیان میں حامد نے سب جگہ کا آنا جانا موقوف
کر دیا تھا رات دن میل کرنے کی فکر میں غلطاں پیچاں رہتا
اسے اپنی حال کی حرکتوں پر سخت ندامت تھی اسی وجہ سے
اسکی فرمانبردار چاہنے والی بی بی نے اتنا بڑا صدمہ اٹھایا تھا۔
دنیا کے لیل و نہار اپنی قدیمی رفتار سے آئے اور چلے گئے
دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح ہوئی یوں ہی ہفتہ
کا دن گزر رات تمام ہو کر اتوار کی صبح نمودار ہوئی حامد
بستر سے اٹھا منہ دھو کر کپڑے بدلے اور باہر چلا گیا جاتے
ہی معاً واپس آیا۔

اس وقت اس کی صورت سے پریشانی اور فکر کے آثار پائے
جاتے تھے وہ اسی طرح گھبرایا ہوا اسباب کے کمرے میں چلا گیا۔
شوہر کو متحیر متجسس حالت میں دیکھ کر اس کی زوجہ ڈر گئی۔
کیونکہ اس نے حامد کے منہ سے جان دینے والی دھمکی سنی تھی گو
اس کا دل اسی وقت بہت مچلا تھا کہ وہ اپنا فرضی سوانگ
بدلکر دل کی اصلی تصویر پیش کر دے اور عفو تقصیر کی خواستگار
ہو لیکن اس خیال میں کہ آیندہ انھیں غیر حاضری سے باز
رکھنے کے لئے تھوڑا پریشان کرنا چاہئے اس کے بعد اصلی حالت
کا بیان کر دوں گی۔

نصف گھنٹے سے زیادہ ہو گیا لیکن حامد کوٹھری سے نہ
نکلا۔ اب اس کے دل نے نہ مانا وہ اپنی جگہ سے اٹھکر کوٹھری
میں داخل ہوئی یہاں پہنچکر اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی اس نے
پانچ سال کے عرصہ میں کبھی حامد کو ایسی جنونانہ حرکتیں کرتے
نہ دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا حامد لالٹین روشن کئے ہوئے کوٹھری کا کونہ
کونہ چھان رہا ہے۔ کپڑوں کا صندوق خالی ہے اور کپڑے
ادھر ادھر تتر بتر ہیں۔ بہت دیر تک پیکر بے حس کیطرح
خاموش کھڑی دیکھا کی جب کوٹھری میں کوئی جگہ دیکھنے کو
باقی نہ رہی تو حامد اسی انہماک کے ساتھ لالٹین لئے ہوئے
باہر نکلا۔ صحن آنگنائی اور دالان دیکھنا شروع کیا۔ اب
اس کی بیوی سے خاموش نہ رہا گیا اس نے کسی قدر مسکرا کر کہا۔

زوجہ۔ ہیں! آج تمھیں کیا ہو گیا ہے دھوپ نکلی ہوئی
ہے اور تم لالٹین روشن کر کے گھر کا کونا کونا دیکھ رہے ہو۔

حامد۔ مسکرا کر۔ جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔

زوجہ۔ میں بھی سنوں کیا چیز تھی۔

حامد۔ تمھاری زبان کئی دن سے گم ہو گئی تھی مرمٹی ڈھونڈ

رہا تھا اب اس کی سمجھ میں آیا وہ اپنا سر جھکا کر چولھے کے پاس
چلی گئی۔

حامد۔ اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا غصہ تھوک دو اور مل جاؤ

زوجہ۔ آبدیدہ ہو کر خواہ مخواہ مجھے ستاتے ہو اسلئے میں نے
بولنا چھوڑ دیا تھا۔ تمھیں میری کیا فکر ہے تم دوستوں میں بیٹھکر دل بہلاتے

حامد۔ غمگین آواز سے۔ کیا تم نے مجھے سچ مچ بیوفا ہی سمجھ لیا ہے۔

زوجہ۔ مجھے تو تجربے سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

حامد۔ تم غلطی پر ہو اگر تمھارا یہی خیال ہے تو تمھاری قیافہ
شناسی کی نسبت مجھے جتنے خیال تھے غالبًا سب بیہودہ اور غلط تھے

زوجہ۔ شاید ایسا ہی ہو۔

اس بے رحمانہ جواب سے حامد کے دل پر گھونسا پڑا
وہ غمگین صورت بنائے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر
ٹہلتا رہا۔ بازار کی سیر سے دل بہلانا چاہا۔ دوکانوں کی خوشنما
چیزوں پر نظر ڈالی۔ لیکن نگاہوں میں یہ سامان ہیچ معلوم
ہوئے۔ اخبار خرید کر پڑھنا شروع کیا کیونکہ آج سے
پہلے وہ اخبار کے مضامین نہایت دل بستگی سے پڑھا کرتا تھا
لیکن اس وقت خصوصًا کیوں دلچسپی نہ ہوی دو ایک سطریں
سرسری نظر سے دیکھیں اور اخبار توڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا
جب کہیں دل نہ لگا تو گھر واپس آیا اور پلنگ پر چادر
اوڑھکر لیٹ رہا۔

آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا گھڑیال نے بارہ
بجائے اسکی زوجہ سینی میں کھانا لگا کر لائی حامد کو چادر
اوڑھے لیٹا دیکھکر خیال کیا شاید سو رہے ہیں اس لئے
آہستہ سے پاؤں دبا کر کہا۔

زوجہ۔ کیا سوتے ہو! اٹھو کھانا کھالو۔

حامد۔ تم کھا چکیں؟

زوجہ۔ تم کھالو پھر میں بھی کھالوں گی۔

حامد۔ میں تمھارے ساتھ کھاؤں گا۔

زوجہ۔ مجھے تو بھوک نہیں ہے۔

حامد۔ مجھے بھی اشتہا نہیں ہے۔

زوجہ۔ کیوں!

حامد۔ اسلئے کہ اب تمھارے فاقے دیکھے نہیں جاتے

زوجہ۔ نہ تمھارا تغافل کم ہوگا نہ میرے فاقوں کی مصیبت ٹلیگی

حامد۔ میں تو تغافل شعار نہیں۔ اگر تمھارا خیال یہی ہے تو
خیر میں بھی اس وقت تک کھانا نہ کھاونگا جب تک تم میرے
ساتھ نہ کھاؤگی۔

شوہر کا یہ رنگ دیکھکر اس کے حواس جاتے رہے اب
سوا رضامندی ظاہر کر دینے کے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔

زوجہ۔ میں ایک شرط سے اپنا غم بھولنے کیلئے تیار ہوں اگر تم
آئندہ بجز اوقات مقررہ کے رات رات بھر اور دن دن بھر
غائب نہ رہا کرو۔

حامد۔ نوشتہ لیلو۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ اگر ضرورت ہوگی تو تمھیں اطلاع دیدونگا
لیکن شرط میری بھی تمھیں ماننا پڑیگی۔

زوجہ۔ وہ کیا۔

حامد۔ تم بھی کبھی ایسا بھروپ نہ لانا جسکے خیال سے میری روح لرزتی ہے

اسکے بعد دونوں میاں بی بی نے ساتھ کھانا کھایا کئی دن کے
بعد اصلی مسرت حاصل ہوی حامد نے کھانا کھاتے ہوئے مسکرا کر کہا مجھے
یہ خیال نہ تھا کہ تمھاری ایک ادائے بے نیازی میری عمر بھر کے کمال کو نیچا
دکھا دیگی جسکے جواب میں اسکی زوجہ بصد انداز مسکرا کر خاموش ہو رہی

جھکی ذرا چشم خشمگیں بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

بیزار ہو

بیزار ہو؟ آخر کیوں، تمھارے اس استغنا کی قسم، جس نے
حسن بے مثال کی آغوش بے پروائی میں پرورش پا کر میری
زندگی کی ظلمتوں پر نور پاشی کر کے حقیقت درد سے
خبردار کیا ہے، پوچھنے کے لئے مجبور ہوں، وہ جذبۂ اشتیاق،
جس کی گہرائیاں وصل کی تمناؤں کو بے بسی کی پریشانیوں
سے سرگرداں رکھتی ہیں، میرے دل کو بے قابو کئے ہوئے
ہے اور تم بیزار ہو۔ میری تمنائیں، صرف تمھاری ایک
نگاہ محبت بھری نگاہ کو حاصل کرنے کیلئے تمھارے
پاؤں میں لوٹتی ہیں اور تم پروا نہیں کرتے۔ میری آرزوئیں
اس ارمان میں کہ تم انھیں دیکھو۔ تمھاری رفتار پر قربان
ہونے کے لئے بڑھتی ہیں مگر تم ٹھکرا دیتے ہو میری نگاہیں
تمھارے دلفریب حسن کی بلائیں لینے کیلئے گھنٹوں بھٹکتی
پھرتی ہیں مگر تم پردہ نہیں اٹھاتے۔

سرد بے اثر آہوں کی مایوسانہ جد و جہد کے ہجوم میں بے تاثیر
نالوں کی یاس انگیز شورشوں کے درمیان جبکہ آرزوئیں
کا تقاضا یہ ارمان دل کی حسرتوں کو چھیڑتا ہوتا ہے آہ
جبکہ شوق آرزو کی فراوانیاں تخیل کی وسعتوں سے تنگ
آ کر مایوسیوں کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے روتی ہوتی ہیں۔
کس قدر چاہتا ہوں کہ تمھاری دوری کو قرب سے بدلکر
تمھیں اپنا بنا لوں اور مہجور دل کو تمھارے جلووں سے
بھر کر مستغنی ہو جاؤں۔ ان راتوں میں کہ چاند کی حسین
کرنیں بے خود ہو ہو کر تمھارے حسن جان افروز کی نورانی
شعاعوں سے ہم کنار ہونے کی آرزو کے لا حاصل میں میری
نا امیدیوں کی طرح سر پٹکتی ہوتی ہیں اور میں ۔ ۔ ۔ آہ
میں تنہائی اور کس مپرسی کی اندوہ افزا اذیتیں سہتا گزشتہ
فرقت زدہ دل کی بے قراریوں پر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا
اپنے جذبات محبت کو تمھارے آرزو کش تغافل کی یاد
کے پاؤں پر ڈالنے کے لئے بے خود ہو کر تڑپتا ہوتا ہوں جبکہ
آغاز محبت کی پریشانیاں انجام الفت کی ناکامیوں سے
اپنی تلخیوں کا گلا کرتی ہوتی ہیں اور تم میری بے قراریوں
سے محض بے پروا تسلیم خواب کی شیریں اور دلچسپ نیرنگیوں
کے روح پرور نظاروں میں محو ہوتے ہو جبکہ میری اشک آلود
آنکھیں جنھیں تمھارے دائمی انتظار کی طوالت نے نیند سے محروم
کر دیا ہے میری بد قسمتی پر حسرت کا رونا روتی ہوتی ہیں اور تمھارے
آہ گلابی ہونٹ جنھیں مسکراہٹ نے زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دیا،
ہلکے تبسم کے دلفریب گودوں میں کھیلتے ہوتے ہیں اس وقت دل
مایوس کی گھبراہٹوں سے تنگ آ کر پکار اٹھتا ہوں کاش تم میرے ہو جاؤ۔
میرے ہو جاؤ اس مختصر سی زندگی کو تمھارے تبسم کے دل افروز جلوؤں
کی حرکتوں کے حوالے کر دوں اور دور کسی ندی کے سبز کنارے
پر کنج خلوت میں بیٹھا ہوا تمھارے حسن و دلکش کے منور
نظاروں میں محو ہو کر فنا ہو جاؤں۔

امیر حسن خان

حقیقتِ ہستی

میری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی نشاں میرا

موجودات عالم کی خلقت کا راز انسان جیسے کامل اور جمیع الصفات مخلوق کی پیدائش اور ابتدا پر غور کرنے سے اچھی طرح منکشف ہوتا ہے اور صانع عالم کی بے پایاں قدرت و حکمت اس سے ظاہر ہوتی ہے جو مخلوق حیرت انگیز جسمانی اور دماغی قوتیں رکھتا ہے اس کی در اصل ایک نہایت چھوٹے بیضہ سے جس کو انگریزی میں اووم کہتے ہیں نشو و نما ہوتی ہے اس بیضیہ کا خط ایک انچ کا ۱/۱۲۵ حصہ ہوتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جھلی میں ایک نیم سیال مادہ جو مصفیٰ اولے یا پروٹوپلازم کہلاتا ہے بھرا ہوتا ہے اور اس نیم سیال مادے میں ایک اور چھوٹا سا تخم زیادہ منجمد پروٹوپلازم کا ہوتا ہے۔ تمام ذی حیات اجسام کی گوناگوں ترکیب اسی مادہ سے ہوتی ہے لیکن حیوانات اور انسان میں جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں ترکیب جسمانی کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ زن و مرد کے نطفے باہم مل جاتے ہیں اور اسی کا نام استقرار حمل ہے علم تشریح کے عالم بیان کرتے ہیں کہ استقرار حمل کے چار روز بعد رحم میں ایک بیضوی شکل کا قطرہ پایا جاتا ہے جو ایک چھوٹے مٹر کے دانے کے برابر ہوتا ہے لیکن ایک جانب سے زیادہ اور دوسرے طرف سے کم لمبا ہوتا ہے یہ دانہ ایک نہایت باریک جھلی کا بنا ہوتا ہے جس میں انڈے کی سفیدی کی طرح ایک رقیق مادہ بھرا ہوا ہوتا ہے اس وقت بھی اس مادہ میں چند چھوٹے چھوٹے ریشہ آپس میں ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو پیدا ہونے والے بچے کے نظام عصبی کی اصل و ابتدا ہیں اس کے علاوہ ریشوں کا ایک اور گچھا بھی ہوتا ہے جو تھوڑے عرصہ کے بعد آنول یا وہ حصہ بن جاتا ہے جس کے ذریعہ سے بچہ پیدا ہونے کے وقت تک اپنی خوراک حاصل کرتا رہتا ہے جنین کی بیرونی سطح میں تین تہیں نمودار ہوتی ہیں ان میں سے سب کے باہر کی تہ سے تو جلد بدن و آلات احساس اور نظام عصبی بنتے ہیں اور اندرونی تہ سے جھلیاں جو اندرونی اعضا پر منڈھی ہوتی ہیں وسطی تہ سے عضلات استخواں اور شرائین بنتے ہیں۔ اب وہ بیضہ بیچ میں سے سکڑ کر ایک قرص کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس قرص کی وسط میں ایک نلی بنتی ہے جس میں نخاع (حرام مغز) بھرا ہوتا ہے اس کی حفاظت استخوانی زنجیر یعنے ریڑھ کی ہڈی کے فقرات سے ہوتی ہے۔

اب اس عمل کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے یعنے دماغ، آنکھ، کان، ناک وغیرہ آلات احساس کی تولید اور نمو ہوتا ہے استقرار حمل کے سات روز بعد ہم اپنی آنکھ سے رحم میں بچہ کا ابتدائی خاکہ دیکھ سکتے ہیں مگر اس وقت اس کی کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ ایک انابہ

مصغر ہوتا ہے پھر بھی اس میں سر اور جسم کے ابتدائی علامات
صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں بچے کے جسم سے باریک باریک
ریشے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جو بعد میں خون کی رگیں
بن جاتی ہیں اور اس وقت انہی کے ذریعہ سے جنین خوراک
جذب کرتا ہے۔ استقرار حمل کے پندرہ روز بعد سر اچھی طرح
معلوم ہونے لگتا ہے اور چہرہ کے بڑے حصے ظاہر ہونا
شروع ہو جاتے ہیں ناک ذرا بلند ہو جاتی ہے آنکھوں
کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے دھبے پڑ جاتے ہیں اور کانوں کے
مقام پر دو سوراخ پیدا ہو جاتے ہیں۔ جنین کا جسم بھی بڑا
ہو جاتا ہے اور اوپر نیچے شانے اور کانوں کے چھوٹے
چھوٹے ابھار ظاہر ہو جاتے ہیں اس وقت تمام جسم کا طول
آدھے انچ سے بھی کم ہوتا ہے تیسرے ہفتہ کے اختتام پر
جسم تو تھوڑا بہت بڑھتا ہے لیکن ٹانگیں اور پانوں
بازو اور ہاتھ ظاہر ہو جاتے ہیں ٹانگوں کی نسبت ہاتھوں
کا نمو جلد ہوتا ہے اور انگوٹھوں کی نسبت انگلیاں جلدی
جدا ہو جاتے ہیں اس زمانہ میں جسم کے اندرونی حصے بھی
معلوم ہونے لگتے ہیں ہڈیوں کے مقامات پر جھاگ کی طرح
پتلا اور کسی قدر رقیق مادہ ہوتا ہے ان میں پسلیاں
بھی دکھائی دیتی ہیں جو ریڑھ کے دونوں طرف مثل دھاگوں
کے ہوتے ہیں اونگلیاں اور انگوٹھے بھی بال سے زیادہ موٹے
نہیں ہوتے۔

ایک ماہ بعد جنین ایک انچ لمبا ہو کر اوس کا جسم آگے
کی طرف جھک جاتا ہے اور تمام مدت حمل میں اسی طرح رہتا
ہے یا تو اس سبب سے کہ یہ وضع زیادہ آرام دہ ہوتی ہے
یا اس وجہ سے کہ اس میں جگہ کم درکار ہوتی ہے۔ اس وقت
اونگلیاں صاف طور پر معلوم ہونے لگتی ہیں چہرہ کا ہر حصہ
پہچانا جا سکتا ہے جسم کا نقشہ کھنچ جاتا ہے آنتیں الگ پہچانی
جاتی ہیں ہڈیاں بہت نرم ہوتی ہیں لیکن بعض جگہ کسی قدر
سختی پیدا ہونے لگتی ہیں۔ سرائین جو آنول تک جا کر بچے
کو خوراک پہنچاتی ہیں ناف سے نکلکر آنول پر پھیلتی ہوئی
معلوم ہوتی ہیں بعض محققین کی رائے میں لڑکے کا جنین
بہ نسبت لڑکی کے جلدی نشو و نما پاتا ہے ان کا بیان ہے کہ
تیس دن کے بعد لڑکے کے جسم کے حصے پہچانے جا سکتے ہیں
درآنحالیکہ لڑکی کے جسم کے حصے چالیس یوم تک
اچھی طرح ظاہر نہیں ہو سکتے۔ چھ ہفتہ میں جنین دو انچہ
لمبا ہو جاتا ہے اور اس کی صورت ہر روز زیادہ کامل
ہوتی جاتی ہے سر بہ نسبت جسم کے دیگر حصوں کے اب تک
زیادہ بڑا رہتا ہے پچاس دن کے جنین میں دل کی حرکت
محسوس ہوتی ہے دو ماہ کے بعد جنین دو انچ سے زیادہ
طویل ہو جاتا ہے بازوؤں اور رانوں کی ہڈیاں سخت
ہونے لگتی ہیں اور ٹھوڑی کے مقام پر جبڑے کا حصہ اوپر
کے حصے کی نسبت جلدی بڑھتا ہے ان مقامات کو بجائے
ہم استخواں کے صرف استخوانی مقامات کہہ سکتے ہیں۔
ناف کی رگیں جو پہلے برابر رہتی ہیں اب رسی کی طرح
ایک دوسرے پر بل کھانے لگتی ہیں۔ اور آنول سے ملنے
کیلئے جو ابھی تک بہت چھوٹی ہوتی ہے مائل ہوتی جاتی
ہیں تین مہینہ میں جنین تین انچہ لمبا ہو جاتا ہے اور اس کا
وزن تقریباً تین آونس ہو جاتا ہے اس وقت تک ماں کو
بچے کی حرکت محسوس نہیں ہوتی۔ لڑکی کے حمل میں بعض اوقات
حرکت چار ماہ تک بھی نہیں معلوم ہوتی۔ بعض عورتیں بچے

کی حرکت دو ماہ کے بعد بھی محسوس کر لیتی ہیں یہ نئی الاصل حرکت
کے احساس کا مدار زمانہ پر نہیں بلکہ بچہ کی طاقت اور ماں کے
اور اک نفاس کی قوت پر ہے۔

استقرار حمل کے ساڑھے چار ماہ بعد جنین (۶) سے (۷) انچ تک
لمبا ہو جاتا ہے جسم کے تمام حصے اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ
ان کا تناسب بھی شناخت کیا جا سکتا ہے انگلیوں اور
انگوٹھوں پر ناخن پیدا ہونے لگتے ہیں معدہ اور امعا خوراک
حاصل کرنے اور ہضم کرنے کا کام شروع کر دیتے ہیں اس
زمانہ میں گویا جنین کی وضع معین ہو جاتی ہے سر آگے کو
جھکا ہوا اور ٹھوڑی سینہ سے لگی ہوی ہوتی ہے گھٹنے
سر کی طرف اٹھے ہوئے ٹانگیں پیچھے کی طرف جھکی ہوتی ہیں
بعض وقت گھٹنے ایسے اونچے ہوتے ہیں کہ رخساروں سے
لگ جاتے ہیں اور پاؤں ایک دوسرے پر رکھے ہوے
اور بازو سینہ پر ہاتھ دونوں ملے ہوے اور کبھی جسم کے برابر
لٹکتے ہوے ہوتے ہیں جنین کی یہ معمولی وضع ہے لیکن کبھی
اس کی صورت بدل بھی جاتی ہے اور اس تبدیلی کے سبب
ماں کو مروڑ اور تکلیف معلوم ہوتی ہے۔

اس حالت میں قدرت سے وہ تمام اشیا جنین کو پہونچتی
ہیں جو اس کے نشو و نما کے لئے ضروری ہیں اور جوں جوں
وہ جسم میں بڑھتا جاتا ہے احتیاج بھی زیادہ فراہم ہوتی
جاتی ہیں۔ ابتداً جب وہ رحم مادر میں بڑھنا شروع ہوتا
ہے تو رحم جو پہلے چھوٹا تھا اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے
اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ ہر روز موٹا بھی ہوتا جاتا ہے مثلاً کیرہ
کو کھینچیں جس قدر طویل ہوگا اسی قدر پتلا ہو جائیگا لیکن رحم
کی حالت اس کے برعکس ہے جس قدر بڑھتا ہے زیادہ موٹا
ہو جاتا ہے۔

اس وقت تک بچہ رحم مادر میں دو جھلیوں میں لپٹا ہوا
ہوتا ہے اور ایک رقیق شفاف مادے میں جس سے وہ
کسی قدر خوراک حاصل کرتا ہے تیرا کرتا ہے لیکن بچہ کو زیادہ تر
آنول سے غذا پہونچتی ہے جو اسفنج سے مشابہ ایک مادہ ہے
اور رحم کے اندرونی حصوں سے ملکر ناف کی رگوں کے
ذریعہ سے جنین کو غذا پہونچاتا ہے ان رگوں کے ذریعہ سے
جو خون جنین تک پہونچتا ہے وہ شش میں نہیں جاتا ہے
بلکہ دل کے سیدھے طرف کے پردے دار خانوں میں داخل ہو کر
ایک سوراخ کے ذریعہ سے سیدھا دل میں چلا جاتا ہے
چونکہ جنین شش کے ذریعہ سے ہوا نہیں حاصل کر سکتا اسلئے
وہ اس وقت بیکار ہوتے ہیں آنول کسی قدر شش کا کام
انجام دیتی ہے آنول رحم کے رقیق مادے کو خون بناتا ہے
اور اس خون کو ناف کی رگوں کے ذریعہ سے دل تک پہونچاتا
ہے اور یہاں سے وہ چکر کھا کر تمام جسم میں دوڑ جاتا ہے
جنین اس حالت سے رحم میں آرام کرتا ہے قدرت اس کو بیا
غذا پہونچا دیتی ہے جو اس کی ضروریات کیلئے کافی ہے
اور اس کی حالت کیلئے جو اعضا مناسب ہیں وہ بھی
اس کو مہیا کر دئے گئے ہیں چونکہ اس کے محسوسات کم ہیں
اس کی احتیاج بھی اسی مناسبت سے کم ہے۔

رحم مادر میں بچے پر ہر وقت خواب کی سی حالت
طاری رہتی ہے جوں جوں وہ طاقت اور جسامت میں
بڑھتا ہے وہ زیادہ بیدار اور بے چین ہوتا جاتا ہے
اور رحم ہی میں اس کو ان اشیاء کی ضرورت معلوم ہونے
لگتی ہے جو اوس کو وہاں میسر نہ ہوں۔ یہ احساسات

جبلی ہیں۔ اور جب تک انسان زندہ رہے۔ اس کے دم کے ساتھ
ہیں مدت حمل نو ماہ ہے لیکن بہت سی حالتوں میں بچے سات
ماہ بعد بھی پیدا ہو کر زندہ رہتے ہیں بعض مدت معینہ سے
ایک ماہ اور زیادہ لگا دیتے ہیں لیکن عموماً نو ماہ کے بعد
بچہ شکم مادر سے آزادی کی کوشش شروع کرتا ہے۔ اس
کوشش سے تکلیف پیدا ہوتی ہے نازک اور ناتوان
عورتوں کو زیادہ اور طاقتور عورتوں کو کم۔ افریقہ کی
عورتوں کے ہاں بلا معاونت غیرے بچہ پیدا ہو جاتا ہے
اور چند گھنٹے کے بعد وہ بالکل اچھی ہو جاتی ہے یورپ
اور ایشیا کی عورتیں دوسرے کی مدد کی محتاج ہوتی ہیں۔
اور کچھ عرصہ کے بعد تندرست ہوتی ہیں۔ بچہ آزادی حاصل
کرنے کے لئے سر مارتا ہے اور جب اس کو کامیابی حاصل ہوتی
ہے تو اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے خون جو
اس وقت دل میں ایک تھوڑا راستہ طے کرکے گزرتا تھا اب
بڑا چکر کھاتا ہے دل کے وہ خانے جو آنول سے خون حاصل
کرتے تھے بند ہو جاتے ہیں شش جو اس وقت تک بیکار تھے
اب پہلے ہی پہل اپنا کام شروع کرتے ہیں اور ہوا داخل
ہو کر ان کو پھیلا دیتی ہے یہ سب سے پہلا تکلیف کا احساس
ہوتا ہے جس سے بچہ چلا اٹھتا ہے۔ انسان کی زندگی کی ابتدا
اور اختتام دونوں تکلیف کے ساتھ ہوتے ہیں کائنات
میں جو حیوان بہ تناسب جسم زیادہ عرصہ میں تکمیل کو پہونچتے
اور زیادہ مدت تک حمل میں رہتے ہیں وہ زیادہ مکمل
ہو جاتے ہیں تمام حیوانات میں انسان پیدا ہونے میں
زیادہ دیر لگاتا ہے انسان کی جسامت کے اور حیوان
چھ ماہ سے زیادہ شکم مادر میں نہیں رہتے درآنحالیکہ
انسان نو ماہ تک رہتا ہے اور پیدائش کے بعد بھی اسکی
طفولیت کا زمانہ بہت دراز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جو
حیوان ایک وقت میں ایک ہی پیدا ہوتے ہیں وہ
زیادہ کامل اور اعلیٰ ہوتے ہیں کیونکہ فطرت اپنی تمام
کوشش ایک ہی کی تکمیل میں صرف کرتی ہے۔ لیکن جہاں
توجہ منقسم ہو جاتی ہے وہاں حیوان کی تکمیل میں بہت
کمی رہ جاتی ہے اس سبب سے توام بچے ایسے قوی اور
طویل نہیں ہوتے جیسے کہ وہ بچے جو ایک دفعہ میں ایک
ہی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ فطرت کو اس میں مادے سے
جو ایک نفس کے لئے تھا دو کی پرورش کرنی پڑتی ہے
بکریاں بھیڑیں وغیرہ کئی بچے ایک وقت میں پیدا کرتی
ہیں۔ لیکن گھوڑا اور ہاتھی ایک ہی پیدا ہوتا ہے غرض
جو حیوانات خاصیت میں انسان کے قریب ہیں
وہ شریف و ممتاز ہیں۔ رینگنے والے جانور نباتات سے
ایک درجہ اعلےٰ ہیں جو جانور انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں
وہ رینگنے والے جانوروں سے ایک درجہ بلند ہیں جو حیوان
زندہ پیدا ہوتے ہیں وہ انڈے سے پیدا ہونے والوں سے
ایک درجہ بڑھے ہوئے ہیں اور ان میں جو ایک وقت میں ایک
پیدا ہوتے ہیں زیادہ کامل ہیں۔

انسان جو سب سے اشرف اعلیٰ ہے اپنی ساخت میں مجموعاً
وہ تمام کمال اور خوبیاں رکھتا ہے جو دوسرے حیوانات
بہ انفراد رکھتی ہیں اس لئے اس کی مدت قیام حمل اور مدت
طفولیت سب سے زیادہ ہے اور وہ ایک وقت میں بالطبع
ایک ہی پیدا ہوتا ہے فقط

حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

تنقید

گیتان جلی یہ سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی بنگالی نظموں کا ترجمہ ہے جو انگریزی زبان سے حضرت نیاز فتحپوری نے شستہ اردو نثر میں کیا ہے ٹیگور صاحب کے شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعرانہ جذبات کو اپنے رنگ میں ادا کرتے ہیں اور یورپ کی تقلید نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ کا کلام یکسر فطری جذبات اور وجد انگیز خیالات سے معمور ہے اور اس میں جو ادبی خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں نزاکت سادگی اور بے تکلفی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے آپ کی معاشرت فقیرانہ سادگی اور حب وطن کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اس لئے یہ اثر آپ کی نظم و نثر دونوں میں غالب رہتا ہے یورپ نے ٹیگور صاحب کو "نوبل پرائز" دیکر یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف موجودہ بنگالی علم ادب کے آفتاب ہیں بلکہ شعرائے ایشیا میں کوئی ان کی ہمسری کا دعوےٰ نہیں کر سکتا ان کی نظمیں جو ہم تک پہونچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ نے اس انتخاب میں مطلق غلطی نہیں کی۔ ان نظموں میں اظہار خیالات کے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں وہ اس قدر پر لطف و دل نشین ہیں کہ اصل واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ٹیگور صاحب کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں دل کے حقیقی جذبات اور عبد و معبود کے باہمی تعلقات کا اظہار کیا گیا ہے ایک جگہ اپنے کو مُغنی فرض کرکے خدا سے اس طرح خطاب کیا ہے:-

"جب تو مجھے گانے کا حکم دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا قلب فخر و غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا میں تیری صورت دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں"

دوسری جگہ حالت انتظار کی یوں تصویر کھینچی ہے:-

"اگر تو مجھے اپنی صورت نہ دکھائیگا اگر تو مجھے بالکل تنہا چھوڑ دیگا تو میں نہیں جانتا کہ یہ برسات کے طویل گھنٹے کیونکر کٹیں گے"

"میں ایک بھکاری لڑکی کی طرح منہ پر آنچل ڈالے بیٹھی ہوں، اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں تو میں اپنی آنکھیں جھکا کر رہ جاتی ہوں اور انھیں کوئی جواب نہیں دیتی، اور آہ، حقیقتاً میں ان سے کہہ بھی کیسے سکتی ہوں کہ مجھے تیرا انتظار ہے تو نے آنے کا وعدہ کیا ہے"

"میری حسرت اسی میں ہے کہ یونہی تیرا انتظار کیا کروں اور اس راہ کو تکتی رہوں جہاں سایہ روشنی کا تعاقب کرتا ہے اور جہاں مینہہ گرمی کی بیداری میں آتا ہے قاصد بے جانے بوجھے آسمانوں سے خبریں لیکر آتے ہیں تہنیت پیش کرتے ہیں اور سڑک پر ہولیتے ہیں میرا جی اندر سے خوش ہے اور گزرنے والی نسیم کی سانس شیریں

صبح سے شام تک میں اپنے دروازہ پر بیٹھی رہتی ہوں
اور جانتی ہوں کہ خوشی کی گھڑی حالت انتظار میں
اچانک آجائیگی۔ اسی اثنا میں میں مسکراتی ہوں،
اور اکیلی گانے لگتی ہوں کہ ہوا کسی کے وعدے کے
پیمان سے مجھے لبریز کردیتی ہے۔"

غفلت اور تمنائے دید کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:-

"وہ آیا اور میرے پہلو میں بیٹھ گیا لیکن میں نہ جاگی،
ہائے وہ نیند کیسی کمبخت نیند تھی، ذلت ہو میرے لئے!
وہ آیا جب رات خاموش و ساکن تھی، اس کے ہاتھ
میں اس کا بربط تھا اور اس کے نغموں سے میری
نیندیں معمور تھیں، افسوس کیوں میری ساری
راتیں اسی طرح ضایع ہو رہی ہیں، آہ، میں کیوں
ہمیشہ اس کا دیدار چوک جاتی ہوں جسکی سانس
میری نیند کو چھو جاتی ہے۔"

اس نظم میں گرمی کی شکایت اور حالت فراق کی جانب اشارہ کرکے آخر میں بے حد لطیف استعارہ سے کام لیا گیا ہے:-

"اے میرے خدا مدتیں گزریں کہ میرا دل تشنہ کام باران
رحمت کو ترس رہا ہے، افق (دل) خوفناک
طریقہ سے عریاں ہے، نرم بادل کی باریک سی باریک
چادر بھی نہیں، دور کی ٹھنڈی بوچھار کا آوارہ
سے آوارہ اشارہ بھی نہیں۔ موت کی طرح خوفناک
اک برہم طوفان بھیج، اگر تیرا جی چاہے اور بجلی
کے چابک سے آسمان کو یہاں سے وہاں تک
تڑپا کر رکھ دے۔ لیکن بلا لے اے آقا، واپس بلا لے
اس پھیلی ہوی خاموش گرمی، ساکت، تیز، ظالم
گرمی قلب کو خوفناک مایوسی سے بھون ڈالنے والی
گرمی کو، تیرے لطف و محبت کے بادل اوپر سے نیچے
کی طرف اس طرح مائل ہوں جس طرح باپ کے غصہ
ہونے کے وقت ماں کی پرنم نگاہ جھک جاتی ہے۔"

ذیل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پروردگار عالم کے مہر و الطاف آغوش مادر سے گوشہ قبر تک کارفرما رہتے ہیں:-

"وہ بھی اک دن تھا جب میں تیرے لئے اپنے تئیں
تیار نہ رکھ سکی، اور تو نے اے میرے بادشاہ مجمع
عام کے ایک معمولی آدمی کی طرح بغیر رکھے ہوئے
بلا میرے علم کے دل کے اندر سما کے، میری زندگی کے
بہت سے فانی لمحات پر مہر دوام ثبت کردی اور آج
جب اتفاقاً میں ان (لمحات) پر روشنی ڈالتی ہوں اور
تیرے نقوش دیکھتی ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ
وہ لمحات میرے بھولے ہوے ایام زبون کے مسرات
و آلام کی یاد کے ساتھ خاک میں ملے ہوے پڑے ہیں
خاک میں میرے طفلانہ لہو و لعب کو دیکھکر نفرت
و حقارت سے واپس نہیں گیا اور وہ قدم جنکی آواز
میں نے اپنے گھروندے میں سنی تھی، وہی ہیں جو ایک
ستارہ سے دوسرے ستارہ تک آواز بازگشت پیدا کر رہے ہیں"

غرض ساری کتاب نیچرل جذبات سے پر ہے اور ہم نہایت زور سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں شروع میں ایک ۴۲ صفحہ کا دیباچہ قابل مترجم کا لکھا ہوا ہے جس میں ٹیگور صاحب کی شاعری کے خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی چھپائی لکھائی اور جلد دیدہ زیب ہے با وصف اسکے ہماری رائے میں اسکی قیمت دو روپیہ زیادہ ہے جس سے علم دوست

حضرات کا دسترس اس دلچسپ اور قابل دید کتاب پر کل
ہو جاے گا۔ تقطیع چھوٹی اور خوشنما۔ صفحات ۱۱۲ ملنے کا پتہ
دائرۃ الادب دہلی

جذبات بھاشا

مرتبہ حضرت نیاز فتحپوری

جن حضرات کو مبدء فیاض
سے ہندی زبان کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا ذوق
سلیم عطا ہوا ہے وہ ان جذبات کے کیف سے ہمیشہ سرشار رہینگے
جن سے یہ مجموعہ بھرا ہوا ہے دوسری زبانوں میں شعر مختلف
الفاظ اور اشعار کے اجتماع سے جو دلکشی پیدا کر سکتے ہیں
ہندی شاعری کا ایک لفظ وہی لطف و اثر پیدا کرنے پر
قادر ہے، خیالات کی لطافت، جذبات کی پاکیزگی اور طرز بیان
کی دلپذیری ہندی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے
حضرت نیاز قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ہندی شعروں کا
مطلب نہایت سلیس اور دلنشیں پیرایہ میں ادا کیا ہے اور
اُن کو اس زبان سے فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے امید
کی جاتی ہے کہ یہ مختصر انتخاب آیندہ زیادہ مکمل صورت میں
پیش ہو کر اہل ملک کے مذاق شاعری کو ارفع و اعلی کر دیگا
کاغذ لکھائی چھپائی خوشنما۔ صفحات ۸۰ قیمت ۱۲ ؍ علاوہ محصول
ملنے کا پتہ ذخیرہ بک ڈپو حیدرآباد دکن اور دائرۃ الادب دہلی

انتخاب زوج

کے ایف بیگم صاحبہ دہلوی نے ناول
کے پیرایہ میں اپنے صنف کی وکالت
کا حق ادا کیا ہے اور دلپذیر انداز میں یہ بحث چھیڑی ہے کہ
والدین کو انتخاب زوج کے معاملہ میں لڑکی کے میلان طبعی
کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ لاریب یہ غفلت علی العموم خطرناک
نتایج پر منتہی ہوتی ہے اور اکثر شریف خاندان اس امر کی
زندہ شہادت ہیں کہ لڑکی کے خلاف مرضی شادی کر دینے
سے قبل از وقت موت واقع ہوتی ہے یا جانبین لطف زندگی سے
ہمیشہ کیلئے محروم ہو جاتے ہیں مگر غیر تعلیم یافتہ گھرانوں کے
قطع نظر تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے کتنے خاندان ہیں جو اس
مفید مشورہ پر کاربند ہونے کے لئے بدل آمادہ ہوں؟
مگر ہم کو اس بارہ میں ناامید نہ ہونا چاہئے کوئی مسئلہ
جو ایک زمانہ میں لاینحل معلوم ہوتا ہے امتداد ایام سے
اس کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ ہماری رائے میں لیڈیز
کانفرنس کو جسمیں ہر عمر اور ہر طبقے کی خواتین نئے اسکول
اور پرانے مدرسہ کی مخدرات جمع ہوتی ہیں اس مبحث پر
غور و خوض کرکے اس اہم مسئلہ کی گتھیوں کو سلجھانا چاہیے
اور باہمی مشورہ سے ایسی رائے اور تجویز پیش کرنا چاہیے
جو قابل عمل ہو۔ صفحات ۱۰۴ قیمت ۳ ؍ کلدار علاوہ
محصول۔ ملنے کا پتہ۔ ذخیرہ بک ڈپو حیدرآباد دکن
اور دائرۃ الادب دہلی

کاشف القلب عرف پیغام شہنشاہ

مصنفہ شہنشاہ گوپال برہمچاری

جن لوگوں کو منزل نجات کا
راستہ دریافت کرنا ہو انکی
یہ کتاب جو نثر و نظم پر مشتمل ہے رہبری کریگی، ساری کتاب
پاکیزہ خیالات، مفید ہدایات اور دلپذیر حکایات سے
بھری ہوی ہے جو لوگ روحانی بیماریوں میں مبتلا ہیں ان کے
لئے نہایت تیر بہدف نسخے اس میں تجویز کئے گئے ہیں۔
اس کتاب میں قابل لحاظ خصوصیت یہ بھی ہے کہ تکلف اور
تصنع کے شایبہ سے بالکل معرا اور سراسر آمد ہے یعنی جو
واردات شہنشاہ صاحب کے قلب پر وقتاً فوقتاً گزری

رہی ہیں یہ کتاب اُن کا مجموعہ ہے اور آپنے اس امر کی کوشش
کی ہے کہ اس میں کوئی فقرہ ایسا نہ ہو جو دل سے بے ساختہ تڑپ کے
زبان و قلم پر نہ آیا ہو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ زبان کے اعتبار سے
اکثر اسقام کتاب میں رہ جائیں مگران فرو گزاشتوں کو آپ نے
خود محسوس کیا چنانچہ الفاظ ذیل بعنوان دفع دخل تحریر کیے گئے ہیں :-

”گریمر اور قاعدے دماغ سے نکلے اور وہ اسی کیواسطے ہیں کہ جس
چیز کا ماخذ دل ہو اوسکو دل ہی قبول کرتا ہے دل کا کام دماغ اور
دماغ کا کام دل سے بالکل جداگانہ ہے اگر ہم دماغ کو آنکھیں اور
دل کو محسوس کرنے کی طاقت کہیں تو بے جا نہ ہوگا پس دل
میں سے کچھ چیز نکالنے کیلئے آنکھوں اور زبانوں اور کانوں کو بند
کرنے کی ضرورت ہے برعکس اسکے دماغ کی آورد کے لئے یہ تینوں
کھلے رہنے چاہئیں“

خواہشات نفسانی کی تکمیل کو لوگ دنیوی راحت و آرام کی سب سے بڑی منزل
خیال کرتے ہیں اور اکثر منچلے ہوس شب و روز اسی ادھیڑبن میں مبتلا رہتے
ہیں اور اسی کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں کہ جو سب سے خوبصورت عورت ہو
وہ کسی طرح ہمارے قبضہ میں آ جائے ایسے لوگوں کیلئے مندرجہ ذیل نصیحت
تازیانہ عبرت کا کام دیگی :-

”اگر کوئی مان بھی لے کہ دنیاوی عشق میں تھوڑی دیر کیلئے تو
سکھ ہوتا ہے لیکن یہ بات ماننے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا
کہ آغاز میں بھی اس سے دکھ ہوتا ہے اور آخر میں بھی پس وہ لوگ
نہایت غلطی پر ہیں جو بیچ کے تھوڑے سے سکھ کیلئے آغاز اور انجام
دونوں خراب کر لیتے ہیں جو چیز شروع میں نہیں ہوتی اور
آخر میں بھی نیست ہو جاتی ہے اس کا بیچ کا ہونا نہ ہونا
برابر ہے جس طرح ایک آگ کے تنکے سے ہزاروں پھوس
کے چھپر جل جاتے ہیں اسی طرح ایک کاماتور یا شہوت پرست
انسان سے اس کا تمام خاندان و عزیز و اقارب اگر اس کے
ساتھ رہیں جلکر خاکستر ہو جاتے ہیں راون کی مثال اس
بات کے لئے کافی ثبوت ہے“

دولت اور سیم و زر کی مذمت آپ سے ہزار در ہزار کان دنیا کی زبانی
سنی ہوگی مگر اس بارہ میں شہنشاہ صاحب نے جو فتوے صادر کیا ہے وہ
اپنی طرز میں بالکل نرالا ہونے کے باوجود اصولی امور سے مستنبط ہے :-

”دنیا بھر کی ساری چیزیں دولت کے تیاگ سے حاصل ہوتی ہیں
اس سے یہ ثابت ہوا کہ دنیا کی سب چیزوں سے روپیہ پیسہ کم قیمت
کا ہے اگر پیسہ مٹی سے زیادہ کام کا ہوتا تو مٹی کے عوض دنیا کو
گوارا نہ کرتا“ ”دولت کا نہ ہونا غریبی نہیں بلکہ اوس کو
پیدا کرنے کی بجا فکر غریبی اور ناداری ہے لیکن اسمیں شک نہیں کہ
دولت کا ہونا نہ ہونے سے برتر اور بہتر ہے ؎
”تہیدستوں کا درجہ اہل دولت سے زیادہ ہے صراحی سر جھکا دیتی ہے جبکہ جام آتا ہے
قدرت نے جتنی چیزیں بنائی ہیں وہ سب کی سب آرام کیلئے ہیں
اسمیں شک نہیں اگر کوئی کہے کہ دولت بھی آرام کیلئے ہے ٹھیک
ہے مگر وہ تب ہی آرام کیلئے ہو سکتی ہے جب تیاگی جاوے
اگر دولت نہ ہوتی تو تیاگ (داد و دہش) کا آنند کبھی نہ آتا
پھر اگر یہ پوچھو کہ غریب آدمی جس کے پاس دولت ہے ہی نہیں
تیاگ وہ کس کا کرے غور سے کام لو کہ جو چیز پاس ہے اس کا تیاگ
آسان ہے لیکن جو چیز پاس نہیں اور اسکی آشا (امید) بنی رہتی
ہے اس کا تیاگ کرنا نہایت مشکل ہے یعنی غریب لوگ اس کی
آشا کا تیاگ کر کے وہی آنند (خوشی) لے سکتے ہیں جو کہ امیر
اپنی ساری سلطنت کو تیاگ کے حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس سے
کچھ زیادہ“ کس قدر پاکیزہ خیال ہے۔
آپ کی رائے میں حقیقی آزادی اسوقت میسر ہو سکتی ہے جبکہ دل آزاد ہو

میں ہو اور دل پر اسوقت قابو حاصل ہو سکتا ہے جب توجہ پوری اور کامل ہو۔ گیان۔ پوجا۔ نماز۔ بھجن روزے یہ سب گورکھ دھندے اسلئے ہیں کہ من پر قابو ہو مگر وہ لوگ کس قدر قابل رحم ہیں جو ایسے منازل طے کرنے پر بھی اپنی توجہہ کو یکسو نہیں کر سکتے۔ مدتوں کورے کے کورے رہتے اور امراض دل میں مبتلا رہکر ملول رہتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کاموں کا سر انجام رسمی طور پر کیا جاتا ہے۔ دھیان اچھی طرح نہیں کرتے اور ایسے موقعوں پر ان کا من غیر حاضر رہتا ہے من کو قابو میں کرنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس کو برے کاموں سے ہٹاؤ اور اچھے کاموں میں لگاؤ جس طرح جسم کو طاقتور بنانے کیلئے ورزش نہایت ضروری بات ہے اسی طرح من کو قوی کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اس کو سچا خود نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اسے وہ کام کرنے پر مجبور کیا جائے جو اچھا ہو اور برے کاموں سے باز رکھنے کیلئے ہمت و استقلال سے کام لیا جائے۔

ایک جگہ مرشد کی خصوصیات اور اس کی شناخت کا طریقہ یوں بیان کیا ہے:۔

"بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ مہاتما یا خدا رسیدہ لوگ کسی خاص زمانے میں ہوتے ہیں یا یہ کہ وہ زمانہ اور تھا جسمیں کہ ایسے لوگ ہوئے یہ خیال ان کا ٹھیک نہیں ایسے مہاتما سدا رہتے ہیں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ وہ اکثر اپنے آپ کو حتی الوسع ظاہر نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کو سوائے نقصان کے نفع کچھ نہیں بالفرض اگر دنیا ان کو سراہے یا ان سے خوش بھی ہو جاوے تو ان کے واسطے وہ کیا کر سکتی ہے وہ بیچاری خود بیزار، بیمار اور دکھ درد رنج تکلیف پریشانی یہی چیزیں اس کے پاس ہیں قدرتی بات ہے کہ جو چیز جس کے پاس ہوتی ہے وہی دوسرے کو دے سکتا ہے پس اگر دنیا کسی سے خوش بھی ہو جائے تو کنکر پتھر کے سوائے اس کے پاس دینے کو اور کچھ نہیں یا وہ چیزیں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے پس جو اونچے درجے کے اور اصل مہاتما ہوتے ہیں وہ دنیا داروں سے زیادہ التفات نہیں کرتے ہاں کبھی کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر دنیا کے لوگوں پر ظاہر ہو کر ان کی تشنگی دور کر دیتے ہیں"

رنج و راحت کے فلسفہ کی یوں تشریح کی ہے:۔

"کسی بات کا ٹھیک سمجھ لینا گیان ہے اور ٹھیک نہ سمجھنا اگیان۔ پس سارے دکھ گیان سے ادا ہوتے ہیں اور صرف اگیان میں تمام دکھوں کی کان ہے سکھ یا انند صرف اسی شخص کے حصہ میں ہے جو راضی برضا ہے۔

نانک دکھیا سب سنسار وہی سکھی جس نام آدھار

الغرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ قوم کے نوجوان اس کو ضرور پڑھیں اسمیں روحانی امراض کے اسباب و علامات نہایت واضح طور پر بتلانے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کا علاج بھی ایسا تجویز کیا گیا ہے جو بآسانی میسر آسکتا ہے قیمت (۱۲) صفحات (۲۲۴) ملنے کا پتہ:۔ ہندوستان اسٹیم پریس لاہور

کلام محروم

یہ منشی تلوک صاحب محروم کی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مشہور رسالوں میں شائع ہوا کی ہیں انداز بیان کی پسندیدگی اور جذبات کی خوبی کے لحاظ سے یہ مرقعہ قابل دید ہے اس کے صفحات تمدنی، ادبی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل اور لطافت شعری و مظاہر فطرتی کی دلچسپ کیفیتوں سے معمور ہیں شروع میں منشی صاحب کی فوٹو تصویر سے اسی مجموعہ کی زینت ہوئی ہے اور آخر میں اکثر مشاہیر ملک کی پسندیدہ رائیں درج ہیں۔ صفحات (۱۵۰) قیمت (۱۲)

ملنے کا پتہ:۔ لالہ منی رام کالر اٹیچر وکٹوریہ بھراتری ہائی اسکول ڈیرہ اسمعیل خاں۔

رہنمائے مسافران ریلوے

مرتبہ بابو ہنرراج صاحب ہیڈ کلرک دفتر ڈسٹرکٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ ریلوے کوچہ سیٹھ دہلی۔ یہ (۴۴۸) صفحہ کی کتاب ہے جسمیں بہ ترتیب حروف تہجی ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے ریلوے اسٹیشنوں کے مختصر حالات، تاریخی واقعات اور کرایہ ریل کی تفصیل مسافروں کی سہولت و واقفیت کی خاطر درج کی گئی ہے اور سفر یورپ کے متعلق بھی مفید ہدایات جمع کئے گئے ہیں آخر میں بہ نظر سہولت ہندوستان کے ریلوے لائنوں کا ایک مکمل نقشہ بھی شامل کیا گیا ہے کتاب اسم بامسمی اور نہایت دلچسپ مفید ہے قیمت ۱۲ ار بہ لحاظ حجم اور محنت کے واجبی ہے۔

رسالہ شعلہ دہلی

اسمیں طالبان حق کیلئے روحانی غذا کا دسترخوان نہایت خوش سلیقگی سے آراستہ کیا جاتا ہے اعلی تعلیم یافتہ اور عوام کے طبقوں میں اسکی مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے اور لوگ اس کو شوق و محبت سے دیکھتے ہیں اسمیں علمی و اخلاقی مضامین بھی دلچسپ انداز کے ہوتے ہیں اور ترتیب چھپائی حضرت مدیر کی قابل تحسین شفقت کی پوری شہادت دیتی ہے غرض شعلہ عرفان، اور حق شناسی پاکیزہ خیالات اور مذہبی صداقتوں کا قابل تعریف مجموعہ ہے طالبان حقیقت کو اسکی دل سے قدر کرنا چاہیے قیمت سالانہ ہے۔ پتہ ۸ محلہ چوڑیگران دہلی

نظارہ

ہمارے پاس اس نام کے دو رسالے بغرض تبادلہ و ریویو وصول ہوئے ہیں نظارہ تو ہر جگہ سے ہو سکتا ہے مگر ان میں خصوصیت یہ ہے کہ پہلا نظارہ میرٹھ سے اور دوسرا لاہور سے جلوہ افروز چشم نظارگیاں ہوتا ہے میرٹھ والے نظارہ کے ایڈیٹر مولانا حمید میرٹھی ہیں جنکے نام اور کلام سے اردو خواں پبلک بخوبی آشنا ہے یہ نظارہ اپنی عمر کی چار پانچ منزلیں طے کر چکا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب اسکو کامیاب بنانے میں بدل ساعی رہتے ہیں اسلئے کہ اسکی حالت کیا بلحاظ ترتیب مضامین اور کیا بلحاظ لکھائی چھپائی ہر طرح قابل اطمینان ہے مشہور اہل قلم حضرات بھی اس سے دلچسپی لیتے ہیں۔ بڑی سائز کے اڑتیس صفحوں پر دو کالم میں یہ رسالہ چھپتا ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ پبلک اسکی قدر کرے۔ سرورق پر نظارہ کو "اردو کا آفتاب" کہا جاتا ہے ہماری رائے میں اگر یہ فقرہ آیندہ سے حذف کر دیا جائے تو نامناسب ہوگا اسلئے کہ اس سے ایک قسم کی خودستائی ظاہر ہوتی ہے حالانکہ لقب وہ جو قوم سے تعریف وہ جو لوگ کریں مقبولیت وہ جو لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھکے بولے ہم لوکام سے کام رکھنا چاہیے۔ لیڈر یا بینش کا کام ہے کہ وہ حسن کارگزاری کے لحاظ سے کام کی قدر کریں اور ہم کو آسمان کا طرہ دستار بنائیں۔ اس میں ایک مضمون شمع پر منظوم ہے اسکی فارسیت کے اعلی درجہ پر فائق ہونے کا جناب ایڈیٹر صاحب نے بہت دعوی کیا ہے بلکہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اب تمام ہندوستان فارسی کی شاعری سے بے بہرہ ہے مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ اول تو اردو کے رسالہ میں فارسی نظم کچھ بے لطف معلوم ہوتی ہے اور نظم بھی ایسی جسمیں خاقانی کا منہ چڑایا گیا ہے دوسرے اتنا کہنا ضروری ہے کہ آپ کا دعوی فارسیت کا خود اسی نظم کے ایک مصرع سے باطل ہے وہ مصرع یہ ہے۔

از رخ گلنار نارم رشک گلزار خلیل

شمع کہتی ہے کہ میرے رخ گلنار کی وجہ سے میری آگ گلزار ابراہیم کو تپک دیتی ہے بحث اتنی ہے کہ رخ گلنار کہنا غلط فارسی ہے گلنار انار کی کلی یا پھول کو کہتے ہیں اہل زبان اس مقام پر گلنار رنگ یا گلناری کہتے ہیں رخ گلنار کہنا اور اس سے رخ سرخ مراد لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے بعض لوگ اردو میں

مے زعفران بھی باندھ جاتے ہیں حالانکہ زعفران ایک سرخ رنگ کے پھول کا نام ہے مے زعفرانی کہنا چاہئے محض مئے زعفران کسی اہل زبان نے آج تک نہیں کہا شمع کے رخ گلنار میں ویسی ہی غلطی ہے جیسے ایک صاحب نے چرخ چنبری کی جگہ چرخ چنبر باندھ دیا تھا غرض کہ رخ گلنار کی ترکیب پر جس شخص کو نظر نہ ہو اسکے متعلق آپ کا یہ فرمانا کہ ان کا شل نہیں ہے ایک ایڈیٹر کی شان کے خلاف ہے قیمت سالانہ ہے نمونہ ۵ ر دارالاشاعت اندر کورٹ میرٹھ۔

نظارہ لاہور

منشی لال چند فلک کی زیر ادارت جنوری ۱۹۱۶ء سے سرکش اولی الانظار ہوا ہے فروری نمبر ہمارے سامنے ہے جسمیں باستثناء دو چار کے تقریباً کل مضامین نظم و نثر منشی فلک صاحب کی جگر کاوی کا نتیجہ ہیں اسمیں یہی ایک بات ایسی ہے جو ہم کو ایڈیٹر صاحب کی ہمت اور حوصلہ کی بے ساختہ تعریف پر آمادہ کرتی ہے اور یہہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ماشاء اللہ بلا امداد غیر انواع و اقسام کے مضامین تحریر کرنے کی کافی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دیگر اہل قلم حضرات کو بھی تکلیف خامہ فرسائی دیجائے تو امید ہے کہ ہر مرتبہ اس قدر محنت و جگر کاوی کی ضرورت لاحق نہ ہوگی اسلئے کہ خاکدان ہند میں مضمون نگار حضرات کی ایسی کساد بازاری نہیں ہے رسالہ بلحاظ اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے ملک کی طرف سے حوصلہ افزائی کا حق رکھتا ہے۔ ہر مہینہ عمدہ مضامین، پرمعنی اشعار، جرأت آمیز واقعات، دلچسپ حکایات، سبق آموز انسانی حالات، اخلاقی ہدایات اور مفید مطلب معلومات سے ناظرین کی ضیافت کیجاتی ہے۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ ایک رسالہ اسی نام کا ہوتے ہوئے پھر اسی نام کو کیوں اختیار کیا گیا ہے حالانکہ بجائے اسکے بہتر سے بہتر نام مل سکتے تھے اور اگر ایڈیٹر صاحب چاہیں تو اب بھی مل سکتے ہیں یہ تو بعید از قیاس ہے کہ نظارہ میرٹھ سے جسکو نکلے ہوئے چوتھا یا پانچواں مہینہ ہے ایڈیٹر صاحب لاعلم تھے بہرحال توارد اتفاقیہ ہو تو برا نہیں معلوم ہوتا مگر بالعمد توارد کو توارد نہیں کہتے بلکہ اس کا نام نقل و اتباع ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظارہ میرٹھ کے کسی امر کی اسمیں تقلید و نقل نہیں کیگئی ہے بلکہ یہ پرچہ بجائے خود ایک طرز خاص اور انداز جدید رکھتا ہے جو دوسرے رسالوں سے علانیہ طور پر مختلف ہے۔ پھر چاہئے کہ نام کے لحاظ سے بھی لاثانی ہو۔ آیندہ سے فہرست مضامین کے ساتھ مضمون نگار کا نام بھی ضرور رہنا چاہئے صفحات (۴۸) لکھائی چھپائی عمدہ قیمت سالانہ ہے نمونہ ۴ر پتہ۔ دفتر نظارہ لاہور

عبرت

روہیلکھنڈ کے ایک ویران گوشہ سے اس نام کا ایک تاریخی رسالہ جنوری ۱۹۱۶ء سے شایع ہو رہا ہے اسکے مضامین تمامتر تاریخی واقعات سے مملو رہتے ہیں اور اس مقصد کو پیش نظر رکھکر نکالا گیا ہے کہ علاوہ دلچسپ تاریخی معلومات کے جو غلط واقعات لاعلمی کی وجہ سے شایع ہو جاتے ہیں اسکے ذریعہ سے انکی تنقیح و تصحیح کیجاے ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں یہ اپنی طرز کا اکیلا رسالہ ہے ایسے لوگ بہت کم ہونگے جنکو تاریخ سے کم و بیش دلبستگی نہ ہو اسلئے امید ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جائیگا علاوہ تاریخی خصوصیات کے یہ رسالہ ضمناً اخلاقی مذہبی و تمدنی خدمات بھی انجام دیتا ہے قیمت عه سالانہ بلحاظ ضخامت (۴۰) صفحات بالکل اچھی ہے۔ پتہ رسالہ عبرت نجیب آباد ضلع بجنور

تمدن لکھنؤ

یہ وہی مشہور رسالہ ہے جو مولانا عبدالراشد الخیری کی زیر ایڈیٹری دوران اقامت دہلی میں سند قبولیت حاصل کر چکا ہے لکھنؤ سے اب یم اے قاری دہلوی خلف قاری محمد سرفراز حسین صاحب جو مشہور سیاح جاپان ہیں اسکو نکال رہے ہیں ظاہری و معنوی خوبیوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور وہی شان پائی جاتی ہے جو دہلی میں تھی صرف فرق اسقدر ہے کہ اب تصویریں اسکے ساتھ شایع نہیں ہوتی مگر ایڈیٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ اس کمی کو بھی وہ بہت جلد پورا کر دینگے ہم کو امید ہے کہ یہ سرزمین اسکے لئے مبارک ثابت ہوگی قیمت سالانہ ہے صفحات (۴۸) مقام اشاعت پل جھاؤلال لکھنؤ

"سلطان القلم"

شاہ دکن کی شبیہ مبارک دیکھکر

شاہِ دکن کی شبیہ مبارک دیکھکر

اے شہنشاہ زمن حامی دینِ اسلام | تجھ سے قائم ہے زمانہ میں حکومت کا نظام
شہریارِ دکن و فخرِ سلاطینِ جہاں | آیۂ رحمتِ حق ظلِ خداوند انام
بانیٔ امن و اماں موجدِ عدل و انصاف | مرکزِ لطف و عطا مایۂ جود و اکرام
فیض سے تیرے ہوا لطف و کرم کا احداث | عدل سے تیرے ہوا ظلم و ستم کا اعدام
ختم سادات کی ہے شانِ جلالت تجھ پر | تیرے آبا تھے پیمبر ترے اجداد امام
حامی دینِ مبیں لمعۂ انوارِ جلال | حاملِ شرعِ نبی ظلِ خداوند انام
بادشاہی تری میراثِ قدیم و دیریں | حکمراں اُن کی تیرے بزرگانِ کرام

خاندانی ہے لقب تیرا نظام آصف جاہ (خلد اللہ ملکہ)
میر عثمان علیخان (خلد اللہ ملکہ) بہادر ترا نام

اور بھی ان کے سوا کتنے ہی القاب و خطاب | ہیں ترے نام سے وابستہ بطرزِ اعظام
نام نامی میں ترے وہ بخشی ہے خدا نے برکت | جان کرتے ہیں فدا تجھ پہ خواص و عوام
تیری خلقت سے مشیت تھی یہی خالق کی | دینِ محکم کو ابھی اور بھی ہو استحکام
کوئی دنیا میں نہیں فخر و جلال ایسا | سب سے اول ہے تو ہی گرچہ تو سابع ہے نظام
صاحبِ تاج و نگیں وارث میراثِ نبی | زورِ بازوئے علی پشت پناہ اسلام
صلحِ کل ہیں ترے آئینِ حکومت ایسے | کہ ترے ملک میں ہیں شیر و شکر کل اقوام
مختلف مذہب و ملت میں نہیں کوئی بگاڑ | اختلافاتِ مذاہب سے کسی کو نہیں کام
شاد ہندو و مسلمان و مسیحی سب ہیں | زندگی عیش سے کٹتی ہے خوشی سے ایام
ہر طرف ملک میں ہیں علم و ہنر کے چرچے | شاد و آباد ہیں سب خاص سے لیکر تا عام
ساری دنیا سمٹ آئے ہیں یہاں اہلِ کمال | ہند سے تا بہ عرب روم سے لیکر تا شام
قدردانی کا یہی گھر ہے یہی ہے مرکز | اہلِ فن کا یہی مرجع ہے یہی جائے مقام
تجھکو دیتے ہیں دعائیں کہ رعایا ہیں تری | ایسی راحت کہیں ممکن ہے نہ ایسا آرام
بسکہ ہے فیض رساں ذاتِ ہمایوں تیری | چین کرتے ہیں ترے عہد میں جمہورِ انام
مانعِ فکرِ معیشت ہے ترا لطفِ عمیم | چارہ سازِ غم و افلاس ہے تری بخشش عام

کامرانی ہو نصیب تجھے یہ دعا ہے ہر وقت
عظمت و دولت و اقبال رہے تیرے غلام

اخگر اجیگری

ماتمِ شباب

آخر ہوا شباب وہ دورِ جنوں نہیں رہا | لو صبح ہو گئی شبِ عشرت نہیں رہی
پچھلے کی چاندنی ہیں یہ کچھ سفید بال | جاڑوں کی دھوپ ہیں وہ حرارت نہیں رہی
سیماب کشتہ ہو گیا کافورِ شیب سے | بے چین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی
سکتہ میں ہیں آئینہ دکھلا کے چارہ گر | اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی
دل کو سنبھالے رہتے تھے پہلے جوان آپ | خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی
نامہ بر گو کہ سراپا سنجاب ہیں | نامہ بری نبض میں ہے رعشت نہیں رہی
تلووں کو شوق خارِ مغیلاں میں رہ گیا | سر میں ہوائے بادیہ وحشت نہیں رہی
وہ انتظارِ وصل کی شب کا گزر گیا | وہ بیقراری شبِ فرقت نہیں رہی
ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر | مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی ہوا | لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی بات | لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی
ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پہ آب و تاب | لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی
گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا | باقی وہ ولولے وہ جوانی میں لذت نہیں رہی
اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار | وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

جاتا رہا شباب ۔ رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب ۔ قیامت نہیں رہی

علی حیدر طباطبائی

جاڑا

گئی ہے جو برسات آیا ہے جاڑا
زمانے میں سردی نے جھنڈا ہے گاڑا

شب و روز ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
برودت کی تکلیف دل ہل رہی ہے

نئے رنگ ہے اب تو جاڑا ابلتا
خلایق کے منہہ سے دھواں ہے نکلتا

گری برف گلزار عالم میں بےحد
شجر جم گئے مثل کوہِ زمرد

ہوا کرتی ہے برف باری مسلسل
سفید آ رہے ہیں نظر سبز جنگل

جمے بیٹھے ہیں جانور آشیاں میں
کچھ ایسا ہے پالا پڑا بوستاں میں

درختوں کو ہے چھیڑتی بادِ صرصر
نہیں جھومتے۔ کانپتے ہیں مقرر

چمن میں یہہ جاڑے نے شورش مچائی
کہ شاخوں نے پتوں کی اوڑھی رضائی

خلافِ آتشِ گل سے ایسا ہوا ہے
گلستاں بھی سردی سے ٹھنڈا پڑا ہے

پڑی اوس امسال ایسی چمن میں
کہ افسردگی ہے گلِ نارون میں

چکوروں کا ہے بھوک سے حال ابتر
سمجھتے ہیں انگاروں کو سرخ پتھر

ہر اک قطرہ شبنم کا موتی بنا ہے
درختوں کی شاخوں پہ ایسا جما ہے

یہ کہرے کی شدت ہے اللہ اکبر
ہے باغ عالم کا تاریک منظر

مزاجوں سے سردی بہم ہو گئی ہے
عزیزی حرارت بھی کم ہو گئی ہے

برودت کا اتنا اثر بڑھ گیا ہے
کرہ نار کا زمہریر اب ہوا ہے

ہوئی سرد آتش مزاجوں کی گرمی
گھٹا دل جلانا بڑی سرد مہری

محبت پہ اب اوس ایسی پڑی ہے
احبا سے بھی گرمجوشی مٹی ہے

لحافوں کو انسان لپیٹے ہوئے ہیں
ہر اک ہاتھ اندر سمیٹے ہوئے ہیں

ہوا سرو ایسا روئی کا لبادہ
کہ چلنے میں ہے جسم جھک کر کبادہ

برودت کی ایذا اوٹھائے ہوے ہیں
بشر آگ سے لو لگائے ہوے ہیں

زیادہ ہوئی آگ سے یہ محبت
مجوسی نظر آتی ہے ساری خلقت

ہوا گونجتی ہے جو ٹھنڈی گھروں میں
کیے ہے عمل اپنا سردی گھروں میں

کیا ایسا موسم نے پانی کو ٹھنڈا
ہر اک ظرف ہے کوزۂ برف گویا

برودت حرارت پہ غالب ہوئی ہے
کہ یہہ ہم چراغوں کی لو کانپتی ہے

مغنی جو بھولے سے گاتا ہے دیپک
ادا منہہ سے ہوتی نہیں لو رہی تب تک

اکھاڑا ابھی اندر کا ٹھنڈا پڑا ہے
ہری راگ کا دور دورا ہوا ہے

یہ سردی ہے شیروں کا زہرہ ہے پانی
سمجھتے ہیں آئی بلا آسمانی

کیا ترک اپنا ترائی کا مسکن
چلے آتے ہیں کانپتے سمت گلخن

شراروں سے مفقود گرمی ہوئی ہے
ہر اک شے میں ساری یہ سردی ہوئی ہے

مبدل برودت سے ہے دل کی گرمی
نکلنے لگی منہہ سے بھی سانس ٹھنڈی

خلایق پہ جاڑے کے جوہر کھلے ہیں
کہ اب دانت سے دانت بجنے لگے ہیں

ہوے ہیں جو اونچے بخارات ارضی
زیادہ ہوا اور بھی زور سردی

فلک پر ہے خورشید کا اب یہ نقشا
ہوا صورت قرصِ کافور ٹھنڈا

کسی مہروش کا نہیں زور چلتا
کلیجا ہے سردی سے ہاتھوں اچھلتا

بطِ مے جمی یوں کہ چلتی نہیں ہے
پری شیشے سے اب نکلتی نہیں ہے

تحیر میں ہے ساقیٔ آتشیں خو
نہ غمزہ ہے باقی نہ ہلتے ہیں ابرو

سبو مے سے لبریز اک جا پڑے ہیں
کہیں مغبچے کانپتے سب کھڑے ہیں

ہر اک شیشے میں کاگ ہے جم کے بیٹھا
ابھارے سے بھی اب نہیں ہے ابھرتا

گلاس ایسے مے کے بھرے اب جمے ہیں
کہ سب برف کے آبخورے بنے ہیں

جو نشہ ہے کم۔ درد سر میں سوا ہے
ہر اک بادہ کش منہہ لپیٹے پڑا ہے

کسانوں پہ بھی آئی ہے یہ مصیبت
جلائی ہے پالے نے ساری زراعت

غریبوں کو آفت سے پالا پڑا ہے
کہ سب کھیت کا کھیت سوکھا کھڑا ہے

کشاورز سب فاقوں میں مبتلا ہیں
گرفتارِ غم ہیں اسیر بلا ہیں

گئی رخ سے ہر آدمی کی طراوت
نمایاں ہے چہروں سے سب کے یبوست

گرانی پہ دانتوں کے ٹھنڈی غذا ہے
برودت سے ہر لقمہ اولا بنا ہے

نہ پانی سے مطلب نہ دلنے سے مطلب
فقط رہ گیا دھوپ کھانے سے مطلب

تماشا دکھاتی ہے اپنا یہ سردی
گلوں میں ہیں لٹکائے انساں انگیٹھی

یہ جاڑے کا عالم یہ سردی کی کثرت ہوئی برف کو بھی نمد کی ضرورت
برودت سے پارہ جو نیچا ہوا ہے حرارت کا پتا نہ اترا ہوا ہے
بھلا حال سردی کا کیونکر بیاں ہو قلم بھی نہ جب انگلیوں سے رواں ہو
یہ اندھیر کہرے نے برپا کیا ہے کہ جاڑے کا مضموں نہیں سوجھتا ہے
نہ گرمی رہیگی نہ سردی رہے گی نہ سبزی رہیگی نہ زردی رہیگی
نہ الوان ہوں گے نہ اجسام ہوں گے نہ انواع ہوں گے نہ اقسام ہوں گے
نہ فرعیں ہوں گی نہ اصلیں ہوں گی نہ موسم رہیں گے نہ فصلیں ہوں گی
نہ برسات کا زور باقی رہیگا نہ دریاؤں کا شور باقی رہیگا
نہ عشرت رہیگی نہ عسرت رہیگی نہ راحت رہیگی نہ کلفت رہیگی
فنا ہونے والی یہ سب حالتیں ہیں کبھی مٹنے والی یہ کیفیتیں ہیں
نہ یہ سرد و گرم زمانہ رہے گا ہمیشہ خدائے یگانہ رہے گا
یہی بات ہے شیفتہ سب سے احسن
رہے شمع یادِ خدا دل میں روشن

شیفتہ کنتوری

اگلی دلچسپیاں

کچھ ایسی نہ تھیں اگلی دلچسپیاں جنھیں بھول جائے کوئی مہرباں
بتاؤ تو اے اخترانِ فلک ان آنکھوں سے دیکھا ہے کیا کیا سماں
تمھاری تو صورت کہے دیتی ہے کہ سب دیکھ ڈالا ہے تم نے جہاں
جھپکتی نہیں ایک پل بھی پلک رہا کرتے ہو رونقِ آسماں
خصوصاً وہ حیرت بھری رات ہے ق کہ جب تھے اس دور کے درمیاں
تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آنکھ سے گذر جاتی ہے شب پرانے نشاں
سحر تک جھپک جاتی ہیں یاس سے تمھاری وہ آنسو بھری انکھڑیاں
عجب لطف کی ہے نسیمِ سحر قیامت کی ہیں اس کی اٹھکیلیاں
مگر جب وہ افسردہ دل کی طرح چلی ڈھونڈنے اگلی سرسبزیاں
تو اجڑے ہوئے پائے ایسے چمن کہ جو رونقِ دہر تھے بے گماں
وہ اگلے مورخ جو طے کرتے تھے ترقی میں جو کر گئی آسماں
قیامت کا ہوتا ہے اس میں اثر سناتی ہے جو حال ان کی زباں
وہ عالی منش بادشاہان دہر وہ انکی سواری وہ تختِ رواں
وہ طلاب دن رات محنت سے جو لگاتے ہیں امید کی سیڑھیاں
مبارک تھیں شائستہ وہ محفلیں مبارک تھی وہ بزمِ اسپیکراں
وہ نکھری ہوئی صحبتیں کامیاب جو وحدت پرستی کی تھیں ترجماں
وہ علمِ الٰہی کے اجلاسِ پاک مجالس مدارس کے وہ قدرداں
وہ اگلے پیادہ روی کے سفر وہ فاقہ کی سوکھی ہوئی روٹیاں
سمندر اولوالعزمیوں سے تھے پر انھیں ہمتوں سے تھے دریا رواں
جہازوں کے وہ نامور ناخدا وہ اہرام مصری کی صناعیاں
وہ بڈھے مقدس وقائع نگار وہ سچ بولنے والے پیر و جواں
جب اقبال کی چل رہی تھی ہوا جب ادبار کا تھا نہ نام و نشاں
منور تھی تہذیب کی انجمن شجاعت دکھاتی تھی بدمستیاں
نہ تھی قحط سالی نہ طاعون تھا بہشت بریں تھا یہ ہندوستاں
زباں سے جو کہدیں وہ کر کے دکھائیں نہ افسوس دولت نہ افسوس جاں
کہاں تک نہ کہے جائے یہ کتھا مزے کی ہے حسرت بھری داستاں
یہ نقشِ طلسمی زمانہ نے سب مٹائے مٹا کر کئے رائگاں
نہ وہ اگلی باتیں نہ وہ اگلے لوگ مگر ان کی باقی ہیں دلچسپیاں
بس اب خواب غفلت سے بیدار ہوں جو موجود ہیں قوم میں نوجواں
کریں ایسی کوشش کریں ایسے کام
زمانہ پس مرگ ہو قدرداں

عشرت لکھنوی

اشکِ ناکامی

مہماں کی صورت بھی گھڑی بھر نہ رہے آ کے — دربان کے ترے صدقے در پر رہے سو آئے
تقدیر کو ہم اپنی دل تھام کے رو آئے — ہر خاک کے ذرے کو اشکوں سے بھگو آئے
ہمراہ مرے کل وسائل یہ بھی ہیں آئے — دریائے محبت میں مجھکو تو ڈبو آئے
ہاں دیکھ کے حالت اغیار بھی رو آئے — دل کھو کے بھی پایا ہم جان بھی کھو آئے
کمظرف کہیں کیونکر اس دیدہ گریاں کو — نظروں میں نہیں لاتا یہ نوح کے طوفاں کو
اک بحر بنایا ہے رو رو کے بیاباں کو — وحشت نے رلایا تھا صحرا کو ڈبو آئے
انجام نہ کچھ سوچا مشکل میں تمہیں باسط — غیروں کے مقابل تم کیوں آئے کہ کھو آئے
کوشش سے محبت میں ہرگز نہ رہے قاصر — بحر غم الفت میں چھپ چھپ کے ہیں ہو آئے
اے گریۂ ناکامی دل ڈوب گیا آخر — ساحل نہ ملا ہم کو کشتی کو ڈبو آئے
افسانہ محبت کا کیوں تم نے سنا صاحب — ہاں حال مصیبت کا کیوں تم نے سنا صاحب
قصۂ شب فرقت کا کیوں تم نے سنا صاحب — میں کہتا نہ تھا تم سے دیکھو نہ کہ رو آئے
پوچھے کوئی بسمل سے یہ عشق تپاں باسط — اب جائیگا مشکل سے یہ عشق تپاں باسط
نکلا نہ مگر دل سے یہ عشق تپاں باسط — ہم شیخ کی خاطر سے کعبہ کو بھی ہو آئے

باسط بسوانی

فراقِ جاناں

(از سید محمد اسمعیل رسا ہمدانی گیاوی)

آہ! یہ کس نے کہا وہ دلربا جانے کو ہے — درد دل کی جانتا ہے جو دوا جانے کو ہے
دل سے راحت چشم سے نور ضیا جانے کو ہے — کیا چمن سے شاہد گل اے صبا جانے کو ہے
رنج و غم سے غیر حال بلبل بیمار ہے
خون کا دریا رواں با دیدۂ خونبار ہے

کیوں پریشاں ہو گئی سنبل کے گیسو باغ میں — چشم نرگس میں ہیں کیوں شبنم کے آنسو باغ میں
ہائے کیوں مرجھا گئے گلہائے خوشبو باغ میں — کیوں نظر آتے ہیں سوکھے نخل ہر سو باغ میں
یہ اداسی کیوں ہے سناٹا ہے کیوں چھایا ہوا
باغباں ہر سمت کیوں پھرتا ہے گھبرایا ہوا
کونسا گل جا رہا ہے آج گلشن سے صبا — فرط غم سے کیوں عنادل کو بھی سکتا ہو گیا
قمریاں خاموش کیوں چپ چاپ گلچیں ہے کھڑا — جانے والے سے کوئی بہر خدا پوچھے ذرا
کچھ خبر ہے تجھکو اپنے عاشق بیمار کی
غیر حالت ہو رہی ہے اس نحیف و زار کی
آپ جاتے ہیں سدھارین پر رہے آنا خیال — عاشق بیمار کا ہے ہجر میں بچنا محال
نام فرقت کا سنا جس دم سے ہے رنج و ملال — فرط غم سے ہو گیا ہے قابل رحم اس کا حال
مستعد ہے ہر گھڑی وہ جان کھونے کیلئے
دونوں آنکھیں تل گئی ہیں خوں رونے کیلئے
دیتے جائیں آپ تسکین اس دل بیمار کو — چھوڑ کر کس پر چلے ہیں اس نحیف و زار کو
آپ کھلائینگے جلوہ حسن کا اغیار کو — ہائے ہم ترسا کرینگے دور سے دیدار کو
آپ جاتے ہیں تو اک خنجر لگاتے جائیے
پہلے جانے سے ہمیں مردہ بناتے جائیے
تھمئے دم بھر داستان غم سنا لوں آپکو — کھولکر جی داغ ہائے دل دکھا لوں آپکو
سیر آنکھوں پر کلیجے پر بٹھا لوں آپکو — خوب جی بھر اپنے سینے سے لگا لوں آپکو
پھر میسر دیکھنا اے دل یا ہو یا نہ ہو
پھر مجھے دیدار روئے پرضیا ہو یا نہ ہو
جائیے! ہاں جائیے! پر دھیان کیجئے گا ذرا — صدمۂ فرقت سے میری جان جانا ہے بدا
تنگ آکر ہجر میں کھا لیگا زہر اک دن رسا — آپکا ہر حال میں ہو حافظ و ناصر خدا
پر نہ جانا بھول اپنے عاشق ناشاد کو
یاد رکھنا اس غریب خانماں برباد کو
بس دعا ہے حق تعالی تم کو رکھے شادماں! — باغ عالم میں ہو سرسبز اے سرو رواں!

میرے مرنے کی خبر تم کو اگر پہنچے وہاں   میرے ماتم میں ہونا سینہ زن نوحہ کناں

یہ سمجھنا عاشقوں میں نام اپنا کر گیا

فرقت گل میں کوئی ناشاد بلبل مر گیا

کوئل

اے نوا سنج چمن آئی بہار   کوک تیری پھر دلوں کے ہوگی پار

تیرے دم سے ناز کرتی ہے صبا   لیتی ہے تیری بلائیں جوئبار

تیری آمد کی خوشی میں ہر طرف   ہو رہے ہیں نو بنو نقش و نگار

عطر افشاں سو بسو موج نسیم   ہے رواں جوش جنوں میں جوئبار

بارور سر سبز ہر نخل چمن   صد گلستاں در بغل ہر شاخسار

خندۂ گل کا چمن میں شور ہے   مسکرا دیتے ہیں غنچے بار بار

طائران خوش بیان گلستاں   خیر مقدم میں ترے مستانہ وار

نغمہ سنج و زمزمہ پرداز ہیں   بیخودی ہر شاخ سے ہے آشکار

صبح کا غم ہے نہ تجھ کو شام کا

تجھ کو ہے آزادی لیل و نہار

آہ اے نغمہ طراز گلستاں   میں ہوں نالاں رات دن شکل ہزار

اس چمن میں غنچۂ دلگیر ہوں   یا کہ نخل خشک ہوں بے برگ و بار

آرزوئیں اپنی سب خوں گشتہ ہیں   پرزہ پرزہ ہے گریبان قرار

چرخ میرے در پئے آزار ہے   اور مجھ سے ناموافق روزگار

شرح ناکامی ہے اپنی داستاں   حسرت و حرماں کا دل ہے خانہ زار

تجھکو لطف گرمی بازار حسن   اور ہے سوز دروں میرا شعار

کنج دلکش ہے ارم خانہ ترا

اور قید غم میں میری جان زار

اب میرے دل کی یہی ہے آرزو   کاش ہو جاؤں میں تجھ سے ہمکنار

شادماں دلکش مناظر سے رہوں   خوشنما آئے نظر ہر شاخسار

خون رلوائے نہ مجھکو شکل گل   شاخ غم آئے نہ ہو صبح بہار

عالم دلبستگی غنچوں میں ہو   پھول میں شان تبسم آشکار

زمزموں میں ہو بہم کیف سرور   ہو دل شوریدہ کو صبر و قرار

ہو بسا پھولوں سے میرا آشیاں   بیم گلچیں ہو نہ خوف نوک خار

نکہت گل کے لئے شام و سحر

میں رہوں مست مئے باد بہار

ذاکر بازید پوری

آفتاب

نور و گرمی دیر ہا ہے روح پرور آفتاب   اہل دنیا کیلئے ہے فیض گستر آفتاب

رات دن کھاتا ہے کیوں چکر پہ چکر آفتاب   ہاں کسی مہرو کا جویا ہے مقرر آفتاب

دفعتاً گھٹ جائے سب کام جہاں جس دم نہ ہو   روئے روشن پھر نہ دکھلائے جو چھپ کر آفتاب

خلق کی راحت رسانی میں ہے کتنا گرم جو   موسم گرما میں بن جاتا ہے مجمر آفتاب

کیوں نہ سمجھیں اسکو پھر اپنا خدا آتش پرست   چرخ کے آتشکدہ کا ہے سمندر آفتاب

دن کو چڑھ کر چرخ پر کرتا ہے عالم کی سیر   رات کو رہتا ہے کس منزل میں چھپ کر آفتاب

از برائے اخذ فصد جملہ محروران ہر   لیکے کرنوں کے نکل آتا ہے نشتر آفتاب

عہد پیری میں نہیں لازم ہے یہ غفلت کی نیند   چونک اے غافل کہ اب آیا ہے سر پر آفتاب

دھوپ میں نکلو نہ گھر سے تاو کھا جائیگا رنگ   آگ برساتا ہے دیکھو نیزہ بھر پر آفتاب

تھا بغل میں میرے اک مہوش جو وقت میکشی   میں یہ سمجھا آگیا ساغر کے اندر آفتاب

کہتے ہیں اسکو شہ سیارگاں اہل نجوم   ہر طرح ثابت ہوا ہے نیک اختر آفتاب

ماہرو جب دم لب دریا کھڑا تھا بعد غسل   اک نظر آتا تھا اندر ایک باہر آفتاب

اف ری مخرور المزاجی الحذر غیظ و جلال   پھر رہا ہے چرخ نیلی پر کھلے سر آفتاب

رات کی گہری سیاہی ہوتی جاتی ہے سفید ۔ پھونکتا رہتا ہے کیا پردہ زمستر آفتاب
سارا فواجِ کواکب اسکو دیتے ہیں سلوٹ ۔ چرخ کا ہے انڈیا کے لارڈ کچنر آفتاب

مطلعِ دوم

کاسۂ زر لیکے پھرتا ہے جو در در آفتاب ۔ حسن کی دولت کا ہے شاید گداگر آفتاب
لاکھ اترائے اگرچہ پیکر فلک پر آفتاب ۔ کب رخِ شمس الضحےٰ سے ہوگا ہمسر آفتاب
چرخ پر فوج کواکب سکے بنے زیرِ نگیں ۔ میرِ لشکر ہے شاہ ہفت کشور آفتاب
ہے بڑا گردان اسی کے سارے اجرام فلک ۔ ہو گیا ثابت ہے سیاروں میں اکبر آفتاب
کھائی ہے خالق نے خود اسکی قسم قرآن میں ۔ خاص انوار الٰہی کا ہے مظہر آفتاب
کون دیکھیگا نظر اس پر ٹھہر لی ہی نہیں ۔ اس طرح رعب و جلالت کا ہے منظر آفتاب
چھپتے تارے صبح کو ہوتا ہے ساغر میں طلوع ۔ بیٹھتا ہے رات بھر بوتل میں چھپکر آفتاب
ہوتا ہے گنبد کے شمسہ پر سر مغرب فدا ۔ دیکھیے کیسا ہے فدوی پیمبر آفتاب
مہ وش نے چہرۂ انور سے سرکا دی نقاب ۔ یا ہوا ہے ابر کے پردے سے باہر آفتاب
زہرہ وش سے وصل ہوگا سا تویں ہے مشتری ۔ شکر خالق اندنوں ہے میرے برج پر آفتاب
ایکدن میں شرق سے تا غرب ہے یہ دوڑتا ۔ تیز رفتاری میں ہے بے مثل موٹر آفتاب
ہر طرف سے ہوگا شور الحریق و العطش ۔ تیز ہوگا جب گنہگاروں کے سر پر آفتاب
کرکے منہ خورشید کی جا وہ نبی لیجیے صبح کو ۔ غرب سے ہوگا برآمد روزِ محشر آفتاب

رات کو نورِ سحر کی کھا کے کہتا ہوں قسم
شوق ہے میری نظر میں سب سے بہتر آفتاب

شوقؔ جعفری

رُباعیاتِ عدیل

گھٹتی جاتی ہے ناتوانی ہر دم ۔ سنتا ہوں دل کی میں کہانی ہر دم
کہتا ہوں کچھ زباں سے اپنی لیکن ۔ یاد آتی ہے پیری میں جوانی ہر دم

جز شکرِ خدا نہیں زباں کو کچھ کام ۔ ہے حق سے دعا بخیر کر تو انجام
سب جانتے ہیں مجھ میں کوئی عیب نہ تھا ۔ سو عیب کا پیری نے لگایا الزام

یہ قدِ خمیدہ کچھ خبر دیتا ہے ۔ تصویرِ عبادت کا یہ اک نقشا ہے
پیری سے ہویدا ہیں یہ ارکانِ نماز ۔ پہلے ہے رکوع بعد میں سجدا ہے

بچپن پیغامِ نوجوانی لایا ۔ پیری کا رہا شباب میں ہمسایا
غفلت سے کھلی آنکھ تو دیکھا یہ حال ۔ دو منزلیں طے کرکے بڑھاپا آیا

جانے سے جوانی کے مٹی رعنائی ۔ تشویشِ طبیعت میں زیادہ پائی
تسکیں ہوئی دل کو جو دیکھا دمِ صبح ۔ سر میں ہے فلک کے بھی سفیدی آئی

افسوس جوانی نے نہ کچھ ساتھ دیا ۔ کیا جلد میری طرف سے منہ پھیر لیا
خوابِ غفلت سے اب ہو بیدار عدیل ۔ آخر ہوئی شب چاندنی نے کھیت کیا

عدیل بلگرامی

انعامِ صداقت

ایک لڑکی اونٹنی کا دودھ جب دوہنے لگی ۔ اس کی ماں بولی کہ بیٹی اس میں پانی دو ملا
چونک کر معصوم نے ماں سے کہا واللہ ۔ یہ تو ہے اک جرم اور اسکی مقرر ہے سزا
دیکھیے ہیں حکم یہ حضرت امیر المومنیں ۔ یعنی وہ فاروقِ اعظم صاحبِ صدق و صفا
سن کے یہ ماں نے کہا ایسا بھی کیا خوف امیر ۔ دیکھتے ہیں وہ تجھے پانی ملایا یں کیا
بولی لڑکی یہ تو سچ مجھکو نہیں وہ دیکھتے ۔ پر ہے سچ یہ بھی کہ سب کچھ دیکھتا ہے خدا
اور مطلب اس کا کیا ہاں گو ہم بظاہر ہیں مطیع ۔ ورنہ اصلیت یہ ہے باطن میں ہم ہیں بے رضا
ظاہرا ہم حکم مانیں باطنا ہوں منحرف ۔ ہم سے تو یہ ہو نہیں سکتا ہے سوگند خدا
رفتہ رفتہ یہ خبر حضرت عمر کو مل گئی ۔ نکلی لڑکی کی صداقت پر زباں سے مرحبا

اور یہ لڑکی ہی بالآخر بنی ان کی بہو
ان کے بیٹے حضرت عاصم سے عقد اس کا ہوا

اظہر دہلوی

خیر مقدم خواجہ کمال الدین صاحب

مسلم مشرقی

آفریں صد آفریں خواجہ کمال الدیں تمھیں — مرحبا صد مرحبا تحسین پر تحسین تمھیں
قومی خدمت سے نہ ہو کیوں عزت و تمکیں تمھیں — دل ملا ہی بارگاہ حق سے عجز آگیں تمھیں

جاں نثار ملک ہو تم افتخار قوم ہو
کھل گیا باغ تمنا نو بہار قوم ہو

خوب مغرب میں بیاں کیں خوبیاں اسلام کی — اہل یورپ میں ہوئیں محبوبیاں اسلام کی
ہو گئیں معلوم خوش اسلوبیاں اسلام کی — گھر گئیں دل میں جگہ مرغوبیاں اسلام کی

جب مے توحید کے لبریز پیمانے ہوئے
سب شراب معرفت پی پی کے مستانے ہوئے

لمعۂ نور عرب کی جلوہ آرائی ہوئی — عالم کثرت مٹا نظروں میں یکتائی ہوئی
مذہب اسلام کی ظاہر مسیحائی ہوئی — سرور عالم کے در کی جبہ فرسائی ہوئی

ہند والے آپ کے ممنون ہیں مشکور ہیں
داد دے سکتے نہیں مجبور ہیں معذور ہیں

آپ کا احساں نہ مانے کون سا انسان ہے — ہے مثل احسان کا بدلا سدا احسان ہے
اپنے ہمدردوں کی سب کو جان و پہچان ہے — یہ مسلمانوں کا بے شک دین ہے ایمان ہے

بج گیا دنیا میں ڈنکا سید لولاک کا
دین ظاہر کر دیا تم نے رسول پاک کا

نکتۂ مذہب سکھانا کوئی تم سے سیکھ لے — کھول کر عقدے بتانا کوئی تم سے سیکھ لے
علم ہو کر دل میں آنا کوئی تم سے سیکھ لے — نقش ہو کر بیٹھ جانا کوئی تم سے سیکھ لے

فائدہ مغرب کو پہنچا ہند کی تہذیب سے
ہو گئی اسلام کی تبلیغ اس تقریب سے

فیض کا انگلینڈ میں چشمہ یہ مسلم اُبڈیا — ہمت و مردانگی سے آپ نے جاری کیا
علم کا دریا بہا توحید کا پانی دیا — تشنگان معرفت نے سیر ہو ہو کر پیا

اہل مغرب ایستادہ ہو گئے تعظیم کو
روضۂ رضواں سے لائے کوثر و تسنیم کو

اہل یورپ کو بتایا مرتبہ قرآن کا — کام نکلا اس طرح انسان سے انسان کا
بڑھ گیا ہے دائرہ اسلام کا ایمان کا — یہ تماشا دیکھتے ہیں سب خدا کی شان کا

ہیں کلام پاک میں ایسی اثر کی خوبیاں
فلسفی کے دل میں ہیں خیر البشر کی خوبیاں

چاہیے کرنی مدد ان کے مشن میں کچھ نہ کچھ — جب مزا ہے آبپاشی ہو چمن میں کچھ نہ کچھ
فیض پہنچے آپ کا اہل وطن میں کچھ نہ کچھ — نکہت مشک ختن پھیلے ختن میں کچھ نہ کچھ

واقعی قومی عمارت کا نمونہ آپ ہیں
اینٹ ہے جوش حمیت اور چونہ آپ ہیں

کون لیتا ہے مصیبت قوم کی خاطر یہاں — ایک پیسہ کا کوئی کرتا نہیں اپنا زیاں
یاد رکھیں گے مسلماں آپ کی ہمدردیاں — ہر سال روشن رہیگا آپ کا نام و نشاں

آپ شیدا قوم کے ہیں آپ کا غمخوار ہوں
کیونکہ پروانوں کا پروانہ خلیق زار ہوں

خلیق دہلوی

آپ خوش عالم دنگ

نرالا سا کہ زمانے سے ہے کچھ اپنا رنگ — کہ آپ خوش ہیں مگر ہے تمام عالم دنگ
جو زرد رو تھے وہ ہیں سرخرو زمانے میں — وہ سرخرو ہیں نہیں ہم کو پاس نام و ننگ
ہیں پا لنگ تو طاقت بھی طاق ہے اپنی — یہی ہے منزل مقصود بھی بصد فرسنگ

نتیجہ پھوٹ سے آپس کا مل گیا ہم کو — رہیگی تا بہ کجا بھائیو یہ ہم میں جنگ
طبیعتیں جو ہوں اپنی یہ خوگر سعی — تو ہمتیں نہ ہوں ناکامیوں سے کبھی تنگ
لگائیں توسن ہمت کو ایڑ کوشش کی — کہ آگے چل کے نہ ہو جائے ہم پہ میداں تنگ
جو لات ماریں تو پتھر بھی پانی ہو جائے — ہزار عقدہ کشا ہے جوانیوں کی امنگ
بجا دو علم و ہنر کے جہاں میں ڈنکے — خدا کے واسطے چھوڑو کہیں بھی راگ رنگ
دکھائے نکہت و اخلاص کے نئے جلوے — ہے اپنے جام میں جب تک کہ یہ مے گل رنگ
اثر عیاں ہو جو ہو صاف آئینہ دل کا — مکدّر ہو کب حوادث سے جب چڑھا ہو زنگ
یہ اپنے حرف حکایات سلف چھوڑو بھی — کہ دل لبھانے کا پیدا کرو نیا ہی ڈھنگ
معین ہے کثرت گفتار باعث وحشت — بس ہو چکا قول یہ سعدی کے تو بھی ہم آہنگ

تو پاک باش برادر مدار از کس باک!
زنند جامہ ناپاک گازراں بر سنگ

محمد خواجہ معین الدین

پان

اہل یورپ کا سگار و چائے پر رجحان ہے — ایشیائی ملک میں خاطر تواضع پان ہے
یہ گلابی رنگ ہونٹوں کا خدا کی شان ہے — پان کی سرخی لب نازک کی گویا جان ہے
رنگت اپنا جماتا ہے لب معشوق پر — سرخ رو پتوں میں ہے دیکھو خدا کی شان ہے
لعل لب پر اسکی رنگت کا ہو کیونکر منہ سے بیاں — جسکے نظارے کا ہر انسان کو ارمان ہے
پان کھا کر مسکرانے سے یہ ہوتا ہے گمان — برق تاباں ہے شفق میں کیا خدا کی شان ہے
باطن و ظاہر میں یاقوت و زمرد کا ہے رنگ — طرفہ نیرنگ و رنگی کا نمونہ پان ہے
تیز کر دیتا ہے یہ دوران خوں کو کس قدر — ہے مقوی و مفرح بادہ کش کی جان ہے
صاف کرتا ہے گلے کو سینہ کو آواز کو — گائنوں پر مطربوں پر پان کا احسان ہے
معدہ و قلب و جگر کو بھی ہے اس سے تقویت — ذہن بھی اک آئینہ ہے جسکی صیقل پان ہے
کھول دیتا ہے یہ فوراً جسم کے سارے مسام — منہ کا خوشبودار کرنا بھی بہت آسان ہے
درد دندان میں گلوری منہ میں رکھ کر دیکھ لو — پھر یہ ہے تکلیف کچھ باقی یہ کیا امکان ہے
منہ لگا ہے آج کل ایسا کہ جسکو دیکھئے — جیب میں بٹیا ہے اور ڈبیا کے اندر پان ہے
رنگ بھی اس کا نرالا اور اثر بھی ہے عجیب — ایک برگ سبز ہے یا لعل تر کی کان ہے
منہ کو پاک و صاف خوشبو اک گلوری نے کیا — خوبیوں پر اسکی ہر غنچہ دہن قربان ہے
بے نوا ہو یا تونگر ہو سفر ہو یا حضر — اس کا طالب اس کا خواہشمند ہر انسان ہے
اپنی زینت جانتے ہیں اسکو خوبان جہاں — ایک برگ سبز یہ قیمت خدا کی شان ہے
ہند میں منظور و مقبول خلائق ہے یہی — شغل اس کا ہر جگہ ہر وقت اسکا دھیان ہے
اسکی کثرت پر نظر ڈالو تو ہوتا ہے عجب — اسکی ہر بازار میں چلتی ہوئی دکان ہے
میزبان کے ہاتھ سے رقاص ہے اسکی صدا — چلتا پھرتا ہے یہ محفل میں مگر بیجان ہے
مختصر کر نظم کو اب طول کیوں دیتا ہے تو — کام میں دنیا کے لاکھوں تیری اک جان ہے

شعر گوئی کا مزہ شاعر سے پوچھو ہوش تم
خون دل پیتا ہے کیا کچھ شاعری آسان ہے

ہوش بلگرامی

غزلیات

(جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل)

اسکو سمجھائی کیونکر غم فرقت کیا ہے — جسکو یہ بھی نہیں معلوم محبت کیا ہے
ناز و انداز سے چلنا کوئی سیکھے تجھ سے — تیغ کیا چیز ہے خنجر کی حقیقت کیا ہے
موت بھی سوکھ کے بیٹھی ہے مسیحا کی طرح — کس سے پوچھو کہ علاج شب فرقت کیا ہے
لاکھ سمجھائی قابو میں کہاں آتی ہے — کوئی معشوق ہے بیچین طبیعت کیا ہے
محو ہوں دیکھ کے ساقی ترے میخانے کو — آج مجھ پر یہ کھلا راز کہ جنت کیا ہے
تیغ وہ باندھنے بیٹھے تو نزاکت بولی — ایسے قاتل کیلئے تیغ کی حاجت کیا ہے
ایسے ظالم سے بچا کوئی کیونکر دل کو — جسکی صورت سے یہ کھلتا نہیں سیرت کیا ہے

نگہ لطف کا منشا تھا فقط دل لینا — اب انھیں آنکھ ملانے کی ضرورت کیا ہے
کبھی قاتل کی خوشامد ہے کبھی خنجر کی — اک مرض ہے یہ تمنائے شہادت کیا ہے
چارہ سازوں نے کیا اور بھی بیمار مجھے — یہ نہ سمجھے کہ دوا کیا ہے شکایت کیا ہے
فکر قاتل کی عبث ہے دل بیتاب تجھے — تو سلامت ہے تو قاتل کی ضرورت کیا ہے
جلوۂ حسن ترا ہوش اڑا دیتا ہے — یہی صورت ہے تو دیدار کی صورت کیا ہے

ہیں سخی ابن سخی آصف دیجاہ جلیل
آپکے سامنے حاتم کی حقیقت کیا ہے

(مولوی سید احمد صاحب زید بلگرامی مغفور)

رشک گلشن مرا سینہ ہوا مجمر کے عوض — داغ دل عشق کے روشن ہوئے اخگر کے عوض
نقش پا اُن کا ہے کافی مجھے بستر کے عوض — سایۂ دیوار کا درکار ہے چادر کے عوض
ہو کے زندہ میں ابھی قبر سے باہر نکلوں — ہاتھ رکھدو مرے سینہ پہ جو پتھر کے عوض
جانکنی سی ہے مجھے یاد خط سبز میں آج — ساقیا زہر پلادے مئے احمر کے عوض
صفحۂ دل پہ لکھا عشق کا مضمون ہمنے — پاس ہیں تار نفس سینہ میں مسطر کے عوض
باغ ہستی میں میں سرسبز رہونگا کیونکر — آمد و شد ہے نفس کی یہاں صرصر کے عوض
میں کروں اپنی خطائیں وہ رہیں مجھپہ فدا — انکی قسمت میں نہوں اپنے مقدر کے عوض
سچ کہا ہے کہ نگہ انکی ہے اک تیغ ادا — لال ڈورے ہیں مگر آنکھ میں جوہر کے عوض
خون گرفتہ ہے مرا دل یہ انھیں ہے معلوم — اسلئے مانگتے ہیں مجھسے گل تر کے عوض
سوئے آتشکدہ ہوجائے جو اس گل کا گذر — بلبلیں آگ میں پیدا ہوں سمندر کے عوض
کاش آجائیں مری قبر پہ وہ بعد فنا — انکی رفتار ہے کافی مجھے محشر کے عوض
گیسوئے یار کا شیدا ہوں یہ ہے میری سزا — طوق و زنجیر وہ پہنائینگے زیور کے عوض
بعد مرنے کے بھی ہیجانے ہیں نکلنے کے نشاں — آئنہ سامنے رکھا ہے سکندر کے عوض
بچ گیا انکی جفا سے میں اسی کے سبب — پھول اب مجھپہ لگاتے ہیں وہ پتھر کے عوض
ہاں ذرا اسلئے فیاض وہ ہو جائے ق — خم کا خم منہ سے لگادے کہیں ساغر کے عوض
ہو کے بدمست چلا جاؤں میں پھر بارگہ — نشہ رہ جائے مرے ساتھ میں ساغر کے عوض
ہے جو گردش تو طپش بھی ہے فلک کو سیدا — داغ دل میرے لگالے جو وہ اختر کے عوض

بوسۂ لب تو کہاں پر نگہ قہر ہے وہ — زہر ملتا ہے مگر زید کو شکر کے عوض

(مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی)

ظالم نے ہاتھ اٹھایا اعجاز دلبری سے — خنجر گلے پہ رکھا جب ناز دلبری سے
تاریخ مرگ ارماں یاد آئے کیونکر اُنکو — ہوش اڑ گئے ہوں جنکے آغاز دلبری سے
بیتابی جگر بھی کچھ دیر دیکھ لینا — فرصت کبھی جو پاؤ تم ناز دلبری سے
زور شباب سے وہ بجلی بنے ہوئے ہیں — شوخی ٹپک رہی ہے انداز دلبری سے
دنیائے عاشقی میں آجائیگی قیامت — اٹھینگے لاکھ فتنے اک ناز دلبری سے
آنکھوں سے تا بہ شہ رگ اور قلب سے جگر تک — پہنچا کہاں کہاں تو اعجاز دلبری سے
کس نے بتوں کو اپنا بندہ بنالیا ہے — کعبے میں کون آیا انداز دلبری سے
کھل جائیں دونوں آنکھیں چل جائے حور واعظ — سرمہ بنا ہے پتھر اعجاز دلبری سے
ذوق طپش میں پایا آسان ہی خون بہا ہے — اور ایک ہاتھ قاتل انداز دلبری سے
دیکھے ہوئے ہے چشم و گیسو کی سب ادائیں — آئنہ کیوں نہ واقف ہو ناز دلبری سے

موسیٰ کی زندگی میں اڑتے ہیں ہوش محشر
جاتی ہے جان سنکر آواز دلبری سے

(مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

وہ نگاہیں کیا کہوں کیونکر رگ جاں ہو گئیں — دل میں نشتر بنکے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں
اک نظر گھبرا کے کی اس شوخ نے اپنی طرف — ہستیاں جب مٹکے اجزائے پریشاں ہو گئیں
وادئ وحشت میں قائم کیجئے کیا یادگار — چند قبریں تھیں یہاں وہ بھی بیاباں ہو گئیں
پھونکدی اک روح دیکھا زور اعجاز جنوں — جتنی سانسیں تھیں ہے لیں تار گریباں ہو گئیں
اوڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جس جس جگہ — رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں
چند تصویریں میری جو مختلف قسمونکی تھیں — بعد میرے زینت ایوان زنداں ہو گئیں
شام وعدہ آئیے تو آپ اسکی فکر کیا — پھر بنا دونگا اگر زلفیں پریشاں ہو گئیں

کس دل آوارہ کی میت گھر سے نکلی تھی عزیز
شہر کی آباد راہیں آج ویراں ہو گئیں

(مولوی سید علی اکبر صاحب کوثر بلگرامی)

میرے ساقی رات دن گردش میں پیمانہ رہے — جب تلک میں ہوں سلامت تیرا میخانہ رہے
یا خدا آئے وہ میرے گھر تو اس انداز سے — شیشہ مے ہو بغل میں چال مستانہ رہے
ایک موسیٰ تھے کہ برق حسن سے غش کر گئے — تجھکو جو دیکھے وہ ساری عمر دیوانہ رہے
یہ غرورِ حسن سب اک دن ہوا ہو جائیگا — یا الٰہی وہ رہیں اور آئینہ خانہ رہے
ساغر صہبا ہمیں دیا ندے ساقی مگر — جامۂ تقویٰ ہمارا رہن میخانہ رہے
آؤ ہم بھی چل کے دیکھیں وادی ایمن کی سیر — تشنگان دید سے کیوں طور ویرانہ رہے
التہاب دل مزہ دینے کو کافی ہے مجھے — رند تیرا ایسی نشہ میں مستانہ رہے
تو پلائے جا مجھے اور میں دعا دوں تجھے — حشر تک آباد ساقی تیرا خم خانہ رہے
آج شب ہے اس پری پیکر سے وعدہ وصل کا — لطف جب ہے آئے وہ اور بے حجابانہ رہے
خود نمائی مجھ سے بھاگے میں ہوں محو خود سے دور — میرا استغنا میں بھی مسلک فقیرانہ رہے
ہوں مریضِ عشق مجھکو ہے دوا کیا غرض — سامنے میرے ہمیشہ روئے جانانہ رہے

جام کوثر ہاتھ میں کل شرما کے ہو روزِ حساب
حوریں پہلو میں ہوں اور جنت میں کاشانہ رہے

(ابوالبیان محمد رضا صاحب رضا صدیقی الہ آبادی)

ہو گیا نام دیدۂ تر کا — خوب خاکہ اڑا سمندر کا
وہ بھی عاشق ہے انکے ٹھوکر کا — میں بنوں گا رقیب خنجر کا
دور ہے گردش مقدر کا — کیا پتہ آج دور ساغر کا
جسکو دنیا میں ابر کہتے ہیں — ایک خاکہ ہے دیدۂ تر کا
وجہ شورش ہوئی ہے کم ظرفی — نام بدنام دور ساغر کا
رشک جنت ہے اپنا میخانہ — حوض کوثر ہے نام ساغر کا
گردش چشم یار کہتی ہے — میٹ دو نام دور ساغر کا
پی گئے آنسو انکو فرقت میں — آنکھ دیتی ہے کام ساغر کا
دونوں عالم سے بیخبر ہوں رضا — معجزہ ہے یہ ایک ساغر کا

(مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنوی)

جو مخلوقِ خدا کے کام میں مصروف رہتا ہے — وہی واقف ہیں رستہ سے وہی آگاہ منزل ہے
نہ دل واقف ہوا ہم سے نہ ہم واقف ہوئے دل سے — رہے دنیا میں رہنے کو مگر افسوس غافل ہے
عمل ہو اپنے کہنے پر کہو صاف اور کھرے ہو لیے — فصیح ایسے ہیں رنہ ملتی ہے شمع رعنا دل ہے
پتا دل کا ملا آخر اسی کھوئے ہوئے دل سے — نشان غم سے ڈھونڈا عمر بھر اور وہ بھی مشکل سے
جگہ ہو کس طرح دل میں تمہارے ان خصائل سے — بظاہر خوب ملتے ہو مگر ملتے نہیں دل سے
نہیں یہ ضعف غم کی بھیڑ ہے تنگ ہے میرے دل سے — زباں تک بات کرتی ہے مگر کس کس کی مشکل سے
زباں عاجز ہے لیکن ہمنشیں ہے دیکھے قابل — وہ صحبت بھی کہ جب دو شخص آپس میں ملیں دل سے
یہ سیدھی سادی باتیں بھی بدقت نظم ہوتی ہیں — سلیس الفاظ ملتے ہیں بدقت فکر مشکل سے
بظاہر ہے بہت آسان بہت دشوار ہے لیکن اتفاق یہ باتیں جمع ہوتی ہیں سخن میں سخت مشکل سے
سلیس الفاظ ستھرے پر معانی مختصر جیدہ — مگر ایسے جو نکلے ہوں اثر میں ڈوب کر دل سے
یہاں ممکن نہیں جو لطف ہے سچی محبت میں — اگر باور نہ ہو تم کو تو بل کر دیکھ لو دل سے
سخی دل منفعل ہے لے لے اپنی نگہ پستی سے — جواب صاف دیکر لی ندامت دست سائل سے
مطیع دل ہو حامد تو مبارک ہے یہ ہمت تم کو — اگر ہو عقل کے تابع تو اٹھو کوئے قاتل سے
احبا جمع ہیں حامد مگر اک شب کے مہماں ہیں — سحر ہوتے سفر ہے یہ صدا آتی ہے محفل سے
مزا یوں صحبت احباب کا ملتا ہے خلوت میں — انھیں کے تذکرے دن رات لیتے ہیں بڑے دل سے

(حافظ محمد یعقوب صاحب اوج گیاوی شاگرد حضرت کوثر خیر آبادی)

ہے گرمی ہفت دوزخ کی ہمارے سوز پنہاں میں — تعجب کیا جو دریا خشک ہے دامان مژگاں میں
لکھا ہے وصف خط سبز جاناں اپنے دیواں میں — پر طاؤس جنت رکھدیا اوراق قرآں میں
نگاہ لطف سے ڈر کر وہ کیوں میری طرف دیکھیں — ہزاروں چاہنے والے ہیں بیٹھے بزم جاناں میں
کسی کو رات دن غیروں کے جلسوں سے ہے صحبت — ہے گردش میں بگولے کی طرح کوئی بیاباں میں
ہزاروں اہل حاجت جنکو گھیرے بیٹھے رہتے تھے — اکیلے سو رہے ہیں آج وہ گور غریباں میں
تصور ہے جو زلف یار کا دنیا اندھیری ہے — نہیں کچھ روشنی اپنے چراغ شام ہجراں میں
بگولے کی طرح دن رات میں وحشت میں پھرتا ہوں — جو مر جاؤں تو مجھکو دفن کر دینا بیاباں میں
تصور کیوں کوئی دم جا نہیں سکتا ہے خوبی کا — ہمارا دل بھی گویا نور کی صورت ہے طوفاں میں

ہوں ذوق شعر سے مجبور ورنہ اوج سچ یہ ہے
کہ پڑھ سکتا نہیں اپنی غزل بزم سخنداں میں

(مولوی محب حسین صاحب سابق اڈیٹر رسالہ معلم النسواں)

اُس شمع جہانتاب کا پروانہ میں ہی ہوں
خود آگ میں جل جائے وہ دیوانہ میں ہی ہوں

مستیٔ مئے عشق سے خود آپکو بھولا
بیداریٔ عالم میں وہ مستانہ میں ہی ہوں

آیا نہ کیا بار امانت کو اٹھا لیا
عالم میں فقط جاہل و دیوانہ میں ہی ہوں

گردش میں ہو مے قلب کی حرکت جو چلا ہے
عالم میں مئے عشق کا پیمانہ میں ہی ہوں

دنیا یہ مرے عشق کی مستی سے ہے مسرور
عرفاں کی مئے ناب کا مخانہ میں ہی ہوں

تجرید سے ہر خواہش دنیا کو مٹایا
آبادیٔ عالم میں وہ ویرانہ میں ہی ہوں

پھرتے ہیں جسے ڈھونڈتے سب جن و ملک
عالم میں اسی یار کا کاشانہ میں ہی ہوں

جس تخم سے اس عالم ہستی کی نمو ہے
سچ پوچھو تو کہتا ہوں کہ وہ دانہ میں ہی ہوں

میں وہ ہوں کہ معراج کی شب عرش پہ پہونچا
افلاک کا تاج سر شاہانہ میں ہی ہوں

یکساں نہیں ہر وقت مرا ظاہر و باطن
باطن میں تقی وضع میں رندانہ میں ہی ہوں

سر پر جو کے نہ چھوٹا جو کبھی دام بلا سے
زلف سر محبوب کا وہ شانہ میں ہی ہوں

یہ خواہشیں میری ہی تو بت اور صنم ہیں
محمود سے ٹوٹا نہ وہ بت خانہ میں ہی ہوں

سر جس پہ جھکاتے ہیں ملک جن و ملک سب
کاشانۂ جاناں و رجانانہ میں ہی ہوں

بے میرے توسط کے نہ پہونچا کوئی اس تک
اُس شوخ کا سر رشتۂ یارانہ میں ہی ہوں

کیا میری حقیقت کو ملک خاک سمجھتے
تاج سر افلاک کا دردانہ میں ہی ہوں

خود ہو کے خدا بندہ ناچیز بنا میں
ہوشیار ہوں کہنے کو دیوانہ میں ہی ہوں

فرمایش جاناں سے غزل میں نے کہی ہے
الفت میں محب بندۂ جانانہ میں ہی ہوں

(سید محمد علی صاحب افسوس)

دشواریوں پہ راحت قرباں کر کے دیکھیے
یوں اپنی مشکلوں کو آساں کر کے دیکھیے

ہے آرزو سے باطل کہتے ہیں وصل جسکو
ارماں میں مزا ہے ارماں کر کے دیکھیے

بے مہریوں کے دکھ سے واقف جب تو ہو گی
خود آپ اپنے دل کو حیراں کر کے دیکھیے

عریاں ہوئے تھے پیدا ساماں تعلق و وحشت
بیکار ہی رہے سب ساماں کر کے دیکھیے

بے لطفیوں میں پنہاں ہے لطف زندگانی
انسان زندگی کو قرباں کر کے دیکھیے

انجام کار الفت ذلت ہی جب ہے جسکو
ہشیار کر کے دیکھیے ناداں کر کے دیکھیے

جو دل لوٹے تھے وصل کے کم ہو سکے نہ ہرگز
تم نے ہزار ہا دل ویراں کر کے دیکھیے

مطلب سے ملنے والے دشمن تھے بعد مطلب
ہم نے ہزار ہا احساں کر کے دیکھیے

افسوس اب کھلیں گی بدعہدیاں کسی کی۔
اب ہم سے کوئی جھوٹے پیماں کر کے دیکھیے

(اختر حبیب صاحب جونا گڑھی)

عشاق پہ بیرحمی ! یہ کرو دغا کرنا !
لازم نہیں اے جاناں بے وجہ جفا کرنا

آتے نہیں نظروں میں پتلی میں سما کر بھی
سکھلایا تمھیں کس نے آنکھوں میں چھپا کرنا

تیری نظر قاتل کا تحفہ نہ یہیں ہے
کس طرح پھر اس دل کو پہلو سے جدا کرنا

کیونکر ہو مجھے جرات پھر عرض تمنا کی
معلوم ہے اس بت کا وعدہ پہ وفا کرنا

زنجیر محبت میں آساں تھا الجھنا یہ
دشوار ہوا دل کو زلفوں سے رہا کرنا

قاصد کی تو موت آئی پر کھینچے کبوتر کے
اب نامہ بری اپنی تو آہ رسا کرنا

دل دیکھے نوا سنج حسرت ہو کوئی بھی
جب نقد گنوا بیٹھے افسوس ہی کیا کرنا

ہر حال میں رکھتا ہے خوش مجھکو مرا مالک
شکر اسکی عنایت کا کس منہ سے ادا کرنا

آغاز شباب اپنا ہوتا ہے ابھی اختر
پیری کے دن آئیں جب تب یاد خدا کرنا

(مولوی صدر الاسلام صاحب صدر)

اجل کا سامنا ہے وصل کی شب بعد اک سحر ہو
خوشی یا شام ہو نا غم کی صورت میں سحر ہونا

امید باطنی کہتی ہے کوئی دل ہی جائیگا
حیات تازہ ہے غدر شب کی کا خوش پسر ہونا

وداع روح کا وقت مبارک آ گیا آخر
ہمارا نزع کے عالم میں ان کا بے خبر ہونا

بڑھا لو تم بھی انداز ستم کو حد امکاں تک
دکھا دونگا میں آہوں کا کسی دن پر اثر ہونا

عجب عالم ایسی حالت ہے تو یارب کیا کچھ کوئی
کبھی تو دل الٹ جانا کبھی زیر و جگر ہونا

قیامت ہے سر مقتل کسی کا مسکرا دینا
تہ خنجر میری فریاد میں پیدا اثر ہونا

دکھا دیتا ہے عالم کو یہ اک تصویر یوسف کی
فراق دوست کے غم سے میرا با چشم تر ہونا

گرفتار بلا پر خندہ زن ہیں کیا قیامت ہے
وہی حباب جنکو چاہئے تھا نوحہ گر ہونا

یہ کہکر وہ مریض غم کی بالیں سے چلے آئے — بہت مشکل نظر آتا ہے اس شب کا سحر ہونا
جنون عشق میں ایسے کرشمے بھی تو دیکھے ہیں — بہار آنا چمن میں اور ویران میرا گھر ہونا
وہی ایذائیں پھر رہ جائینگی پھر شام آئیگی — نہ دکھلائے خدا بیمار فرقت کو سحر ہونا
تحمل ہو نہ ہو ارماں آنکھوں کا نکل جائے — کبھی دکھلا دو تم نشے میں اپنا بے خبر ہونا
مریض درد کی اک اف سے نبضیں رک گئیں آخر — مقدر میں لکھا تھا یوں ہی قصہ مختصر ہونا
حریف شمع ہوں سوز دروں ہے زندگی بھر کی — مبارک خیر سے ہو اوروں کو محفل میں سحر ہونا

شکایت ہے مسیحا کیوں کرتے ہو اس بے مہر قاتل کی
کہ لکھا ہے مقدر میں دعا کا بے اثر ہونا

ایڈیٹوریل

سر جان مارشل

اس نمبر کے ساتھ سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ ہند کی تصویر شایع کیجاتی ہے۔ آثار و عمارات قدیمہ ہند پر جو آپ کا احسان ہے اس سے سارا ہندوستان آپ کا ممنون منت ہے اور آنے والی نسلیں بڑی احسانمندی کیساتھ آپکی ان قابل قدر کوششوں کو یاد رکھینگی۔ اسی تصویر کے وصول و تیاری کے انتظار نے اس نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کی اور اسی تاخیر کا باعث ہے کہ ہم دو نمبروں کو یکجا شایع کرنے پر مجبور ہوئے۔

نواب حاکم الدولہ بہادر مرحوم

نواب حاکم الدولہ بہادر حضور نواز جنگ

شیخ مصلح الدین سعدی ایم اے بیرسٹر ایٹ لا جن سے میر مجلس عدالت العالیہ حیدر آباد دکن کو زینت تھی اور جنکا دماغ مشرق و مغرب کی بہترین علمی خوبیوں سے لبریز تھا نہایت افسوس ہے کہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۱۶ء کو ایک قلیل علالت کے بعد ہم کو داغ مفارقت دیگئے۔ آپنے ۴۴ سال ملازمت سرکار عالی میں گزارے، اور اس مدت میں ڈسٹرکٹ ججی سے میر مجلسی تک تمام مراحل محض اپنی لیاقت اور حسن انصاف کی بدولت طے کئے۔ آپکو رکن عدالت العالیہ مقرر کرتے وقت اعلیحضرت غفران مکان نے آپ کی لیاقت و قابلیت کا اعتراف فرمایا تھا۔ ملک کو ابھی آپکے خدمات کی ایک عرصہ دراز تک ضرورت تھی اور آپکے دیرینہ تجربوں کی بدولت سررشتہ عدالت میں بہت سے مفید اور ضروری اصلاحات کی توقع تھی مگر افسوس کہ اس بیوقت موت نے جو ۶۴ سال کی عمر میں واقع ہوئی ایک قابل قدر فرد کے وجود سے ہم ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئے۔ آپنے کوئی اولاد نہیں چھوڑی مگر آپکی یادگار وہ کثیر التعداد کارنامے ہیں جو قانوندان اصحاب کیلئے رہبر کامل کا کام دینگے اور جن پر حیدرآباد کی آنے والی نسلوں کو بجا طور پر فخر کرنے کا استحقاق حاصل ہے ہم کو آپکے برادر خورد نواب سعد جنگ بہادر رکن عدالت العالیہ سے اس جانکاہ صدمہ میں دلی ہمدردی ہے خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

رسالہ ترجمان اوہم

فروری سنہ ۱۹۱۶ء کے پرچہ میں بھنگ صاحب نے ہماری نسبت جس حسن عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کیلئے ہم ان کے ممنون ہیں اور اس ممنونیت کا اعتراف مصرعہ ذیل کے ذریعہ سے کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

شکرانۂ اعانت

ہم پر واجب ہے کہ ہم مولوی سید علی اکبر صاحب رضا مشیر بلگرامی کا دلی شکریہ ادا کریں کہ انہوں نے ذخیرہ کی توسیع اشاعت میں عملی کوشش فرما کر ہماری حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اپنے حلقۂ احباب میں سفارش کر کے (۳۰) خریدار ہم پہونچائے۔ ہم اپنے احباب و ناظرین کو اس ضروری طریقہ امداد اور قابل تقلید ایثار کیجانب متوجہ کرتے ہیں۔

تصحیح

ناظرین براہ کرم آپ خوش عالم فرنگ کی نظم میں اسطرح تصحیح فرمالیں صفحہ ۱۹ کالم

سطر (۷) — اثر عیاں ہے جو ہو صاف آئینہ دل کا ÷ پڑا ہو جو کدورت کا آگیا ہو زنگ

سطر (۸) — سلف کے حرف حکایات کو بس اچھے پڑھ ÷ دلوں کے جذب کا پیدا کرنا ہے ڈھنگ

سطر (۹) — معین کثرت گفتار و خوشتے ÷ یہ خوب ہے کہ ہو سعدی سے تم بھی ہم آہنگ

ایڈیٹر

جے ٹبلیٹس طاقت کی دوا

قیمت فی شیشی کلاں للعہ　　　قیمت فی شیشی خورد عصا

ہمیشہ رہا شیخ فانی کی صورت　وہی قد کہ سیدھا تھا جوں کل ناک　چھپاتا ہے کیوں شوق دردِ نہاں کو
نہ دیکھی کبھی نوجوانی کی صورت　ہوا خم کمانی کی صورت　کہیں چھپتی ہے ناتوانی کی صورت

مریضان بے احتیاج مایوس العلاج لوگ جو بچپن کی خرابیاں یا ایام جوانی کی غلط کاریوں و بے اعتدالیوں کیوجہ سے یا کثرت شراب چانڈو و افیون کی مضرتوں کے سبب اپنی قوت کاملہ سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہوں اور مایوسی کے باعث زندہ درگور ہونے کو غنیمت شمار کرتے ہوں انکو بصدائے کوس جتلایا جاتا ہے کہ وہ اگر دائمی اور اصلی قوت کو حاصل کرنا چاہتے ہوں تو بہت جلد ہماری ایجاد (جے ٹبلیٹس) جو بڑی کوشش و محنت اور برسوں کی جانفشانی سے تیار ہوی ہے جو آب حیات کا اثر رکھتی ہے منگوا کر استعمال کریں یہ ایک دوائی اور سینکڑوں بیماری کو فائدہ پہنچاتی ہے اندرونی اور بیرونی غلاظتوں سے پاک صاف بناتی ہے اعضائے رئیسہ اور شریفہ کو راحت بخشتی ہے۔ بوڑھے کو جوان اور جوان کو جوانمرد بناتی ہے۔ اطبائے قدیم اسکی تعریف میں متفق البیان ہیں اور ڈاکٹران یورپ و امریکہ اسکی تعریف و توصیف میں ہم زبان ہیں۔

۱	جے ٹبلیٹس۔ دماغ اور دیگر اجزا کو زوال سے بچاتی ہے و مقوی ہے	۱۰	جے ٹبلیٹس معقوی باہ و ممسک ہے۔
۲	جے ٹبلیٹس۔ مقوی و محافظ بصارت ہے۔	۱۱	جے ٹبلیٹس۔ دافع گنٹھیا و عرق النسا و نقرس ہے۔
۳	جے ٹبلیٹس۔ خالص خون کو بڑھا کر چہرہ رخسار کو سرخ کرتی ہے	۱۲	جے ٹبلیٹس۔ ہڈیاں اور پٹھوں کو طاقت پہنچاتی ہے
۴	جے ٹبلیٹس۔ سول جگر و معدہ کو مفید قوت پہنچاتی ہے۔	۱۳	جے ٹبلیٹس۔ کاہلی و جسم کے ٹوٹن کو دور کردیتی ہے
۵	جے ٹبلیٹس۔ ہاضم ہے اور اشتہا کو زیادہ کرتی ہے۔	۱۴	جے ٹبلیٹس ریاحی دردوں کیلیے نہایت مفید ہے
۶	جے ٹبلیٹس۔ دافع قبض اور قاطع ریاح ہے۔	۱۵	جے ٹبلیٹس عضلات کو قوت پہنچاتی ہے۔
۷	جے ٹبلیٹس درد کمر اور درد گردہ کیلیے اکسیر ہے۔	۱۶	جے ٹبلیٹس استعمال سے ملیریا نمونیہ نہیں ہوتا۔
۸	جے ٹبلیٹس مقوی مثانہ اور دافع کثرت بول ہے۔	۱۷	جے ٹبلیٹس عورتوں اور مردوں کو یکساں۔
۹	جے ٹبلیٹس۔ مغلظ منی و دافع جریان و کثرت احتلام ہے	۱۸	جے ٹبلیٹس مفید ہے! مفید ہے!! مفید ہے!!!

یہ ایک عجیب الاثر ہے جسکے فوائد کی صداقت امتحان پر موقوف ہے۔

سول ایجنٹ اے ستار جمال کمپنی رنگون۔ کلکتہ کا ایجنٹ حاجی عمر حاجی ابوبکر ۲۷ - امرتلہ لین کلکتہ ٹیلیفون

نظام دکن پریس میں چھپا

هو الناصر

جلد ۲ نمبر ۳ — اردوِ علم ادب کی دلچسپیوں کا مصور رسالہ — مارچ ۱۹۱۶ء

ذخیرہ

مرتبہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

تصویر خوابگاہ

(فہرست مضامین)

قیمت سالانہ للعہ — دفتر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا — فی پرچہ ۸ر

نوٹ :- ڈاکٹر ایس کے برمن کی کافوری جنتری ۱۹۱۶ء کی خوبصورت تیار ہوئی۔ دس شریف پڑھے لکھے اشخاص کے نام اور پتہ لکھنے پر جنتری بلاقیمت و محصول بھیجی جاتی ہے

چھ مشہور دواؤں کا بکس

آزمائش کیلئے — آزمائش کیلئے

ڈاکٹر ایس کے برمن کی مجرب دوائیں گزشتہ ۳۱ سال سے تمام ہندوستان میں استعمال ہو رہی ہیں اس لئے قدیم خریداروں کو مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں صرف نئے اصحاب سے جو اشتہاری ادویات سے متنفر ہو گئے ہوں یقین دلانے اور آزمائش کے لئے یہ مندرجۂ ذیل چھ مشہور اور مجرب ادویات کے نمونہ کا بکس بنا ہے جس میں اس قدر کافی ہر ایک ادویہ ہیں کہ آزمائش پورے طور سے ہو سکتی ہے یہ پٹینٹ شیشوں میں بھری ہوئی خوبصورت کاغذ کے بکس میں بند رہتی ہیں جن کے ساتھ ان کے حالات کی چھپی ہوئی کتاب اور استعمال کی ترکیب بھی رہتی ہے گھر باریوں کے لئے یہ انمول ہے اور مسافرت کی حالت میں بہت مدد دیتی ہے تھوڑے خرچ میں ڈاکٹر ایس کے برمن کی خاص مفید دواؤں کا فائدہ ملتا ہے اپنی خواہ دوسروں کی تھوڑے ہی خرچ میں بہتری ہو سکتی ہے ہر اک پوری شیشی کے دام الگ الگ ہیں۔

دواؤں کے نام

دمہ کی دوا۔ دمہ کیسا ہی زور میں ہو فوراً دباتی ہے۔

کولا ٹانک ۔ ہر ایک کے لئے طاقت بڑھانے کی دوا۔

مقوی باہ گولیاں۔ جیسا نام ویسا فائدہ۔

عرق کافور۔ ہیضہ اور گرمی کے درد کی ایک ہی دوا۔

جلاب کی گولیاں۔ جلاب کی گولیاں شب کو سوتے وقت کھا لینے سے صبح کو خلاصہ اجابت ہوتی ہے۔

قیمت

عرق پودینہ سبز۔ درد شکم دریاحی درد کی دوا۔ پوری حالت کی فہرست طلب کر کے دیکھئے دوا ہر جگہ دوکانداروں اور ڈاکخانوں سے مل سکتی ہیں اور کارخانہ سے طلب کیجئے

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبرہ و ۶ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

دہلی کے نایاب گوہر

ہمارے خاص خاندانی مجربات میں جو معتمد الملک احترام الدولہ والد حکیم محمد احسن خاں مرحوم طبیب حاذق وزیر اعظم بہادر شاہ شاہ دہلی کی ہیں دواخانہ نور تن دہلی انکو خاص طور پر تیار کراتا ہے جو بعد تجربہ اپنے مفید ہونے کا کافی ثبوت دیتے ہیں یہ مجربات سینکڑوں سال سے برابر تجربہ ہو رہے ہیں دواخانہ کی فہرست مفت ملتی ہے

طلاء حیات

نامردوں اور مجلوقوں کے لئے اکسیر ہے۔ کجی و لاغری کو حیرت انگیز فائدہ دیتا ہے پٹھوں و رگوں کو مضبوط کرتا ہے فی شیشی (۱) تولہ عہ

حب مقوی باہ - اعضائے رئیسہ کی کمزوری کو دور کرتی ہیں سست کو چست او نامرد کو مرد بناتی ہیں گولیاں قیمتی اجزا سے تیار کرائی جاتی ہیں قوت باہ بڑھانے میں بے نظیر ہیں فی شیشی ۲۴ گولیاں عہ

حب جریان یہ گولیاں منی کو گاڑھا کرتی ہیں اور بہتی ہوئی کو روکتی ہیں کثرت احتلام رقت منی سرعت اور کمزوری کو بہت مفید ہیں قیمت فی شیشی (۲۰) گولیاں .... عصہ

دوائی ضیق ہر قسم کی کھانسی دمہ کے لئے اکسیر ہے ضعف دماغ میں مفید ہے فی شیشی .... عصہ

بہار حسن پری جمال کہتے ہیں جس کو وہ ہے صورت میری چمن کی شان بڑھانے کا ہی صابن ہے۔ **معزز ناظرین** اگر آپ زندگی کی بہار دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے پری جمال صابن اور روغن پری بہار گیسو دراز کو جو خاص طبی ادویات سے تیار کرائے گئے ہیں صرف ایک مرتبہ بطور امتحان طلب کیجئے ممکن نہیں کہ آپ ہمیشہ اسکو یاد رکھیں اور طلب کیا کریں

پری جمال صابون جو گورے و خوبصورت ہونے کی بہترین ایجاد ہے تازہ تازہ پھولوں اور طبی ادویات سے تیار کیا جاتا ہے جو جسن کو دوبالا کر تا ہے اور منہ کو آئینہ کی مانند شفاف بنا دیتا ہے اور جلد کی تمام جھائیاں چھا داغ دھبے پھوڑے پھنسیاں زائل کر دیتا ہے اور جلد کو مخمل کی مانند ملایم اور گلاب کی پتی کی طرح خوبصورت بنا دیتا ہے ملک نے اسکی بہت قدر کی ہے فی بکس تین ٹکیہ مع محصول ڈاک .... عصہ

روغن پری بہار گیسو دراز نفیس تیل جو اپنی مستانہ خوشبو میں لاجواب ہے اسکے استعمال سے دماغ کو تازگی دل کو فرحت ہوتی ہے خشکی دماغ اور بال لمبے ملائم ہوتے ہیں قیمت مع خوشبو بڑی شیشی ایک تولہ عصہ

المشتہر حکیم محمد یعقوب خاں مالک دواخانہ نورتن دہلی بازار خانم

خواب گاہ

آہ! وہ صبح کو کہنا اُن کا　　　اجی اُٹھتے بھی ہو، ہم جاتے ہیں

(از منشی حکیم محمد خان صاحب لکھنوی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابن رشد اور اوسکے ہمعصر

زندہ مشاہیر کے حالات چشم دیدہ واقعات ہوتے ہیں مگر جن مشاہیر کو مرے صدیاں گزرچکی ہیں اُن کے تذکرے میں عبرت و بصیرت کے بے شمار نکتے مخفی ہوتے ہیں۔ ابن رشد جو اسلام کا عظیم الشان مورخ گزرا ہے اوس کے واقعات زندگی سے ہم اس مرتبہ اپنے ناظرین کو روشناس کرتے ہیں حسن اتفاق سے ایسے بلند پایہ شخص کے حالات ہم کو ایک ایسے بزرگ کے قلم سے لکھے ہوے دستیاب ہوے ہیں جو خود علامۂ روزگار رہے اور اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع کمالات ہندوستان تو ایک طرف ایران و روم کی خاک نے بھی سیکڑوں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہونگے آنریبل نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے ذیل کا محققانہ مضمون عنایت فرماکر اون بے شمار احسانات میں جو "ذخیرہ" پر ابتدائے اشاعت سے مبذول رہی ہیں ایک اور کڑی کا اضافہ کردیا ہے اس التفات و سرفرازی پر نواب صاحب ممدوح کا شکریہ عرض کرنا خاکسار ایڈیٹر اپنا فرض سمجھتا ہے۔

شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو

ایڈیٹر

بر یورپ کے جنوب ومغرب میں ایک جزیرہ نما واقع ہے جس کے تین طرف دریا کا حصار ہے اور شمال کے جانب کوہ پی رینیز کی دیوار اُسے فرانس کے ملک سے جدا کرتی ہے۔ یہہ جزیرہ نما اب اسپین اور پرتگال نامی دو سلطنتوں پر منقسم ہے جن کو اگلے زمانہ میں ہسپانیہ اور لوسیٹانیہ کہتے تھے۔ طارق بن زیاد پہلا مسلمان تھا جس نے اس سرزمین میں قدم رکھا۔ سنہ ۹۲ھ میں مراکش کی طرف سے جہاز پر سوار ہو کر اپنی فوج کے ساتھ ایک مقام پر اُترا جو آج تک اوسی کے نام سے مشہور ہے اور یوروپین زبانوں میں بھی جبرالٹر یعنے جبل الطارق کہلاتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اکثر صوبہ جات اسپین کے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے اور چونکہ صوبہ اندلس پہلا صوبہ تھا جس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا اور دارالامارۃ قرطبہ بھی اسی صوبہ میں واقع تھا انھوں نے کل مملکت کا نام اندلس رکھا۔ کم بیش آٹھ سو برس تک مسلمانوں نے اس ملک میں بادشاہت کی مگر آٹھویں صدی میں زوال شروع ہوا اور نویں صدی تک یہ دولت بالکل اون کے ہاتھ سے تلف ہو گئی۔ اور سارا ملک قبضہ سے نکل گیا۔ اس آٹھ سو برس کے عرصہ میں بھی نہ حکومت ہمیشہ ایک حالت پر رہی اور نہ ایک خاندان نے برابر حکمرانی کی کبھی تو بنی امیہ کا زور تھا کبھی بنی عامر کا دور دورہ رہا کسی زمانہ میں مرابطین کی سلطنت تھی کبھی موحدین بادشاہت کرتے تھے ان انقلابوں کے ساتھ بھی علوم و اخلاق کو جس قدر اندلس کے مسلمانوں نے جلوہ دیا اور صفات انسانی اور کمالات روحانی وجسمانی جس درجہ انھوں نے حاصل کئے قدیم زمانہ کے سربرآوردہ قوموں میں سے کم کسی قوم کو نصیب ہوئے ہیں۔

آٹھ سو برس کے عرصہ میں کئی دور اس قسم کے گزرے کہ آج تک تاریخ سلف میں یادگار اور لایق اعتبار ہیں۔ یعنے وہ دور ہے جس میں علم وحکمت وصلاحیت وشایستگی وتہذیب کے درخت نے چند قرن کا نشوونما چند سال میں حاصل کیا اور برسوں کی مسافت مہینوں میں طے کی۔ قومی زندگی میں یہہ وہ یادگار زمانے ہیں جن کو بعد زوال ونکبت بھی ہم کبھی بھول نہیں سکتے کیونکہ ہمارا بلکہ ہر قوم کا مایۂ فخر اور سرمایۂ نازش جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ اوس قوم نے اپنے زمانۂ عروج میں اور اپنی سعی وکوشش سے مجموعی ذخیرۂ علم و ہنر میں کس قدر رأس المال بڑھایا اور رہاہیت انسانیت کو حالت بہیمیت سے بہ نسبت گزشتہ قوموں کے کس قدر آگے بڑھایا ان دونوں باتوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہے الا تتبع حالات سلف سے خصوصاً اوس وقت کے حالات سے جبکہ علم وہنر وتمدن و دولت نے زیادہ ترقی کی تھی کیونکہ اس جستجو میں بادشاہوں کے کروفر اور سپہ سالاروں کے فتوحات کی کچھ قدر و منزلت نہیں ہے بلکہ مورخ فلسفی ان حوادث تاریخی کو اوسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے استاد یا پدر مہربان ناچ رنگ بکھیڑ وغیرہ کو دیکھتا ہے کہ یہ سب چیزیں ملہی اور تحصیل علم میں حارج اور تہذیب اخلاق کی ترقی کو سست اور بطی کرنے والی ہیں۔

قاضی ابوالولید ابن رشد جسکے حالات آج ناظرین کے روبرو بیان کئے جائیں گے اس قسم کی یادگار قرنوں میں سے ایک قرن کے علم وفضل کا نمونہ اور خلاصہ تھا۔

قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد شہر قرطبہ میں سنہ ۵۲۰ھ مطابق سنہ ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا اور قریب اسّی برس کے سن کو پہنچکر سنہ ۵۹۵ھ مطابق سنہ ۱۱۹۸ء میں وفات پائی۔ ابن رشد کا خاندان قرطبہ میں ہمیشہ سے عالی اور نامآور اور علم میں ممتاز تھا اس حکیم کا دادا ابوالولید محمد بھی قرطبہ کا قاضی تھا اور فقہ مالکی میں بہت شہرت رکھتا تھا اس قاضی کے فتاوی سے ایک بڑی ضخیم کتاب ابن دران خطیب محمد قرطبی نے جمع کی تھی اس کا ایک نسخہ کتابخانہ فرانس میں موجود ہے تمام امصار مغرب واندلس سے

قاضی قرطبہ کے پاس سوالات آتے تھے امور مملکت میں بھی اس شخص
کو بہت کچھ رسائی تھی اور بادشاہان مغرب اس سے مدد لیا کرتے
تھے اور مشاورت کیا کرتے تھے ایک موقع پر جب بعض ولایات
اندلس سلطان سے منحرف ہو گئے تھے اس بغاوت کے رفع ہونے
کے بعد ابو الولید اس خدمت پر مامور ہوا تھا کہ اون کے طرف
سے اطاعت نامہ بادشاہ مراکش کے پاس پہنچاوے ایک مرتبہ
جب الفانسو نے جس کو عربی مورخ اوفنش بن اومیر لکھتے ہیں
ثغور اسلام پر بہت یورش کی تھی اور معاہدین کے مدد سے غرناطہ
کے قریب تک چلا آیا تھا اوس وقت اس حملہ کے دفع ہونے کے
بعد ابو الولید نے خود مراکش جا کر علی بن یوسف المرابطی سے
جو اوس وقت کا خلیفہ تھا یہ کہا کہ جب تک معاہدین کی معقول
تلافی نہ ہوگی دیار اسلام نصرانیوں کی شر سے محفوظ نہ رہیں گے
چنانچہ اس کی صلاح سے بہت سے معاہدین جو غرناطہ کے قرب
وجوار میں رہتے تھے اور جنھوں نے الفانسو کو مدد دی تھی۔
جلاوطن کئے گئے اور لیجا کر آفریقہ کے بعض شہروں میں بسائے گئے
ابو الولید کا بیٹا ابو القاسم احمد حکیم ابن رشد کا باپ ۴۹۲ھ
میں پیدا ہوا اور ۵۶۳ھ میں وفات پائی یہ بھی قرطبہ کی قضاۃ
پر مقرر تھا۔ نہایت عبرت اور تعجب کا مقام ہے کہ ابن رشد
جسکے نام نے صفحات یورپ میں ارسطو کے نام پر مدت تک تفوق
پایا اور تمام علما و حکما میں زبان زد رہا اور آج تک مشہور ہے
وہ شخص خود ہماری کتابوں میں فقط حفید العلامہ ابن رشد یعنی
اپنے دادا ابن رشد کے نام سے مشہور رہے۔

حکیم ابن رشد مثل اپنے بزرگوں کے ابتدائے سن سے تحصیل
علم میں مشغول ہوا اور اصول فقہ طریقہ اشعری اور فقہ مالکی کو
مشاہیر علمائے وقت سے حاصل کیا۔ حدیث کو اپنے والد
ابو القاسم احمد سے اور ابو القاسم بن بشکوال اور ابو مروان بن
مرہ اور ابوبکر بن سمحون و ابو جعفر بن عبد العزیز سے یاد کیا۔
اور ابو جعفر بن عبد العزیز اور ابو عبد اللہ مازری سے اجازہ
پایا علم طب ابو مروان ابن جریول البلنسی سے اور ابو جعفر بن
درون الرجالی سے سیکھا کہتے ہیں کہ روایت کے نسبت درایت
میں اس کو زیادہ ملکہ تھا گو سب سے زیادہ علوم اولیہ اور فنون
عقلیہ میں دخل تھا۔ ابن ابار لکھتا ہے کہ اندلس میں ابن رشد کا کوئی نظیر
علم و فضل و کمال میں نہیں پیدا ہوا اور باوجود اس کے نہایت
متواضع و منکسر تھا ابتدائے سن سے علم کی تحصیل اور اشاعت
میں مصروف رہا۔ بروایت ابن ابار لوگ کہتے ہیں کہ بدو شعور
سے کتاب بینی میں کبھی وقفہ نہیں ہوا الا جس شب کو اوس کے
والد نے وفات پائی اور جس رات اوس کی شادی ہوی ابن
ابار لکھتا ہے کہ اوس نے اپنی عمر میں اپنی مصنفات سے دس
ہزار ورق سیاہ کئے علوم اولیہ کے طرف اسے زیادہ میلان
تھا اور اس فن میں اپنے وقت کا امام تھا مگر اوس کے ساتھ
طب اور فقہ دونوں میں صاحب الرائے تھا اور اس کے
قول سے لوگ استناد کرتے تھے اگرچہ بعض مسائل فلسفی میں
ابن رشد ابن ماجہ کا مقلد ہے اور اپنی تصنیفات میں اس
حکیم بلند مرتبت کا ہمیشہ بڑی عزت سے نام لیتا ہے مگر بعض
اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ماجہ ابن رشد کی ولادت سے
پیشتر وفات پا چکا تھا اگرچہ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ابن رشد
کو ابن ماجہ سے تلمذ تھا اور بالذات اس کی خدمت سے
مستفید ہوا تھا ابن رشد کے ابتدائی زمانہ میں اندلس فحول علما
و حکما سے بھرا ہوا تھا ابن طفیل ابو مروان بن زہر ابوبکر بن زہر
وغیرہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم مسلمان آج فخر کر سکتے ہیں اور

جن کا نام جب تک دنیا قایم ہے زندہ رہیگا ابن زہر کا خاندان جامع کمالات تھا اور ہر فرد اس خاندان کا فرد اکمل تھا خصوص فنون طبعیہ میں اس خاندان کے لوگوں کو بڑی دستگاہ تھی اور نام اون کا یورپ میں آج تک مشہور ہے ہر ایک ان علما و حکما سے اپنے زمانہ کا آفتاب تھا اگرچہ ابن رشد کے کمالات کی روشنی ان سب پر غالب ہوگئی ایسی جلیل القدر لوگوں کی صحبت میں ابن رشد نے تربیت پائی۔ ابن طفیل اس کا بڑا مربی اور دوست تھا ابومروان ابن زہر اور ابن رشد میں ایسی دوستی تھی کہ جب ابن رشد نے کلیات طب کی تصنیف شروع کی ابومروان ابن زہر نے ابن رشد کے فرمایش سے جزئیات میں ایک کتاب لکھنی شروع کی تاکہ دونوں دوستوں کی تصنیفیں یکجا ہوکر فن طب میں ایک کامل کتاب بن جائے اور جس طرح سے خود مصنف ایک جان دو قالب تھے اون کی تصنیف بھی ہمیشہ ایک ہی قالب میں مجتمع رہے۔ ابن رشد کی کتاب کا نام کتاب الکلیات ہے اور ابن زہر کی کتاب کا نام تیسیر ہے ابن رشد کے ذاتی حالات پر ہم کو کسی طرح کی اطلاع نہیں ہے مسلمانوں میں بہت کم بزرگان علم یا مذہب گزرے ہیں جنکے ذاتی حالات بتفصیل ہم کو معلوم ہوں اور اس بے خبری سے ہماری قوم کو کس قدر نقصان اور ہمارے تاریخی علم میں کس قدر نقص واقع ہوا ہے وہی لوگ کچھ خوب اندازہ کرسکتے ہیں جو آج کل یورپ کے تراجم وسیر سے واقف ہیں جس میں ہر ذی کمال کی ساری خانگی اور مخصوص کیفیتیں اور اس کے خصایل و عادات اور معیشت و معاشرت کے طریقے لکھے جاتے ہیں الغرض جو کچھ احوال ابن رشد کا معلوم ہے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے مولوی مشتاق حسین صاحب کی عمدہ تحریر علاوہ بن وزیر و خلیفہ محمد بن عبداللہ تیومرث کے احوال میں ملاحظہ کی ہے وہ یقیناً واقف ہونگے کہ محمد بن عبداللہ اور اوس کے خلیفہ عبدالمومن نے کیونکر علی بن یوسف المرابطی کو شکست دیکر مرابطین کی حکومت کو برباد کیا اور خود ممالک آفریقیہ و اندلس پر قابض ہوگیا اگرچہ اس انقلاب کا باعث و محرک جوش مذہبی تھا اور ابتدا میں اس جوش نے جہلائے متعصب اور عامیان غیر مہذب کے ہاتھ سے بہت کچھ علم کا خرابہ کیا اور کتابیں جلوادیں مگر عبدالمومن کے تخت پر بیٹھتے ہی علم اور عالموں کے دن پھر گئے کتابوں کی تباہی ایک قلم موقوف ہوی اس علم دوست بادشاہ نے اپنے عصر کے سارے فلاسفہ کو اپنے گرد جمع کرکے علما اور فضلا کا نورتن بنالیا بلکہ باغ بسادیا۔ اس بادشاہ کے دربار میں ابن زہر ابن باجہ ابن طفیل ابن رشد مقربین سلطنت میں سے گنے جاتے تھے ۵۴۸ھ م ۱۱۵۳ء میں ابن رشد کو عبدالمومن نے مراکش میں بلوایا اوس وقت یہ بادشاہ مدارس کی بنا میں مشغول تھا اور ابن رشد کو اسی لیے بلایا تھا کہ اس کام میں مدد ملے مولوی مشتاق حسین صاحب کی تحریر میں عبدالمومن کے مدارس کا حال بشرح و بسط بیان ہوا ہے ابن رشد اس کام کے ساتھ ہیئتہ کی تحقیقات میں بھی مشغول تھا۔ عبدالمومن کے بعد یوسف تخت نشین ہوا یہ بادشاہ اپنے وقت کا بڑا عالم اور فاضل بلکہ اعلم و افضل گنا جاتا تھا۔ اس کے عہد میں ابن طفیل کو بہت فروغ ہوا اور بادشاہ کی مزاج میں بڑا دخل پیدا کیا اس نے اپنے اقتدار اور قربت سے یہ کام لیا کہ تمام اطراف و اکناف و دیار و امصار سے علما و فضلا بلاکر جمع کئے اور ابن طفیل

ہی کے باعث سے ابن رشد کو امیر یوسف کے دربار میں رسوخ
حاصل ہوا۔ عبدالواحد ابن رشد کے ایک شاگرد کے زبانی روایت
کرتا ہے کہ ابن رشد اکثر صحبتوں میں اپنی پہلے باریابی
کی کیفیت یوں بیان کیا کرتا تھا

جب میں امیرالمومنین کے سامنے گیا اوس وقت وہ
تنہا بیٹھا تھا اور سوائے ابن طفیل کے کوئی دوسرا حاضر نہ تھا
مجھے دیکھتے ہی ابن طفیل نے میری تعریف و توصیف شروع
کی پہلے میرے علو و قدامت خاندان کا ذکر کیا پھر اپنے
حسن اخلاق سے میرے علم و فضل کی ستایش شروع کی اور
اس قدر مبالغہ کے ساتھ کہ میں ہرگز اس کا سزاوار نہ تھا امیر نے
مجھ سے میرا اور میرے باپ کا نام پوچھ کر باب مخاطبہ
اس عنوان سے کھولا کہ حکما کے نزدیک افلاک کی کیا حقیقت
ہے آیا جواہر قدیمہ ہیں یا حادث مجھ پر رعب ایسا غالب
تھا کہ میری زبان نے مطلق یاوری نہ کی گونگوں اور بہروں
کی طرح ساکت و صامت رہ گیا ایک بات بھی منہ سے نہ نکلی
دل میں کوئی بہانہ ڈھونڈتا تھا کہ جس سے جواب دینا نہ پڑے
بلکہ چاہتا تھا کہ علوم فلسفیہ سے اپنی لاعلمی ظاہر کروں امیر میرے
بشرہ سے تاڑ گیا کہ اوس وقت میری کیا حالت تھی اور
روئے سخن ابن طفیل کی طرف پھیر کر اس نے خود اپنے
سوال کا جواب دینا شروع کیا پہلے افلاطون اور ارسطو
اور دوسرے حکما کے اقوال اس مسئلہ میں نقل کئے پھر متکلمین
اہل اسلام کے معتقدات بیان کئے میں امیر کے قوت حافظہ
سے دنگ رہ گیا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس قدر
معلومات اور تتبع کتب اور وسعت نظر جس کا وجود ان
علما میں بھی شاذ ہے جو تمام وقت اپنا تحصیل علوم فلسفیہ میں
صرف کرتے ہیں اس امیر کو حاصل ہے غرض امیر نے اپنے
حسن تقریر سے میرا رعب ایسا کھو دیا کہ مجھے بھی منہ کھولنے
کی جرات ہوئی اور امیر کو میرے مایۂ علمی پر اطلاع یابی کا
موقع ملا رخصت کے وقت امیر کے حضور سے مجھے ایک خلعت
فاخرہ اور بیش بہا اور کچھ زر نقد اور ایک سواری کا
گھوڑا عنایت ہوا۔

عبدالواحد لکھتا ہے کہ امیر یوسف کے دربار میں مشرف ہونے
کے بعد ابن طفیل ہی کے ترغیب و تحریص سے ابن رشد نے
ارسطو کے کتابوں کی شرح لکھنی شروع کی چنانچہ خود ابن رشد
نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ ایک دن ابن طفیل نے مجھے
بلا کر یہ کہا کہ آج امیرالمومنین شاکی تھے کہ ارسطاطالیس
اور اوس کے مترجمین کا بیان بہت مغلق ہے خدا کرے
کوئی ایسا شارح پیدا ہو کہ مشکل مقاموں کو بخوبی حل کرے
اور اغلاق دور کرے تاکہ عموماً لوگ اس کے کتابوں کے
سمجھنے پر قادر ہوں ایسی تصنیف کے واسطے جو کچھ لیاقت
درکار ہے آج خدا کے فضل سے تجھ میں موجود ہے پھر کیوں
نہیں شروع کرتا تیری فہم و ذکا اور وسعت نظر سے مجھے امید
کامل ہے کہ تو اس کام کو بخوبی انجام دیگا میں خود اقدام
کرتا مگر میری پیرانہ سری اور اوس کے ساتھ اشغال کی کثرت
مانع ہے اوس روز سے میری ساری توجہ اوس تصنیف کے
طرف متوجہ رہی جس کو میں نے ابن طفیل کے اشارہ سے
شروع کیا تھا اور یہ شرح کتب ارسطاطالیس اسی کا نتیجہ ہے

غرضکہ ابن رشد امیر یوسف کے عہد سلطنت میں ہمیشہ مقرب
بارگاہ اور خدمات جلیلہ پر مامور رہا معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۶۵ھ
مطابق سنہ ۱۱۶۹ء میں اشبیلیہ کی قضاوت کا عہدہ اس سے

متعلق تھا چنانچہ کتاب الحیوان ارسطو کی شرح میں جس کو اوس نے
اشبیلیہ میں ختم کیا عذر کرتا ہے کہ میں مشاغل سرکاری میں
مصروف ہوں اور میرا کتب خانہ قرطبہ میں مجھ سے بہت دور
ہے اگر کسی مقام پر مجھ سے خطا ہوگئی ہو تو خوانندے میری
کتاب کے اوس سے چشم پوشی کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۱ء میں ابن رشد
کو اپنے وطن مالوف یعنے قرطبہ میں واپس آنا نصیب ہوا
اور اپنی بڑی شرح اس نے یہیں تمام کی اس کتاب میں
بھی اکثر شکایت کرتا ہے کہ مجھے سرکاری امور نے تصنیف
کی مہلت نہ دی۔ اور مختصر المجسطی کے باب اول کے آخر میں
لکھتا ہے کہ مجھے اس قدر فرصت نہ ملی کہ مسائل اہمہ کے سوائے
اور کسی امر سے اپنی کتاب میں تعرض کروں اور میری مثال اوس
شخص کی ہے کہ جس کے گھر میں آگ لگی ہو اور اوس کو فقط
اتنی ہی مہلت ہو کہ کچھ ضروری اور بیش قیمت چیزیں ہاتھ
میں اٹھالے اور اپنی جان بچا کر نکل بھاگے۔

ابن رشد سے ایسے خدمات متعلق تھے کہ اوسے اکثر
اوقات ممالک محروسہ موحدین میں دورہ کرنا پڑتا تھا
کبھی مراکش میں جانا پڑتا تھا کبھی اشبیلیہ میں کبھی قرطبہ میں
۱۱۷۸ء میں ابن رشد نے مراکش کے مقام میں المقالہ
فی الجرم السماوی کا ایک حصہ لکھا اور ۱۱۷۹ء میں اشبیلیہ پہنچکر
اپنی دینیات کی کتابوں میں سے ایک کتاب تمام کی ۱۱۸۲ء
میں پھر مراکش بلا لیا گیا اور ابن طفیل کی بجائے امیر کے
دربار میں رئیس الاطبا مقرر ہوا بعد ازاں اوس کو قرطبہ
کی قضاوت ملی جو اباً عن جدٍ اس کے خاندان میں چلی آتی تھی
امیر یوسف نے ۵۸۰ھ میں اس دار فانی سے انتقال

کیا اور اس کی جگہ پر اس کا بیٹا یعقوب ابو یوسف ملقب
بالمنصور باللہ تخت نشین ہوا اس امیر کے زمانہ میں بھی
ابن رشد کو وہی رسوخ اور تقرب باقی رہا جو یوسف اور
عبد المومن کے زمانہ میں تھا۔ اکثر امیر اس کے ساتھ علمی مباحث
میں گفتگو کیا کرتا تھا اور اپنی مسند سے بہت قریب بٹھاتا تھا
اور حجاب اس قدر اٹھ گیا تھا کہ اثنائے گفتگو میں ابن رشد
اکثر اپنے بادشاہ سے اسمع یا اخی یا اعلم یا اخی
کہہ کے خطاب کرتا تھا بعضے مورخوں کا قول ہے کہ خود خلیفہ نے
اپنی فرط محبت سے اپنے ملازم اور دوست کو یا اخی کا خطاب
دیا تھا بہر حال خطاب جس کے طرف سے ہو کوئی شک نہیں کہ
دونوں حالتوں میں یہ انداز گفتگو نہ ابن رشد کی شان سے
برتر نہ امیر منصور کے مرتبہ سے فروتر تھا یعقوب المنصور باللہ
کا نام بھی کسی نے نہیں سنا ہے اور ابن رشد کا علم و فلسفہ
آج تک مغرب میں زندہ ہے عام الارک ۵۹۱ھ م ۱۱۹۵ء
میں یعنے جس سال المنصور نے الفونسو (الفنش) پر چڑھائی
کی اور الارک (الارکاس) کی لڑائی ماری ابن رشد باوجود
کبرسن امیر کے ساتھ تھا۔ ابن ابی اصیبعیہ قاضی ابو المروان
الباجی سے روایت کرتا ہے کہ جبکہ المنصور قرطبہ میں غزوہ
الفنش کے واسطے سامان جنگ مہیا کر رہا تھا اوس وقت
اوس نے ابن رشد کو بلایا اور اوس کے ساتھ نہایت درجہ
عزت و احترام سے پیش آیا اور اس قدر قریب اپنے بٹھایا
کہ ابو محمد عبد الواحد بن الشیخ ابی حفص الہنتاتی کی درجہ سے
بھی تجاوز کر گیا یہ ابو محمد عبد الواحد امیر عبد المومن کے
بڑے مقرب وزرا میں سے تھا اور ایسا بڑا مرتبہ اوس کا
تھا کہ امیر منصور اپنی بیٹی کو اوس کے عقد میں لایا تھا غرضکہ

امیر منصور ابن رشد کو اپنے پہلو میں بٹھلا کر بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور کتنے ہی لوگ جو اوس وقت بارگاہ سلطانی میں حاضر تھے اوس کے تقرب کو دیکھکر آتش حسد میں جلتے رہے جب ابن رشد باہر نکلا اوس کے دوستوں اور شاگردوں نے اوس کے گرد حلقہ باندھ لیا اور مبارکباد دینے لگے ابن رشد نے کہا کہ اے صاحبو امیر المومنین کا مجھے دفعتاً اس قدر تقرب دینا کچھ تہنیت اور مبارکباد کا مقام نہیں ہے اور یہ مرتبہ جو مجھے عنایت ہوا ہے میری امید اور توقع سے دور اور میری لیاقت و قابلیت سے زیادہ ہے گویا ابن رشد اپنی فراست و ادراک سے سمجھ گیا تھا کہ میری نکبت اور ادبار کا زمانہ قریب آگیا ہے اور غرض اس تقریر سے یہ تھی کہ بادشاہوں کے تقرب پر پھولنا اور غرہ کرنا عقلمندی سے دور ہے گھے بہ سلامے برنجند و گہے بہ دشنامے خلعت دہند

القصہ اس صحبت کے وقت ابن رشد کے دشمنوں نے مشہور کر دیا تھا کہ امیر المومنین نے اوس کے قتل کا حکم دیا ہے اس واسطے ابن رشد نے صحیح و سلامت باہر آتے ہی اپنے خدام میں سے ایک شخص کو اپنے گھر روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ میرے واسطے قطا کا سالن اور کچھ کبوتر بھنے ہوے جلد تیار کر رکھو میں ابھی آتا ہوں اس پیام سے غرض ابن رشد کی یہ تھی کہ اوس کے اہل خانہ کو اطمینان ہو کہ آقائے خانہ صحیح و سالم ہے۔

القصہ امیر منصور کی عنایت بے نہایت نے ابن رشد کو محسود اقران بنا دیا اور دربار میں اوس کے دشمنوں کی تعداد زیادہ کر دی اور اون کی سعایت و نمامی نے آخر کار امیر کے مزاج کو برہم کر دیا اور اوس کی نکبت و ادبار کا باعث ہوے اس واقعہ کو مورخوں نے مختلف طور پر بیان کیا ہے انصاری کہتا ہے کہ امیر منصور کے بھائی ابو یحیی والی قرطبہ اور ابن رشد میں باہم بڑی محبت و دوستی تھی اور اس امر نے منصور کو ابن رشد سے بدظن کر دیا تھا عبد الواحد لکھتا ہے کہ ابن رشد شرح کتاب الحیوان میں ایک مقام پر لکھ گیا تھا کہ میں نے ایک زرافہ سلطان بربر کے سرکار میں دیکھا ہے ابن رشد کے حاسدوں نے منصور کو یہ عبارت دکھائی کہ امیر کی وقعت اس شخص کے دل میں بس اس قدر ہے کہ امیر کو سلطان بربر کے نام سے یاد کرتا ہے جب ابن رشد سے پوچھا گیا اوس نے جواب دیا کہ یہ سہو کتابت ہے اصل میں میرا مقصد سلطان البرین تھا نہ سلطان البربر یہ وجہ صحیح ہو یا غلط علما و حکما کا دستور چلا آتا ہے کہ علمی کتابوں میں جب کسی بادشاہ کا نام آتا ہے تو اوس کو معمولی طور پر لکھ جاتے ہیں مدحیہ الفاظ و خطابات وغیرہ کو حذف کر جاتے ہیں علما کے شان سے بعید ہے کہ سلاطین و امرا کی چاپلوسی کریں اور اون کی مدح و ثنا میں مبالغہ کریں ابن رشد کی کوئی خطا نہ تھی بلکہ اصل حقیقت تو یوں ہے کہ امیر منصور کے نام کا ابن رشد کی کتاب میں ذکر کیا جانا ہی امیر کے بقائے نام اور فخر خاندان کا باعث تھا۔ انصاری نے ایک روایت اس باب میں نقل کی ہے۔ لکھتا ہے کہ مشرق و اندلس میں ایک خبر نجومیوں نے مشہور کی تھی کہ ۵۸۱ھ یا ۵۸۲ھ میں ایک ریح عاتیہ فلاں دن فلاں تاریخ چلیگی جس سے تمام خلقت ہلاک ہو جائیگی اس خبر کو اس قدر شیوع ہوا کہ تمام لوگ ہراساں اور خوف زدہ ہو گئے اور اپنی جانیں بچانے کے واسطے زمین میں گڑھے اور خندقیں کھودنے لگے حکومت نے عامہ خلایق

کو اس قدر ترساں و لرزاں دیکھکر قرطبہ میں ایک مجلس منعقد کی اور تمام علمائے وقت کو جمع کرکے اُن سے اس خبر وحشت اثر کی حقیقت پوچھی غرض جب مجلس برخاست ہوچکی ابن رشد جو اس وقت قرطبہ کا قاضی تھا اور ابن بندود آپس میں باتیں کرتے ہوئے مجلس سے باہر نکلے ابن بندود اندروے حکمت طبعی و تاثیرات کو اکب اس طوفان کے بارہ میں کچھ بیان کررہا تھا کہ اس اثنا میں ابو محمد عبد الکر نے جو بقول خود اس وقت حاضر تھا یہ کہا کہ اگر طوفان کی خبر سچ ہے تو یہ ثانی ریح عاتیہ ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے قوم عاد کو ہلاک کیا تھا کیونکہ قوم عاد کی ہلاکت کے بعد کوئی طوفان اس قسم کا سننے میں نہیں آیا جس سے قوم کی قوم ہلاک ہوگئی ہو ابو محمد عبد الکر کہتا ہے کہ ابن رشد نہ رہ سکا یہاں تک کہ بول اٹھا کہ وجود قوم عاد کا ہی محقق نہیں ہے چہ جائے کہ ان کی ہلاکت سننے والے سن کر حیران رہ گئے اور یہ گمراہی کا قول اون کو سخت ناگوار ہوا جس کا کوئی شخص بغیر صریح بد اعتقادی کے قایل نہیں ہوسکتا۔

ابن زبیر لکھتا ہے کہ علمائے وقت نقل احادیث و مسایل دینیہ میں ابن رشد پر اعتماد کیا کرتے تھے اور اوس کے اقوال سے سند لیا کرتے تھے مگر جب اوسے علوم حکمیہ میں زیادہ توغل ہوا اور ارسطو کے کتابوں کی اوس نے تلخیص کی اور شریعت و فلسفہ کو باہم جمع کرنے کا قصد کیا اوس وقت سے اکثر لوگوں نے اس کی تقلید چھوڑ دی اور اعتبار اس کا ساقط ہوگیا عبد الواحد ناقل ہے کہ ابن رشد نے اپنی تصنیف میں بعضے قدما کا قول نقل کیا تھا کہ زہرہ آلہ میں سے ہے اوس کے دشمنوں نے اس عبارت کو اپنے مقام اور سیاق کلام سے علیحدہ کرکے امیر منصور کو دکھایا کہ یہ شخص ملحد ہے سیارہ کو خدا کہتا ہے۔

اصل حقیقت یہہ ہے کہ جب کبھی کسی شخص نے اپنے فضل و لیاقت سے دنیا میں نام و نشان پیدا کیا اور بادشاہوں کے درباروں میں اس قدر تقرب و اعتبار حاصل ہوا جس قدر ابن رشد کو امیر منصور کے دربار میں حاصل ہوگیا تھا تو ایک عالم اس کا دشمن اور اوس کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے جس وقت تک حاکم کی نظر مہربان ہے لوگ اوس کے قدموں کے تلے پلکیں بچھاتے ہیں ادھر شعرا اور ادبا اوس کی مدح و ثنا میں رطب اللساں ہیں ادھر علما و امرا اوس کی خوشامد گوئی میں عذب البیان ہیں اس سے اگر خطا ہو تو صواب ہے، ہزل بکے تو عین حکمت ہے گالیاں دے تو لوگ فخر سمجھکر سنتے ہیں گناہ کرے تو اوسے ثواب جانتے ہیں کفر کا مرتکب ہو تو معرفت پر حمل کرتے ہیں۔ مگر جہاں حاکم کی نظر اس سے پھری اور اپنے پایہ سے گرا پھر تو ایک آن کی آن میں کایا پلٹ جاتی ہے یہی لوگ جو ہر وقت خوشامد میں مصروف رہا کرتے تھے کتوں کی طرح بھونکنے لگتے ہیں پھر تو کوئی ہنر اُس میں نہیں ہے جو عیب نہ ہو کوئی حسن نہیں جس میں ہزار داغ نہ ہوں۔ وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ ولکن عین السخط تبدی المساویا جس کسی کو حاکم تک رسائی ہے اپنے رسوخ کے واسطے کوئی نیا عیب ڈھونڈکر پیش کرتا ہے جھوٹ کی ندیاں بہ جاتی ہیں بہتان کے طوفان چل جاتے ہیں ابن رشد کے حسادنے بھی ابن رشد کے حق میں کچھ کمی نہیں کی ہجوئیں لکھیں تاریخیں کہیں خوشیاں منائیں خوب شماتت کی ایک شخص کہتا ہے کہ

الآن ایقن ابن رشد ان تو الیفہ توالف

یا ظالما نفسہ تأمل هل تجد الیوم من تؤالف

چونکہ شماتت کے ساتھ بادشاہ کی خوشامد کے بغیر کچھ مزہ نہ تھا اس واسطے ہی شاعر یہ بھی لکھتا ہے۔

خلیفة الله دم للدین تحرسه من الاعادی وتقیه شر شانیه

فالله یجعل عدلا من الخلیقة مطهرا دینه فهو اس کلما

اور اسی قبیل سے اور بہت کچھ بک گئے ہیں جس کا ذکر ہمارے میدان فکر اور احاطہ مضمون سے باہر ہے۔ غرض ابن رشد کے اخراج کی کتنی ہی تاویلیں کیوں نہ کی جائیں اہل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ خلیفہ کو بعض امور نے اوس کے طرف سے بدگمان کر دیا تھا حساد نے موقع پاکر عیب چینیاں شروع کیں جس کسی کو کوئی بات جھوٹی یا سچی ہاتھ لگی جا کے امیر کے کانوں تک پہنچا آیا امیر تو بدگمان ہو ہی چکا تھا الحاد کا بہانہ اُسے اچھا مل گیا چند فقہا کو جمع کر کے بعلت زندقہ اس کے اخراج کا فتوے دلوا دیا اور اوس کے ساتھ ہی تمام ملک میں منادی پٹوا دی کہ کوئی علوم فلسفہ کی تحصیل نہ کرے اور تمام معقولات کی کتابوں کے جلا دینے کا حکم دیدیا عجب نہیں ہے کہ جس طرح امیر حکم بن عبد الرحمن المستنصر باللہ کے بعد اس کے حاجب منصور نے عوام الناس کو اپنا طرفدار بنانے کے واسطے حکم کا کتاب خانہ جلوا دیا تھا اور علوم عقلیہ کی تعلیم موقوف کرا دی تھی اُسی طرح اس خلیفہ کو بھی جو اتفاقاً اس کا ہم لقب ہے یہی ضرورت پیش آئی ہو یعنے چونکہ خود اوس کو علوم حکمیہ میں بہت توغل تھا اور حکمائے وقت کو اپنے دربار میں نہایت پیش پیش کر رکھا تھا اور ابن رشد سے تو سمجھے اپنے بھائی کی دوستی کی وجہ سے بدگمان ہو ہی چکا تھا اور شاید اوس کے فضل اور کمال کا رشک بھی فی الجملہ اس کے دل میں سما گیا تھا اس واسطے الحاد کے بہانہ کو اُس نے غنیمت جانا کہ جس سے اول تو ابن رشد نکالا گیا اور دوسرے خود اُس نے عوام الناس سے اپنی برات اور صیانت کا صداقت نامہ حاصل کر لیا کیونکہ ہمیشہ سے عوام علما اور حکما کے دشمن ہیں قصہ مختصر ابن رشد کا نکالا جانا کیا تھا کہ ایکبارگی علم اور علما پر نکبت آگئی اکثر فحول علمائے وقت ابن رشد کے ساتھ شہر بدر کئے گئے اور ترقی علم کا ستارہ غروب ہو گیا کہتے ہیں کہ عتاب سلطانی میں مبتلا ہونے کے بعد ابن رشد کو قرطبہ سے نکال کر الیانہ میں رہنے کا حکم ملا تھا چنانچہ ایک مدت تک وہیں مقیم رہا ابن رشد کے حساد اور دشمن کہتے ہیں کہ یہ شخص مجہول النسب بقول بعض یہودی الاصل تھا اس واسطے بادشاہ نے اسکو الیانہ بھیجا کیونکہ الیانہ کے باشندے اکثر یہودی تھے مگر تاریخ واخبار سے اس قول کی بنا سوائے بغض اور حسد کے دوسری نہیں پائی جاتی بلکہ ظاہر ہے کہ اگر یہودی الاصل ہوتا تو ہرگز خود اس کو اور اس کے اجداد کو دار الخلافہ قرطبہ کی قضات کا عہدہ کبھی نہ ملتا ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ابن رشد کے ساتھ ابو جعفر الذہبی اور فقیہ عبد اللہ محمد بن ابراہیم قاضی بجایہ اور ابو الربیع الکفیف و ابو العباس الحافظ الشاعر القرابی بھی اس علت میں شہر بدر کئے گئے کہ علوم اولیہ میں ان کو زیادہ توغل تھا مورخوں نے لکھا ہے کہ ابن رشد چار برس تک معتوب رہا اور بعد چار برس کے ۵۹۵ھ میں بعض اعیان اشبیلیہ نے بادشاہ کے حضور میں بیان کیا کہ ابن رشد در حقیقت ملحد نہیں ہے اور لوگوں نے غلط اوسے متہم کیا ہے منصور نے اس شہادت کو قبول کیا اور ابن رشد اور اس کے ساتھ تمام علمائے مہاجر کو اپنے پاس مراکش میں بلوا لیا اور جو احکام علوم عقلیہ کے بارہ میں جاری کئے تھے سب کو

منسوخ کر دیا اور خود بھی بار دیگر ان علوم کی تحصیل میں مصروف
ہوا ابن رشد کو پھر اپنا مقرب بنایا اور ابو جعفر ذہبی کو جو
ابن رشد کی ہجرت میں اوس کا رفیق تھا اور اوس کے ساتھ
نکالا گیا تھا تصنیفات طبی و فلسفی کے واسطے مقرر کیا۔ ان
قرائن سے ظاہر ہے کہ ابن رشد کے اخراج کا باعث وہ نہ تھا
جو عوام میں مشہور ہو گیا تھا بلکہ مصالح ملکی نے امیر کو اس تجویز
پر مجبور کر دیا تھا و الّا قیاس سے دور ہے کہ منصور جیسا عالم
و حکیم چند حسّاد و متعصبین کے کہنے سننے سے اپنے دربار کو
فحول علمائے وقت سے خالی کر دے اور اوس کی رونق
شادی دوبارہ دربار بادشاہی میں باریاب ہونے کے
بعد ابن رشد کو قضا نے زیادہ مہلت نہ دی اسی سال
پنجشنبہ کے دن ۹ صفر ۵۹۵ھ مطابق دسویں دسمبر ۱۱۹۸ء
میں اس جہان فانی سے رحلت کر گیا اور مراکش میں باب تا
غزوت کے باہر تین مہینہ تک اس کی لاش مدفون رہی بعد
تین مہینے کے لوگ اُسے اٹھا کر قرطبہ لے گئے اور اپنے بزرگوں
کے ساتھ مقبرہ ابن عباس میں دفن کیا ابن رشد کے کئی فرزند
تھے اور سب رشید ابو عبد اللہ طبیب حاذق اور صاحب
تصانیف تھا جس کا ترجمہ احوال ابن ابو صبیعہ نے اپنے
طبقات اطبا میں لکھا ہے قاضی ابو القاسم اور ابو الحسین
علوم دینیہ میں فایق اور صاحب رائے و اعتبار تھے ایک
نصرانی مورخ نے روایت کی ہے کہ ابو محمد عبد اللہ نے بادشاہ
الیان کے دربار میں رسوخ پیدا کیا تھا مگر یہ قول پایۂ اعتبار
سے ساقط ہے۔ اسی زمانہ میں تھوڑی مدت کے فاصلہ سے
تمام مشاہیر علمائے وقت دنیا سے اٹھ گئے یہ وہ لوگ تھے
جن کا ثانی پھر کسی سرزمین اسلام میں نہ پیدا ہوا ابن بیطار

اور عبد الملک ابن زہر نے اسی سال میں قضا کی ابن طفیل پیش
قدمی کر چکا تھا ابو بکر بن زہر بھی تھوڑی ہی مدت اور جیا
عبد الواحد مورخ موحدین جس نے اسی ۵۹۵ھ میں مغرب
و مراکش کا سفر کیا تھا ابو بکر کو بہت ہی ضعیف اور زار گویا
لب گور پایا۔ یادگار سلف فقط ایک ابن طفیل کا بیٹا مراکش
میں باقی رہ گیا تھا امیر یعقوب المنصور باللہ نے بھی ابن رشد
کے مہینہ بھر بعد وفات پائی ؎ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد۔ منصور اپنے وقت کا
مہتاب علم تھا اور یہ بزرگوار اوس کے دربار کے ستارے
تھے تھوڑے ہی زمانہ میں نہ یہ علما رہے نہ منصور سا سرپرست
رہا جہل کی تاریک گھٹا چاروں طرف چھا گئی اور عالم
اسلام کو تیرہ و تار کر دیا اوس وقت سے تحقیق کا باب مسدود
ہو گیا۔ علوم عقلیہ سے لوگوں نے کنارہ کیا فلسفہ و حکمت
کو وسوسۂ شیطانی سمجھنے لگے حکمائے سلف کی ہر طرف تکفیر
ہونے لگی یہ سامان جہالت ممالک شرقیہ اسلام میں پہلے
ہی پھیل چکا تھا ۵۱۱ھ میں خلیفہ مستنجد باللہ کے وقت
میں کسی قاضی کے ہاں علوم معقول کی کتابیں جمع تھیں خلیفہ
کے حکم سے بغداد میں جلا دی گئیں خصوصاً ابو علی بن سینا کی
کتابیں اور اخوان الصفا کے رسالے ۵۹۲ھ میں عبد السلام
نام ایک طبیب نامی گرامی تھا لوگوں نے اُس کو زندقہ سے
متہم کیا اور بادشاہ وقت کے حکم سے اوس کی کتابیں بڑے
اہتمام کے ساتھ جلائی گئیں اس خدمت پر ایک بڑے
مولوی صاحب مقرر ہوے اول انھوں نے منبر پر بیٹھ کر
فلسفہ و حکمت کی مذمت میں کچھ کلمات فرمائے اس کے بعد
کتابیں طلب کیں ایک ایک جلد ہاتھ میں لیتے اور کچھ

کلمات اوس کی شناعت و ردائت میں بیان کرکے لوگوں کے سپرد کرتے تھے وہ اوسے فوراً الاوہ میں ڈالدیتے تھے موسیٰ بن میمون کا ایک شاگرد رشید بیان کرتا ہے کہ میں اوس حیرت انگیز موقع پر حاضر تھا جب ابن ہیثم کی کتاب ہیئات قاضی صاحب کے ہاتھ میں آئی۔ قاضی صاحب نے اوس بے گناہ کتاب کے حق میں بہت سے کلمات سخت و سست کہہ کے اوسے آگ میں ڈلوادیا۔ معلوم نہیں کہ اس قسم کے ستمگاروں کے ظلم سے کس قدر دولت علمی آگ میں جلی ہے اور خود قوم عرب اور ملت حنیف اسلام کا کتنا بڑا نقصان ہوا۔

اندلس میں اس قسم کا ایک معرکہ بنی امیہ کے آخر زمانہ دولت میں گزر چکا تھا خلیفہ الحکم ثانی المخاطب بالمستنصر باللہ بنی امیہ کے خاندان کا نواں خلیفہ ۳۵۰ھ میں اپنے باپ عبدالرحمن کی وفات کے بعد قرطبہ کے تخت پر بیٹھا اس بادشاہ کے تفصیلی حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں سوائے حکمرانی اور جہانبانی کے علم کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ تمام وقت اپنا کتاب بینی اور علما کی صحبت میں صرف کرتا تھا۔ ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ کوئی بادشاہ اسلام نہیں گزرا جس نے اس قدر کتابیں جمع کی ہوں اور علم کا اس قدر حریص ہو ہمیشہ علم کے رواج میں ساعی رہتا تھا طلبا اور علما کی ہر طرح تحریص و ترغیب کرتا تھا اور دور دور انعام اور صلۂ مصنفان زمانہ کے پاس بھیجتا تھا غیر ملکوں میں علما اور حکما اس خلیفہ کے طرف سے وظیفہ پاتے تھے ابوالفرج اصفہانی کے پاس ہزار دینار ذہب بھیجے اور اوس سے ایک نسخہ کتاب الاغانی کا منگایا چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ بے نظیر کتاب خود عراق میں مشتہر ہونے نہ پائی تھی کہ اندلس میں شایع ہوگئی اطراف وجوانب میں اس کی طرف سے کاتب مقرر تھے جو کتاب نئی تصنیف ہوئی پایا اور ہاتھ لگی فوراً نقل ہوکے قرطبہ بھیجی گئی۔ اس کے کتابخانہ کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی اور باوجود اس کثرت کے اوس کی کتاب بینی کا یہ حال تھا کہ کوئی کتاب اس کتابخانہ میں ایسی نہ تھی جسکو اس نے اول سے آخر تک مطالعہ نہ کیا ہو اور اوس کے سادہ ورق پر یا حاشیہ پر اپنے خط سے مصنف کا حال اور نسب نامہ نہ لکھا ہو اس خلیفہ کے زمانہ میں اندلس کتابخانوں سے بھر گیا تھا۔ اور شوق علم کا چاروں طرف پھیل گیا تھا اور جیسا شوق اس کو علم کا تھا اوسی قدر حلم ومروت و رعیت پروری بھی اس کی طبیعت میں سرشت تھی اور تدین کا یہ حال تھا کہ باوجودیکہ انگور سے محاصل کثیر اس کی سرکار میں آتا تھا چونکہ شراب بہت کثرت سے بننے لگی تھی الحکم نے حکم دیدیا تھا کہ دو ثلث زراعت انگور کی موقوف کردی جائے اور تاکستان مسمار کردئے جائیں اور فقط ایک ثلث کھانے اور رب بنانے کے واسطے باقی رکھا جائے الحکم نے ۳۶۶ھ میں وفات پائی اور اوس کا صغیرسن بیٹا ہشام تخت نشین ہوا اور محمد ابن ابی عامر مدارالمہام اور کارپرداز ہوا ابن عامر کے بارہ میں مورخین نے بہت اختلاف کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ اس نے نمک حرامی کی راہ سے تمام بڑے بڑے امرا کو کسی نہ کسی بہانہ مرواڈالا اور ساری حکومت خود اپنے اختیار میں کرلی اور ہشام کو برائے نام تخت پر بٹھلا رکھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تدابیر ابن عامر نے ملک و دولت کی مضبوطی کے واسطے کی۔ غرض اس میں شک نہیں کہ

یہ شخص بڑا عاقل اور ذی ہوش اور جواں مرد اور بارائے
وتدبیر تھا اس کے وقت میں حدود ملک کے بہت وسیع
ہوگئے اور انتظام بہت درست رہا جس غرض سے ابن
عامر کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ الحکم کے مرنے
کے بعد اُس نے اُس کے کتاب خانہ میں سے تمام علوم معقول
کی کتابیں نکالکر جلوادیں اور علوم عقلیہ کا درس تدریس
بالکل موقوف کرادیا اور سبب اس فعل کا وہی معلوم ہوتا ہے
جو ابن رشد کے زمانہ میں المنصور کے ہاتھ سے کتابوں
کی خرابی کا باعث ہوا یعنے ابن عامر کو مثل المنصور کے
ضرور ہوا کہ عوام الناس کو خوش کرے اور جہلا کے قلوب
کو اپنی جانب متوجہ کرے اور اون کی جہالت سے کام
لے تاکہ تدابیر ملکی میں خلقت اوس کی مددگار ہو۔

اس قصہ کے بیان کرنے سے اس قدر دکھانا مقصود ہے
کہ جو اسباب ابن رشد کے زمانہ میں جمع ہوگئے اور علم وعلما
کی کساد بازاری کے باعث ہوے زمانہ سابق میں بھی ایک
مرتبہ ایسا ہی سامان جمع ہوا تھا اور نتایج بھی اُس کے
وہی مترتب ہوے تھے واقع میں خود ملت اسلام نے کبھی
علم کے ساتھ دشمنی نہیں کی ہے بلکہ عوام کی جہالت اور سلاطین
کی پولیٹیکل ضروریات کبھی کبھی علم اور علما کے سر پر آفت لائی
ہیں حقیقت میں بمصداق الناس اعداء ما جهلوا
علم وجہل میں تباین ہے اور عالم وجاہل میں سرشتی اختلاف
ہے جاہل ہر قوم کے کالانعام ہوتے ہیں بلکہ اون سے بھی
گمراہ تر۔ مسلمانوں میں اسلام کبھی علم کے مٹانے کا باعث نہیں
ہوا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح نصرانی بادشاہان اندلس
نے دولت اسلام کے زوال کے وقت عربی کتاب خانے
جلائے اور لاکھوں نسخے برباد کردئیے اور نصرانی فاتحان
مصر نے رومیوں کی علمی دولت میں آگ لگائی ویسا
کبھی کسی مسلمان بادشاہ نے نہیں کیا اور نہ یورپ کی
طرح اختلاف مذہب یا تفلسف کی وجہ سے لوگ زندہ
آگ میں جلائے گئے جو کچھ ظلم مسلمانوں کے ہاتھ سے علم
وعلما پر ہوا جہلا اور عوام الناس کے خاطر ہوا یا زوال
دولت کے وقت جبکہ دولت وحکومت خود ایسے رذل لوگوں
کے ہاتھ میں تھی جو جاہل اور عامی تھے اندلس میں ابن رشد
کے قریب قریب زمانہ میں کئی واقعے اس قسم کے گزرے
ابن باجہ ابن رشد کا استاد زندقہ کے اتہام میں قید ہوا
اور ابن رشد کے باپ قاضی القضاۃ قرطبہ کی سفارش
سے رہائی پائی۔ ابن طفیل کو لوگ مخترع بدعت فلسفی
کہتے تھے اور کہتے تھے کہ ابن رشد اور موسیٰ بن میمون کو
اسی حکیم کی تعلیم نے گمراہ کیا اس خوف سے عبدالملک
ابن واہب نے جو اشبیلیہ کا رہنے والا ابن باجہ کا معاصر
اور اپنے وقت کا بڑا حکیم تھا علوم عقلیہ کی درس تدریس
کو ترک کردیا تھا چنانچہ ان فنون میں جن میں وہ بڑا ماہر
تھا ایک پرچہ بھی اوس کے تصنیفات سے اوس کے بعد
نہ ملا ابن حبیب اشبیلیہ کا رہنے والا تفلسف کے جرم میں
قتل کیا گیا ایک مشرقی مورخ ابن حبیب کا ذکر کرنے کے
بعد لکھتا ہے کہ اندلس میں فلسفہ اور حکمت سے بڑی نفرت
ہے جن لوگوں کو ان فنون کا شوق ہے وہ بہت ہی
پوشیدہ طور پر اون میں توغل کرتے ہیں مطرف اشبیلی آج
کل اس شغل میں مشغول ہے اور اپنے ہم شہریوں میں بدنام ہے
مگر اپنی تصنیفات کبھی کسی کو نہیں دکھاتا۔

ابن اصیبعہ ابوبکر ابن زہر کے ترجمہ میں لکھتا ہے کہ جب المنصور نے علوم عقلیہ کی تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا کہ جو کوئی منطق یا فلسفہ کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے گھر میں رکھے تو اُس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم ثابت ہو تو سخت سزا دی جائے اُس وقت اُس نے ابوبکر ابن زہر کو اس قانون کے اجرا کے واسطے مقرر کیا خوب معلوم ہے اور اس وقت کے لوگوں کو اور خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا خاندان کا خاندان فلسفی تھا اور پشت سے یہ فن ان کے گھر کا فن تھا خود ابوبکر بن زہر بھی مثل اپنے چچا اور بھائی کے حکیم کامل تھا اگرچہ اس زمانہ میں مصلحتاً ان علوم سے اپنا جہل ظاہر کرتا تھا۔ امیر المنصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے تجویز کرنا میرے نزدیک خود دلالت کرتا ہے کہ امیر المنصور کی ساری کارروائی مصلحت وقت اور تدبیر مملکت پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ اور حکمت کی کتابیں ڈھونڈہ ڈھونڈہ کر جلائیں الّا اپنے کتب خانہ کے موسوریناں لکھتا ہے کہ دستور کے موافق

اس رفتار کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما نے ظاہر پرستی اختیار کی اور اپنی مکتوبات کو چھپانے لگے ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ہم کو ابو عباس احمد بن محمد بن احمد اشبیلی سے یہ بات پہونچی ہے کہ ابن زہر کے دو شاگرد طب کی کتابیں اُس سے پڑھتے تھے ایک دن معمول کے موافق یہ دونوں طب کی کتابیں بغل میں مارے ہوے استاد کی خدمت میں حاضر ہوے۔ ابن زہر نے دیکھا کہ ایک کے ہاتھ میں ایک کتاب منطق کی بھی ہے فوراً لڑکے سے چھین کر ایک کوتہ میں ڈالدی اور لکڑی لیکر ان دونوں کے پیچھے دوڑا مگر وہ اس دن ہاتھ نہ لگے اور کئی دن تک سبق لینے نہ آئے بعد چند روز کے جب انھوں نے سمجھ لیا کہ اُستاد صاحب کا غصہ فرو ہوگیا ہوگا پھر معمول کے موافق حاضر ہوے اور عذر و معذرت کرنے لگے کہ اُس روز بھول سے ایسی بیہودہ کتاب ہم اپنے ساتھ لائے تھے ہمیں خود نہیں معلوم تھا کہ کاہے کے اندر کیا لکھا ہے۔ ابن زہر بھی اغماض و تجاہل کر گیا اور اون کا عذر قبول کر لیا اور پھر اون کو بدستور طب کا درس دینے لگا مگر اس قدر اضافہ کے ساتھ کہ ہر روز دو ایک رکوع قرآن مجید کے اُن سے زبانی سن لیا کرتا تھا اور تاکید کر دیتا تھا کہ گھر پر پہونچ کر اون آیتوں کی تفسیر دیکھ لو اور سیرت نبوی کا بھی مطالعہ کیا کرو۔ جب تھوڑے عرصہ میں شاگرد ان علوم میں مضبوط ہوچکے اوس وقت ابن زہر ایک دن وہی رسالہ منطق کا اپنے کتاب خانہ میں سے نکال لایا اور کہا کہ اب تم کو اس کتاب کا پڑھنا کچھ منع نہیں ہے اور اون کو پڑھانا شروع کیا

نفح الطیب میں لکھا ہے کہ اہل اندلس تمام علوم و فنون میں دوسری قوموں پر سبقت لے گئے تھے سوائے طبعیات اور ہیئت کے اگرچہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ان دونوں فنون میں بھی پوشیدہ توغل رکھتے تھے مگر اعلان ان کی تعلیم نہ ہوتی تھی کیونکہ عوام الناس ان فنون کو بہت بُرا جانتے تھے اور اگر کہیں سن پاتے تھے کہ فلاں شخص طبعیات یا ہیئت میں ماہر ہے تو فوراً کفر کا حکم اس پر لگا دیتے تھے اور انواع و اقسام کی

تکلیف پہنچاتے تھے کبھی خود سلطان کو بھی جہلا کی خاطرداشت
کے واسطے اُن کی مرضی کے موافق علما کو ستانا اور اون
کی کتابیں جلانا پڑتا تھا جس طرح الحکم ثانی کے بعد
المنصور نے بعض علمار کو مروا ڈالا اور کتابیں جلوا دیں
حالانکہ المجاری لکھتا ہے کہ خود المنصور ان فنون کا
بڑا اشایق تھا۔

ریان لکھتا ہے کہ اس قسم کی دشمنی علم کے ساتھ
عوام الناس کو بہت مرغوب تھی اور علم دوست
سلاطین بھی اکثر بہ مجبوری و بہ کراہت عوام کے خوش
کرنے کے واسطے ایسے فعل کے مرتکب ہوا کرتے تھے اور
تتبع تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندلس کے عوام اہل اسلام
کے ساتھ یہ صفت علم دشمنی کی مخصوص تھی بہ ظاہر اسباب
اندلس کے نصارے کی صحبت سے مسلمانوں کو یہ
بات حاصل ہوئی تھی کہ اندلس کے اصل باشندے اس
وقت سے آج تک متعصب مشہور ہیں اور ہمیشہ علمی
کتابوں کے اور علما کے ساتھ دشمنی کرتے آئے ہیں
چنانچہ انتزاع سلطنت کے بعد جب فرڈننڈ اور اس
کی ملکہ ازابیلا ملک پر قابض ہوئے مسلمانوں کا خزینہ اندوختہ
اون کے ہاتھ سے بہت کچھ تلف ہوا اور اسی ہزار
کتابیں ایک مرتبہ جلائی گئیں۔ ایک انگریزی مورخ کا
قول ہے کہ اندلس کے لوگوں کو متعصب ترین بادشاہان
اسلام کے وقت میں جس قدر آزادی حاصل تھی نصرانی
بادشاہوں میں سے زیادہ سے زیادہ آزادنش اور
علم دوست بادشاہ کے وقت میں کبھی حاصل نہیں ہوئی

ذکر مصنفات ابن رشد بطور اجمال

ابن رشد کے تصنیفات بہ کثرت ہیں اگرچہ آج کوئی ایک
بھی اون میں سے ہمارے ہاتھ میں موجود نہیں ہے۔
بعض کتابوں کا فقط نام ہی لے لینا اس کے علم اور
وسعت نظر کو بتائیگا۔

کتاب[1] المقدمات فی الفقہ۔ کتاب[2] نہایۃ
المجتہد فی الفقہ۔ کتاب[3] الکلیات فی الطب
شرح[4] الارجوزۃ السینائیہ۔ کتاب[5] الحیوان
جوامع[6] کتب ارسطاطالیس فی الطبیعیات
والالٰہیات۔ کتاب[7] الضروری فی المنطق
تلخیص[8] کتاب مابعد الطبیعیہ لارسطاطالیس
تلخیص[9] کتاب الاخلاق لارسطاطالیس
تلخیص[10] کتاب البرہان لارسطاطالیس تلخیص[11] کتاب
السماء الطبیعی لارسطاطالیس شرح[12] کتاب السماء
والعالم لارسطاطالیس شرح[13] کتاب النفس
لارسطاطالیس شرح[14] کتاب الاسطقسات لجالینوس
تلخیص[15] کتاب المزاج لجالینوس تلخیص[16] کتاب القوی
الطبیعیہ لجالینوس تلخیص[17] کتاب العلل والاعراض
لجالینوس تلخیص[18] کتاب التعرف لجالینوس تلخیص[19]
کتاب الحمیات لجالینوس کتاب[20] تہافۃ التہافۃ
فی الرد علی کتاب التہافۃ الامام الغزالی رح
کتاب[21] منہاج الادلہ فی علم الاصول کتاب[22] فصل المقال
فیما بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال شرح[23]
کتاب القیاس لارسطاطالیس مقال[24] فی العقل

مقالہ فی القیاس[25] مقال فی التعریف[26] اس کتاب میں ارسطو اور ابونصر فارابی کے منطقی تصنیفات کا مقابلہ کیا ہے۔ اتصال العقل بالانسان[27] میں دو کتابیں ایک کتاب میں اپنے اور ابن طفیل کے مراجعات اور مناظرات طی درج کئے ہیں مسئلہ فی المزاج[28] مسئلہ فی الزمان[29] مسئلہ فی النوائب الحمی[30] مقال فی حمیات العفن[31] مقال فی حرکت الفلک[32] سوائے ان کے اور بہت سی کتابیں ہیں منطق اور فلسفہ اور عربیت کے فنون میں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ارسطو کی کتابوں کی کسی نے اس تفصیل و بسط کے ساتھ شرح نہیں کی جس طرح ابن رشد نے کی اور انھیں شروح ہی کے باعث اس کے نام کو زیادہ فروغ ہوا اگرچہ ہر فن میں اس حکیم اسلامی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں یورپ کے فلاسفہ کا مدت تک یہ مقولہ تھا کہ طبیعت کا ترجمان ارسطو ہے اور ارسطو کا ترجمان ابن رشد۔ ارسطو کے کتابوں پر ابن رشد نے تین طرح کی شرحیں لکھی ہیں اول شروح بسیطہ ان شروح میں متن کے ہر فقرہ کو الگ نقل کرکے اس کی شرح کرتا ہے اور تمام مالہ و ماعلیہ کو بیان کرتا ہے دوم شروح متوسطہ جن میں اس قدر شرح و بسط نہیں ہے اور تمام متن نقل نہیں کیا ہے یہ شرحیں ابن رشد کی کم سنی کے تصنیفات سے ہیں سوم ملخصات ان میں متن سے مطلق تعرض نہیں ہے بلکہ علوم فلسفیہ کی کتابیں ہیں جن میں ابن رشد خود مطالب بیان کرتا ہے اور کسی کا حوالہ نہیں دیتا۔ اپنے شروح میں اسکندر افرودشی۔ تھمسٹیس۔ نیقولاوش اور ابن سینا اور ابن باجہ کے اقوال اکثر نقل کرتا ہے اور رد و قدح و جرح و شرح سے کوئی صفحہ خالی نہیں چھوڑتا۔

کہتے ہیں کہ ابن رشد یونانی زبان سے ناواقف تھا اور ارسطو کی کتابوں پر اسے اطلاع نہیں ہوئی الا حنین بن اسحاق و اسحاق بن حنین یحیٰی بن عدی وغیرہ کے ترجموں سے اور یہ ترجمہ خود سریانی ترجموں سے ترجمہ ہوئے تھے۔ چنانچہ اس تعدد وسائط کے سبب جابجا ابن رشد سے غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں مثلاً پروٹاگورس اس کو فیثاغورس سمجھتا ہے ہراقلیطس اور ہرقولیس میں فرق نہیں کرتا اور سقراط کو اس فرقہ میں شمار کرتا ہے اناک گورس یونانی کو لاطینی فلسفہ کا امام بتاتا ہے مگر جو دقتیں اور زحمتیں ابن رشد کو ارسطو کی کتابیں پیدا کرنے میں پیش آئی ہیں اس سے زیادہ اب ہم کو ابن رشد کی کتابیں پیدا کرنے میں درپیش ہیں ارسطو کی کتابیں تو یونانی زبان میں موجود تھیں مسلمانوں نے یونانی زبان کے سیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہ کی ابن رشد کی اصلی کتابیں ہی مفقود ہیں عربی سے عبری اور عبری سے لاطینی میں جس قدر ترجمہ ہوئی تھیں یورپ کے کتب خانوں میں دستیاب ہوئی ہیں اصل عربی نسخے اکثر تصنیفات کے نہیں ملتے۔ ابن رشد کی وفات کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں علوم فلسفی کی تعلیم موقوف ہوگئی اور علم کا چرچا اٹھ گیا پر یہودیوں نے جو اس وقت بڑے علم دوست تھے اس کی کتابوں کو عبری میں ترجمہ کرکے عالم میں منتشر کیا اور یورپ کے لوگوں کو ابن رشد

سو اسی قوم کی معرفت واقفیت حاصل ہوی میکائیل
اسکاٹ یورپ کے لوگوں میں اول شخص تھا جس نے طلیطلہ
میں جاکر ابن رشد کی کتابیں بہم پہونچائیں اور جرمنی
کے بادشاہ کے ہاں لے گیا! اُس کے بعد بہتیرے فلاسفۂ
یورپ ابن رشد کے پیرو ہوے بعضوں نے اُس سے
مخالفت بھی کی۔ ٹامس اکونیاس ایک بڑا نامی متکلم
مذہب عیسائی کا گزرا ہے۔ اس شخص نے ساری عمر
اپنی ابن رشد کی رد میں صرف کی مگر وہ بھی اپنے خصم کا
عزت وحرمت سے نام لیتا ہے اور اوس کے علم کی
داد دیتا ہے ایک بڑا شاعر اٹالی کا اپنے کلام میں اقلیدس
اور بطلیموس اور جالینوس وغیرہ حکما کے زمرہ میں اس
کا نام لیتا ہے اور انگلستان کا پیشوائے شاعران
چاسر بھی ابن رشد کو بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ
شمار کرتا ہے چودھویں صدی عیسوی کے اوایل
میں ریمانڈ للی نے عربی زبان سیکھی اور منطق کا فن حاصل
کیا فقط اس غرض سے کہ ابن رشد کی تردید کرے جس کو
اوس کے عصر میں اور اس کے بعد دو سو برس تک یورپ
کے متکلم مذہب عیسائی کا سب سے بڑا دشمن شمار کرتے تھے
للی تو اوس کو گالیاں تک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ
سگ ہے کہ ہمیشہ حضرت عیسیٰ مسیح پر بھونکا کرتا ہے
مگر ایک فرقہ عیسائیوں کا جو بہ لقب فرانسسکن مشہور تھا
ابن رشد کا بڑا معتقد تھا کیونکہ یہ وہ فرقہ ہے جو اُس
زمانہ کے عیسائی تعصبات کو ناپسند کرتا تھا۔ باقی
کل عیسائی مذہبی فرقے اُس کے دشمن تھے اور اوس
کے نام کو شیطان کے نام کے برابر سمجھتے تھے اور دین
و مذہب کا اور خدا و عیسیٰ مسیح کا دشمن جانتے تھے بلکہ
وہ تو کل مسلمانوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے اور یہ جانتے
تھے کہ یہ ایک وحشی خونخوار بے دین بت پرست
قوم ہے جس سے احتراز ضرور ہے۔ جب صلاح الدین
کے زمانہ میں یورپ کے اکثر بادشاہوں نے شام پر
حملہ کیا اور مسلمانوں سے مدت تک مقابلہ رہا اور
اون کی جوانمردی اور علم و ہنر و اخلاق پر اہل یورپ
کو اطلاع ہوی اُس وقت سے اون کی آنکھیں کھل
گئیں اور یہ عام نفرت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ
مسلمانوں کے علوم و فنون کی طرف اون کو میلان
پیدا ہوا چنانچہ منجملہ اور اسباب کے صنعت یورپ
پر ترقی کا یہ بھی ایک سبب ہوا یہاں تک کہ کہتے
ہیں کہ فریڈرک ثانی نے اپنے دربار میں بہت سے
عرب علما جمع کئے تھے اور عربوں کے لباس و عادات
کا بھی حتی الوسع تتبع کرتا تھا۔ جس طرح اس زمانہ میں
ہم اور ہمارے سلاطین و امرا اہل یورپ کے
لباس و طریقۂ معاشرت کا تتبع کرتے ہیں۔

"ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"

سترہویں صدی تک اٹالی کے ایک بڑے دار العلوم
میں ابن رشد کو لوگ خود ارسطو سے زیادہ مانتے تھے
اور دن رات اوسی کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف
کرتے تھے کہتے ہیں کہ ایک دن پٹرارک شاعر کے ہاں
کوئی طالب علم ملاقات کو آیا اثنائے گفتگو میں پٹرارک
نے پولوس کا کوئی قول نقل کیا یہ طالب علم جھنجلا کر
بولا کہ اپنے پولوس اور اغسٹین کو تہ کر رکھو۔ ہمارا استاد

ابن رشد ہے تم اگر ابن رشد کی کتابیں پڑھو تو اور سب
کو بھول جاؤ۔ افسوس ہے کہ ایسے بڑے حکیم کا
نام تک ہمارے ہاں کسی کو معلوم نہیں ہے۔ نہ حاجی
خلیفہ نے کشف الظنون میں نہ ابن خلکان
نے وفیات الاعیان میں اس حکیم کا ذکر کیا
ہے۔ صفدی کی کتاب میں اس کا نام بھی نہیں ہے
جمال الدین قفطی نے بھی اپنی تاریخ فلاسفہ میں اسے
چھوڑ دیا ہے۔ یافعی نے فقط اس قدر لکھا ہے کہ
۵۹۵ھ میں اوس نے وفات پائی اور عام
طور پر یہ لکھ گیا ہے کہ اس کی چند تصنیفات ہیں
غرض کہ ابن رشد کا اگرچہ ہماری مشرقی کتابوں
میں کسی نے نام تک بہ مشکل لکھا ہے۔ یورپ میں
اوس کے علم کا اثر آج تک موجود ہے اور گو ہم
خود اپنے قوم کے بڑے بڑے محسنوں کی قدر
نہ کریں غیر قومیں محض علم کی تلاش میں اون لوگوں
تک پہونچی ہیں اور اون کی تصنیفات سے
متمتع ہوئے ہیں اور اون کا شکر نعمت آج تک
ادا کرتے ہیں فقط

(باقی آئندہ)

عماد الملک

حق معرفت

(۱)

کاش ہم اس منظر کا معائنہ کر لیتے جسے ہم میں سے مرجانے والے
دیکھ چکے ہیں مگر جو کچھ ان مرنے والوں نے دیکھا ہے ابھی ہماری
نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور وہ وقت بالکل قریب ہے کہ یہ
پردۂ حجاب سراسر اٹھا دیا جائیگا لیکن اگر ہم چشم بینا رکھتے
ہیں اگر ہم سامعۂ باطنی سے بہرہ مند ہیں تو ہمیں وہ تمام منظر
دکھا دیے گئے ہیں ایک ایک واقعہ سنا دیا گیا ہے اگر ہم میں
قبول ہدایت کی استعداد موجود ہے اگر ہم ہدایت کے طلبگار ہیں
تو سبیل ہدایت ہم پر نہایت ہی مشرح طریقہ سے ظاہر کر دی
گئی ہے، دنیا کی عبرتوں نے احوال زندگاں کو ہم پر بالکل آشکارا
کر دیا ہے، قوم نوح کی حالت کا اندازہ کرو، قوم عاد پر نظر
ڈالو، قوم ثمود کی عبرتناک حالت دیکھو، غرض ہمارے سامنے
عبرت کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، دنیا اور اس کی لذتیں دنیا
والوں کے ساتھ نہایت سرعت کے ساتھ روگردانی کر رہی
ہیں یہ وہ سرائے ہے جو عنقریب فانی ہونے والی ہے اور اس
کے ساکن اس سے باہر ہونے والے ہیں۔ ہم میں غائب ہو جانے
والا جیسے لیل و نہار کی نت نئی گردشوں نے منزل تک پہنچا دیا ہے

اسی قابل تھا کہ بہت جلد اپنی منزل پر پہونچ جائے کیونکہ اب تو
لیل و نہار نہایت تیز روی کے ساتھ جا رہا ہے دنیا گزر رہی ہے
اور اپنے گزرنے کا اعلان کر رہی ہے وہ کسی کے ساتھ احسان
و نیکی کے ساتھ پیش نہیں آتی اور نہایت سرعت کے ساتھ پشت
پھرا رہی ہے اہل دنیا کے نزدیک یہ ایک شیریں و سرسبز چیز ہے
مگر ناظر اور صاحب بصیرت کے نزدیک اس کی طراوتیں اور
سبزیاں مشتبہ ہیں۔ آہ یہ دنیا اپنے باشندوں کیلئے فنا کی تدبیریں
تیار کرتی ہوئی اپنے ہمسایوں کو بھی جو اس کے ساتھ زندگی
بسر کر رہے ہیں، موت کی طرف کھینچ رہی ہے اس دنیا کی لذتیں
آخرت میں نہایت ہی تلخ ہیں اور اس کی صاف و شفاف
شرابیں بالکل دُرد آمیز اور مکدر سمجھی جاتی ہیں اس دنیا کی
کوئی شئے باقی نہیں رہیگی مگر اس جرعہ کے مثل جو حالت سفر
میں پانی کم ہوجانے کے وقت پانی تقسیم کرنے والے پیمانے
میں باقی رہ جاتا ہے اگر کوئی پیاس کا مارا اس چیز کو چوسے تو
اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا بس اب اس گھر سے کوچ اور رحلت
کا ارادہ کرنا ہی بہتر ہے جس کے مکینوں کے لئے نیستی اور زوال
مقدر ہوچکے ہیں اس کا سایہ ہم پر چھایا ہوا ہے اور بحکم خدا ہماری
فطرت ہی ہمیں رحلت پر آمادہ کر رہی ہے کہیں دنیا کی خواہشیں
اور آرزوئیں ہم پر غالب نہ آجائیں اور اپنی مدت عمر کو طویل
اور دراز نہ سمجھ بیٹھیں۔

اے ان بچھی ہوئی زمینوں کے بچھانے والے اے آسمان بلند
و مرفوع کے بحالت خود رکھنے والے اور ہر ایک نفس کو اسکی
جبلت و فطرت پر پیدا کرنے والے ہمیں ان شخصوں میں سے
بنا دے جو قول حق کو سن کر اس میں غور و تعمق کرتے ہیں حوادث
روزگار پر گہری نظر ڈالتے اور بصیرت حاصل کرتے ہیں ہلاکت
کے مقامات میں گرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ضلالت کی
کھاٹیوں میں گم ہوجانے سے بچتے ہیں جنکی نعمتیں انھیں تکبر میں
مبتلا نہیں کرتیں اور جنکو موت کے بعد پشیمانی حاصل نہیں ہوتی
ایسے مکان کی کیا توصیف کی جائے جس کے اول میں تو
رنج و تعب ہے اور آخر میں فنا، اسکی حلال چیزوں میں
تصرف کرنے سے حساب کا سامنا ہوتا ہے اور اس کے محرمات
میں مبتلا ہونے سے عذاب کا، جو اس میں رہکر غنی اور مستغنی ہوگیا
وہ مفتون اور دیوانہ ہے اور جو اس میں فقیر ہے وہ حزن و
الم میں گرفتار ہے جس نے اس کے حاصل کرنے میں سعی اور کوشش
کی اسی کی پاس سے فوت ہوگئی اور جو اسکی طرف سے منھ پھرا کر
بیٹھا اُسی کی طرف متوجہ ہوگئی جس نے اس دنیا کو گہری نگاہ
سے دیکھا دنیا نے اُسے بینا اور آگاہ کردیا اور جس کی نگاہیں
اس کی زینتوں اور آرائشوں ہی میں الجھ کر رہ گئیں اُسے اس
دنیا نے اندھا کر چھوڑا، یہ دار العمل ہے وہ شئے جو اسی کیلئے
حاصل کی جائے کبھی نجات نہیں دیسکتی یہ دنیا دار الامتحان
ہے اسی میں اچھی طرح گرفتار کرکے لوگوں کا امتحان کیا جاتا
ہے اب جن لوگوں نے دنیا میں سے اسی کی آرائشوں کو
حاصل کیا وہ ان سے خارج کردئے جائینگے ان آسائشوں سے
علیحدہ ہوجائینگے اور ان کے حاصل کرنے پر اُن سے حساب لیا
جائیگا اور جنھوں نے دنیا میں سے اُس کے غیر یعنی آخرت
کے لئے کچھ کمالیا وہ کمائی دنیا سے علیحدہ ہوجانے کے بعد
انھیں پہونچا دی جائیگی، بیشک یہ دنیا عقل [illegible] کے
نزدیک شاخص کے سایہ سے زیادہ وقعت [illegible] رکھتی،
جسے ابھی پھیلا ہوا دیکھا تھا اور ابھی بالکل [illegible] یہ دنیا
اس دنیا کے چشمے نہایت تاریک و مکدر [illegible]

نہایت ہی گندلے اور غبار آلود ہیں، اس کے منظر بنظر ظاہر
نہایت خوش آیند اور فرحت بخش ہیں مگر انجام کار ہلاک
کرنے والے۔ یہ دنیا مکار و ہے، فریب دینے والی ہے اسکی
روشنی بہت جلد اوجھل ہو جائیگی اس کا سایہ زوال پذیر ہے
اور اس کی تکیہ گاہیں خراب و برباد ہو جانے والی ہیں، اسے
بلاؤں نے گھیر لیا ہے، مکر و حیلہ کے ساتھ مشہور ہے اس کا
عیش ناپسندیدہ ہے، امان اس گھر میں معدوم ہے۔ ہم اس
دنیا میں ایسے رستے پر کھڑے ہیں جس پر سے ہمارے قبل بہت
سے لوگ گزر گئے اب وہ وقت قریب ہے کہ آرزوئیں ختم
اور امیدیں قطع ہو جائینگی۔ دل اپنی حالتوں کا اندازہ کرتے
ہوئے حرص و ہوا سے گزر جائینگے۔ آوازیں پستی کے عالم میں
لرز جائینگی، چہروں پر جاری ہونے والا پسینہ لگام کی طرح منہ
تک آئیگا اور لوگوں کے کان اس بلانے والے کی سخت و
درشت آواز کی طرف مضطرب ہونگے جو انھیں جزا و عفو بہت
کی طرف بلائیگا اور بخشش و ثواب کے لئے طلب کریگا۔

ہمیں تاریکی جہالت سے نکلنے کی مہلت دی جا چکی ہے
واضح اور روشن راستے دکھا دئے گئے ہیں، خوشنودی خدا
حاصل کرنے کے لئے ہمیں مدت عمر عطا ہو چکی ہے، شک و شبہہ
کی تاریکیوں میں مشعل ہدایت روشن کر دی گئی ہے۔ کاش ہمارے
قلوب صحیح و صائب مثالوں اور شفا بخش مواعظ سے متاثر ہوں
گوش شنوا انھیں سنیں، محتاط عقلیں ان پر کاربند ہوں اطاعت
وعبادت کی طرف اقدام کریں، موت کا یقین حاصل کرلیں
حق کو پہچانیں۔ اپنی فطرت اصلی کی طرف راجع ہوں، اپنے
مطلوب کے طالب ہو کر گناہوں سے بھاگیں، اپنے باطن
کو پاک، اپنی روح کو مطہر بناتے ہوئے آخرت میں اپنے مکان
تعمیر کرلیں، اپنے راستے اور اپنے کوچ کرنے کے دن کے واسطے
توشہ اور زادراہ کو ذخیرہ کریں، اس کے وعدوں کی حقیقت
کی سچائی کا یقین کریں اور اس چیز کے مستحق ہو جائیں جس کا
ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کاش ہم صحت بدن کی حالت
میں کوئی سامان آخرت مہیا کرلیں، اس لئے کہ شباب کی طراوت
کے مالک سوائے جھکا دینے والے بڑھاپے کے اور کسی چیز کے
منتظر نہیں اور صحت و تندرستی کی مسرتوں کے اہل دشوار اور
شدید امراض کے سوائے اور کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے بیشک
حالت بقا میں زندگی بسر کرنے والوں کو اوقات فنا کے سوائے
اور کسی چیز کا انتظار نہیں یہی عزیز و اقارب، یہی دوست احباب
عنقریب ہم کو اموات کے مکان میں تنہا چھوڑ دینگے۔ ایک
تنگ و تاریک خوابگاہ کے حوالے کر دینگے۔ ہمیں ایسی غربت
کے مکان میں لیجائینگے جہاں سے پھر ہماری زیارت کسی کو
نصیب نہ ہوگی حوادثات زمانہ ہمارے نشانات کو مٹا دینگے۔
برباد کر دینگے۔ یہ تر و تازہ و بدن متغیر ہو جائینگے و زور دار
اور قوت والی ہڈیاں مندرس اور بوسیدہ ہو جائینگی۔ بہتر ہے کہ
ہم اپنے دلی تفکرات کو امر آخرت میں مشغول کر دیں زہد و تقوی
ہماری خواہشات کو روک دے، ہم اپنے نفوس کو اس بقیہ وقت
کے لئے طاعت خداوندی میں وقف کر دیں۔ تقوی و پرہیزگاری
میں تساہل نہ کریں، خوف و خطر دنیا و دین سے امین رہنے
کے لئے خوف خدا کو ہم اپنا پیشوا بنا لیں، ہم اپنی لذتوں کے
سرور اور حاجتوں کے ظہور میں مست و گمراہ نہ ہو جائیں تاکہ
قبر میں ہماری نیند نہایت خوشتر نیند ہو اور روز حساب
ہمارے لئے نہایت مامون دن ہو، اس لئے کہ آرزوئے
دنیا عقل کو سہو میں گرفتار کرتی ہوئی ذکر آخرت کو بھلا دیتی ہے

پروردگارِ عالم مجھے اپنے نفس پر مسلط ہونے کی توفیق عطا فرما تاکہ میں خوف خدا کو اپنا لباس بنالوں اور رشد الٰہی دنیا کو بامید ثواب آخرت آسان سمجھ لوں، حقیقت امر کو دیکھ لوں اپنے انجام کو یاد کرلوں۔ آب خوش گوار معرفت سے سیراب ہو جاؤں دنیا کو اختیار کرکے آخرت کو نہ چھوڑ دوں، شراب صافی کو ترک کرکے دُرد آشام نہ بنوں۔ میں شہواتِ نفسانیہ کے پیرہن کو اتار ڈالوں، خواہشوں اور ہوا و ہوس کو اپنے دل سے دور کردوں، میں اپنے نفس سے خود محاسبہ کروں۔ قبل اس کے کہ مجھ سے حساب لیا جائے، میں اپنے گناہوں سے توبہ کروں قبل اس کے کہ میری سانس کے رستہ کو موت کا پھندا تنگ اور ضیق کردے، میں اپنی فارغ البالی کے دنوں میں اور مہلت کے ایام میں عمل خیر میں مشغول ہوں، قبل اس کے کہ میرا مجرائے نفس گرفت کرلیا جائے اس لئے کہ جس شخص نے موت سے پہلے ایام آرزو و زندگی میں کوئی نیک کام کیا۔ بیشک وہ عمل نیک اسے پہونچا دیا جائے گا اور مرگ ناگہانی اُسے کچھ نقصان نہ پہونچا سکیگی۔ دنیا کی خوشحالیاں رنج واندوہ کے ساتھ ملی ہوئی ہیں، اب یہی چاہئے کہ دنیا کی وہ آرائشیں جو دلوں کو لبھالیتی ہیں، ہمیں فریب نہ دیں ہم ان پر مفتون نہ ہوجائیں، یہ دنیا مکر و فریب کے ساتھ مزین ہو رہی ہے اسکی شادیاں اور مصیبتیں ہمیشہ نہیں رہینگی، یہ اتحالہ ہے، اپنے شکاروں کو کھاجانے والی ہے، اپنے گرفتاروں کو ہلاک کرنے والی ہے بعینہ دنیا کا یہی عالم ہے کہ ابھی سرسبز تھی ابھی خشک پڑی ہے اور خرمن ہستی کو فنا کی ہوائیں اڑائے لئے جاتی ہیں۔ کوئی ایسا شخص نہیں جس نے دنیا میں کوئی ساعت خوشی کے ساتھ گزاری ہو اور اس کے بعد ہی آنسوؤں کا تار نہ بندھ گیا ہو

کوئی تنفس ایسا نہیں جس کے ساتھ دنیا نے اپنی مسرتوں کے ملاقات کی ہو اور پھر اس نے اپنی مضرتوں اور سختیوں کے مزے نہ چکھائے ہوں، اس دنیا کا یہی وطیرہ ہے اسکی خوشی کا بالکل اعتبار نہ کرنا چاہئے، یہ دنیا سخت دھوکے دینے والی ہے، یہ سراسر فریب ہے، یہ رنج و تعب کا مکان ہے، یہ عبور کرنے کی جگہ ہے، یہ متغیر ہوجانے والا مقام ہے، اسکی بلاؤں کے تیر خطا نہیں ہوتے، اس کی جراحتوں کا اندمال نہیں ہوسکتا یہ زندہ کو موت کے گڑھے میں پھینک دیتی ہے، تندرست کو مریض بنا دیتی ہے، اس دنیا میں سوائے زہد و پرہیزگاری کے کسی چیز میں بہتری نہیں، جو شخص دنیا میں مطمئن بنا وہ دردرسیدہ بن گیا۔ واللہ دنیا کے عیش مکدر ہیں، اسکی شیرینیاں ناگوار ہیں، اس کی حلاوتیں تلخ ہیں، اس کے اسباب ٹوٹنے والے ہیں، اسکی زندگی موت ہے اور اس کا ہمسایہ آوارہ و پریشان ہے عمر رفتہ کے واپس آنے کی اتنی بھی امید نہیں جتنی کہ رجعت رزق کی امید ہے، وہ رزق جسے زمانہ نے فوت اور گم کردیا ہے امید ہے کہ وہ کل کو زیادہ ہوجائے مگر عمر کا وہ حصہ جو کل گزر گیا آج اس کے واپس آجانے کی آس نہیں، آئندہ کیلئے امید ہے مگر گزشتہ کے لئے بالکل ناامیدی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ جب نفرت کرنے والا اس سے مانوس ہوا اور انکار کرنے والا اس کی طرف سے مطمئن ہوگیا تو اس دنیا نے اُسے لات ماردی۔ اپنے دام میں اسیر کرلیا اور اپنے تیر دل سے اسے ہلاک کرڈالا، اس دنیا نے انسان کی گردن میں موت کی رسی باندھ کر ایک تنگ و تاریک خوابگاہ اور وحشتناک منزل و مکان کی طرف کھینچ لیا، جہاں وہ اپنے اعمال کا معائنہ کریگا اور عمل نیک کا ثواب اور اعمال بد کی سزا پائیگا

کیا ہم اُن لوگوں کے مساکن میں سکونت پذیر نہیں ہیں جنکی عمریں ہم سے بہت زیادہ طویل تھیں جنکے مکانات ہم سے زیادہ آباد تھے جنکی آرزوئیں حد سے زیادہ تھیں انہوں نے کن کن طریقوں سے دنیا کو اختیار نہ کیا مگر آخر کار دنیا سے کوچ کر گئے۔ حوادث زمانہ اُن پر مسلط ہو گئے اب تو انکی قبریں پتھروں کی ڈھیر ہیں مٹی ان کے لئے کفن کا کام دے رہی ہے اب ان میں ذرا بھی ناہمواری باقی نہیں اب ان سے کیسا ہی سلوک کیا جائے مگر منع نہیں کر سکتے اب کینہ اُن کے دلوں سے نکل چکا ہے، حسد ان سے بالکل زائل ہو گیا ہے اب اُن لوگوں نے روئے زمین کو تہ زمین سے مبدل کر لیا ہے، وسعت کے عوض تنگی قبول کر لی ہے اپنی روشنیاں تاریکیوں سے مبدل کر لی ہیں۔ عبرت ہائے دنیا بھی نہایت قابل غور ہیں، ہم نے اکثر دیکھا ہے بارہا معائنہ کیا ہے کہ ایک شخص اپنی آرزوؤں پر فائز ہوا چاہتا ہے اور اپنی تمناؤں کے بالکل قریب ہے ناگاہ موت آئی۔ اور اس کی آرزوؤں کو قطع کر دیا۔ اب کوئی آرزو ہی نہ رہی جس تک پہونچنے کی تمنا کی جائے۔ اس دنیا کی خوشحالیاں کس قدر فریب دینے والی ہیں، اسکی سیرابیوں میں کس قدر تشنگیاں مضمر ہیں اس کا سایہ کتنی جلد دھوپ سے مبدل ہو جائیگا دنیا میں جو شئے ناقص ہی اور اس کے سبب سے آخرت میں زیادتی ہو گئی وہ اس سے بہتر ہے کہ آخرت میں نقص آئے اور دنیا میں زیادتی ہو۔ بیشک حلال اشیا ان سے کہیں زیادہ ہیں جو ہم پر حرام کی گئیں ہیں، پس ہم اب زیادہ چیزوں کے سبب سے کم کو ترک کر دیں ہم اس دنیا میں وہ نشانہ ہیں جن پر موت تیر اندازی کر رہی ہے اس کے ہر ایک گھونٹ میں کدورت ہے اور اس کے ہر ایک لقمہ میں پیچ ہے یہ دنیا لذت زندگانی کی ایک کلی ہے جس کا ذائقہ تھوڑی دیر تک چکھنے کے بعد پھر تمام کو پھینک دیتے ہیں۔

ہمارے اصول (آباو اجداد) گزر گئے ہم ان کی فرع موجود ہیں تو کیا اصل کے زائل ہونے پر فرع باقی رہ سکتی ہے؟ ہر شخص اس شئے سے ملاقات کرنے والا ہے جس سے اسباب دنیا جمع کرتے وقت کراہت ظاہر کیجاتی ہے، انجام کار یہ بدن روح سے خالی ہو جائیگا یہ متحرک شئے ساکن ہو جائیگی یہ گویا زبان بالکل بستہ ہو جائیگی۔ خداوندا! ہم تیرے انعام و افضال کے امیدوار ہیں تیرے عذاب و عقوبت سے خائف ہیں ہمیں ناامید ہو جانے والوں کی حالت میں اپنے مکانات کو نہ بھیج، اپنی رحمت کی بارشیں ہم پر برسا دے، ہماری عقلیں ہدایت کے چراغوں سے روشن ہو جائیں ہماری آنکھیں پرہیزگاری کی علامتوں کی دیکھنے والی ہوں ہمارے قلوب تیری معرفت کے لئے وقف ہو جائیں ہمارے عزم تیری اطاعت کے لئے کمربستہ ہو جائیں ہماری رات کی خوابگاہیں اور دن کو آرام کرنے کے کمرے دنیا طلبی سے خالی ہوں ہم نہایت ہی عمدہ توشہ اور زاد آخرت لیتے ہوئے اس دنیا سے گزر جائیں اس سے بقدر کفاف ہی سوال کریں اور اپنی منزل پر پہونچنے سے زیادہ اس سے طلب ہی نہ کریں۔

باقی رہنے والوں کے ساتھ زمانہ کی وہی رفتار چلی جاتی ہے جو گزشتگان کے ساتھ تھی جس شخص نے اس سے منہ پھیر لیا وہ پھر واپس نہیں آئیگا اور جو شئے اسمیں باقی ہے وہ ہمیشہ

نہ رہیگی - ایک ہنکانے والا ہم کو اس طرح ہنکار رہا ہے جیسے
ساربان اونٹنیوں کو ہنکایا کرتا ہے جن کا دودھ خشک ہوگیا
ہو ہم دنیا سے کوچ کرنے پر مامور ہوئے ہیں ہم ان ٹھہرے
ہوئے سواروں کے مانند ہیں جنھیں کچھ معلوم نہیں کہ کب
کوچ کا حکم مل جائیگا کل کا دن بہت ہی قریب ہے آج
کا دن مع اس چیز کے جو اس میں موجود ہے گزر جائیگا۔
اور کل کا دن آجائیگا جو اس سے بالکل ملحق ہے ہم میں
سے ہر ایک شخص تن تنہا اپنی اس منزل تک پہونچ جائیگا
جو زمین میں موجود ہے - آہ! وہ تنہا مکان، وہ وحشتناک
منزل، وہ غربت میں اکیلا مکان، وہ قبروں کی تنگی، وہ
کسر وانکسار کی سختی، یہ رستہ کی درازی، یہ زاد راہ کی قلت
یہ دور دراز کا سفر، اور یہ منزل کی بزرگی! بار الٰہا میرے
وہ گناہ بخش دے جنھیں لوگ نہیں جانتے۔ مجھے اس چیز
سے پرہیز کرنے کی توفیق عطا فرما جو باقی نہیں رہیگی۔ میں
اپنے قول کو فعل کے ساتھ مرکب کردوں میری لغزشیں قلیل
ہوں میرا قلب خاشع، میرا نفس قانع ہو، میری خواہشیں
بہت تھوڑی ہوں، میری روزی آسان ہو، میرا دین
محفوظ ہو، لوگ مجھ سے خیر کے ہی امیدوار رہیں، میرے شر سے
امن ہو جائیں، بیشک تو سنسان بیابانوں میں حیوانات
وحشی کی آوازوں کو سنتا ہے تو خلوتوں میں بندوں کے
گناہوں سے واقف ہے، تجھے بڑے بڑے اور ذخّار
دریاؤں میں مچھلیوں کی مختلف حالتیں معلوم ہیں ہمارے
مطالب کی برکت وفیروزی تیرے ہی ساتھ ہے اور تو ہی
ہماری خواہشات کا منتہا ہے، ہمارے خوف وخطر کیلئے
باعث امن ہے تیرا تقویٰ تیرا خوف، ہمارے قلوب کے
درد کی دوا ہے ہمارے دلوں کے اندھے پن کے لئے بصیرت ہے
ہمارے جسموں کے امراض کی شفا ہے، ہمارے سینوں کے فساد
کی اصلاح کرنے والا ہے، ہماری آنکھوں کے پردوں کو جلا دینے
والا ہے ہماری ضلالت کی سیاہی کی ضیا ہے، ہماری قبروں
کی تاریکیوں کے لئے ایک روشن چراغ ہے، اب ہم اپنے
نفسوں کو اس کی عبادت کے لئے رام کرلیں اور اس کے
حق اطاعت کو ادا کرنے کی حالت میں اس کے روبرو حاضر
ہو جائیں اس لئے کہ کسی اصل کی اصل جو تقوی و پرہیزگاری
پر ہو کبھی برباد اور ہلاک نہیں ہوسکتی اور جس قوم کی کھیتیاں
زمین زہد وتقویٰ پر لہرا رہی ہوں وہ ہمیشہ شاداب رہینگی۔
افسوس جب کوئی شخص مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے
کیا ترکہ چھوڑا اور فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ یہ کونسا ذخیرہ
آخرت اپنے ہمراہ لایا، ہم کو لازم ہے کہ اپنے اموال کے بعض
حصے کو آگے روانہ کردیں تاکہ ہمارے لئے ذخیرۂ آخرت ہوجا
اور اپنے تمام مال کو دنیا ہی میں نہ چھوڑ جائیں اس لئے کہ قریب
ہے وہ وقت جبکہ ہم موت کا پیالہ پی کر گویائی کو گونگے پن سے
قوت سامعہ کو بہرے پن سے اور حرکت کو سکون سے
بدل لینگے، ہماری خبریں منقطع ہو جائینگی۔ یہ رنگ روغن
والی صورتیں مکروہ ہو جاینگی، یہ نرم ونازک بدن مٹی میں اٹ
جائینگے۔ ہماری خاموش منزلیں ہم پر منہدم ہوجائینگی، ہم
ان تنگیوں سے نکلکر وسعت میں نہیں آسکیں گے۔ آہ! اس
زمین نے کس قدر تازہ بتازہ جسموں اور رنگ روغن
والی صورتوں کو کھالیا جو عزتوں میں پلے تھے، جنہو
نعمتوں میں پرورش پائی تھی، رنج کی گھڑی
گزارتے تھے اپنے عیش وطرب کا ترک گوارا نہ تھا اپنی

دنیوی زیبائشوں کو دیکھ دیکھ کر ہنستے تھے ناگاہ زمانہ نے انھیں
اپنے خس و خاشاک کی طرح ڈھنک ڈالا۔ امراض ہستی کے
کمانداروں نے ان پر موت کے تیر چلائے گردش ایام نے
ان کی قوتیں توڑ ڈالیں، انھیں ایسے رنج و غم کا ہمراز بنا دیا
جسے وہ اپنے پاس بھی نہ آنے دیتے تھے، ہم اپنے ایسے جسم کو
آرام پہونچانے کے لئے کیوں کسی پر ظلم کریں جو کہنہ اور بوسیدہ
ہونے کے لئے عجلت کر رہا ہے اور جو مدتوں تک ہزاروں
من مٹی کے نیچے پڑا رہیگا۔

پروردگارا! مجھ کو توفیق عمل، توفیق توبہ عنایت فرما
قبل اس کے کہ کراماً کاتبین کے قلم میرے نامہ عمل کی تحریر سے
فارغ ہو جائیں، پیشتر اس سے کہ توبہ کا دروازہ بند ہو
اور ملائکہ نامہ عمل کو لیکر اوپر کو صعود کر جائیں، آخر وہ کونسی
چیز ہے جس نے مجھے پروردگار کی اطاعت سے مغرور کر دیا؟
کس چیز نے مجھے گناہوں پر جری اور دلیر بنا دیا؟ کس شئے
نے مجھے اپنے نفس کی ہلاکت پر مانوس کیا ہے؟ کیا میرے
درد کے لئے صحت نہیں؟ کیا میرے خواب کیلئے بیداری
نہ ہوگی؟ کیا میں اپنے نفس پر اتنا بھی رحم نہیں کرتا جتنا
کہ کسی غیر پر کرتا ہوں، کیونکہ بسا اوقات میں کسی شخص کو
آفتاب کی حرارت میں بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس پر
سایہ کر لیتا ہوں، کسی کو درد میں مبتلا پاتا ہوں، ایسا درد
جو اس کے بدن کو اذیت پہونچاتا ہے تو اس پر رحم کرکے
آنسو بہانے لگتا ہوں پھر کس چیز نے مجھے اپنے درد کے
واسطے صبر عنایت کر دیا مجھے اپنے نفس پر رونے دھونے
سے مغرور کر دیا حالانکہ اپنا نفس مجھے نہایت ہی عزیز
ہونا چاہئے مگر قوت احساس نہیں رہی۔ افسوس ہے
کا خوف عذاب خداوندی کو میرے سامنے پیش کرکے مجھے
کیوں بیدار نہیں کرتا، اب میں مستقل ارادے اور عقل کی کوشش
سے اپنی کاہلی اور دل میں قائم ہو جانے والے ضعف کی
بیماری کا علاج کرکے خداوند عالم کا مطیع ہو جاؤں، اسکی
یاد سے مانوس ہوں، اپنے ذہن میں اس حالت کا تصور کروں
کہ میں اس سے روگردانی کر رہا ہوں اور وہ میری طرف رخ کر رہا
ہے، مجھے اپنی معافی کی طرف بلا رہا ہے، میرے گناہوں کو اپنے
فضل و کرم کی چادر میں ڈھانک رہا ہے اور میں اس کی طرف
سے منہ پھراتے ہوئے اس کے غیر کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں
بلند و برتر ہے وہ خدا جو قوی و قادر ہے وہ مجھ پر اور میری
فروتنی پر جو ضعیفی ہے کس قدر رحم و کرم کرتا ہے اور میری
دلیری گناہوں پر کس قدر بڑھی ہوئی ہے حالانکہ میں اسکی
چادر رحمت کی پناہ میں مقیم ہوں، اس کے وسیع و فراخ
فضل و کرم کے دامن میں پلٹنے والا ہوں اس نے اپنے فضل و
کرم کو مجھ سے روک نہیں لیا، مجھ سے اپنے پردہ پوشی کو علیحدہ
نہیں کیا میں ایک لحظہ بھر کے لئے بھی اس کے لطف و کرم کے
سبب سے نعمتوں سے خالی نہیں جنھیں وہ میرے واسطے
ظاہر کرتا رہتا ہے یا میرے بہت سے گناہوں کی پردہ پوشی
کرتا ہے یا بہت سی بلاؤں کو مجھ سے روکتا ہے البتہ
اگر دو برابر کی قوت والوں میں اور برابر کی قدرت رکھنے
والوں میں یہ صفت قدرت و قوت ہوتی تو بیشک میں
پہلا حاکم ہوتا جو اپنے نفس کو اخلاق ذمیمہ اور اعمال بد کا حکم
کرتا کیونکہ حالت موجودہ میں کو میں اپنے پروردگار کا کسی
طاقت میں ہم پلہ نہیں مگر پھر بھی اس کی نافرمانی کئے جاتا
ہوں، دنیا نے مجھے مغرور نہیں کیا بلکہ میں ہی دنیا پر فریفتہ

ہو رہا ہوں کیونکہ اس دنیا نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھا دئے ہیں، طرح طرح کی نصیحتیں میرے لئے ظاہر کر رکھی ہیں، وہ کمی جو میرے رزق میں ہونے والی ہے، وہ بلائیں جو میرے جسم پر نازل ہونے والی ہیں جن کا مجھ سے اس دنیا نے وعدہ کر لیا ہے، وہ بالکل سچی ہیں، انھیں ضرور وفا کرے گی، ان وعدوں میں اس نے بالکل دروغگوئی سے کام نہیں لیا، مجھے کسی قسم کا فریب نہیں دیا اگر میں ویران شہروں اور سنسان مکانوں سے اس دنیا کی معرفت حاصل کروں تو میں انھیں خدا کی یاد دلانے مواعظ و نصائح تک پہونچانے اور برائیوں سے منع کرنے میں نہایت ہی اعلیٰ پاؤں گا۔

واہ کیا اچھا ہے اس شخص کا مکان جو اس دنیا میں گھر بنانے پر راضی نہیں ہوتا کیا خوب ہے اُس شخص کا محل جو اس دنیا کو اپنی منزل سمجھ کر اسمیں متوطن نہیں ہوتا بیشک کل کے دن نیک بختان دنیا وہی لوگ ہیں جو آج اس دنیا سے فرار کر رہے ہیں جس وقت ایک ہولناک آواز دنیا کو متزلزل کر دیگی۔ ہر ایک عبادت گاہ کے ساتھ اس کا اہل ملحق ہو جائیگا ہر ایک معبود کے ساتھ اُس کا عبادت کرنے والا ملاقات کریگا، ہر اطاعت کئے جانے والے کے ساتھ اس کا اطاعت کرنے والا قایم ہوگا۔

افوہ! اس روز کس قدر حجتیں ہیں جو باطل ہونگی کس قدر عذر و معذرت کے رشتے ہیں جو منقطع ہونگے۔ اب مجھے لازم ہے کہ میں اس کام کو اختیار کروں جس کے سبب سے میرا عذر قایم رہے، میری حجتیں ثابت رہیں، اس ناپائدار دنیا سے وہ چیز حاصل کر لوں جو میرے واسطے باقی رہ جائے اپنے سفر کے لئے تیار ہو جاؤں، برق نجات کی روشنی پر نظر کروں اور اپنے بوجھ اٹھانے والے اونٹوں کے تنگ کس لوں

بیشک موت لذات کو قطع کرنے والی اور خواہشات کو مکدر کرنے والی ہے وہ ایسی قاتل ہے جس سے خون بہا نہیں لیا جا سکتا۔ قریب ہے کہ اس کے ابر خشم کی تاریکیاں اس کے آتش امراض کے شعلے، اس کی سختیوں کی ظلمتیں، اس کی عالم جانکنی کی بے ہوشیاں۔ اس کی روح کو باہر نکالنے والے آلام، اس کی گھیرنے والی تاریکیاں، ہمیں گھیر لیں ہمارے پکارنے والوں کو متفرق، ہمارے رازداروں کو خاموش کر دے، ہمارے آثار مٹا دے اور ہمارے آباد گھر ویران کر دے۔ بار خدایا۔ مجھے دنیا سے بیزاری اور خدا کی توفیق عطا فرما اس لئے کہ یہ بڑی مکارہ ہے، یہ سخت فریب دینے والی ہے دیدیتی ہے اور پھر چھین لیتی ہے، پہناتی ہے اور پھر اتروا لیتی ہے، اس کی آسائشوں کو ہمیشگی نہیں اور اس کا رنج و تعب منقضی نہیں ہوتا، علی کو اس نعمت سے کیا کام جو فنا ہونے والی ہے اس لذت سے کیا غرض جو باقی نہیں رہیگی؟ ہم لغزشوں کی برائی اور عقل کی بیہوشی سے تجھ ہی سے پناہ مانگتے ہیں۔ خدایا تو ہماری پوشیدگیوں کو مشاہدہ کرتا ہے، تو ہماری ضمیروں اور دلی باتوں سے واقف ہے، ہمارے اسرار اور بھید تجھ پر ظاہر ہیں، خدایا اگر میں اپنے سوال کرنے سے عاجز اور درماندہ ہو جاؤں یا اپنی حاجت کے سبب سے حیران ہو جاؤں تو تو مجھے میری مصلحتوں پر رہنمائی فرما اسلئے کہ تجھے ہمارے اعمال کا علم ہے اور ہماری پوشیدگیاں تجھ پر ظاہر ہیں۔

اے بلند و بالا گردوں کے آفریدگار اور اپنے [illegible]

جیسے تونے شب و روز کے ظاہر ہونے اور غائب ہونے کا مقام
شمس و قمر کی سیرگاہ اور ستاروں کے لئے آمد و شد کا مکان بنا دیا
ہے اور اے وسیع و فراخ زمین کے پیدا کرنے والے جیسے تونے
لوگوں کے لئے قرار، حشرات الارض چوپایے اور وہ حیوان
جو نظر آتے ہیں یا نظر نہیں آتے ہیں ان سب کے لئے آرامگاہ
بنا دیا ہے تو کسی صاحب مال سے روزی طلب کرنے کا
محتاج نہیں بلکہ اپنی قدرت کاملہ سے ہر ایک شئے کو رزق
پہونچاتا ہے، کوئی شئے تیری سلطنت سے نکل کر تیرے غیر کی
طرف قرار نہیں کر سکتی، کوئی ہمسر نہیں جو تیری ہمسری کر سکے
کوئی نظیر اور مثال نہیں جو تیرے مساوی ہو بیشک تو ہی
موجد عالم ہے اور سوائے تیرے کوئی نہیں، چنانچہ اگر مخلوقات
میں تمام حیوانات و پرند و چرند زندہ و مردہ جمع ہو جائیں
ان کے مختلف اصلوں اور علیحدہ علیحدہ جنسوں کے اقسام
حاضر کئے جائیں، ان کے گروہ کے عقلمند جمع ہو جائیں اور
سب کے سب ملکر ایک پشہ کو پیدا کرنا چاہیں تو اس کی خلقت
پر قادر نہ ہو سکینگے، وہ کبھی نہ جان سکینگے کہ اس کی پیدائش
کا کیا طریقہ ہے وہ اس کی ایجاد سے عجز کا اقرار کرینگے اور
اس کے فنا کر دینے پر اپنی مجبوری کا اظہار کرینگے اور بیشک
خداوند تعالیٰ دنیا کو فنا کر دینے کے بعد پھر اسی حالت تنہائی
کی طرف عود کریگا جیسا کہ وہ خلقت دنیا سے پہلے تھا ویسا
ہی اس کی فنا کے بعد ہو جائیگا اور فنائے دنیا کے ساتھ
مدتیں اوقات و ساعات سب فنا و معدوم ہو جائینگی
سوائے اس واحد و اول کے کوئی [illegible] باقی نہیں رہیگی جسکی
طرف سب کی بازگشت ہے۔

اے پاک و پاکیزہ خدا تو مثال [illegible] سے نہیں پہچانا
جا سکتا۔ تجھے از روے مشاہدہ نہیں دیکھ سکتے، نفس موجودات
کے سوائے تیرے لئے کوئی حجاب نہیں، قواے باطنی تیرا
تصور نہیں کر سکتے، حواس ظاہری تیرے ادراک سے عاجز
ہیں، لیل و نہار کی گردشیں تجھے کہنہ نہیں کر سکتیں، کوئی
مکان تجھ پر حاوی نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی زبان تیری
کما حقہ توصیف کر سکتی ہے۔ نہ تو تجھسے پانی کے قطروں کا
شمار چھپا ہوا ہے نہ آسمان کے تارے تجھ سے پوشیدہ ہیں
ہوا کا کرہ ہوا میں تموج، مورچہ کی سنگ سخت پر جنبش، اندھیری
رات میں چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی خوابگاہیں، ان میں سے
ایک چیز بھی تیری نگاہوں سے اوجھل نہیں، تو گوشۂ چشم
کے خفی سے خفی اشارے کو بھی جانتا ہے، تجھ پر ہموار زمین
کے قطعات اور ایک دوسرے سے متصل ہونے والی رات
اور حد سے بڑھی ہوی تاریکی مخفی نہیں رہ سکتی، وہ شئے جسکے
سبب سے بادلوں کی بجلیاں پھیل جاتی ہیں، وہ پتے جو زمین پر
گرتے ہیں جنھیں اُن کے گرنے کے مقام سے تند و تیز ہوائیں
اور آسمان کی متواتر بارشیں کہیں سے کہیں اڑا لیجاتی ہیں
ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو تجھ پر پوشیدہ ہو ہم تیرے
سامنے اپنی برائیوں کو ظاہر کر رہے ہیں اور تو ہمارے عیوب
کو ڈھانک رہا ہے ہم تیرے عذاب سے کنارہ کش ہو رہے
ہیں اور تو ہمیں مہلت دئے جا رہا ہے جو لوگ اس دنیا میں
متوطن تھے انجام کار انکو انھیں مقامات (قبور) کو وطن بنانا
پڑا جن سے وحشت کرتے تھے، اسی شخص کی طرف رخ کیا جس سے
جدا ہوتے تھے آخر کار اُن مشاغل دنیا کو چھوڑا جنکی طرف کار
آخرت کو ترک کر کے متوجہ ہوتے تھے، انھوں نے دنیا سے محبت
کی اس دنیا نے اُسے دھوکا دیا، انھوں نے اس پر اعتماد کیا اور

اس نے انھیں خاک میں ملا دیا، اب ہم کو لازم ہے کہ پروردگار کی اطاعت پر صابر رہکر اس کی مصیبتوں سے پرہیز کرتے ہوے اسکی نعمتوں کے اتمام کے منتظر رہیں کیونکہ کل کا دن آج کے دن سے بالکل قریب ہے، ساعتیں آج کے دن کو گزارنے کیلئے عجلت کر رہی ہیں، مہینے کے ختم کرنے میں ایام مستعجل ہیں اور سال کے ختم کر دینے کی مہینوں کو جلدی پڑی ہوی ہے اور عمر کے گزار دینے کے لئے برسوں کو کس قدر عجلت ہے، اب بتاؤ اس مکان میں کونسی خوبی ہے جسکی بنیادیں خراب ہو کر شکستہ ہو جائیں اس زمانہ میں کیا بہتری ہے جو مسافر کی مسافت کی طرح منقطع ہو جائے اور اس عمر میں کونسی بھلائی ہے جو آہستہ آہستہ توشہ دان کی طرح فنا ہو جائے۔

ہم تقوائے الٰہی کے سبب سے اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ اور دنیا میں نہایت پاکیزہ رہیں، آخرت کے مشتاق و شیفتہ ہو جائیں، دولت دنیا کی چکدار تجلیوں کی طرف رخ نہ کریں اسکی نفاستوں پر فریفتہ نہ ہوں، اس دنیا کی باتوں کو نہ سنیں اس کی آواز کا جواب نہ دیں، اس کا حال انتقال و زوال ہے، اس کی عزت ذلت ہے اس کی کوششیں فضول اور بے فائدہ ہیں، یہ فسق و فساد کا گھر اور غارتگری کی جگہ ہے یہ ہلاکت کی منزل ہے۔ دنیا والوں کو انھیں نیرنگیوں میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے کہ کہیں مردہ پڑا ہوا ہے، عزیز و اقارب رو رہے ہیں، اپنے بیگانے ماتم پرسی میں مصروف ہیں، کہیں مریض کراہ رہا ہے، لوگ عیادت کو چلے آ رہے ہیں، ایک دوسرا شخص ہے جو ہزاروں ہزار حسرتوں کو سینے میں چھپائے دم توڑ رہا ہے، ایک انسان ہے کہ دنیا کو طلب کر رہا ہے اور موت اسکی طالب ہے وہ موت سے غافل ہے، مگر موت اس سے غافل نہیں ہے بعض لوگ تاسف کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو کاٹ رہے ہیں کوئی کف افسوس مل رہا ہے، کوئی بحر تفکر و الم میں غرق ہے گر جب ناگہانی موت سامنے آ گئی تو وہ وقت حیلہ گری اور چارہ سازی کا نہیں، ہیہات۔ ہیہات!! اب گریز کہاں جو اسباب عبادت کے فوت ہوئے ہو گئے۔ جو زمانہ اطاعت گذر گیا گذر گیا!!

الٰہا قادرا پروردگارا۔ کریما منعما آمرزگارا بیشک تو اسی قابل ہے کہ تیرے احسان و نعمت کا شکر ادا کیا جائے اگر تیری طمع کی جائے تو یہ بہترین طمع ہے، اگر تجھ سے امید رکھی جائے تو یہ عمدہ ترین امید ہے۔ خداوندا۔ مجھے تیری حاجت ہے، میں تیرا محتاج ہوں اور تیرے فضل و کرم کے سوائے کوئی چیز اس احتیاج کا سد باب نہیں کر سکتی۔ اس کی ضروریات رفع نہیں ہو سکتیں مگر تیری بخشش بے اندازہ سے تیرے جود و کرم سے، خداوندا مجھے اس العمل میں اپنی خوشنودی و رضا کا جامہ پہنا دے۔ مجھے اپنے سوائے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بے نیاز کر دے بیشک تو اپنی مشیتوں پر قادر اور بڑا قدرت رکھنے والا ہے فقط

باقی آئندہ

سید علی اصغر بلگرامی

فغاں کیں لولیان شوخ شیریں کار شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکان خوان یغما را
من از آن حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

حافظ شیرازی رح

ذخیرہ

داشتہ آید بکار

ذخیرہ بضم اول وسکون ثانی سے کسی چیز کا نگاہ رکھنا یا کوئی شئے نگاہ داشتہ مراد ہے جو کسی خاص وقت کے واسطے نگاہ رکھی گئی ہو۔ ذخیرہ سے مراد وہ شئے ہے جو کسی وقت کے واسطے محفوظ ہو جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ایک شئے ذخیرہ میں سے لائی گئی یا نکالی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سرمایہ میں سے لائی گئی یا نکالی گئی ہے جو کسی وقت اور بعض اغراض کے تابع محفوظ تھی بالفاظ دیگر ذخیرہ کا مفہوم سرمایہ بھی ہوا سرمایہ کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ کسی وقت اور کسی ضرورت پر کام آئے یا کام دیسکے بایں معانی گویا فقرہ "داشتہ آید بکار" ذخیرہ اور سرمایہ کی ایک مختصر شرح ہے اور اگر یہ معانی ذرا اور وسعت سے زیر بحث لائے جائیں تو الفاظ ذخیرہ۔ سرمایہ اور داشتہ آید بکار کفایت شعاری اور ضروریات تمدن یا ضروریات زندگی کی بزنگ پیش بینی ایک دلاویز اور جامع تفسیر ہیں کفایت شعاری کیا سکھاتی اور کیا کچھ چاہتی ہے یہ کہ آیندہ اوقات اور آیندہ ضروریات کے واسطے انسان کچھ نہ کچھ پس انداز کرے تاکہ اس کی آیندہ زندگی مصیبت اور تکلیف میں نہ پڑے جو شخص ایسا کرتا ہے یا کفایت شعاری کے خیال سے ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہے وہ ایک ذخیرہ جمع کرتا ہے اور چند چیزیں اس طریق سے اکٹھا کرتا اور محفوظ رکھتا ہے کہ ان اوقات میں وہ کام آسکیں جو اوقات اور جن اوقات کی کیفیات اوس کی نگاہوں سے بہت کچھ اوجھل و مخفی ہوتی ہیں۔ اور جنکی نسبت وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ذخیرہ۔ سرمایہ جمع کرنا کفایت شعار بننا انسان کا ایک طبعی خاصہ ہے اگرچہ بہت سے لوگ کفایت شعار نہیں ہوتے کوئی ذخیرہ اور سرمایہ جمع نہیں کرتے داشتہ آید بکار پر اون کی نگاہ نہیں ہوتی پھر بھی انھیں اس ضرورت سے انکار نہیں ہوتا وہ اگر شروع شروع میں اس کا احساس نہیں رکھتے تو آخیر پر ضرور احساس کرتے ہیں اور اس طرح پر احساس کرتے ہیں کہ اون کی طبیعت ہی جانتی ہے۔

انسان کا یہ ایک طبعی خاصہ ہے انسانی فطرت میں یہ مرکوز ہے اور قدرت اپنے عملوں اور اپنے نمونوں سے علانیہ جتا رہی ہے کہ ذخیرہ اور سرمایہ ایک لازمی مرحلہ ہے اگر ہم قدرت کے مختلف ذخیروں پر غور کریں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے بھی کس وسعت سے ذخیرے موجود کر رکھے ہیں ایسے ذخائر جن میں باوجود اس قدر صرف اسراف کے کمی نہیں ہونے پاتی۔ آؤ ہم دیکھیں کہ قدرت کے کون کون سے ذخائر ہیں دیکھو انسان کی وہ فطرت اور انسان کی طبیعت اور انسان کا جسم مختلف قوتوں جذبات اور مواد کا کس قدر

ذخیرہ ہے دیکھو کس حکمت سے اس میں مختلف قوتوں اور مختلف جذبات کا مواد بھر رکھا ہے جو قوتیں اور جو جذبات لڑکپن میں کام دیتے ہیں وہی ایک دوسرے رنگ میں عالم شباب اور عالم ضعیفی میں کام دیسکتے ہیں دیکھو انسان کی طبیعت میں غصہ غضب اور جوش ہر وقت نہیں دیکھا جاتا اور بعض وقت انسان اخلاقاً ان صفات کی تاویل بُرے رنگ میں بھی کرتا ہے لیکن وقت پر یہ جذبات جو کام دیتے ہیں اُن کی ضرورت سے بھی انسان انکار نہیں کرسکتا۔
اگر غصہ غضب اور جوش کسی پہلو سے برا ہے تو اچھا بھی ہے غیرت اور محبت انسان کی صفات محمودہ میں سے ایک صفت ہے اور وہ کسی حد تک غصہ غضب اور جوش ہی سے کہ آمیزش پاتی ہے اگرچہ غصہ غضب اور جوش میں بعض وقت غلط بھی ہوجاتی ہے اور انسان مارے وحشیانہ جوش کے حقوق مادی اور حقوق اخلاقی کے اتلاف سے دریغ نہیں کرتا۔
لیکن باوجود اس کے بھی بعض وقت یہ صفتیں اور یہ جذبات جو کچھ ضرورت اور رغوبی رکھتے ہیں اس کے اعتراف سے بھی خاموش نہیں رہا جاسکتا اس میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں کہ ہر مقام اس قابل نہیں ہوتا کہ غصہ وغضب اور جوش سے کام لیا جائے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ضرورت اسکی پڑتی ضرور ہے ہاں احتیاط لازمی ہے۔

ناقدردان حسن مشو حرف من شنو
منما بہر کسے رُخ نو سپائے خویش را۔

یہ مان کر بھی کہ واقعی بعض اوقات انسان کو غصہ غضب اور جوش سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ انسانی طبیعتوں میں اس قسم کا مصالحہ موجود نہیں ہے تو کس قدر مایوسی ہوگی تمدنیات۔ مذہبیات اور سیاسیات میں کسی نہ کسی وقت جوش کی ضرورت پڑتی ہے اور بغیر اس کے کام نہیں نکلتا قدرت اگر یہ مصالحہ طبایع میں نہ رکھتی اور یہ ذخیرہ نہ ہوتا تو انسان کس قدر مشکلات میں پڑتا غصہ غضب اور جوش نظام کائنات کے ایک وسیع عنصر ہے اگر میں ایک فعل واقعی برا سمجھتا ہوں تو اگرچہ اس کا موجب اوس فعل کی برائی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جوش بھی ہے جو میرے دل میں اذیت اور تکلیف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جو میری طبیعت کو الگ اشتعال میں لاتا ہے اسی قسم کی دیگر مثالوں سے پتہ لگ سکتا ہے کہ قدرت کہاں تک ذخائر رکھنے کی مشتاق ہے اور کہاں تک اُس کے ذخائر سے اپنا کام لے رہی ہے مختلف عناصر کائنات سے جو کچھ اس وقت تک انسان معلوم کرچکا ہے وہ ابھی ایک ابتدائی مرحلہ ہی ہے انسان کسی وقت ختم ہوجائیگا لیکن قدرتی ذخائر ختم نہیں ہونگے۔
ذخائر ایک قسم کے نہیں ہیں انکی موٹی موٹی اقسام حسب ذیل ہوسکتی ہیں۔

(۱) معادی ذخائر
(۲) معاشرتی ذخائر
(۳) جسمانی ذخائر
(۴) وجدانی ذخائر
(۵) لفظی ذخائر
(۶) معنوی ذخائر
(۷) مادی ذخائر
(۸) مجرداتی ذخائر
(۹) قدرتی ذخائر
(۱۰) انسانی ذخائر فطری وغیرہ

بہ امعان نظر دیکھوگے تو تمھیں معلوم ہوسکیگا کہ قدرت کی حمایت سے جس قدر ذخائر مختلف انواع کے مہیا کئے گئے ہیں اون کا منشا سوائے اسکے اور کیا ہوسکتا ہے۔
(الف) وقت پر وہ کام کریں۔

(ب) وقت پر ان کا احساس ہو۔

(ج) اون کے انکشاف میں طبایع کی ذہانت اور قوت مدرکہ عملی رنگ میں مجھتے ہو۔

(د) اونھیں بہ رنگ ارتقائی ترقی اور تزکیہ ہو۔

(ھ) لوگ اُن سے اپنے اپنے رنگ میں مستفیض ہوں۔

زمین اپنی قوتوں اور مواد کی حیثیت سے ایک قدرتی ذخیرہ ہے اور بعض انواع کائنات اُس سے اور اوس کی قوتوں اور مواد سے فائدہ اٹھارہی ہے انسان اپنی قوتوں اور اپنے جذبات کے اعتبار سے ایک کان اور ایک ذخیرہ ہے جوں جوں وہ غور کرتا اور اپنے جذبات سے کام لیتا ہے ووں ووں اُسے تزکیہ کی وجہ سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جنھیں وہ بعض حالات ایک اعجاز سمجھتا ہے۔ دیکھو حافظہ کس قسم کا ذخیرہ رکھتا ہے ہزاروں باتیں اور ہزاروں الفاظ مکنون حافظہ ہیں جو وقت پر نکلتے اور کام دیتے ہیں ایک مقرر اور ایک بولنے والے پاس اگر الفاظ کا ذخیرہ نہ ہو تو اوس کی طلاقت اور اوس کا ناطقہ کس طرح کامیابی کے ساتھ کام دیسکتا ہے لغات کیا ہیں ایک ذخیرۂ الفاظ کیا ہیں ایک ذخیرۂ معانی کیا ہیں ایک ذخیرہ، وقت اور ضرورت پر اُن سے کام لیا جاتا ہے اور اون کے سوائے گزران نہیں۔

تمام علمی صورتیں اور تمام علمی انکشافات ایک ذخیرہ ہیں وقتاً فوقتاً اون سے کام لیا جاتا ہے اور بمصداق داشتہ آید بکار ایسا ذخیرہ انسان کے واسطے اون سہولتوں اور اون تصرفات کا موجب ہوتا ہے کہ جنکے بغیر ایسی سہولتیں اور ایسے تصرفات قریباً ناممکن ہیں قدرتی اور انسانی ذخائر کیوں مہیا کئے جاتے ہیں بایں غرض کہ اونھیں ایک سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ کام میں لایا جائے یا اون سے کام لیا جائے قدرت کی جانب سے حضرت انسان کو جو جو قوتیں اور جو جو جذبات عطا ہوے ہیں اون کا ایک سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ کام میں لانا ہی تہذیب اور اخلاق ہے اعتدال کے ساتھ اون کا استعمال اور وقت پر اون کا احساس اوس ضرورت کا ثبوت ہے جو ذخیرہ کی ایک خوش کن اور کافی ضمانت ہے اور جس سے ثابت ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کو ذخیرہ کی کس قدر ضرورت ہے اور ملک و قوم پر ذخیرہ کی نگاہداشت وسایل کا بہم پہنچانا کس قدر لازمی ہے۔ ذخیرہ کی نگہداشت صرف اس غرض کے واسطے ہوتی ہے کہ وقت پر اوس سے کس طرح کام لیا جائے یا ضرورت پر اُسے کس طرح کام میں لایا جائے

استعمال ذخیرہ کے وقت ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

(۱) شناخت وقت (۲) حسن استعمال (۳) تنقید ذخیرہ

یہی تین باتیں ہیں جو تمام قسم کے ذخائر کے استعمالات کی روح رواں ہیں۔ اگر ذخیرہ واقعی اپنے عناصر اپنے اجزاء اپنے فوائد اور اپنے تصرفات کی جہت سے مفید ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اوس کے قیام اوس کی پا بجائی اور حسن استعمال کے وسائل ہاتھ سے نہ دیں اور اوسے ایک مقامی ذخیرہ سمجھیں بہت سے ذخائر صرف اس واسطے رائیگاں اور برباد یا ضائع ہو جاتے ہیں کہ نہ تو وقت دیکھا جاتا ہے اور نہ حسن استعمال ہوتا ہے اور نہ اون کی تنقید ہوتی ہے۔ بصارت سماعت اور ذہانت، ایک قدرتی ذخیرہ ہے اگر اون کا استعمال باقاعدہ اور بالترتیب نہ ہو تو اوس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا اخلاق

کی لازمی تعلیم یہی ہے کہ قوتوں اور جذبات کو احتیاط اور
تربیت کے ساتھ کام میں لایا جائے اور باصول وضع
الشئی فی محلہ اونھیں رکھا جائے ابداخلاقی اور بدتہذیبی
کیا ہے؟ قوتوں اور جذبات کا برا استعمال۔ ادیب کیا
کرتا ہے؟ فصیح و بلیغ مقرر کا کیا فرض ہوتا ہے صرف یہ کہ
الفاظ فقرات اور معانی کی ترتیب اور سلسلہ موقت اور
باسلیقہ ہو اور وہ حسن بندش اور حسن استدلال جو لازمی ہے
ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ذخائر کی خوبی اور عمدگی اسی میں
ہے کہ ان کی نگہداشت۔ ترتیب حسن استعمال اون قوانین کے
تابع رہے جو فطرتی حسن اور فطرتی نظام سے ایک نسبت رکھتے
ہوں۔ ذخیرہ کبھی ایک ہی جنس اور ایک نوع پر مشتمل ہوتا
ہے اور کبھی مختلف اجناس اور مختلف انواع پر دیکھو
ذخائر اشجار کبھی مختلف پودوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور کبھی
صرف ایک ہی نوعیت رکھتے ہیں جب موسم آتا ہے تو
اون میں سے مختلف یا ایک ہی قسم کے پودے مختلف مواقع
اور مختلف اراضیات میں لگائے جاتے ہیں یہی کیفیت
علمی ذخائر کی بھی ہے مختلف اوقات میں اون کی بھی
تخم لگائی جاتی اور اون سے کام لیا جاتا ہے بوقلموں
ذخائر بہ مقابلہ ایک ہی جنس یا ایک ہی نوع کے ذخائر
کے زیادہ دلچسپ اور دلاویز ہوتے ہیں اور اون سے
مختلف ہستیاں مستفیض ہوتی ہیں اگر تم نے کوئی ذخیرہ
حسنات جمع کیا ہے اور اگر تمھارے پاس کوئی ذخیرہ
قوائے سعیدہ اور جذبات حمیدہ کا ہے اور اگر تم
معلومات بالغہ کا کوئی ذخیرہ رکھتے ہو اور اگر تمھاری
جماعت میں سے کوئی متنفس ایسا ذخیرہ حسنہ رکھتا ہے

تو تمھارا فرض ہے کہ اوس کی پابجائی۔ امداد حسن استعمال
میں دل سے ساعی رہو کیونکہ قدرت نے یا بعض انسانی
ہاتھوں نے اگر کوئی ایسا ذخیرہ حسنات تمھیں دیا ہے یا
اوسکی بنیاد رکھی ہے تو تمھارا فرض ہے کہ اوس کا استعمال
اون وسایل کے تابع ہو جو وسایل اوس کی خوبیوں
اوس کی عمدگیوں اور اوس کے فضایل کے اظہار کے
واسطے ایک خصوصیت رکھتے ہوں بعض قوموں کے
افراد میں ذہانت اپنی محنت اور اپنی قوت فیصلہ کی مدد
سے بعض وقت اچھے اچھے ذخائر کے بانی ثابت ہوتے
ہیں بعض لوگ اپنے ہاتھ میں ایک ذخیرہ حسنہ رکھتے ہیں جو
تمدنی۔ اقتصادی۔ ادبی اور اخلاقی رنگ میں ایک قابل
قدر ذی الفواید ذخیرہ ہوتا ہے بعض اوقات وہ اس
واسطے کس مپرسی کی حالت قبول کر لیتا ہے کہ لوگوں کو
اوس کے محاسن اور اوس کے فضائل پر عبور نہیں ہوتا۔
علمی رنگ میں اگر کسی قوم میں کوئی ایسا ذخیرہ موجود ہے
یا کسی کی طرف سے ایسا ذخیرہ پیش ہوا ہے تو قوم کا فرض
ہے کہ اوس کی پابجائی اور تحفظ میں پوری کوشش کھائے
بعض وقت بعض ذخائر محض اس وجہ سے بحالت
کس مپرسی رہ جاتے ہیں کہ قوم اور افراد قوم اون کی ضرورت
سے ناآشنا ہوتی ہے اور نہیں جانتی کہ فلاں ذخیرہ
اپنے اندر کیا کچھ سامان ترقی اور سامان ذہنی وسامان
علمی رکھتا ہے ہر چیز اور ہر طاقت کی ہستی کا موازنہ
اوس وقت ہو سکتا ہے جب اوسے دیکھا جائے اور
اوس کی تنقید کی جائے اور اوسے کام میں لایا جائے
اگر تمھاری جماعت کوئی اچھا ذخیرہ رکھتی ہے اور

اوس ذخیرہ کی روش حوصلہ افزا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اوس کی قدر نہ کی جاوے۔ اور اوس سے کام نہ لیا جائے اور اُسے قایم نہ رکھا جاوے ذخیرہ اوسی حالت میں قایم اور محفوظ رہ سکتا ہے کہ جب اوس کے بعض اجزائے مجتمعہ سے ایک طرف کام لیا جائے اور دوسری طرف اوس میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق دیگر اجزائے جدیدہ بڑہائے جاویں اور ایسے اجزائے جدیدہ اوسی صورت میں بڑہ سکتے ہیں جب ذخیرہ کی ترقی کا خیال ہو اور یہ پایا جائے کہ قوم میں سے کوئی فرد ایسا ذخیرہ حسنہ پیش کرتا ہے اور اس غرض سے اُسے قوم کے سامنے پیش کرتا ہے کہ قوم اور اوس کے افراد اوس سے مستفیض ہوں تو قوم ہی کا فرض حسنہ ہے کہ اوس کے قیام کے واسطے اون وسایل مادی اور اخلاقی کا خوش اسلوبی کے ساتھ تہیہ کرے جو مناسب اور موزوں ہوں اگر تم اپنے ہاتھ میں فی الواقع کوئی مفید اور جامع ذخیرہ رکھتے ہو اور وہ فی الحقیقت علمی اور عملی رنگ میں مفید اور قابل قدر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم اس کے دلدادہ نہ ہو اور تم اُسے اپنی ذہنی۔ مادی ضروریات کے واسطے ایک اچھا رفیق نہ خیال کرو۔ تم ایک ذخیرہ ہو ذرا اپنے اندرونہ پر بمصداق و فی انفسکم افلا تبصرون۔ غور کرکے تو دیکھو کہ کس کس قسم کی نادر قوتیں اور نادر جذبات تمھیں قدرت نے دے رکھے ہیں جب تم اپنے اندرونہ میں ایسے ایسے نادر ذخائر رکھتے ہو تو کیا تم یہ نہیں تمیز کر سکتے کہ تمھارے ہاتھوں میں کوئی اور بھی ایسا ذخیرہ ہے یا نہیں جو تمھاری اندرونی اور طبیعی قوتوں اور فطرتی جذبات کو صحیح پیمانہ پر لانے کی کوشش میں ہے ہمارا اچھا ذخیرہ۔ تمدنی ذخیرہ۔ اقتصادی ذخیرہ اخلاقی ذخیرہ اور علمی ذخیرہ۔ قوم کے واسطے خوبیوں کا ایک ذخیرہ ہے اوس کے نشو و نما اور ترقی و پایجائی کے لئے ہمیں مادی۔ جذباتی اور مالی وسائل بہم پہونچا کر اوس کی دلچسپی اور دلدادیزی کو بڑہانا ایک اچھا مشغلہ ہی نہیں ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے واسطے ایک اچھا ذخیرہ بھی ہے کیا ہم اس وقت اپنے ہاتھوں میں کوئی علمی ذخیرہ کوئی مضامین ذخیرہ کوئی لٹریری ذخیرہ رکھتے ہیں تو اوس کا حسن استعمال حسن قیام ہم پر واجب ہے اور وہ سوائے اس کے ممکن نہیں کہ ہم ایک علمی ذخیرہ کی ہستی قوم اور افراد قوم کے واسطے ایک مفید ہستی سمجھیں۔

سلطان احمد

مطالعۂ فطرت

مطالعۂ فطرت سے جو جذبات و تخیلات دماغ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور اون سے جو اونچے خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کا اظہار موزوں الفاظ کے ذریعہ سے کرنا بڑی صنعت ہے شاعری اور موزوں کلام کی ابتدا اسی طرح ہوئی اور صدیوں کے بعد اب بھی اسی طرز اظہار خیال کو نیچرل شاعری کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون ہمارے کرمفرما مولوی سید علی اکبر صاحب کوثر بلگرامی کے ذہن رسا کا نتیجہ ہے۔ عنوان سے زیادہ اچھوتا متن ہے جسکی دلچسپی کو انداز بیان نے اور بڑھا دیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اسے نہایت دلچسپی سے پڑھینگے۔

ایڈیٹر

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

پتا جو دفتر اسرار یزدانی کا ایک صفحہ رنگین ہے اس کی آفرینش پر نظر کرو دیکھو اس میں کارخانہ قدرت کے کیا کیا اسرار خفیہ و جلیہ موجود ہیں یہ عجائب قدرت ربانی کا مظہر اور خوارق حکمت حقانی کا حامل ہے اسکی ہستی کس قدر ضعیف اور اس کا وجود کیسا بے بود ہے اس میں صناع ازل نے کیا کیا گلکاریاں کی ہیں یہ کن کن صنایع و بدایع پر محیط ہے اس صحیفہ حسن کا ہر ورق رخ کیسا صفحہ جمال و دلربائی اور ہر برگ سبز کیسا پیکر نظر افروزی و دلفریبی ہے۔ نام تو ایک ہی ہے مگر اقسام کتنے ہیں کیا ان کا احصا ممکن ہے چند پتوں کو لیکر ان کا بامعان نظر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں رنگتوں کے ظہور نمود اور اختلاف الوان کے حسن و جمال کا ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھکر بے اختیار اوس مبدء جمال حقیقی اور اوس سرچشمہ حسن مطلق کے تصور میں انسان گم ہو جایگا جو ان تمام مصنوعات د تکوینات حسینہ و جمیلہ کا صانع ہے جو ان صفحات منقوشہ و ملونہ کا مصور ہے جس کے ید قدرت کی مشاطگی سے جو شے بنی حسین و جمیل بنی جسکے قالب تخلیق سے جو وجود نکلا دلربا و رعنا بنکر نکلا اور جس کے عکس و ظلال لاہوتی سے عالم خلقت کے ہر ذرہ نے اخذ جمال و رعنائی کیا۔

علماء علم النباتات نے لکھا ہے کہ پتا اپنی آفرینش کے پیشتر مادہ کے غیر معلوم ذرات پر مشتمل ہوتا ہے وہی ذرات تدریجی طور پر پرورش پاتے رہتے ہیں اور اون میں خیوط (Fibres۔) پیدا ہوتے ہیں یہ خیوط یعنے دھاگے درخت کی ٹہنی کی بیرونی سطح کے اندر یا بعض وقت تیور کی طرح سطح کے اوپر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پرورش پاتے پاتے ایک گچھے کی شکل میں ہوکر بیرونی سطح پر نظر آنے لگتے ہیں پھر ان کی پرورش ہوتی ہے اور بالآخر وہ دھاگے پھیلنے لگتے ہیں اور پتے کی شکل اختیار کرتے ہیں قانون قدرت کے مقررہ اور غیر متغیر اصول کے مطابق ہر پتے کی ایک حد اس کی آفرینش کے وقت ہی معین کردیجاتی ہے

اور یہ حد پتے کا آخری اور بالائی سرا ہے اس کے بعد پتے میں
جو نشو و نما ہوتا رہتا ہے وہ عرض و طول میں بڑھتا جاتا ہے
تو یہ فعل ڈنڈی یعنے جڑ کی طرف سے ہوتا رہتا ہے اور یہ پتے کا
پھیلاؤ محض بخیہ گر فطرت کی اوس اعلیٰ دستکاری کی وجہ ہے۔
جس سے اندرونی طور پر پتے کی خیوط میں مسلسل بخیہ گری ہوتی رہتی
اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ایک کپڑا بننے کی مشین میں
پہلے دھاگوں کا گچھا ایک خاص ترتیب سے رکھدیا جاتا ہے۔
اوس کے بعد جب وہ مشین اپنا کام شروع کرتی ہے اور دھاگے
طولاً و عرضاً جب ایک دوسرے سے ملصق ہوتے جاتے ہیں
تو کپڑے کے تھان بنتے چلے جاتے ہیں اور جب تک یہ سلسلہ
جاری رکھا جائے کپڑے کے پھیلاؤ کا سلسلہ جاری رہیگا۔

پتا ذی روح ہے اور اوس کی ساخت بالکل حیوانی ساخت
سے مشابہہ ہے انسان کے جسم میں جس طرح پوست، گوشت،
ہڈیاں، ورید، شرائیں، ریشے یعنے نسیج، خیوط اور خون ہے
وہ سب اس میں موجود ہے جس طرح انسان کا خون گردش میں
ہے اوسی طرح پتے میں بھی خون ہے اور گردش کر رہا ہے
جس طرح انسان کے جسم میں روح یعنے حرارت غریزی موجود ہے
اوسی طرح پتے میں بھی یہ جوہر موجود ہے جس طرح اس جوہر کا
وجود بقائے حیوانی کے لئے ضرور ہے اور اوس کا انحطاط
فنائے حیوانی کا لازمہ اوسی طرح پتے کی بھی بقاو فنا کیلئے اس
جوہر کا وجود لازمات سے ہے جس طرح قدرت نے حیوانات
میں تقسیم تجنیسی کی ہے اسی طرح پتے میں بھی موجود ہے انسان
میں لامسہ اور ذائقہ ہے پتے میں بھی حواس لامسہ اور ذائقہ
موجود ہیں۔

نباتات میں وسایل حس یعنی اعصاب کا وجود پایا
جاتا ہے۔ عصب کا فرض اصلی یہ ہے کہ ہر ہیجان جو اس کے
کسی حصہ میں پیدا ہوا ہو اوسے وہ جسم کے دوسرے حصہ تک پہنچاوے۔
اعصاب کی تکوین و ترکیب چھوٹے چھوٹے ریشوں یا دھاگوں
سے ہے جسکو نسیج یا خیوط کہتے ہیں جب جسم کے کسی حصہ میں ہیجان
ہوتا ہے تو اوس مقام کے خیوط میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور
یہ حرکت برقی رو کی طرح آگے دوڑتی ہے اور جس طرح برقی تار
کے ایک سرے کی حرکت بسرعت تمام دوسرے سرے تک نفوذ کر
جاتی ہے اسی طرح ہر ریشہ اپنے بعد کے ریشہ کو حرکت دیتا ہوا
چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ حرکت مرکز اعصاب یعنے دماغ تک
پہونچ جاتا ہے جسکی سلطنت اقلیم جسم پر انھیں اعصاب کی
بدولت ہے اس نکتہ کے واضح کرنے سے یہ مقصود تھا کہ درختوں
پھولوں اور پتوں میں بھی ایسے ریشے موجود ہیں جو بعینہٖ وہی
کام کرتے ہیں جو جسم حیوانی میں اعصاب کا ہے چنانچہ بعض
پتے من حیث اللمس اس قدر ذکی الحس اور سریع التاثیر ہیں کہ
اگر اون کو تیز ہوا لگ جائے تو مرجھا جاتے ہیں بعض ایسے ہیں کہ
اون کو اگر جسم چھو جائے تو وہ فوری متاثر ہو جاتے ہیں مثلاً
Mimosa جسکو (Sensitive Plant)
بھی کہتے ہیں اور اردو میں جس کا مرادف چھوئی موئی کا درخت ہے
لمس سے اس درخت میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے وہ مقام لمس سے
مرکز تک منتقل ہوتا ہے اور یہ مرکز پتیوں کے اختتام سے شروع
ہو کر ڈالی کے آغاز پر ختم ہوتا ہے اس عضو نباتی میں ایک
ہیجانی حالت یعنے تقلص و انقباض (کھنچنا اور سکڑنا)
شروع ہو کر ایک طوفان خیز حرکت محسوس ہوتی ہے اور یہی
حرکت ہے جس سے دفعتاً پتیاں پژمردہ ہو کر نیچے کو جھک
جاتی ہیں بعض پتے ایسے ہیں کہ وہ گرم ہوا، تمازت آفتاب،

یا گرم ابخرات سے فوری متاثر ہو جاتے ہیں یا اون کا کسی قوی
چیز سے تصادم ہو تو وہ پژمردہ ہو جاتے ہیں اور اسی قوت کا
نام قوت لامسہ ہے۔ اب رہی قوت ذائقہ اوس کا ثبوت یہ ہے کہ
اگر کسی پتے پر کوئی ایسا مرکب جس میں شوریت ہو ڈالدیا جائے
یا تیزاب کے قسم سے کوئی چیز اوسکو مس کر جائے تو فی الفور اوسکی
قوت ذائقہ اپنا کام کرنے لگتی ہے اگر وہ پتا نازک و لطیف
ہے تو فوری متاثر اور پژمردہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ حساس المزاج
قوی ہے تو تدریجی طور پر متاثر ہوتا ہے اور یہی قوت ذائقہ ہے
قوائے سامعہ باصرہ اور شامہ حیوانات سے اسلئے مختص ہیں کہ
ان کا تعلق کان آنکھ اور ناک سے ہے جو نباتات میں نہیں ہیں
پتے کو جسم حیوانی سے مشابہت دینے کی وجہ یہہ ہے کہ اس
میں وہ تمام مادیات جو جسم حیوانی میں ہوتے ہیں موجود ہیں
کسی ایک پتے کو دیکھو اوس میں چاروں طرف اوپر نیچے ایک
نہایت نازک و لطیف جھلی (حجاب) ہے جس میں وہ لپٹا ہوا ہے
جھلی کی بالائی سطح سے گزر کر درمیانی حصہ سے ہوتے ہوئے جھلی
کے حصہ زیرین تک گئی ہیں اون میں جو جو غرائبات ہیں اونکا
بیان آگے آئیگا فی الحال یہ بات بیان کرنی ضرور ہے کہ جھلی
کے فوقانی تحتانی اور وسطی حصص میں مادی ذرات بکثرت ہیں
جن سے پتے کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے زیادہ تر مادہ تولیدی
انھیں سطحات میں موجود رہتا ہے جو پھول آنے کے زمانہ میں
فوقانی سطح پر آجاتا ہے۔ عموماً پتے کی بالائی سطح زیادہ چمکدار اور
پائینی سطح بے رونق ہوتی ہے اوس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ذرات
جنکو ([illegible]) کہا جاسکتا ہے بالائی سطح پر زیادہ موجود ہوتے
ہیں اس نازک و لطیف جھلی کو جو پتے کا ملبوس یا پوست ہے
نہایت احتیاط سے علیحدہ کیا جائے تو اندر سے پتے کے اصلی رنگ
کا گہرا جسم نمودار ہوگا یعنے اگر پتا اپنا قدرتی رنگ سبز رکھتا ہے
تو اندر سے جو جسم نمودار ہوگا وہ گہرا سبز ہوگا اگر پتا سرخ ہے تو
گہرا سرخ اور اگر زرد ہے تو گہرا زرد وقس علی ہذا اور اسی کو
پتے کے گوشت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے حیوانی جسم سے اگر پوست
جدا کردیا جائے تو بمقابلہ پوست کے گوشت کا رنگ جدا گانہ ہوتا
ہے اوس کی وجہ یہ ہے کہ حیوانی پوست موٹا ہوتا ہے اور پتے کا پوست
نازک و باریک ہونے کی وجہ سے اندرونی جسم کا اصلی رنگ باہر
نمایاں رہتا ہے۔ حیوانی گوشت میں جس طرح آورده اور شرائین
ہیں اسی طرح پتے میں آورده اور شرائین موجود ہیں جو ایک سرسری
نظر میں دکھائی دے سکتے ہیں۔ حیوانی جسم میں جس طرح خون کی
گردش نمو اور بقائے حیات کا وسیلہ ہے اوسی طرح پتے میں وہ
رطوبت جو درخت کی جڑ خارجی مادوں سے حاصل کرتی ہے۔
ڈالیوں میں گردش کرتی ہوی پتے کے آورده اور شرائین تک پہونچتی
ہے اور پتے کے جسم میں گردش کرکے اوس کے نمو اور بقا کا ذریعہ
ہوتی ہے پتوں میں ہڈیاں بھی ہوتی ہیں پان ہی کا مطالعہ کیا
جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض پان ایسا ہوتا ہے کہ اوسکو تہ کیا
اور جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ ٹوٹ گئیں جس طرح ایک نوزائیدہ
بچے کی ہڈیاں نرم و نازک ہوتی ہیں اور خفیف سے تصادم سے
پاش پاش ہوسکتی ہیں وہی حال پتوں کا ہے کہ اونکی ہڈیاں
نرم ہونے کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہیں بعض پتے ایسے بھی ہوتے ہیں
جنکی ہڈیاں اچھی خاصی مضبوط ہوتی ہیں جیسے تاڑ کا پتا۔ اکثر
پتوں میں انسان کے جسم کی طرح مسامات بھی ہوتے ہیں اگرچہ اون
کا فعل غیر متحقق ہے بعض پتے ایسے بھی ہیں جن پر بال ہوتے
ہیں اور یہ وہ مخملی سطح ہے جو ہات پھیرنے سے محسوس ہوتی ہے
اس کے اقسام بھی مختلف ہیں بعض پتے نرم بال رکھتے ہیں۔

اور بعض سخت بال بعض پتوں پر بال ایک دوسرے سے پیوست اور گنجان ہوتے ہیں اور بعض پر منتشر اور خال خال۔ پتے کی سطح میں مادہ کے جو ذرات بکھرے ہوے ہوتے ہیں وہ یا تو ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں یا اون میں فصل ہوتا ہے جن پتوں کے ذرات میں فصل ہوتا ہے ان پتوں میں اس فصل کی جگہ سے روئیں اوگتے ہیں جنکو بالوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے

موسس اساس قدرت نے جس طرح حیوانات کو نر اور مادہ میں تقسیم کیا ہے اسی طرح نباتات میں بھی یہ تقسیم جاری ہے چنانچہ جب کسی پتے کا خوردبینی آلات سے مطالعہ کیا جائے تو ایک ہی درخت کے پتوں میں ایسے اجزا نظر آتے ہیں جو اپنی ساخت اور وظائف طبیعی میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان مختلف اجزا میں مختلف نوعیت کے مادے ہوتے ہیں۔ کوپل پھوٹنے کے پیشتر ہی سے یہ مادے آپس میں ملتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب پتے نمایاں ہونے لگتے ہیں تو اون کا عملیہ امتزاج اور بڑھ جاتا ہے بعض پتوں کے مادے اس قدر سریع الامتزاج ہوتے ہیں کہ ہوا کے جھونکے سے جب ایک پتا دوسرے پتہ سے ملتا ہے تو اس مادہ کا نر اور مادہ پتوں میں باہم تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور اون میں سے ایک غیر محسوس ریزش ڈالیوں کے اوس حصہ پر گرتی رہتی ہے جہاں حاملہ غنچہ جلوۂ قدرت میں منتظر رہتی ہے جب یہ مادہ ڈالی کے اوس حصہ میں نفوذ کرنے لگا تو بتدریج کلی نمایاں ہونے لگتی ہے اور ایک سے دوسری دوسری سے تیسری غرض مادہ جس قدر قوی ہو اوسی قدر کلیوں کی افراط ہو جاتی ہے اور بتدریج پھول بنتے جاتے ہیں یہ مادہ بعض پتوں کے سوا پھولوں اور کلیوں میں بھی ہوتا ہے جس سے پھل بنتے ہیں انتقال مادہ کی ایک شکل تو وہ بیان کی گئی جو ہوا کے جھونکوں یا پتوں کی مقاربت کی وجہ سے منتقل ہوتا ہے لیکن بعض پھولوں کلیوں اور پتوں میں یہ مادۂ تولید ایسا بطی النفوذ ہوتا ہے کہ اوس کو ایک پھول سے دوسرے پھول یا ایک پتے سے دوسرے پتے میں منتقل ہونے کے لئے ایک درمیانی واسطہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا انتظام اوس قوت لم یزلی نے یہ فرمایا ہے کہ ایسے درختوں کو چھوٹے چھوٹے پردار کیڑے یا رینگنے والے کیڑوں کا مسکن اور آماجگاہ بنا رکھا ہے اور وہی کیڑے اس مادہ کے انتقال مکانی کا ذریعہ بن جاتی مادے کے اس اختلاط و امتزاج کو انگریزی میں Pollination کہتے ہیں نباتات میں نر اور مادہ کی تقسیم کوئی نیا نظریہ نہیں ہے عربوں کو عہد جہل و بدویت میں بھی اس کا علم تھا اگرچہ اوس کا دائرہ صرف کھجور تک محدود تھا اس کو وہ اپنی اصطلاح میں تعبیر یا تلقیح کہتے تھے۔

بعض پتے ایسے ہوتے ہیں جو بارہ مہینے رہتے ہیں بعض پتے خاص خاص موسموں میں نکلتے اور پھر سوکھ کر گر پڑتے ہیں۔ بعض پتوں کی تولید اس کثرت سے ہوتی ہے کہ درخت کی ٹہنیاں چھپ جاتی ہیں اور بعض پتے اس قدر کم مقدار میں ہوتے ہیں کہ سارے درخت کے پتوں کو بہ آسانی شمار کر لیا جا سکتا ہے پتوں کی جسامت یعنے عرض میں بھی بکثرت انواع ہیں کوئی پتا نہایت باریک ہوتا ہے کوئی دلدار بعض پتوں کی ضخامت ایک ایک انگل تک پائی گئی ہے بعض پتوں کی ترکیب چھوٹے چھوٹے متفرق ریشوں سے ہے۔ وہ سب ریشے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی پتے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ان کو (Fern) فرن کہا جا سکتا ہے یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ پتے

کا فوقانی رخ ہمیشہ بہ مقابلہ تحتانی حصہ کے زیادہ واضح اور روشن ہوتا ہے لیکن جن پتوں کی نوک ([illegible]) آسمان کے طرف ہو اون میں قدرت نے دونوں سمت ایک ہی رنگ رکھا ہے اس نظریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب و ماہتاب کی حرارت و برودت کو تغیر لوں میں بہت بڑا دخل ہے۔

اوس حکیم بے ہمتا کی حکمت بالغہ کی کیا داد دی جا سکتی ہے جس نے اسی پتے میں وہ کنز مکنوز اور وہ دفاین غیبیہ پوشیدہ رکھے ہیں جن کے ادراک میں عقول بشریہ حیران ہیں ایک پتے کا تجزیہ کیمیاوی (Chemical-Analysis) کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر پتہ فی ذاتہ مختلف المزاج مختلف الاثر مختلف الماہیت اور مختلف الخاصیت ہے کوئی حار ہے، کوئی بارد، کوئی رطب ہے کوئی یابس، کوئی چھوٹا ہے، کوئی متوسط اور کوئی بڑا۔ ایک ہے کہ سر سے پاتک بحر اخضر میں نہائے ہوئے ہے دوسرے پر قلم قدرت نے الوان متنوعہ سے وہ قلم کاری اور سحر طرازی کی ہے کہ جب اوس پر نظر پڑی تو ایسی جمی کہ ہٹنا دشوار ہو گیا کسی پر شجر فی خطوط ہیں کسی پر لاجوردی جڑا ہوا ہے کوئی مینا کاری کا بے مثل نمونہ ہے کہیں مسایل اقلیدس کو دوائر و زوایا کی شکل میں حل کیا ہے کسی پر منبت کاری کی ہے کسی کو نقوش علم لدنی سے آراستہ کیا ہے ایک پتا ہے جسمیں وہ عطریت ودیعت کی گئی ہے کہ اوسکی شمیم جان پرور سے دماغ کی تفریح ہے۔ دوسرے کو ملئے تو اوسکی خوشبوئے روح افزا سے مشام جان معطر ہوتا ہے تیسرے کو پکائے تو وہ جوش کھا کھا کر اپنی دل آویز اور مشک بیز عطریت سے دماغ کو معطر کر دیتا ہے کسی کو جلائے تو وہ خاک ہو کر بالیدگی روح کا باعث ہوتا ہے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر اونکی ہوا لگ گئی تو طبیعت مکدر و منقبض ہو گئی ایک پتا ایک نیم جان مریض کیلئے آب حیات کا حکم رکھتا ہے دوسرا پتا زہر ہلاہل کا کام دیتا ہے طب ویدک یونانی اور انگریزی میں جو ادویات ہیں اون میں جوہر و عنصر اصلی نباتات یعنے جڑی بوٹیاں ہیں علی الخصوص طب ویدک کا دارومدار اسی پر ہے انسانی تلاش نے جن جن پتے کی خاصیت دریافت کی ہے اون کو اس وقت مداوا اور معالجہ کی غرض سے کام میں لایا جا رہا ہے بعض ایسے پتے بھی ہیں کہ علاوہ معالجہ وغیرہ کے اور دوسرے کاموں میں بھی آتے ہیں سخت سے سخت فلزات و معدنیات کو ریزہ ریزہ کر دینے کیلئے کسی پتہ کا ایک قطرہ وہ قطعیت رکھتا ہے جس کے وجوہ سمجھنے کے لئے عقل معطل ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ فولاد و طلا و نقرہ اور دوسرے جزئیات جو نہایت سخت معدنی اشیا میں بے اصل پتوں کا عصارہ اونکی قلب ماہیت کر کے اون کو خاک بنا دیتا ہے۔ امراض حارہ میں بارد المزاج پتے اکسیر کا حکم رکھتے ہیں اور امراض باردہ میں محرور المزاج پتے تیر بہدف ہوتے ہیں رطب کا تصفیہ یابس سے اور یبس کا تنقیہ رطب سے کیا جاتا ہے مسموم کو ایک پتا کھلا دیا جائے یا اوس کا عصارہ پلا دیا جائے تو وہ فاد زہر اور تریاق ہے اور دوسری جگہ دوسرا پتا خود سم قاتل ہے۔

الحاصل پتا ہی وہ شئے ہے جسکی تلاش و جستجو میں کیمیا کے شوقین اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں اپنے مال و متاع کو برباد کر دیتے ہیں جنگل بیابان اور لق و دق پہاڑوں میں پھرا کرتے ہیں لوگوں کی منت و سماجت اور اون کی غلامی کو فخر سمجھتے ہیں اگرچہ ہوس کی علت غائی حصول زر ہے مگر اس پتے کی تلاش کا ذوق و شغف اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ اپنی متاع اس کے حاصل کرنے میں رائگاں کر دیجاتی ہے الغرض پتے کی کائنات کا ہر گوشہ رنگتوں کی [illegible]

وقایق وحقایق کی جلوہ فرمائیوں غرائب خواص وعجائب قدرت
کی صنعت کاریوں اور اختلاف وتعدد الوان کی نظر فریبیوں
کا ایک بہشت زار جمال اور ایک طلسم عقل وہوش ربا ہے ایک
چھوٹے سے چھوٹے پتے میں بھی حیرت ومدہوشی کے وہ جلوے
پوشیدہ ہیں کہ اگر دنیا کی تمام ماضیہ ومستقبلہ حکمتیں اور دانائیاں
بھی ایک جگہ جمع کردی جائیں اور اس حقیر سے حقیر پتے کی خلقت
و آفرینش پر غور اوس کے طلسماتی اثرات کی تحقیق اسکی تعجب انگیز
کرامات کا تجسس اور اوسکی حیرت آفریں صنعت وتکوین کے نمونہ
کا مطالعہ کیا جائے اوس پر بھی اوس کا دفتر حکمت ختم نہ ہوگا۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

کوثر بلگرامی

(۲)

کامیاب زندگی

دنیا میں کامیابی کا راز ہمت، استقلال، محنت، کوشش اور جفاکشی
وغیرہ میں پوشیدہ ہے انسان اوس وقت تک اپنے ارادوں میں کامیاب
نہیں ہوسکتا جب تک ان چیزوں کو اپنا حقیقی دوست اور سچا
مصاحب نہ سمجھے اور ان سے کام نہ لے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جاہل
سست آدمی ترقی کی بہترین منازل بغیر کوشش وجفاکشی کے
طے کرسکے اور اس خیال کو دل میں جگہ دیدے کہ اگر خدا چاہیگا تو
میری فلاں خواہش بغیر دوڑ دھوپ کے پوری ہوجائیگی۔ خدا نے
عقل، شعور، آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضا
جو عطا کئے ہیں اون کا مصرف یہ ہے کہ ا [illegible]
وقت ان سے مدد کا خواہاں ہو [illegible] بیٹھا رہے
اور اس بات کا متمنی ہو کہ [illegible] اُن آرزوؤں پر فائز
ہوجائے۔ خدا کی قدرت [illegible] ایک ذراسی بات ہے
بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ا [illegible] ہو اُس کے ایک معمولی سے
معمولی اشارہ پر [illegible] سب کے دلی حالات وواقعات
سے بخوبی واقف [illegible] جانتا ہے کہ یہ شخص چاہتا ہے کہ
ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے نہ چلے نہ پھرے بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے
مقصد میں کامیاب ہوجائے یہ کب ممکن ہے خدا ایسے لوگوں
سے ناراض اور اون کی ان عادتوں پر افسوس کرتا ہے اور
اُس وقت تک ان کا ساتھ نہیں دیتا جب تک کہ یہ خود کسی کام
میں اپنی امکانی کوشش اور دوڑ دھوپ سے کام نہیں لیتے ہیں
اور اوس کو اپنی زندگی کا ایک لازمی وواجبی فرض نہیں سمجھتے ہیں
اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے شہرت
وناموری، عزت ووقعت بھروسہ واعتماد اور علم وفضل حاصل
کیا انھوں نے کون سے ایسے غیر معمولی طریقے اختیار کئے تھے
جنکی بدولت آج اون کا نام چاردانگ عالم میں مشہور ہے
اور انھوں نے ہردلعزیزی اور نام ونمود کا سارٹیفکیٹ حاصل
کرلیا ہے بہت سے ایسے مشہور ومعروف لوگ گذرے ہیں
جنکی ابتدائی حالت نہایت خراب تھی مگر اوس حالت وطبیعت
میں ایک آدہ چیز بدشعوری سے خدا نے اون میں ایسی ودیعت
کردی تھی جنکی بدولت ترقی کی دشوار گذار راہیں طے ہوگئیں

ہم کو سبق بایسے ہی لوگوں کے واقعات وحالات سے ملتا ہے
جنکی ابتدائی حالت پر غور کرنے سے اس کا شان وگمان
بھی نہ ہوتا تھا کہ اُن کا آیندہ زمانہ اس قدر کامیاب ثابت
ہوگا مگر خدا کی مدد اور اون کی ہمت وکوشش اور محنت وجفاکشی
کے صلہ میں بیڑا پار ہوگیا اور آج دنیا میں کون ایسا شخص ہے
جو اون کے کارناموں اور اون کے مفید کاموں پر حیرت نہیں کیا
کرتا ہے۔

اگر انسان چند واجبات پر نظر رکھے اور اوسی کو اپنا مال زندگی
سمجھے تو اون کی مدد سے انسان اپنی زندگی کو کامیاب وخوشگوار
بنا سکتا ہے کامیاب زندگی کے لئے علم ہمت اور کوشش وغیرہ
کی سخت ضرورت ہے۔ علم کے ذریعہ سے صنایع قدرت کی شان
کریمی پر نظر رکھ کر ہمہ تن مستعد ہو کر کسی کام کو کرنے کے لئے تل
جاؤ اور ناکامیوں کا جو درمیان میں حایل ہوں مردانہ وار مقابلہ
کرو اور استقلال کو اپنا سچا رہنما تصور کرو اور یہ ذہن نشین کرلو
کہ اگر علم کی لازوال دولت پر قبضہ ہوگیا تو آیندہ زمانے کیلئے
نہایت مفید وموثر ثابت ہوگا کیونکہ علم مفلس کیلئے دولت
اور دولتمند کیلئے مایۂ عزت ہے، علم نوجوانوں کا معاون
ومددگار اور ضعیف کا سہارا و آسرا ہے۔ علم ایسی دولت
ہے جو واقف کاروں اور ہنرمندوں کے ہاتھ میں دنیا کی
منفعت بخش اشیا میں سے ہے۔ لیکن ناعاقبت اندیش اور
ناسمجھ اشخاص کے ہاتھ میں پرلے درجہ کی ضرررساں اور نقصان دہ
شے ہے۔ علم کو اپنی جیبی گھڑی کی طرح جیب میں محفوظ رکھو
اور اسے محض نمود ونمایش کی خاطر باہر نہ نکالو۔ اگر کوئی
وقت دریافت کرے تو بتادو مگر سنتریوں کی طرح ساعت
بہ ساعت اور بلا دریافت وقت کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے پھرو۔

دنیا میں تین قسم کے اشخاص ہیں اول وہ جو ذاتی تجربوں اور
آزمایشوں سے سبق حاصل کرتے ہیں یہ عقیل وفہیم ہوتے ہیں۔
دوم وہ جو غیروں کے تجربہ سے مستفید ہوتے ہیں یہ خوش وخرم
رہتے ہیں سوم وہ جو نہ ذاتی تجربوں سے نہ غیروں کے تجربے سے
عقل حاصل کرتے ہیں یہ بیوقوف واحمق ہوتے ہیں علم کی
تحصیل اگر صحیح طریق سے کی جائے تو اس سے نوجوان آدمی
صاحب غور وفکر توجہ کے عادی، محنت کش اعتماد نفس کے
خوگر اور ہوشیار ومحتاط ہوجاتے ہیں اور ضعیف آدمی
ہشاش بشاش اور نفع رساں بن جاتے ہیں۔ علم خوشحالی
میں زیور تنگ حالی میں ماوا وملجا اور ہر حال میں ایک طرح کی
تفریح ہے یہ عالم تنہائی میں شاداں وفرحاں رکھتا ہے اور ہر
حالت میں اعتدال و دانشمندی بخشتا ہے جو لوگ دنیائے علم میں
ہل من مزید کے قایل اور ہر آن علم کی جستجو میں رہتے ہیں انھیں مزید
علم حاصل ہوتا ہے اور جس قدر زیادہ تلاش کرتے ہیں اسی قدر زیادہ
اُن کا دامن تمنا گوہر علم سے بھر جاتا ہے ایسے لوگ اون خوش قسمت
اشخاص کے زمرہ میں ہیں جو ہر وقت کچھ دیتے اور لیتے رہتے ہیں
داد وستد کا یہ مدوجزر ہی انسانی خوشی کا ماحصل ہے جسکی نشاط
انگیز کیفیت سے وہی آشنا ہوسکتا ہے جو تحصیل علم کا خواہاں
ہو۔ علم عقل اور آنکھ کا ایک ایسا نور ہے جو آنکھ سے پوشیدہ چیزوں
کو نہایت آسانی سے دکھا دیتا ہے۔ خدا کو کسی نے نہیں دیکھا
مگر عقل سے پہچانا ہے۔ جب تک انسان علم کے زیور سے آراستہ
نہ ہو اوس کا وجود بے بنیاد اور بے سود ہے۔

دوسری چیزیں جو کامیاب وکامگار کردیتی ہیں وہ عمدہ اخلاق
وعادات اور دیانت داری راستبازی ہیں یہ چیزیں ایسی
بے بہا اور انمول ہیں جنکی دنیا میں قیمت ہی نہیں ہے اون

سے دنیوی کاروبار میں سہولت کے علاوہ آخرت میں بھی نجات حاصل ہوتی ہے اور انجام کار یہ بیش بہا جواہر اپنی سچائی و اصلیت کا رنگ ظاہر کئے بغیر نہیں رہتے۔

دریا میں وہی شخص آگے بڑھتا ہے جو اپنے سینے اور بازوؤں کی طاقت سے اپنے لئے راستہ نکالتا ہے بیشک بعض وقت خوش قسمت لوگ ایسے ہی حالات میں پیدا ہوے ہیں کہ انھیں ابتدائے عمر سے عزت و دولت حاصل کرنے کے وسایل میسر تھے تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانہ کے لوگوں کی زندگی نہایت عیش و عشرت سے بسر ہوتی تھی وہ رنج و دکھ سے ناواقف ہوتے تھے اگر دکھ درد نے اتفاقاً اپنی منحوس صورت بھی دکھائی تو وہ لوگ شیروں کی طرح مقابلہ کیلئے تیار ہوجاتے تھے۔ مگر ہماری ہمتیں کمزور اور خیالات پست ہیں اس کا خیال بھولے سے بھی نہ کرنا چاہئے کہ ہم جس منزل پر پہونچنا چاہتے ہیں اوس کا راستہ مہینوں برسوں کا ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ راستہ طے بھی نہ کیا جائیگا اور ساحل مقصود پر پہونچنے کی جلدی بھی ہو ہم کو چاہئے کہ ان منزلوں کو مستعدی کے ساتھ طے کریں اور راستہ کے قرب و بُعد کا خیال نہ کریں۔

وہ راہیں جن میں اگلے لوگ مسافرت کرکے منزل مقصود پر پہونچ گئے ہیں اب تک کھلی ہوی ہیں اگر ہم اون سیاحوں کے قدم بقدم چلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی وہاں تک پہونچ نہ جائیں بفرض محال اگر وہاں تک قدموں نے نہ ساتھ دیا جہاں انکی رسائی تھی تو جہاں تک ہم پہنچ سکیں وہ ہمارے لئے کچھ کم منفعت بخش نہ ہوگا۔ دنیا میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں کہ اگر اُن کے خیالات کو ہم اپنے دماغ میں جگہ دیدیں تو ہم انھیں کے سے ہوجائیں گے۔

دنیا کے سربرآوردہ لوگوں نے اکثر نہایت غربت و فلاکت کی حالت سے بلند مرتبوں تک ترقی کی تھی۔ نپولین اعظم امیر تیمور اور نادرشاہ وغیرہ کے واقعات ہر ایک تاریخ پڑھنے والے کو معلوم ہیں اور اینڈرو کارنیگی و مسٹر سیسل روڈز آنجہانی کے ناموں سے بھی لوگوں کے کان آشنا ہیں۔ لیکن اس وقت ایسے اور کئی اصحاب موجود ہیں جنکے نام زبان زد خاص و عام ہے لیکن انکی ابتدائی تنگی و پریشانی سے ہم ناواقف ہیں مثلاً ٹامس لپٹن مشہور تاجر چائے جو چار دفعہ کئی کئی لاکھ روپیہ کے خرچ سے کشتیاں بنوا کر امریکہ کی مشہور بحری وارڈ میں حصہ لے چکے ہیں۔ پہلے پہل نصف کراون (عہ) فی ہفتہ کی تنخواہ پر ایک دُکان میں سامان اٹھانے اور خطوط رسانی کی نوکری کر چکے ہیں امریکہ کے مشہور موجد و ماہر علم البرق مسٹر ایڈیسن آج اپنی ایجادات کی بدولت والیان ریاست کی برابر آمدنی رکھتے ہیں لیکن انھوں نے ریلوے ٹرین پر اخبار بیچنے والے لڑکے کی حیثیت سے اوقات بسر کرنی شروع کی تھی اور بعد ازاں تارگھر میں ملازم ہوے۔ سر ہیرام مکسیم۔ جنکی کلدار توپیں اس وقت لڑائی میں ہزارہا انسانوں کا صفایا کر رہی ہیں ۶۰ برس پہلے نیوانگلینڈ کی جھاڑیوں میں ننگے پاؤں پھرنے والے لڑکے کی طرح گشت لگاتے اور گاڑی سازی کی دُکان میں خراد کا پہیہ پھراتے تھے۔

لارڈ ریڈنگ لارڈ چیف جسٹس لڑکپن میں جہاز پر ادنی حیثیت سے ملازم ہوگئے تھے اور اپنی پہلی تقریر انھوں نے کپتان جہاز کے روبرو کی تھی جبکہ سب لوگوں نے برا کھانا ملنے کیوجہ سے کام کرنا چھوڑ دیا تھا وہ اپنی اس پہلی وکالت میں کامیاب ہوے اور جہازیوں کو اچھی خوراک ملنے لگی۔

برطانیہ کے لارڈ چانسلر لارڈ ہلڈین اور اونکے بھائی لارڈ سوڈیل

نیوکیسل کے ایک کوئلہ والے کے لڑکے تھے۔
لارڈ سینٹ لیونارڈ ایک ایسے شخص کے بیٹے تھے جس نے لنکن
میں حجامت بنانے کی دکان کھول رکھی تھی اور لارڈ ٹینٹرڈن
تو زمانہ طفولیت میں اپنے باپ کو ایک ایک آنہ اجرت پر
لوگوں کا خط بنانے میں مدد دیتے تھے۔

مندرجہ بالا واقعات کے پڑھنے سے دل سے انکی قابل رشک
کامیابیوں پر بے ساختہ مبارکباد نکلتی ہے اور اونکی ہمت و
جرارت پر صدائے تحسین و آفرین بلند ہوتی ہے اور ہمارے
دل میں اس بات کا جوش پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی ان کے نقش
قدم پر چلیں اس لئے کہ اون لوگوں نے صرف اپنی ذاتی محنت
و قابلیت سے ترقی کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی انھیں ذرایع
سے کام لیکر ترقی نہ کریں بے محل نہ ہوگا اگر میں اسی قسم کے ایک
اور واقعہ کا ذکر کروں کہ ایک غریب لوہار کا لڑکا کیونکر
وزارت کی جلیل القدر کرسی پر متمکن ہوگیا۔ خدا انھیں کی مدد
کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس لوہا
کے لڑکے نے اپنی عزیز زندگی کو کامیاب بنا کر چھوڑا۔
۴۰ سال قبل شہر گلاسگو کے بازاروں میں ایک غریب لوہا ڈھا
والا لڑکا پھرا کرتا تھا آج وہ لوہا ڈھالنے والا لڑکا زندگی
کے کئی مرحلوں سے گزر کر اور واقعات کی کئی منزلیں طے
کرکے باون سال کا معمر انسان ہے آج وہ برطانیہ کے پولیٹکل
حلقوں میں خاص شہرت و امتیاز رکھتا ہے اور گورنمنٹ کا
مرکزی رکن ہے اس کا نام آرتھر ہنڈرسن ہے۔ مسٹر ہنڈرسن
نے ترقی کے راستے میں لمبی لمبی چھلانگوں سے کام نہیں لیا بلکہ
وہ بتدریج ترقیوں کی ایک روشن اور زندہ مثال ہے اس کا
قدم ترقی کے زینہ کے ہر ایک ڈنڈے اور سیڑھی سے گزرا ہے
اور آخر کار اب وہ بام شہرت پر جلوہ گر ہے اس کو کسی غیبی
طاقت نے امداد نہیں دی بلکہ اس نے محض اپنی طاقت اور
اپنی قابلیت کے دیر میں ظاہر ہونے والے نتایج کا مفید پھل
پایا ہے پہلے وہ آہستہ آہستہ نیوکیسل کی سٹی کونسل، ڈارلنگٹن،
برگ کی کونسل اور مزدوروں کی انجمن وغیرہ میں داخل ہوا
اور وہاں سے پارلیمنٹ میں جا پہونچا وہ کسی خاندانی حقوق
کے سبب سے پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہوا بلکہ اپنی سرگرمیوں کے
باعث اس بلند مرتبہ پر پہونچا پھر وہ حاکم شہر بنایا گیا غرضکہ
اوس نے اپنی زندگی میں مختلف اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کئے۔
ان سب فرایض کی انجام دہی کوئی معمولی کام نہ تھا آخر کار وہ
اپنی زور دار کوششوں اور قابل رشک محنتوں سے ایک روز
پریوی کونسل میں داخل ہوگیا اور شاندار تقریریں کیں اس شخص
کی شخصیت کا پتا اسکی کامیابیوں سے لگ سکتا ہے۔ اسکی
تقریر اور اس سے بات چیت کرنے سے یہ امر ذہن نشین ہوجاتا
تھا کہ اس میں قدرت کی عطا کی ہوی وہ لازوال طاقت موجود
ہے جو عبارت ہے مستحکم ارادے، عمدہ چال چلن، پختہ مقصد،
عمدہ خصلت و عادت، راستی و راستبازی، اتحاد و اعتماد،
تحریر و تقریر، تحمل و برداشت اور دیانت کی طاقت سے غرضکہ
ان خداداد طاقتوں نے اوس کے حوصلوں کو بلند کرکے خیالات
میں بلند پروازی کا مادہ پیدا کردیا تھا۔

دنیا میں ہزاروں لوگ ایسے موجود ہیں جو بتدریج کامیابی حاصل
کرنے کے خواہاں ہونگے جو لوگ اس پر عملدرآمد کرنے پر مستعد
ہیں اون کو چاہئے کہ کمر ہمت باندھ لیں اور کاہلی و سہل انگاری
کو خیرباد کہکر کسی مفید کام میں کوشش شروع کریں لیکن پوری
تندہی ہمت جرارت اور پورے استقلال و ثبات قدم کے ساتھ

اگر وہ ایسا کرینگے تو انھیں یقیناً کامیابی کا بہترین ثمرہ حاصل ہوگیا اور اون کا دامن مقصد موتیوں سے لبریز ہوجائیگا۔ کیونکہ خدا کسی کی محنت وکوشش کو رائیگاں نہیں کرتا اگر کوشش ومحنت میں ذرا بھی کمی نہ رہے اپنے ارادے میں پختگی اور اپنے خیالات میں دلجمعی پیدا کرو پھر دیکھو کہ پردہ خفا سے کیسے کیسے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔

دنیا ترقی کررہی ہے اور تم کو بلاتی ہے کہ آؤ اس میں شرکت کرو ہمارا ہاتھ بٹاو ہمارے سے ہوجاؤ، ہمارے ہم خیال ہو، محنت کرو، کوشش کرو، اور خدا کی ذات پر سوتے جاگتے بھروسہ واعتماد کرو، اپنے عقیدہ کو حد یقین تک پہونچا دو۔ پھر دیکھو خدا تمھاری کیسی مدد کرتا ہے۔ اور تم کامیابی کا سہرا کس طرح سر پر بندھوا لوگے۔ صانع قدرت کی نیرنگیاں۔ بزرگان سلف کی لکھی ہوئی تاریخیں بہ آواز بلند پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اے غفلت پرست انسان کیا تو کامیاب زندگی کا متلاشی ہے؟ کیا تو حیات جاودانی کا طالب ہے؟ کیا تیری یہ خواہش ہے کہ آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے تیرے کارناموں کی فہرست کارآمد ہو اگر واقعی تیرا ایسا خیال ہے تو دوسرے کی اعانت اپنے لئے باعث ننگ سمجھ۔ کمر ہمت کو مضبوطی سے کس لے میدان میں بلاخوف وخطر قدم رکھ اور اپنی مدد آپ کر اور پھر نیرنگی قدرت کا اپنی آنکھوں سے تماشا دیکھ۔ تجھ کو خود ہی معلوم ہوجائیگا کہ تیرے مستقل ارادوں نے تیری زندگی کو کامیاب بنانے میں کس قدر حصہ لیا ہے۔

تم پر لازم ہے کہ ثابت قدمی اور استقلال کا طرز اختیار کرو امور مذہبی میں سرگرم رہو، قول وفعل میں مطابقت پیدا کرو فرض کی پابندی، راستبازی ایثار اور اعتبار واتحاد کے خیالات زندگی کے کل امور پر پورے طور سے حاوی ہیں راستبازی، دیانت داری اور پرہیزگاری ایسے صفات نہیں ہیں جو انسان کو بے منت حاصل ہوجائیں وہ خوش نصیب شخص جس کی ذات میں یہ ستودہ صفات مرضی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ جمع ہوجائیں وہ ایک ایسی غیر معمولی طاقت کا حاکم بن جاتا ہے جس کے زور واثر کو مان لینا ضروری ہے

کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لئے اس امر کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اصلی وحقیقی کامیابی کہتے کس کو ہیں بعض لوگوں کے نزدیک کامیاب وہ شخص ہے جو بڑا زمیندار اور جس کے پاس بے قیاس دولت ہو اور اوس کے پاس امیرانہ ٹھاٹھ کے جملہ سامان بکثرت موجود ہوں اور وہ ایک بہت بڑے عالیشان محل میں رہتا ہو اور شب و روز اوس کے یہاں سونے چاندی کی ریل پیل ہو۔ گاڑی، گھوڑے موٹر، ہاتھی اور نوکر چاکر غرضکہ وہ تمام چیزیں جنکی موجودگی ایک امیر کے یہاں لازمی ہیں مہیا ہوں۔

اصلی وحقیقی کامیابی ایک ایسی زندگی سے پیدا ہوسکتی ہے جس میں فرض کی ادائی اور اچھے ونفیس اصول کی پابندی کا اوس کے دل میں ہر وقت خیال رہے فرض کی ادائی اور عادت کے درست کرنے میں اس نے مصیبتیں اٹھائی ہوں سخت سے سخت خطرات کا جوانمردی سے مقابلہ کیا ہو جس نے استقلال وہمت سے ایک کام کی بجا آوری میں لگاتار کوشش کی ہو اور جس نے اپنے اوس ایک ہی خیال وارادے کو دل میں جگہ دی ہو اور دوسرے خیال کو دل میں جگہ دینا مناسب نہ سمجھا ہو ایک ہی خیال کے مختلف پہلوؤں پر نظر تعمق ڈالنے اور اون کو سوچنے میں اپنا وقت صرف کردیتا ہو جس نے کبھی ایسا کام نہ کیا ہو جس کا آخری انجام باعث خیالات شرمناک ہو

ہو جو اپنی کمزوریوں پر نظر ڈالتا اور اوس کے دور کرنے کی کوشش
کرتا ہو اور جو بہترین خیالات اور پاکیزہ عادات کا تابع ہو
اوس کی زندگی قطعی ناکامیاب نہیں رہ سکتی۔

ایک ایسا مدعا قرار دینے کے بعد جس میں کسی کی کوشش صرف ہو سکتی
ہو اوس کے حاصل کرنے میں اپنی تمام طاقت لگا دو اور تمام
ضروری و جائز وسایل مثل دیانتداری، راستبازی، خودداری
سرگرمی، اخلاقی جرات کو دل کھولکر صرف کرو تاکہ ان چیزوں
سے تمہارا مدعا، دلی حاصل ہو اور تم کو اپنے سچے اور جائز ارادے
میں کامیابی ہو۔

کچھ شبہہ نہیں کہ راہ زندگی بہ کامیابی و عزت طے کرنے کے لئے
اون لوگوں کے سفرنامے اور اون لوگوں کے حالات نہایت
مفید اور بکار آمد ثابت ہوتے ہیں جو ہوشیار اور ممتاز رہ نورد
اور اپنے ملک و قوم کے ایک درخشان زیور خیال کئے گئے ہیں
کیونکہ ان کی مثالوں سے دل میں جوش اور عمدہ طریقہ سے زندگی
بسر کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے بلاشبہہ وہ سچے اور عبرت خیز
واقعات جو کسی بہت بڑے ہیرو کی زندگی کا نتیجہ ہیں ہمارے
واسطے اوسی قدر مفید اور کارآمد ہیں جس قدر کہ کسی محترم بزرگ
سے شرف قدمبوسی بلکہ ایسے واجب التکریم لوگوں کی تصویریں
ایسا اثر رکھتی ہیں کہ اون کے دیکھنے سے ایک باریک بین شخص
کو اون کے تدبر، اون کے اخلاق و عادات، اون کے چال
وچلن اون کا علم و فضل اور اون کے حرکات و سکنات کا
آسانی سے پتہ چل جاتا ہے جس سے دل میں جوش و ترقی
کی امنگیں اٹھتی ہیں غرضکہ اچھے لوگوں کے اقوال و افعال
نہایت ہی بیش قیمت اور قابل قدر ہوتے ہیں۔

زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے
گفتگو ایسی نہ کرو جو دوسروں کو بری معلوم ہو یا اوس سے
کسی کی دل شکنی ہو۔ کسی کی بدقسمتی پر مضحکہ نہ اڑاؤ اور کسی کی
خوش قسمتی پر ملول و رنجیدہ نہ ہو۔ عاجزوں، مفلسوں، محتاجوں
کے طرفدار رہو، جو مدد کا مستحق ہو اسکے ساتھ سلوک کرو۔ مفید ہوتی
اور اچھے وقت کو ضایع نہ کرو۔ شایستگی او سنجیدگی کو اپنی طبیعت کا
ایک جزو لاینفک بنالو انسانی بزرگی کے اہم اجزا کو اپنا ہمراز
بناؤ۔ مستقل مزاجی، ہمدردی، بردباری، خودداری وغیرہ ایسی
چیزیں ہیں کہ ان چیزوں سے خود فائدہ اٹھانا چاہیئے اور
اپنے ابنائے وطن کو اس طرف مایل اور کاربند ہونے کی ترغیب
دلانا چاہیئے تاکہ وہ ان مفید اور کارآمد باتوں کے شروع ہی
سے عادی ہو کر آخر عمر میں انکے مفید ثمرات سے بہرہ مند ہوں فقط

ایڈیٹر

جذبات اکبر

بڑھاتا جاتا ہی ضعف بازو آہستہ آہستہ — لئے جاتی ہی پیری سوئے گور آہستہ آہستہ

تمھاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھکو — سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہی جو آہستہ آہستہ

ہمارے باب میں ہوتی ہے گفتگو کیا کیا

نواب عماد الملک بہادر بالقابہ کے مضمونوں پر آپنے مجھے رائے
طلب کی ہے حقیقت امر یہ ہے کہ یہ دونوں مضمون ادبیات
اردو کا نادر نمونہ ہیں رسالہ حسن کے بعد یہ فخر آپ کے
رسالہ کے لئے اُٹھ رہا تھا معاصرین رشک کرتے ہیں تو جا ہے ہے
اقبال و ادبار کا وسواس لوگوں کے دلوں میں ڈاروں کے
اصول سے وراثتاً چلا آتا ہے قدیم زمانہ میں کلدانی و یونانی
و رومی مشتری کو اقبال کا ستارہ اور زحل کو ادبار کا ستارہ
سمجھ کر دونوں کی پرستش کرتے تھے وہ قومیں تو فنا ہو گئیں
لیکن برا ہمہ ہند میں جس طرح چہروں کو چندن سے یا سیندور سے
چیتنا زمانہ قدیم کی بڑی نشانی ابھی تک باقی رہ گئی ہے اسی طرح
برہسپت او سنیچر کو اقبال و ادبار کا ستارہ سمجھنا اُن کے عقاید
میں آج تک داخل ہے جس قوم میں کوئی عقیدہ پشتہا پشت تک
راسخ چلا آتا ہو وہ کسی مذہب کے مٹائے نہیں مٹ سکتا یورپ
میں اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ فلسفہ افلاطونی کی تثلیث
یورپ والوں کے دلوں میں اس طرح اوتر گئی تھی کہ مذہب عیسائی
اوسے نہ مٹا سکا اسی تثلیث افلاطونی نے توحید فی التثلیث
کی شکل میں جنم لیا۔ بس اسی طرح اقبال و ادبار کے عقیدہ نے
اہل اسلام میں مقدرات باری تعالی کا برن بدلا عقلا کا بڑا اعتراض
اس عقیدہ پر یہ ہے کہ اقبال جسے تم کہتے ہو اوس کے حاصل
کرنے میں جد و جہد شرط ہے واذا فات الشرط فات
المشروط ترک سعی کرکے تم خود ادبار میں مبتلا ہوتے ہو ع

جہد کن پس تکیہ بر جبار کن

اپنے بعض احباب کا یہ فیصلہ مجھے پسند آیا کہ مقدرات باری تعالی کے
تجویز عقل ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ اوس کے حاصل کرنے
میں نماز و دعا کی شرط لگی ہوی ہو اور تم تارک صلوۃ ہو کر
اوس نعمت سے محروم رہتے ہو۔

امریکہ کا ایک مشہور شاعر و نثار امرسن کہتا ہے کہ اگر تقدیر
پر تم کو بھروسہ ہے تو جاو خطرات صعب میں اپنے کو ڈال دو
اور فرایض کو اپنے ادا کرو اگر تمھارا یہ اعتقاد ہے کہ مصایب کا
سامنا تقدیر کے سبب سے ہے تو یہی اعتقاد رکھنا چاہئے کہ
تمھاری بہتری کا سامان بھی تقدیر ہی سے ہو جائیگا یعنے اپنے
فرایض کے ادا کرنے میں خطرات و مہالک سے تم کیوں جان
بچاتے ہو اب کیوں نہیں تقدیر پر بھروسہ کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ جہلائے اہل اسلام میں اقبال و ادبار کے
عقیدہ نے شرک خفی کی صورت پیدا کی ہے اور کسی کو تنبیہ نہیں
شرک خفی کا یہ خاصہ ہے کہ مسلم کو اس طرح مشرک بنا دیتا ہے
کہ اوسے خبر بھی نہیں ہوتی۔

ایک عارف کا یہ قول حیرت انگیز ہے لوگوں نے اوس سے پوچھا
کہ اہل شہر کی صحبت سے اجتناب کرکے آپ نے اس ویرانہ میں
زاویۂ عزلت کیوں اختیار کیا۔ اُس نے کہا مجھے یہ خوف ہوا
کہیں اون لوگوں کی صحبت میں میرا ایمان نہ جاتا رہے
اور مجھے خبر بھی نہ ہو۔

راستی وراستبازی کا بیان تو شروع سے آخر تک ایک سحر ہے۔ نواب صاحب نے اس تحریر میں مضامین کی ترتیب ایسی کی ہے کہ مجھے تو حیرت ہوتی ہے ایک سے ایک مضمون بڑھتا چلا جاتا ہے راست بازوں کے رفتار وگفتار کے مطابق ہونے کو ایک کشمیری شاعر نے بھی خوب کہا ہے غنی؎

ہمی باشد موافق قول وفعل راستان باہم
کہ گفتار قلم باشد ز رفتار قلم پیدا

اس شعر کے سامنے سعدی کا یہ سیدھا سادہ مصرع

راستی موجب رضائے خداست

بڑھیوں کی نصیحت کی طرح پھیکا پڑ گیا بے مزہ ہو گیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تلخ معلوم ہونے لگا غنی نے قول کا فعل سے مطابق ہونا ایک تشبیہ دیکر کیا دل نشین کر دیا آنکھوں سے دکھا دیا کہ دیکھو راستی وراستبازی اسے کہتے ہیں۔

معتزلہ کی طرح جو لوگ کہ حسن وقبح عقلی کے قائل ہیں وہ پہلی مثال یہی پیش کرتے ہیں۔

الحسن والقبح فی الافعال عقلیان کالحسن الصدق وقبح الکذب

یعنے راستی کی خوبی بدیہیات عقلی سے ہے اس پر دلیل کی ضرورت نہیں نہ کسی نص کی حاجت ہے غرض راستی کے سیرۃ فاضلہ ہونے میں شک نہیں مگر زمانہ اس طرح کا ہے کہ جھوٹے کے آگے سچا رو مرے۔

استاذ ابو ریحان بیرونی کتاب الہند میں براہمہ کے اصول عقوبات وکفارات کے بیان میں لکھتے ہیں۔ صفحہ ۲۸۰۔ اون کا

حال نصرانیۃ کی حالت سے　　مثال الحال فیہم علی
مشابہہ ہے اوسکی بنا خیر پر　　شبیہ بحال النصرانیۃ
اور دفع شر پر ہے قتل کسی　　فانہا مبنیۃ علی الخیر
حالت میں نہ کرنا جو چادر چھین　　وکشف الشر من ترک
لے گیا ہو قمیص بھی اس کے　　القتل اصلا و دفع
آگے ڈال دینا جس نے ایک　　القمیص خلف عاصب
گال پر تماچہ مارا ہو دوسرا　　الطیلسان وتمکین لاطم
گال بھی اوس کے سامنے　　الخد من الخد الاخری
کر دینا۔ دشمن کیلئے دعائے　　والدعا للعدو بالخیر
خیر ورحمت خدا کا طالب ہونا　　والصلوۃ علیہ وھیہ
اور بخدا یہ سیرت فاضلہ ہے　　لعمری سیرۃ فاضلۃ
لیکن دنیا کے تمام لوگ فلسفی نہیں　　ولکن اھل الدنیا لیسوا
ہوتے زیادہ اون میں جاہل　　بفلاسفۃ کلھم وانما
وگمراہ ہیں جو تیغ وتازیانہ　　اکثرھم جھال ضلال
بغیر سیدھے نہیں ہو سکتے۔　　لا یقومہم غیر السیف والسوط

زمانہ ایسا جھوٹا ہے کہ میں لاکھ لاکھ کہوں کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں مگر دنیا کے لوگ یہی کہے جائینگے کہ چل ہم خوش آمد کی باتیں خوب سمجھتے ہیں ہاں اب یورپ کے فلاسفہ بھی اس کے قایل ہوتے جاتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں راستی وراستبازی کا دور ہوگا مریض کو کونین شیریں معلوم ہوگی مٹھائی سے منہ کڑوا ہو جائیگا۔ اس خیر وبرکت کے زمانہ کی خبریں تمام دنیا کے انبیا نے الہام ووحی کے ذریعہ سے ہزاروں برس پیشتر اپنی اپنی امت کو پہنچا دی ہیں جس کا انتظار ہر فرقہ میں پایا جاتا ہے۔ خدا وہ دن دیکھنا ہم کو نصیب کرے۔

ان تحریروں کو میں اردو کا بہتر سے بہتر نمونہ سمجھتا ہوں جس نمونہ کی اہل ملک کو بہت ضرورت ہے آنکھیں کھول کر اسے دیکھیں اور سمجھیں کہ یہ کیا چیز ہے آپ نے یہ مثل سنی ہوگی

کہ تعرف الاشیاء باضدادہا۔ دو متضاد چیزوں کے مقابلہ سے حسن و قبح ہر ایک کا خوب معلوم ہوتا ہے دو ایک فقرے قدیم طرز کے سنئے جو اہل زبان کے قلم سے نکلے ہیں۔ اور انصاف کیجیے۔

"بد رویگی کے نشانات کو چھپا رکھنا بمنزلہ دہوکہ دہی کرنے کے ہے اعلیحضرت نے بخریدی اشیاء بالیتی تین لاکھ روپیہ۔ نمایشگاہ کلکتہ کی سرپرستی فرمائی"

اس طرز تحریر کی رکاکت پر جن لوگوں کو تنبہ ہوا انھوں نے دوسرا راستہ اب اختیار کیا ہے جسے شاہراہ عام کہوں تو بجا ہے مثلاً میرے نقطۂ خیال سے موجودہ زمانہ کی اسلامی دنیا کے تمامی مصنفوں میں عملی طور سے دو شخص قریباً بہت مشہور ہوئے۔ ایک نے سعدی کی حیات تصنیف کی ایک نے المامون کی زندگی لکھی اول الذکر شمس العلما حالی ہیں۔ آخر الذکر شمس العلما شبلی۔

دونوں کے دونوں طرز اس قدر پوچ اور لچر ہیں کہ زیادہ مثالیں نہیں دے سکتا ایسا نہ ہو کہ جی متلا جائے جیسے اسرار البلاغہ میں متوکل کی ایک نقل لکھی ہے کہ بحتری نے اس کے سامنے قصیدہ پڑھنا شروع کیا قافیہ تھا یذ لعہا۔ یشعہا منیعہا پڑھ چکا تو خلیفہ نے کہا عہا عہا عہا سنتے سنتے میرا جی متلا گیا مصنف نے تو متوکل کی نافہمی و ناشناسی پر ملامت کی ہے مگر میں اس نازک مزاجی کی داد دیتا ہوں عہا عہا عہا کے ابکای لینے کی آواز ہے جسے مصنف نہیں سمجھا۔

غرض اس افتخار کے علاوہ رسالہ **ذخیرہ** تک سکہ سے درست ہے دارالامارہ حیدرآباد سے ایسے ایک رسالہ کے جاری ہونے کی بہت ضرورت تھی خدا کرے چل جائے۔

علی حیدر طباطبائی

بھول گئے

(ہز اکسلنسی راجۂ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی۔ ای شاد بالقابہم)

آنکھ کو اسکی جو دیکھا تو ہرن بھول گئے
قد کو دیکھا تو سہی سرو چمن بھول گئے

رخ کو دیکھا جو ترے رنگ چمن بھول گئے
زلف کو دیکھ کے سب پیچ شکن بھول گئے

آکے دنیا میں ہوئے محو تغافل ایسے
ای غریب الوطنی اپنا وطن بھول گئے

عیش و عشرت کے جو سامان میسر آئے
علم کو چھوڑ دیا جتنے تھے فن بھول گئے

غیر کے ہو رہے اپنا اسے سمجھا افسوس
اور اپنوں کو تم اے شفق من بھول گئے

تازہ مے ہے نئی محفل ہے نیا ساقی ہے
اب تو وہ صحبت یاران کہن بھول گئے

خوگر کنج قفس ہائے اسیری نے کیا
اک زمانہ ہوا گلگشت چمن بھول گئے

ترے چہرے کی وہ سرخی کہ شفق پھولی ہے
جب سے دیکھا ہے ہم لعل یمن بھول گئے

سادگی عالم طفلی کی کہاں ہے باقی
اب جو ان ہو گئے بیساختہ پن بھول گئے

چشم مستانۂ ساقی ترے صدقے جاؤں
عہد و پیمان ترے سب بد شکن بھول گئے

ایک ہی ایک ان آنکھوں سے نظر آتا ہے
مرے آنکھوں کی قسم گنگ و جمن بھول گئے

اب کہاں یوسف مصری ہے زلیخا ہے کہاں
کس کی چاہت رہی اب چاہ ذقن بھول گئے

یہ خموشی بھی تمہاری ہے ترا اے گلرو
بات کرنا بھی ہم اے غنچہ دہن بھول گئے

ہائے وہ درد کہاں اور کہاں سوز جگر
وہ تپش بھول گئے دل کی لگن بھول گئے

عاشقی کے ہوئے چرچے جو تمہارے شاد
لوگ افسانۂ لیلےٰ و دمن بھول گئے

شعبدۂ کون و فساد

دیکھے جو تو نے عالم فانی کے شعبدے
بس محو ہو گیا اسی نقش و نگار میں

ہر اک طلسم بوقلموں گنبد فلک
بہروپ سو طرح کے ہیں لیل و نہار میں

ایک آب و گل سے دونوں کا نشو و نما ہوا
تو جانتا ہے فرق ہے گل اور خار میں

خوش ہو رہا ہے دیکھ کے لالہ کے رنگ کو
سوجھی تجھے بہار دل داغدار میں

یہ نقص ہے نظر کا جو سمجھے ہوئے ہے تو — افسردگی خزاں میں ہے نزہت بہار میں

او بے خبر خبر بھی ہے بجتے ہیں تیرے کان — بربط میں نغمہ ہے نہ ترانہ ستار میں

غفلت میں عمر کٹ گئی آیا تجھے نہ ہوش — گزرا شباب نشہ میں پیری خمار میں

دست ہوس کو اور بھی تو نے کیا دراز — لٹکا دئے جو پاؤں اجل نے مزار میں

انسان میں کیا ہے دل ہے فقط یا زباں ہے — تیری نہ ہے زبان، نہ دل اختیار میں

اپنی نظر میں جو نہ سمایا یہ جان لے — رسوا وہ ہو گیا سر محفل ہزار میں

کوچۂ صفائے دل کا وہ تو اختیار کر — گرد ملال تک نہ ہو جس رہگزار میں

ہر امر میں وقار و تحمل سے کام لے — لاکھوں خرابیاں ہیں اسی اضطرار میں

آہستگی سے موج صبا نے لیا جو کام — ناخن اتر گیا گرہ استوار میں

لازم ہے ایک دو سے بھی اسکو بیان کر — جو بات منہ پہ لا نہیں سکتا ہے چار میں

ناموس کا لحاظ کیا احتیاط کو — عزم بلند کیا ہو کسی ہرزہ کار میں

ہر طرح راستباز ہیں جو راستباز ہیں — پہلو نہیں کوئی گہر شاہوار میں

ہو بات کے کھرے ہیں نہیں ان کے قول کچھ — جس طرح سے کہ کھوٹ زر کامل عیار میں

تنہا ہے وہ جہان میں جس زود رنج ہے — عالم کو دفن کر دیا دل کے غبار میں

کرتے نہیں زبان کو خبر دل کے راز سے — لیتے نہیں ہیں نام چھری کا شکار میں

عزم درست وجوہر قابل ہم ہیں موجب — پھر دیر کچھ نہیں مدد کردگار میں

انساں وہ ہے کہ ظاہر و باطن ہو ایک سا — بے جا ہے امتیاز شعار و دثار میں

فتح و شکست ملک سخن ہے اسی کے نام — جسکی زباں ہو تیغ برہنہ ہزار میں

دو دن کی زندگی پہ مناسب نہیں غرور — انساں پہ تین دن ہیں بھاری مزار میں

جو آج زیر خاک ہوا کل تک اس کا جسم — تقسیم ہو گیا دہن مور و مار میں

شاہ و گدا کا موت میں کچھ تفرقہ نہیں — ہے خاک پر کہ قصر جواہر نگار میں

دیکھا کہ گرد شہر خموشاں سے جب اٹھی — گشتی ہوئی فقیر میاں و شہریار میں

کیا اعتبار لذت دنیا کی دو دل ل — لبریز جام مئے ہے کف رعشہ دار میں

تو او زندگانی فانی پہ اعتماد؟ — اک تار ہے نفس کا بھلا کس شمار میں

کہتے ہیں جسکو گنبد گردندہ سپہر — وہ ایک گرد باد ہے اس رہگزار میں

علی حیدر طباطبائی

بہار کا آخری پھول

صحن گلشن میں سراپائے غم و حرماں ہوں میں — ہستی حسرت نما ہوں بے سر و ساماں ہوں میں

ہو چکا ہے منتشر شیرازۂ ہستی مرا — ہے مخالف آج کل میرے زمانہ کی ہوا

کشتۂ دست خزاں پامال خشک و تر ہوں میں — انکشاف رنج ہستی ہوں سراپا درد ہوں

نقش کاغذ کی طرح اک ہستی بے مایہ ہوں — شام کی ہستی ہوں میں ڈھلتا ہوا سایہ ہوں

کر چکا برباد مجھ کو انتشار زندگی — ہے سراپا غم مری صبح بہار زندگی

ناز بیجا پر ہوئی کتنی پشیمانی مجھے — چھیڑتی ہے آہ رہ رہ کر پریشانی مجھے

میں کہ تھا زینت دہ گلزار جواں ایک دن — میں کہ تھا فانوس بزم باغ امکاں ایک دن

دست گلچیں کا نہ ڈر تھا اور نہ کچھ خوف خزاں — میری شادابی سے تھا گلزار صحن بوستاں

بلبلوں کا نغمۂ جوش مسرت مجھ سے تھا — وہ تماشائے نیاز و ناز الفت مجھ سے تھا

دست نازک زلف عنبر فام مسکن تھا مرا — عطر پاش و کو مشام آئینہ دامن تھا مرا

اب نہ وہ میں ہوں نہ وہ لطف بہار فصل گل — میری آنکھیں ہیں مگر نوحہ گر اندر فصل گل

اس چمن میں عشرت دیرینہ کی تصویر ہوں — جلوہ زار گل کی اک مٹتی ہوئی تنویر ہوں

میرے ساتھی ہو چکے جور خزاں سے پائمال — میں بھی ہوں اب اک چراغ صبحگاہی کی مثال

پہلے میری شام تھی سرمایۂ عیش و نشاط — تھی تجلی ریز ہر جانب سے بزم انبساط

میری صبح عیش تھی صبح بہار زندگی — مست کیف وصل تھا ذوق خمار زندگی

گدگداتی تھی میرے پہلو میں باد صبحگاہ — چھیڑتی تھی مجھکو رہ رہ کر کسی بلبل کی آہ

تھا غرض دن عید میرا اور شب شام برات — کیا خبر تھی آہ یہ عالم ہے اک خواب ثبات

کیا خبر تھی موسم گل یوں ہوا ہو جائیگا — ایک پل میں صحن گلشن کیا سے کیا ہو جائیگا

کاش ہو پھر رحمت پروردگار ارض جناں — پھر مرا اجڑا ہوا گلشن بنے رشک جناں

پھر وہی پچھلی سی رونق آئے کوچۂ باغ پر — ابر رحمت جھوم کر چھا جائے صحن باغ پر

جلوہ گل پھر دکھائے منظر سوز و گداز — پھر سنوں میں نغمہ بلبل کی صوت دلنواز

اے خدا رخ پھیر دے تو گردش ایام کا — پھر وہی منظر نظر آجائے صبح و شام کا

"اختر"

خوابگاہ

ہائے وہ خلوت کہ جسمیں شمع کافوری جلے
ہار پھولوں کے بھی کچھ لپٹے ہوں ہو مومی شمع

سامنے رکھی ہوئی ہے اک تپائی پر وہ شمع
ہنس رہی ہے اپنی قسمت کی رسائی پر وہ شمع

اک حسین نازنین ہے اور اک عاشق مزاج
قسمتوں سے ہاتھ آئی ہے شب وصل آج

شامتِ محرومی کہ عاشق بے خبر ہے سو رہا
بے خبر سو کر مزے کو وصل کے ہے کھو رہا

چہرہ معشوق سے ظاہر ہیں سب آثار دل
دل کو اندیشہ نے فرقت کے کیا ہے مضمحل

دیکھتی ہے شکل عاشق کی نگاہ شوق سے
کمسنی کی شرم سے آنکھیں ذرا نیچے کئے

پوچھنا کیا اس کا وصل یار ہو جسکو نصیب
زیست بعد مرگ سے کچھ کم نہیں وصل حبیب

جاگ اٹھی قسمت عاشق کہ تنہا یار ہے
دلدہی کرتا ہے ایسا باوفا دلدار ہے

وصل کی شب نیند عاشق کو جو آئے عجب ہے
آرزو بر آئے اور سو جائے عاشق ہے غضب

صبحدم معشوق کا کہنا اجی اٹھئے بھی ہو
صبح ہونے کو ہے لو ہم جاتے ہیں تم بھی اٹھو

ہائے عاشق وصل کی شب بے خبر سو کر گئی
قدر تو نے کچھ نہ کی اتری تجھی تیری پری

وصل کی شب کی نہیں تجھکو خبر اے بد نصیب
آ گیا تھا دلربا خود تیرے گھر اے بدنصیب

جاگتا تو وہ رہا اور سو گیا تو ہائے ہائے
کیوں جگا کر اسکو غافل ہو گیا تو ہائے ہائے

تو اگر زندہ نہ ہوتا کہتے شادی مرگ ہم
تو جگانے سے نہ جاگا یہ ستم پر ہے ستم

تو جو مر جاتا خوشی سے کہتے صادق عشق تھا
اور اگر بے خودی تھا کہتے واثق عشق تھا

کیوں جگاتا ہے تجھے معشوق حیرت کی ہے بات
تو جگا کر اوسکو سو جائے ندامت کی ہے بات

یا سفر کا ہے ارادہ اسکو جانا ہے شتاب
یا کسی کے ڈر سے دل ہے آتش غم سے کباب

یا اسے ڈر ہے نہ ہو جائے کہیں افشائے راز
کھل نہ جائے غیر پر یہ باہمی راز و نیاز

دیکھکر یہ حال ظاہر تو یہی ہوتا ہے بس
عشق ہے معشوق کو تجھسے مگر تجھکو ہوس

کیوں ہوس سے کر رہا ہے عشق کو بدنام تو
آخرش ہوگا ذلیل و خوار اے خودکام تو

کیسا تجھکو مل گیا تھا ماہ طلعت مہ جبیں
حور ایسا کہئے جسکو حور فردوس بریں

دل اوا پر لوٹ ہو انداز پر ایمان فدا
عشق میں ایمان ہے کیا اس حسن پر خود خدا

عشق سچا تھا کہ وعدہ وصل کا پورا کیا
ہائے اسکے ساتھ اے کمبخت تو نے کیا کیا

اسکے چہرہ سے برستی ہیں بلا کی حسرتیں
اسکی آنکھوں سے ہیں ظاہر انتہا کی حسرتیں

زلف کہتی ہے ادب آئی ہوا کوئی نہیں
کہتے ہیں انداز تھا مدعا کوئی نہیں

شرم ظاہر ہے جگانے سے مگر کیا ناز ہے
ہے عیاں جس سے نیاز عشق کیا انداز ہے

خوف یہ بھی ہے کہ جاگ اٹھنے سے برہم تو ہو جائے
جو محبت ہے زیادہ وہ کہیں کم ہو نہ جائے

آئے پھر اس رات کو تو کھو کے پانے کا نہیں
وقت ہے صید رمیدہ جا کے آنے کا نہیں

وار کرنا ہو تو کر زر و برشکار ایسے ہیں ہے

ہوش بلگرامی

غزلیات

(جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل)

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے
کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

گلوں کے چاک گریباں سے یہ کھلا عقدہ
جنوں کا رنگ جمانے بہار آتی ہے

چلا ہے تیرا دھر سے قضا یہ کہتی ہے
دوائے دردِ دلِ بیقرار آتی ہے

ہوائے سرکے جھونکے نہیں یہ بادہ کشو
نسیم رحمت پروردگار آتی ہے

وہ گھر سے آج جو نکلے ہیں سیر گل کیلئے
چمن میں ہو موسم سے فصل بہار آتی ہے

خبر ہے تجھکو بھی او چھپکے بیٹھنے والے
مری فغاں تجھے گھر گھر پکار آتی ہے

خدا غفور ہے کچھ لطف سے اٹھا زاہد
کہ روز روز کہاں یہ بہار آتی ہے

نصیب کہتے ہیں مجھ سے کہ تم رہو بیدار
ہمیں تو نیند شب انتظار آتی ہے

کسی کے نذر کو دل کیا سمجھکے میں تجھکو
مجھے تو شرم دل داغدار آتی ہے

شباب کی ہے جو آمد تو ناز کہتا ہے
کہ باغ حسن میں فصل بہار آتی ہے

کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر
یہ جس پہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

اُس آئینے کی سکندر تلاش ہے جس کو — جس آئینہ میں نظر شکلِ یار آتی ہے

قدم قدم پہ چمن سا کھلا ہوتا ہے — وہ آتے ہیں کہ نسیم بہار آتی ہے

پڑی عدو پہ نظر کر گئی حلال مجھے — یہ چال تجھکو بھی اے تیغِ یار آتی ہے

مزہ ہے آہ کا رشک وفاں کے ساتھ جلیلؔ
کنارِ آب ہوا خوش گوار آتی ہے

(منشی محمد صدیق خاں صاحب رعدؔ جونپوری)

پھول برسا رہا ہے تربت کے — اے میں قربان ابرِ رحمت کے

یہ حسیں پیاری پیاری صورت کے — پھول ہیں گلشنِ محبت کے

فتنے کیا شہر میں فساد ہے کیا — تم تو استاد ہو قیامت کے

مل رہی ہے گلے سے تیغ ادا کی — آ رہے ہیں مزے محبت کے

تیرے قربان خنجرِ قاتل — کاٹ دے دن مری مصیبت کے

برق ہو شمع ہو کہ شمس و قمر — ہیں کرشمے سب اسکی قدرت کے

اون کا فتنہ کہیں اٹھتا ہے — مست ہیں جو مئے محبت کے

کون فتنہ خرام آتا ہے — چھکے چھوٹے ہیں جو قیامت کے

اس کا وعدہ غضب کا وعدہ ہے — مجھکو ارمان ہیں قیامت کے

کیا ضرورت ہے سیرِ گلشن کی — رنگ دیکھو مری طبیعت کے

کر گئے مجھ سے وہ وعدۂ فردا — ناز اٹھوائے ہیں قیامت کے

چشم بینا ہو تو یہ بت اے شیخ — آئینے ہیں خدا کی قدرت کے

مجھکو جب دیکھتے ہیں کہتے ہیں — آئے دشمن مری نزاکت کے

چومتا ہوں بظاہر اون کے گال — بوسے لیتا ہوں دستِ قدرت کے

میری حالت پہ تم نظر نہ کرو — دیکھو جوہر میری طبیعت کے

ہوں وہ میکش کہ کرتے ہیں تعظیم — لکے اٹھ اٹھ کے ابرِ رحمت کے

کر رہے ہیں وہ وصل کا وعدہ — ہوش اڑے جاتے ہیں نزاکت کے

قامتِ یار دیکھ کر اے رعدؔ — حوصلے پست ہیں قیامت کے

بلبلوں کی زبان پر اے رعدؔ — تذکرے ہیں مری فصاحت کے

(منشی سید معراج رسول صاحب معراجؔ تعلقہ دار سندیلہ)

وہ لطفِ سوزِ ہجر بھی حاصل نہیں رہا — گویا بجھا چراغ ہے اک دل نہیں رہا

اڑتی ہے آج راہِ طلب میں ہماری خاک — اب کچھ ہراس دوری منزل نہیں رہا

مجبور کر دیا ہے ترے غم میں ضعف نے — میں ناز بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہا

بھولا رہا میں آپ کو اکثر فراق میں — لیکن تمھاری یاد سے غافل نہیں رہا

اللہ رے شوقِ شہادت کا یہ اثر — قاتل کو دیکھتے ہیں کہ قاتل نہیں رہا

معراجؔ لطفِ صحبتِ احباب کی نہیں
جس دل سے زندگی تھی وہ اب دل نہیں رہا

(حکیم مظفر حسین صاحب اطہرؔ دہلوی)

دل کو حصہ رقصِ بسمل سے ملا — یہ نتیجہ دل کے قاتل سے ملا

دل دیا سر دیدیا اور جان دی — پھر نہ ہم سے دل ربا دل سے ملا

عید کی سی دھوم تھی مقتل میں کل — کوئی بسمل کوئی قاتل سے ملا

مجھکو دھمکاتے رہے وہ نازنیں — بوسۂ رخ سخت مشکل سے ملا

لب ملے سینے ملے لیکن صنم — کیا نتیجہ دل نہ جب دل سے ملا

ہم کہیں ہیں سر کہیں ہے دل کہیں — پھل یہ ہم کو تیغِ قاتل سے ملا

تو بھی ہے داغ اے خورشید وش — رخ نہ اپنا ماہِ کامل سے ملا

اور برگشتہ مقدر ہو گیا — یہ نتیجہ سعیِ باطل سے ملا

نکلی حسرت مجھ شہیدِ ناز کی — کھول کر دل تیغِ قاتل سے ملا

نکلے ارمان میرے دل کے غیر سے — کوئی خنجر کوئی قاتل سے ملا

لے لئے مقصد کی ہے گر آرزو — سلسلہ تو محملِ دل سے ملا

ہو گئے گم اس زلف کے کوچے میں آ — دل ہمارا سخت مشکل سے ملا

آپ نازاں ہیں بہت اغیار پر — سچ کہو تو کوئی بھی دل سے ملا

لے چلے آخر یہ حسرت قبر میں
آشنا کوئی نہ یاں دل سے ملا

جے ٹیبلیٹس طاقت کی دوا

قیمت فی شیشی کلاں للعہ ——— قیمت فی شیشی خورد عہ

ہنسے رہا شیخ فانی کی صورت ؛ وہی قد کہ سیدھا تھا جو شکل ناوک ؛ چھپاتا ہے کیوں شیخ دردِ نہاں کو
دیکھی کبھی نوجوانی کی صورت ؛ ہوا خم کمانی کمانی کی صورت ؛ کہیں چھپتی ہے ناتوانی کی صورت

نیان بے احتیاج مایوس العلاج لڑکپن کی خرابیاں یا ایام جوانی کی غلط کاریوں یا بے اعتدالیوں کی وجہ سے
کثرت شراب چانڈو اور افیون کی مضرتوں کے سبب اپنی قوت کاملہ سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہوں اور یاوسی کے
باعث زندہ درگور رہنے کو غنیمت شمار کرتے ہوں اونکو بصدائے کوس جتلایا جاتا ہے کہ وہ اگر دوبارہ اصلی قوت
حاصل کرنا چاہتے ہوں تو بہت جلد ہماری ایجادہ جے ٹیبلیٹس جو بڑی کوشش و محنت اور برسوں کی
جانفشانی سے تیار ہوی ہے جو آب حیات کا اثر رکھتی ہے منگواکر استعمال کریں یہ ایک دوائی اور سینکڑوں بیماری
کا فائدہ پہنچاتی ہے اندرونی اور بیرونی غلاظتوں سے پاک و صاف بناتی ہے اعضائے رئیسہ اور شریفہ کو طاقت
بخشتی ہے۔ بوڑھے کو جوان اور جوان کو جوانمرد بناتی ہے۔ اطبائے قدیم اسکی تعریف میں متفق البیان ہیں اور ڈاکٹران
یورپ و امریکہ اسکی تعریف و توصیف میں ہم زبان ہیں۔

نمبر		نمبر	
۱	جے ٹیبلیٹس۔ دماغ اور دیگر اجزا کو زوال سے بچاتی ہے اور مقوی ہے	۱۰	جے ٹیبلیٹس۔ مقوی باہ و ممسک ہے۔
۲	جے ٹیبلیٹس۔ مقوی و محافظ بصارت ہے۔	۱۱	جے ٹیبلیٹس۔ دافع گٹھیا و عرق النساء نقرس ہے۔
۳	جے ٹیبلیٹس۔ خالص خون کو بڑھاکر چہرہ رخسار دنکو سرخ کرتی ہے	۱۲	جے ٹیبلیٹس۔ ہڈیاں اور پٹھوں کو طاقت پہنچاتی ہے۔
	ٹیبلیٹس۔ سول جگر و معدہ کو جدید قوت پہنچاتی ہے۔	۱۳	جے ٹیبلیٹس۔ کاہلی و جسم کے ٹوٹن کو دور کردیتی ہے۔
	س۔ ہاضم ہے اور اشتہا کو زیادہ کرتی ہے	۱۴	جے ٹیبلیٹس۔ ریاحی دردوں کے لئے نہایت مفید ہے
۶	۔ دافع قبض اور قاطع ریاح ہے۔	۱۵	جے ٹیبلیٹس۔ عضلات کو قوت پہنچاتی ہے۔
۷	۔ درد کمر اور درد گردہ کے لئے اکسیر ہے۔	۱۶	جے ٹیبلیٹس۔ استعمال سے طاقت زیادہ ہوتا۔
۸	۔ مقوی مثانہ اور		
۹	۔ محافظ منی و دافع ... م ہے	۱۸	جے ٹیبلیٹس۔ مفید ہے! مفید ہے!! مفید ہے!!!

یہ ایک مجرب معمول

فوائد کی صداقت امتحان پر موقوف ہے۔

بمال مینی رنگون کلکتہ کا ایجنٹ حاجی عمر حاجی ایوب نمبر ۲۰ امرتلہ لین کلکتہ ٹیلیفون نمبر ۹۰

تمدنِ ہند مجلد و با تصویر مترجمہ شمس العلما ڈاکٹر سید علی صاحب بلگرامی مرحوم ایم اے ڈی لٹ قیمت ۵ علاوہ محصول۔

فلسفہ ازدواج مولفہ سید علی اصغر صاحب بلگرامی ایم آر۔ اے ایس قیمت ۱۲ علاوہ محصول۔

فغانِ ایران مترجمہ سید محمد حسن صاحب بلگرامی گورنمنٹ اڈیٹر ریکارڈ و معدنیات سرکار نظام کی نسبت علامہ شبلی نعمانی کی رائے:۔

وہ کتاب اکثر جگہ سے دیکھی دلچسپ اور پراثر ہے خصوصاً عورتوں کے جلسۂ پارلیمنٹ میں جانے اور ممبروں کے مقابلے میں پستول چلانے کا جہاں ذکر ہے میرے آنسو نکل آئے بہرحال دلچسپ کتاب ہے اور ہندوستانی مخدرات کے کارناموں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے"۔ ہر جلد میں ۱۲ یا ۱۳ عکسی تصویریں ہیں شائقین جلد طلب فرمائیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا ہوگا قیمت مجلد للعہ علاوہ محصول ڈاک۔

دبدبۂ امیری مترجمہ مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی گورنمنٹ اڈیٹر ریکارڈ و معدنیات سرکار نظام یعنی سوانح ضیاء الملت والدین امیر عبدالرحمن خان غازی مرحوم والئی دولت خداداد افغانستان کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں اسکی مقبولیت کا صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلا ایڈیشن ایک ہزار چھپا تھا جن میں سے اب صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں اگر ناظرین جلد طلب نہ فرمائیں گے تو طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا مجلد و با تصویر قیمت (للعہ) علاوہ محصول ڈاک

پریم پچیسی حصہ اول مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے پچیس بہترین قصوں کا مجموعہ مرتبہ ایڈیٹر صاحب زمانہ و آزاد کانپور قیمت فی جلد ۲ ار کلدار علاوہ محصول

سوانح عمری پیغمبر عالم عہ کلدار علاوہ محصول ڈاک

حیات سرور کائنات (۳ ر) علاوہ

علمی کہانیاں مولفہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی ۸ ر کلدار علاوہ محصول

عطرِ سخن یا جذبات مسلم مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی قومی نظموں کا بہترین مجموعہ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت عہ کلدار علاوہ محصول

تاریخی جواہر ۔ مولانا شبلی حضرت اقبال اظہر دہلوی کی تاریخی نظموں کا مختصر و دلکش مجموعہ قیمت فی جلد ۳ ر کلدار علاوہ محصول۔

انتخاب روح مصنفہ کے الف بیگم صاحبہ مجلد قیمت ۳ ر کلدار علاوہ محصول

تہذیب الاسلام قیمت ۸ ر کلدار علاوہ محصول

ایک شاعر کا انجام مصنفہ نیاز فتحپوری ۱۲ ر کلدار علاوہ محصول

جذبات بھاشا مصنفہ نیاز فتحپوری ۱۲ ر کلدار ایضاً

مسدس حالی (۸ ر) کلدار علاوہ محصول ڈاک

لسان الغیب (۲ ر)

شکوہ۔ جواب شکوہ } مصنفہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مجلد قیمت ہر دو جلد (۵ ر) علاوہ محصول

عذر شکوہ مصنفہ پیرزادہ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز مخدومی امرتسری قیمت فی جلد (۱ ر) علاوہ محصول۔

علمی تلاش مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب ۸ ر کلدار علاوہ محصول

جملہ درخواستیں بنام منیجر دبدبہ بک ڈپو اندرون دروازہ چادرگھاٹ ... چاہئیں

نظام دکن پریس میں چھپا

ھو النّاصر

جلد ۲ نمبر ۴ — اردو علم ادب کی پچیس کا مصوّر رسالہ — اپریل ۱۹۱۹ء

ذخیرہ

مرتبہ

سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی

تصویرِ خیالِ یار

(نثر)

فہرست مضامین

نثر

نظم

قیمت سالانہ للعہ — دفتر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا — فی پرچہ ۶؍

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابن رشد کے معاصر

ابن زہر

اس کنیت کے دو بڑے نامی گرامی حکیم اور طبیب اندلس میں گزرے ہیں یہ دونوں ابن رشد کے معاصر اور دوست تھے۔ ایک عبدالملک ابن زہر اور دوسرا اوس کا بیٹا محمد ابو بکر ابن زہر۔ ان دونوں نے خلفائے موحدین کے زمانہ حکومت میں بڑا نام پیدا کیا اور فن طبابت میں سرآمد اطباء وقت گنے جاتے تھے۔ یورپ کی زبانوں میں یہ دونوں حکیم (اونزور) کے نام سے مشہور تھے۔ چونکہ ابن زہر کے گھرانے میں اور بھی بڑے بڑے نامی گرامی لوگ گزرے ہیں بلکہ سات پشت تک ہر فرد اس خانوادہ کا فرد اکمل پیدا ہوا ہے اس واسطے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حکیم کا ترجمہ لکھنے سے پیشتر کچھ سرسری احوال اس کے خاندان کا لکھا جائے جس کے فضل و کمال اور شہرت کی طرف اشارہ کر کے کسی شاعر بزلہ سنج نے بطور مطائبہ کہا ہے

قُلْ للوبا انت وابن زہر	جاوزتما الحد فی النکایۃ
ترفقا بالورٰی قلیلاً	فواحدٌ منکما کفایۃ

(زہر) نام ایک شخص یہودی الاصل اشبیلیہ کا رہنے والا جو اسلام سے مشرف ہوا تھا اس خاندان کا بانی ہے

(۱) زہر کا پوتا محمد ابن مروان ابن زہر الایادی اول شخص
اس خاندان کا ہے جس نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔
محمد نے مقام طلبیرہ میں سنہ ۴۲۱ھ مطابق سنہ ۱۰۳۰ء میں وفات پائی

(۲) محمد کا بیٹا عبد الملک ابو مروان بھی طبیب تھا اپنے
فن کی تکمیل کے واسطے سفر اختیار کیا اور قیروان اور قاہرہ
اور بغداد میں مدت تک مطب کرتا رہا اور ان مقامات
میں بڑا نام پیدا کیا۔ سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن اصلی
یعنے اندلس کو واپس آکر شہر دینیہ میں قیام اختیار کیا
اور وہاں کے حاکم مجاہد صقلبی کے دربار کا طبیب مقرر ہوا
ابن خلکان لکھتا ہے کہ عبد الملک نے اسی شہر میں
وفات پائی مگر ابن ابی اصیبعہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے
کہ اس کا مقام وفات اشبیلیہ تھا تاریخ وفات ٹھیک ٹھیک
معلوم نہیں مگر قیاس یہ ہے کہ قریب ۴۷۰ھ کا یہ واقعہ ہے

(۳) عبد الملک کے بیٹے زہر ابو العلائی بھی اپنے پدر بزرگوار
کے قدم بقدم رکھا اور اپنے آبائی فن میں بڑی دستگاہ حاصل
کی اور ابو عمرو عباد المعتضد باللہ حاکم اشبیلیہ کا وزیر اور
طبیب مقرر ہوا۔ ابن ابی اصیبعہ اس کی وفات کا زمانہ
سنہ ۵۲۶ھ لکھتا ہے مگر ابن خلکان اس کو ایک سال پیشتر کا
واقعہ بتاتا ہے۔

(۴) عبد الملک ابو مروان اس کا بیٹا بھی اپنے فن میں
بڑا حاذق تھا چھوٹی سی عمر میں ابراہیم ابن یوسف ابن
تاشفین آخر خلفاء مرابطین کے گھر کا طبیب مقرر ہوا۔
اور خاندان مرابطیہ کی بربادی کے بعد عبد المومن
کے دربار میں اسی خدمت سے سرفراز ہوا اور بالآخر درجہ
وزارت کو پہونچا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ
عبد الملک یہودی المذہب تھا مگر یہ گمان غلط ہے
اس کی تصنیفات بہت ہیں ایک تیسیر (فن
طبابت کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی تھی۔
اول زبان عبری اور پھر زبان عبری سے لاطینی میں
ترجمہ ہوی اور پندرہویں صدی مسیحی میں مملکت
اٹالی میں چھاپی گئی۔ اس حکیم نے ۵۵۷ھ میں شہر اشبیلیہ
میں وفات پائی۔

(۵) محمد ابو بکر ابن عبد الملک الحفید کے لقب سے مشہور
ہے کیونکہ اس کے پر دادا کا نام اور کنیت بھی محمد ابو بکر ہے
یہ حکیم اور ابن رشد دونوں عبد المومن کے دربار کے طبیب
تھے محمد الحفید اپنے آبائی فن کے علاوہ فقیہ اور شاعر
بھی تھا مورخین اس شخص کو خاندان زہر کا تاج گنتے ہیں
ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے اس حکیم نے سنہ ۵۹۶ھ م ۱۱۹۹
و ۱۲۰۰ء میں وفات پائی مگر ایک مورخ نے ۲۱ ذوالحجہ سنہ ۵۹۵ھ
لکھا ہے اس کی پیدائش کی تاریخ ۵۰۷ھ ہے یہ حکیم اور
اس کا باپ عبد الملک آونزور کے نام سے یورپ میں مشہور ہیں

(۶) عبد اللہ ابو محمد ابن الحفید کی ولادت سنہ ۵۷۷ھ میں
بمقام اشبیلیہ اور وفات سنہ ۶۰۲ھ میں آفریقہ میں مذکور ہے
اس نے بہت تھوڑی عمر پائی اور کہتے ہیں کہ مسموم مرا۔ یہ
بھی اپنے فن میں مشہور تھا۔ عبد اللہ نے دو خلف چھوڑے
ابو مروان عبد الملک اور ابو العلا محمد۔ ابو مروان نے

بڑی شہرت پائی اور بہت تصنیفات چھوڑے۔ یہاں تک
زہر کے خاندان کا حال مختصر طور پر بیان ہوچکا۔ اب کسی قدر
تفصیل کے ساتھ عبدالملک ابن زہر چہارم سلسلہ کے حالات
ابن خلکان اور ابن ابی اُصیبعہ کی عبارت سے ترجمہ کئے جاتے ہیں

عبدالملک ابن زُہر

عبدالملک ابن زہر نے اپنے پدر بزرگوار سے اپنا آبائی فن سیکھا
اور آخر چل کے اپنے بزرگوں اور اپنے ہمعصر اطبا پر
سبقت لیگیا اس کی تشخیص اور اس کے نسخہ دور دور تک
مشہور تھے ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ ابن تیومرت نے
جب مرابطین کی سلطنت پر قبضہ کرلیا اور اوس کی
وفات کے بعد خلیفہ عبدالمومن اس کا جانشین ہوا
اور آفریقہ سے اندلس آیا تو یہاں اس علم دوست
بادشاہ نے منجملہ اور علما کے ابن زہر کی بھی بڑی قدر و منزلت
کی اور اپنے دربار کا طبیب مقرر کیا اور بہت کچھ انعام و
اکرام سے سرفراز کیا۔ ابن زہر نے عبدالمومن کے واسطے ایک
معجون مرتب کی تھی جس میں ستر جز شریک تھے اور تریاق
سبعینی کہی جاتی تھی پھر اس نے اپنے نسخہ کے اجزا اکٹھا
کرکے دس جز رکھی اور اوس کے سات جز رکھی جو تریاق
الاتسلہ کے نام سے مشہور ہوی۔

ابوالقاسم معاجنی اندلسی سے روایت ہے کہ ایک دن
خلیفہ عبدالمومن نے ابن زہر سے فرمایش کی کہ مجھے ایک خفیف
سی مسہل کی ضرورت ہے۔ ابن زہر نے اسی وقت باغ میں
جاکر ایک انگور کی بیل کو چاروں طرف سے کھدوایا اور پانی
میں کچھ دوا ملاکر سینچنا شروع کیا۔ دوا کا اثر ساری بیل میں
دوڑ گیا یہاں تک کہ انگور کے خوشوں میں بھی سرایت کرگیا
ابن زہر اوس وقت ایک خوشہ توڑ کر بادشاہ کے پاس لیگیا
یہاں انگوروں کے تیار ہونے تک بادشاہ کو بخار آگیا تھا
ابن زہر نے بادشاہ کو خوشہ دیکر کہا کہ اسے نوش جان فرمایے
بادشاہ نے دس انگور کھائے ابن زہر نے عرض کیا کہ بس
یا امیرالمومنین یہ دس انگور کافی ہیں انشاء اللہ اتنی ہی
اجابتیں ہونگی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ کا مزاج
درست ہوگیا۔

نقل ہے کہ ایک دن ابن زہر اشبیلیہ میں بادشاہ کے
دربار کو جارہا تھا کہ اثنائے راہ میں ہمام ابوالخیر کے پاس
ایک مریض سے دوچار ہوا جس کا زرد رنگ اور ورم
کا کراہنا صاف بتاتا تھا کہ یہ شخص مستقی ہے ابن زہر
اس کے ساتھ ساتھ مکان تک گیا اور وہاں یہ تفصیل
احوال پوچھ کر نبض دیکھکر چاہتا تھا کہ نسخہ لکھے کہ یکایک
اس کی نظر ایک گھڑے پر پڑی کہ بستر کے سرہانے رکھا
ہوا تھا دریافت سے معلوم ہوا کہ مدت سے یہ گھڑا یہیں
رکھا ہوا ہے اور مریض اسی کا پانی پیتا ہے۔ ابن زہر
نے کسی نوکر سے کہا کہ اس گھڑے کو توڑ ڈالو۔ گھڑا جو
ٹوٹا تو اوس کے اندر سے ایک بہت بڑا مینڈک نکلا۔
جس نے بظاہر اوسی گھڑے میں پرورش پائی تھی۔
ابن زہر اٹھ کھڑا ہوا کہ اب نسخہ لکھنے کی حاجت

نہیں رہی تم یوں ہی اچھے ہو جاوگے۔ آج تک جو تم پانی
پیا کرتے تھے وہ تمھارے حق میں زہر تھا۔

کہتے ہیں کہ ابن زہر کا ہمعصر الفار نام ایک بڑا طبیب اشبیلیہ
میں تھا جس نے ایک کتاب مفردات ادویہ کے بیان
میں دو جلدوں میں تصنیف کی تھی یہ حکیم صاحب ہمیشہ
ابن زہر سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو انجیر نہ کھایا کرو ورنہ
کسی روز سرطان کا مرض تم کو ہلاک کریگا۔ ابن زہر کو
انجیر سے بڑی رغبت تھی خوب کھایا کرتا تھا الفار سے
کہا کرتا تھا کہ تم اپنی خبر لو انجیر سے پرہیز کرتے ہو قبض
میں مبتلا رہوگے اور کسی روز تپ تمھاری جان لیگی
طرفہ ماجرا یہ ہے کہ آخر کار الفار تپ اور قبض سے ہلاک
ہوا اور ابن زہر سرطان سے۔

مرض الموت میں ابن زہر نے بہت کچھ علاج کیا مگر جب
کچھ اثر نہ ہوا تو اوس کے بیٹے ابوبکر نے ایک نسخہ تجویز کیا
ابن زہر نے کہا کہ بیٹا اب نسخہ بیکار ہے موت کی کوئی
دوا نہیں۔ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر کوئی شئے
کارگر نہیں ہوتی خدا کا حکم کون ٹال سکتا ہے ابن زہر
نے ۵۵۷ھ مطابق ۱۱۶۲ء میں وفات پائی۔
اور باب الفتح کے باہر دفن ہوا۔ ابن زہر کے مشہور شاگردوں
میں ایک ابوالحسن ابن اسدون ہے جو المصدوم کے
لقب سے مشہور ہے ابن ابی اصیبعہ نے اوس کا بھی
ترجمہ اپنے طبقات میں لکھا ہے۔

ابن زہر کے مصنفات بہت ہیں۔ مشہور کے نام ذیل
میں درج کئے جاتے ہیں کتاب التیسیر فی المداواۃ و
التدبیر کتاب الاغذیہ۔ کتاب الزینہ اس میں فقط
مسہلات کا ذکر ہے کتاب الامراض۔ رسالہ فی البرص
والبہق۔ کتاب التذکرہ۔ کتاب التیسیر کا ترجمہ اٹالی
میں بار بار چھپا ہے اور وہاں کے اطبا نے اس کی
شرح بھی کی ہے جو ۱۶۲۸ء میں چھاپی گئی۔ ابن رشد
کے ترجمہ احوال میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ کتاب ابن
زہر نے ابن رشد کی فرمایش سے لکھی تھی اور غرض
اس تصنیف سے یہ تھی کہ ابن رشد کی کتاب الکلیات
کے ساتھ ملکر فن طبابت کا پورا مجموعہ بن جائے

ابوبکر بن زہر

ابوبکر محمد بن مروان ابن ابی العلا ابن زہر۔ میانہ قد
صاف رنگ بڑا مضبوط زور آور قوی الجثہ آدمی تھا
بڑی عمر کو پہنچکر مرا۔ اور آخر وقت تک سارے قوی برقرار
اور حواس خمسہ صحیح و سالم لیگیا فقط سماعت میں کسیقدر فرق
آگیا تھا۔

فقہ اور حدیث کو اس حکیم نے عبدالملک الباجی سے حاصل کیا
اور طب وغیرہ اپنے پدر بزرگوار عبدالملک ابن زہر سے اور
ان علوم میں ایسی مہارت اور ایسا کمال پیدا کیا کہ اپنے
تصنیفات سے اپنے زمانہ کے مبلغ معلومات میں بہت کچھ
اضافہ کر گیا۔ ان علوم کے علاوہ فنون ادبیہ عربیہ میں بھی
اُسے بڑی دستگاہ تھی اور حافظ کلام اللہ تھا اور شعر بھی
خوب کہتا تھا اور بیان بھی اُس کا بہت فصیح و بلیغ تھا۔

ابو الخطاب بن دحیہ نے اپنی کتاب (المطرب فی اشعار اہل المغرب) میں لکھا ہے کہ ذو الرمہ کا کلام اس کو حفظ یاد تھا۔ اور حکیم اور طبیب ہونے کے علاوہ بڑا ادیب تھا کچھ کلام بھی اس کا نقل کیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے اشعار ذیل سے اس کے کلام کی متانت و حلاوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وموسدین علی الاکف خدودهم ۔۔۔ قد غالهم نوم الصباح وغالنی
مازلت اسقیهم واشرب فضلهم ۔۔۔ حتی سکرت ونالهم مانالنی
والخمر تعلم کیف تاخذ ثارها ۔۔۔ انی املت اناءها فامالنی

اپنے ایک بہت ہی صغیر سن بچے کے اشتیاق میں لکھتا ہے

ولی واحد مثل فرخ القطا ۔۔۔ صغیر تخلف قلبی لدیه
نأت عنه داری فیا وحشتی ۔۔۔ لذاک الشخیص وذاک الوجیه
تشوقنی وتشوقته ۔۔۔ فیبکی علی وابکی علیه
لقد تعب الشوق ما بیننا ۔۔۔ فمنه الی ومنی الیه

مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اشعار ذیل میری قبر پر کندہ کر دیئے جائیں

تامل بحقک یا واقفا ۔۔۔ ولاحظ مکانا دفعنا الیه
تراب الضریح علی وجنتی ۔۔۔ کانی لم امش یوما علیه
اداوی الانام حذار المنون ۔۔۔ وها انا قد صرت رهنا لدیه

ابوبکر بن زہر اپنے پدر بزرگوار کی رفاقت میں سلطان ابراہیم بن یوسف بن تاشفین المرابطی کا طبیب تھا اور اس خانوادہ کی بربادی کے بعد ابن رشد کی شراکت میں عبد المومن کے دربار کا طبیب مقرر ہوا۔ موحدین کے خاندان میں چار پشتوں تک اس منصب سے سرفراز رہا اور خلیفہ عبداللہ محمد الناصر کے زمانہ میں نوے برس کے سن کو پہونچکر ۵۹۶ھ میں مراکش کے مقام میں اس جہان فانی سے گزر گیا رحمۃ اللہ علیہ۔ ابوبکر کی تشخیص اور حذاقت تمام یورپ میں مشہور تھا۔ تریاق خمسینی اس کی ترتیب دادہ ایک معجون تھی۔ بعض موقعوں پر اپنے پدر بزرگوار کے نسخوں پر بھی اصلاح کیا کرتا تھا اور وہ حکیم اس کی رائے کو تسلیم کر لیا کرتا تھا۔

ابوبکر کی سخاوت اور دوست پرستی کی ایک نقل قاضی ابو مروان الباجی کے زبانی منقول ہے کہ ابوبکر ایک دن ایک دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ اوسے کچھ متفکر و متردد پاکر فکر و تردد کا سبب پوچھا اوس نے جواب دیا کہ میری بیٹی کی شادی ہوگئی ہے کل اوس کے رخصت کا دن ہے تین سو دینار صرف ہونگے میرے پاس ٹکا بھی نہیں ہے میں اس فکر میں ہوں کہ تین سو دینار کس کے گھر سے لاؤں۔ ابوبکر نے کہا کیا مضایقہ ہے بازی تو تمام کرو میرے پاس پانچ کم تین سو دینار اس وقت موجود ہیں تمھاری نذر کرتا ہوں۔ شطرنج گروانے کے بعد ابوبکر نے پانچ کم تین سو دینار کا توڑا اپنے دوست کے حوالہ کیا۔ کئی دن کے بعد وہ دوست پھر ابوبکر کی ملاقات کو آیا۔ اور پانچ کم تین سو دینار واپس لایا اور بیان کیا کہ میں نے ایک زیت کا باغ اپنا سات سو دینار کو بیچا ہے۔ تمھاری عنایت سے

عین وقت پر میرا کام نکل گیا۔ اب یہ رقم حاضر ہے
میری حاجت روا ہو گئی۔ ابوبکر نے کہا اس رقم
کو تم ہی اپنے صرف میں لاؤ۔ میں نے دیتے وقت
یہ نیت نہیں کی تھی کہ تم سے واپس لونگا۔ اس نے
کہا کہ یہ آپ کی عنایت و مہربانی ہے خدا کے فضل
سے اب مجھے احتیاج باقی نہیں ہے۔ اور میں کبھی
پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے احسان کا بار اپنی گردن
پر لوں جس کا عوض مجھ سے نہ ہو سکے۔ ابوبکر نے
کہا میں تمھارا دوست ہوں یا دشمن۔ دوست بولا
کہ یہ کیا فرماتے ہو تم میرے بڑے عزیز دوست ہو
ابوبکر نے کہا کہ اگر میں تمھارا دوست ہوں تو
میرا مال تمھارا مال اور تمھارا مال میرا مال ہے
پس کیا جائے تامل ہے اس پر بھی جب اس
کے طرف سے تامل ہوا تو ابوبکر نے جھنجلا کر کہا
کہ اگر تم نہ قبول کروگے تو آج سے میری تمھاری
ملاقات ترک ہو جائیگی۔ آخر یہ مجبوری اوسے
وہ ہدیہ قبول کرنا پڑا۔ ابن رشد کے ترجمہ میں بیان ہو چکا
ہے کہ امیر المنصور نے معقولات اور حکمت کی کتابیں
تلف کرنے کے واسطے ابن زہر کو مقرر کیا تھا اگرچہ
امیر خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولات کی
کتابوں سے مالامال ہے اور یہ خود علوم عقلیہ کا بڑا شیدا
ہے۔ ابوبکر ابن زہر بادشاہ کے حکم بجا لانے میں
بڑی سرگرمی سے مشغول ہوا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر
معقولات کی کتابیں جلائیں۔ اس وقت اشبیلیہ میں
ایک شخص رہتا تھا جسے ابن زہر سے عداوت تھی
اور ہمیشہ اوس کے درپے رہا کرتا تھا اس فتنہ پرداز
کو یہ مشغلہ سوجھا کہ ایک محضر تیار کیا اوس پر اپنے دستخط
کئے اور چند اپنے دوستوں کے بھی دستخط کرائے۔ مضمون
محضر کا یہ تھا کہ ابن زہر خود معقولات کی تحصیل اور
تفتیش میں مصروف رہا کرتا ہے اور اس فن کی کتابیں
اوس کے کتب خانہ میں بہت ہیں۔ غرض دستخط کرا کے
امیر کے حضور میں گزرانی اوس روز خلیفہ حصن الصرح
میں مقیم تھا جو ابوبکر کے مشورہ سے بادشاہ کے تفرج
کے واسطے تعمیر ہوا تھا۔ عرضی وہیں پہنچی۔ امیر نے کھولکر
اوسے پڑھا اور پڑھتے ہی حکم دیا کہ عرضی گزار گرفتار
ہو کر قید خانہ میں مقید کیا جائے اور علانیہ فرمایا کہ
میں نے ابوبکر ابن زہر کو اسی غرض سے یہ کام سونپا
تھا کہ لوگوں کی زبان اوس کی نسبت بند ہو جائے اگر
سارا شہر متفق ہو کر قسم کھائے کہ اس عرضی کا مضمون
صحیح ہے تو بھی میں ہرگز باور نہ کروں ابن زہر کی
خدا پرستی پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ غرض عرضی گزار
مقید ہوا مگر باقی دستخط کرنے والے روپوش ہو گئے
ابوالعباس احمد ابن محمد ابن احمد اشبیلی سے روایت
ہے کہ دو لڑکے ابن زہر کے پاس طب کی کتابیں
پڑھنے آیا کرتے تھے ایک دن کا ذکر ہے کہ ابن زہر
ابوالحسن المصدوم کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا

کہ یہ دونوں طالب العلم کتابیں لئے ہوئے آپہونچے
سوائے درسی کتابوں کے ایک لڑکے کے ہاتھ میں
ایک چھوٹا رسالہ اور بھی تھا۔ ابن زہر نے اس کے
ہاتھ سے لیکر کچھ عبارت پڑھی دیکھا تو منطق کا
رسالہ ہے۔ فوڑا کتاب کو تو ایک طرف پھینکدیا اور
خود لکڑی لیکر شاگردوں کے جانب چلا۔ لڑکے بھاگے
یہ پیچھے ہوا دور تک دوڑتا ہوا چلا گیا مگر وہ ہاتھ
نہ آئے۔ یہ واپس آیا۔ کئی دن تک شاگردوں نے
ڈر کے مارے منھہ نہ دکھایا مگر بعد چندے جب انھوں
نے سمجھ لیا کہ اب حضرت کا غصہ فرو ہوگیا ہوگا۔
پھر آن کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت اس دن
ہم سبق لینے کو آرہے تھے۔ سر بازار ہم نے ایک داستان
گو کے ہات میں یہ کتاب دیکھی بازاری لوگ
کچھ اوس سے تکرار کر رہے تھے ہم نے کتاب اوس کے
ہاتھ سے جھپٹ لی اور آپ کے پاس لے آئے ہمیں
کیا خبر تھی کہ اس کے اندر کیا لکھا ہے اور کس فن کی
کتاب ہے ابن زہر نے یہ عذر بارد اپنے شاگردوں
کا قبول کر لیا اور پھر بدستور درس میں مشغول ہوا مگر
اوس روز سے اس نے یہ معمول باندھ لیا کہ طب کا
سبق دیکر ایک آدہ رکوع کلام مجید کا شاگردوں سے
پڑھوا کر سن لیا کرتا اور کہدیا کرتا کہ گھر پر اس
مقام کی تفسیر دیکھ لو اور علاوہ اس کے سیر و حدیث
کی کتابوں کا بھی اون سے مطالعہ کرواتا اور صوم
وصلوۃ کے بابت بڑی قدغن رکھتا۔ جب اوس
نے سمجھ لیا کہ اب ان کے عقاید مضبوط ہو چکے اُس
وقت ایک دن وہی رسالہ منطق کا اپنے کتاب
خانہ سے نکال لایا اور خود اوس کا درس دینا
شروع کیا اور کہا کہ اب اس علم کے سیکھنے میں کوئی
مضائقہ نہیں ہے۔

قاضی ابو مروان الباجی لکھتا ہے کہ ابن زہر کی ایک
ہمشیرہ اور اوس کی ایک بیٹی ابن زہر کے ساتھ رہا کرتی
تھی اُس کی صحبت میں ان دونوں نے بھی فن طبابت
میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی خصوصًا عورتوں
کے علاج میں بڑی مشاق تھیں اور امیر المنصور کے گھر
میں محلات کا علاج یہی ماں بیٹیاں کیا کرتی تھیں۔
ابن زہر کے وفات کا حال اس طرح لکھا ہے کہ ابو یزید
عبدالرحمن بن بوجان المنصور کے وزیر نے از راہ
خبثا ابن زہر کے ایک خدمت گار کے ساتھ سازش
کر کے انڈے میں ملا کر زہر دلوا دیا۔ ابن زہر اور اسکی
ہمشیر دونوں نے وہ انڈا کھایا اور زہر نے دونوں
کا کام تمام کیا۔ مورخ لکھتا ہے کہ اوس وقت حکمت
اور طبابت کچھ کام نہ آئی۔ مگر منتقم حقیقی نے ابو یزید
بن بوجان سے اس خون ناحق کا عوض اس طرح
پر لیا کہ وہ اپنے ایک قرابت دار کے ہاتھ سے قتل ہوا۔
یہاں تک ابن ابی اصیبعہ کی روایت تمام ہوئی
ابو بکر کی تصنیفات کا ذکر اس مورخ نے چھوڑ دیا ہے

مگر ۱۹۱۶ء میں بہ مقام بازل ایک کتاب ابن زہر کی حفظ صحت کے مقدمات میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ابن زہر کی ہے کیونکہ عبد الملک ابن زہر کی تصنیفات میں اس نام کی کوئی کتاب مذکور نہیں ہے۔

ابن باجہ

ابو بکر محمد بن یحییٰ ابن باجہ الاندلسی ابن الصائغ کے لقب سے مشہور تھا اور اہل یورپ اسے (اَوِمپیس) کے نام سے جانتے تھے۔ یہ مشہور حکیم حافظ قرآن تھا اور علوم عربیہ پر اس کو بڑا عبور تھا اور اپنے وقت کے بڑے حاذق طبیبوں میں گنا جاتا تھا مگر سب سے زیادہ شہرت اس نے حکمت اور فلسفہ میں پائی ان علوم کا امام وقت تھا علاوہ اسکے موسیقی میں بھی اسے بڑی دستگاہ تھی اور نَے خوب بجاتا تھا بعض مورخ اسکی پیدائش سرقسطہ اور بعض قرطبہ کی بتاتے ہیں اوس کے ایک شاگرد ابو الحسن ابن عبد العزیز ابن امام نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں فقط دو ہی شخص یعنے ابن باجہ اور ملک ابن وہیب اشبیلی علوم طبعیہ و فلسفیہ میں سربرآوردہ تھے مگر ملک ابن وہیب نے آخر چلکر دشمنان علم کے خوف سے اس طرف توجہ کم کردی اور علوم شرعیہ میں زیادہ توغل شروع کیا اور ان میں بڑا ملکہ حاصل کیا ابن باجہ علی حالہ علوم عقلیہ کی تحصیل واشاعت میں سرگرم رہا اور ہیئت وہندسہ و الٰہیات وغیرہ میں بڑا مرتبہ حاصل کیا اور از راہ بغض کئی مرتبہ عامی جاہلوں نے اس کی جان پر حربہ کیا مگر خدا نے بچا دیا ابو الحسن ابن الامام لکھتا ہے کہ بعد ابو نصر الفارابی کے اس مرتبہ کا کوئی حکیم نہیں پیدا ہوا اگر ابو علی ابن سینا اور امام غزالی سے جنھوں نے مشرق میں علوم عقلیہ کو الفارابی کے بعد زندہ کیا ابن باجہ کا مقابلہ کیا جائے تو شاید ابن باجہ کا پلہ جھک جائیگا بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں حکیم بلا ریب اپنے وقت کے ائمہ فن تھے ابن باجہ کا زمانہ اوائل مائہ سنہ ۱۲ھ ثانی عشر مسیحی ہے تاریخ وفات کا ٹھیک پتہ نہیں ملتا۔ کوئی کہتا ہے سنہ ۵۳۳ھ میں وفات پائی۔ کوئی کہتا ہے سنہ ۵۲۵ھ میں۔ ابن باجہ نے بہت تھوڑی عمر پائی تیئس برس کے سن میں اس جہان سے گزر گیا اور مدینہ فاس میں ابو بکر ابن العربی کے قریب مدفون ہوا۔ کہتے ہیں کہ مسموم مرا۔ اس کے تصنیفات کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) شرح کتاب السماع الطبیعی لارسطاطالیس (۲) القول علی بعض کتاب الآثار العلویہ لارسطاطالیس (۳) القول علی الجزء الآخر من کتاب الحیوان لارسطاطالیس (۴) الکلام علی کتاب الکون والفساد لارسطاطالیس (۵) کلم علی بعض کتاب النبات لارسطاطالیس (۶) قول فی التشوق الطبیعی والماہیت (۷) رسالۃ الوداع (۸) ضمیمہ رسالۃ الوداع (۹) کتاب فی اتصال العقل بالانسان

قول[10] علی قوۃ النزوعیہ۔ تدبیر[11] المتوحد۔ کتاب[12] النفس تعالیق علی کتاب ابی نصر فی الصناعۃ الذہبیہ۔ فصول[13] قلیلہ فی السیاستہ المدنیہ وکیفیت المدن حال المتوحد کتاب[14] التجربتین علی ادویہ ابن وافد اس کتاب کی تصنیف میں ابوالحسن صفیان اسکے ساتھ شریک تھا اختصار[15] الہادی للرازی۔ کلم[16] فی الغایت الانسانیہ کلم[17] فی الامور التی بہا یمکن الوقوف علی العقل الفعال کلم[18] فی الاسم والمسمی کلم[19] فی البرہان کلم[20] فی الاسطقسات کلم[21] فی الفحص عن النفس النزوعیہ کلم[22] فی المزاج سوائے ان کے اور بھی کتابیں ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ ابن باجہ کبھی کبھی شعر شاعری سے بھی دل لگاتا تھا چنانچہ وفیات الاعیان میں کچھ کلام اس کا منقول ہے۔ لکھا ہے کہ جب موت کا وقت قریب آیا تو یہ دو شعر پڑھتا تھا:۔

اقول لنفسی حین قابلہا الردیٰ — فراعت فراراً منہ یسریٰ الی یمنیٰ
قفی تحملی بعض الذی تکرہینہ — فطالما اعتدت الفرار الی الرحمیٰ

باجہ ایک شہر کا نام ہے۔ مملکت اندلس میں وفیات الاعیان میں لکھا ہے لفظ باجہ بہ تشدید جیم لغت فرنج مغرب میں چاندی کو کہتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ اہل مغرب نے لفظ فضہ کو بگاڑ کر باجہ بنایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابن رشد اس کے شاگردوں میں سے تھا اپنے فلسفی کتابوں میں عزت سے اوس کا نام لیتا ہے اور اوس کے اقوال کی بڑی وقعت ظاہر کرتا ہے ابن طفیل بھی اپنی کتابوں میں اس کی بڑی مداحی کرتا ہے لوئس نے اپنی تاریخ فلسفیات میں ابن باجہ کا ذکر کیا ہے مگر کوئی نئی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ دیا جائے

ابن طفیل

ابن ابی اصیبعہ اپنے طبقات اطباء میں ابن طفیل کا ترجمہ ترک کر گیا ہے مگر ابن الخطیب نے کچھ احوال اس کا لکھا ہے۔ ابوبکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القیسی وادی آش میں متولد ہوا۔ وادی آش ایک بڑا شہر ہے اعمال غرناطہ سے جس کو وادی الاشات بھی کہتے ہیں اس بستی کی آب و ہوا کو مذاق ادب و شاعری سے بڑی مناسبت تھی اور یہاں کے باغات اور ندیاں بہت پرفزا تھیں۔ ابن طفیل تحصیل علوم کے بعد تھوڑی ہی عمر میں والی غرناطہ کا کاتب یعنے معتمد (سکرٹری) مقرر ہوا اور وہاں سے نکل کر یوسف بن عبدالمومن کے دربار میں خدمت طبابت اور بعد چندے منصب جلیل وزارت سے سرفراز ہوا۔ اپنے قرن کے سرآمد اطبا میں اس کا شمار تھا اور ریاضیات اور ہیئت میں اس کو بڑا ملکہ تھا۔

اس حکیم نے سنہ ۵۸۱ھ مطابق ۱۱۸۵ء و ۱۱۸۶ء میں

مقام مراکش میں وفات پائی۔ لوئیس اپنی تاریخ المسغیات میں لکھتا ہے کہ امیر یعقوب المنصور باللہ خلف امیر یوسف اس کے جنازہ کے ساتھ گیا اور اس کی موت کا بڑا غم کیا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ابن طفیل جس قدر ابن باجہ کا ممنون احسان اور ہمیشہ ثنا خواں رہا اسی طرح ابن رشد جس کو ابن طفیل نے بادشاہ وقت تک پہونچایا تھا تمام عمر ابن طفیل کا احسان مانتا رہا۔ اور اوس کی مداحی کرتا رہا۔ ان بزرگواروں کے دلوں میں دستور زمانہ کے خلاف کبھی بغض وحسد کا گزر نہ ہونے پایا

لوئیس کا قول ہے کہ یورپ کے علماء میں یہ بات مشہور تھی کہ ابن طفیل نے نظام بطلیموسی کو رد کیا ہے اور ایک دوسرا نظام ایجاد کیا ہے ابن رشد اپنے شروح میں اس جدید طریقہ عمل کا ذکر کرتا ہے مگر اس کے قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن طفیل نے بتفصیل اس مسئلہ پر کوئی رسالہ نہیں لکھا اگرچہ ہمیشہ لکھنے کا قصد کرتا رہا۔ ابن طفیل کی رائے یہ تھی کہ فلک الافلاک فلک ثوابت کے اوپر اور بالکل خالی ہے اور اوس کو ایک ہی حرکت ہے یعنے مشرق سے مغرب کی جانب۔ اسی کی حرکت سے جملہ افلاک کو مشرق سے مغرب کی جانب حرکت ہوتی ہے مگر جو فلک الافلاک سے بعید تر ہے اوس کی حرکت بھی زیادہ بطی ہے اور جس قدر قریب تر ہے اُسی قدر حرکت بھی زیادہ سریع ہے کیونکہ قریب کو بہ نسبت بعید کے اصل محرک یعنے فلک الافلاک کی حرکت کا اثر زیادہ پہونچتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس بعید کو بہ نسبت قریب کے کم اور یہی وجہ تفاوت حرکت کی ہے۔ کسی دوسرے متضاد الجہتہ حرکت سے فرض کر لینے کی حاجت نہیں ہے۔ ہر فلک کے قطبین فلک مافوق کے قطبین سے ہٹے ہوے ہیں اور ہر فلک باتباع حرکت فلک مافوق اپنے محور پر پویسیر حرکت کرتا ہے۔ یہ دونوں حرکتیں مجتمع ہو کر ایک طرح کی کوکبی شکل پیدا کرتی ہیں۔ جس کے سبب سے ستارے شمال یا جنوب کے جانب جھکے ہوے نظر آتے ہیں۔

ابن طفیل کے تصنیفات میں کتاب حی بن یقظان نے بڑی مقبولیت پائی۔ ایک مرتبہ اصل عربی مع ترجمہ لاطینی سنہ ۱۶۷۱ء میں طبع ہوی اور پھر دوسری بار سنہ ۱۷۰۰ء میں چھاپی گئی۔ تین مرتبہ انگریزی زبان میں اور دو مرتبہ جرمن میں ترجمہ ہوا۔ اس رسالہ میں ابن طفیل ایک فرضی قصہ لکھتا ہے اور اوس کو بعض مطالب فلسفی اداکرنے کا ذریعہ گردانتا ہے فقط

عماد الملک

حضرت غالب مغفور

حضرت غالب مرحوم کی محض تعریف ہی تعریف کی جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی نہ اردو کے ذخیرہ میں اس سے کوئی مفید اضافہ ہوگا اور اگر مرحوم کے حالات زندگی و شاعری قلم بند کیے جائیں تو یہ امر بھی تحصیل حاصل ہے جبکہ تذکروں کے علاوہ ایک مبسوط و مکمل کتاب "یادگار غالب" موجود ہے اسلئے میں مرحوم کے کلام کے متعلق وہ باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور موجودہ کتب بھی اون کے اظہار سے ساکت ہیں۔

سب لوگ مرزا مرحوم کی شاعری کو ادق کہتے ہیں اور ادق سمجھے ہوے ہیں۔ مگر ان کے خصائص شاعری کے نکات کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔

دیوان غالب کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مرزا کی جدت پسند طبیعت مبتذل معانی سے تو کیا مبتذل الفاظ کے استعمال سے بھی ازبس نفور تھی جو الفاظ ایسے ہیں کہ ابتدائے شاعری سے آج تک دنیا بھر کے شعرا کے دواوین میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور نہ صرف الفاظ ہی کے ترک پر اکتفا کی بلکہ نئی نئی ترکیبیں بھی تراشیں اور ایسی بہتر تراشیں کہ اون کے کلام میں معلوم ہوتا ہے نگینے جڑے ہوے ہیں اون کی طبیعت برجستہ الفاظ کے ٹھیک مقامات کو پہچاننے میں بڑی قدرت رکھتی تھی جس کی وجہ سے اون کے کلام کی معانی میں وہ بات پیدا ہوگئی کہ لوگ اسے بے معنی کہنے اور سمجھنے لگے اور مرزا کی معنی آفریں طبیعت پر الزام دینے لگے حالانکہ یہ خود لوگوں کی سمجھ کا قصور ہے

مرزا غالب مرحوم لکھنو میں جب آئے ہیں تو یہاں اس زمانہ میں شاعری کا یہ رنگ تھا کہ "آفتاب ونچا ہوا اتنا کہ تارا ہو گیا" "دیلی پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں" "چاند کھڑا ہے دوپٹہ آسمانی چاہیئے" "لب نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی" "اوا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا" "وکیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو" "خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے"

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شاد ہو کر
زمیں کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎
"مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا"
"طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا"

دوسرے صاحب اس غزل کے جواب میں یوں گہر فشانی کرتے ہیں: ؎

ازل سے سلسلہ ہے اس جنون فتنہ ساماں کا
شگاف خامہ کن چاک ہے اپنے گریباں کا

کہیں اس شعر کا چرچا ہے کہ ؎
نہ پوچھو اہل محشر ہم سے دیوانوں کی بیتابی
یہاں مجمع سنا یاں بھی تلاش یار میں آئے۔

کوئی اس مطلع کو پڑھکر مزے لے رہا ہے کہ ؎

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوی دل نہ ہمارا ٹھہرا

کوئی اس مبالغہ و اغراق پر ناز کر رہا ہے کہ ؎

ناتوانی نے ہمیں رشک سلیماں کر دیا
جب ہوا آئی رواں اپنی سواری ہو گئی

کئی مطلع اور بھی مشہور تھے اور اوسی زمانہ کے نتایج افکار سے ہیں ؎

؎ تلوار کو اگر تو زیب کمر نہ کرتا
قاتل ادھر کی دنیا کوئی ادھر نہ کرتا

؎ اے آفتاب محشر نظروں سے گر گیا تو
منہ پھیر تا جدھر ہے میں پھر ادھر نہ کرتا

؎ ان انکھڑیوں میں اگر نشہ شراب آیا
سلام جھک کے کرو نگا جو پھر حجاب آیا

؎ جسکو رخ حسن مہ چار دہ کو بھول گیا
مراد پر جو ترا عالم شباب آیا

؎ ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے
کہ ہم تو لحد میں اکیلے رہے

؎ نبض بیمار جو اے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوی دنیا دیکھی

فارسی گویوں میں شہید وغیرہ لکھنؤ میں ہونگے جن کا اس وقت ایک ہی
مصرع مجھے یاد آیا " خود را بدست چاک گریباں فروختم "
غرض مرزا غالب نے جو غزل یہاں پڑھی سب لوگ اُسے سنکر مبہوت
ہوگئے ہونگے کہ یہ کیا روش ہے اور کیا طرز بیان ہے۔ وہ غزل یہ ہے

۵ یاں ہو چکیگی جو غش آتا ہے ہم ہی ہم کو   صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

یعنے لکھنؤ میں آکر مجھے غش یہ غش اس لئے آتا ہے کہ ارادہ یہ ہے اپنے
قدم چوم لوں۔
اردو میں پیہم کے سوائے ہم انھوں نے کبھی کاہیکو سنا ہوگا اسی طرح
صدرہ باندھنا یہ لوگ بھلا کیا جانیں۔ ۵

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے   کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

اس شعر میں بھی " ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو " اردو میں تازہ ترکیب
ہے جس سے اہل لکھنؤ کوسوں دور ہیں۔ ۵

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن   تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

نقش پئے مور کا طوق گردن ہونا انھوں نے کہاں سنا تھا اور نہ مبالغہ و
اغراق تو یہاں شعر کا جزو اعظم تھا بلکہ ہر جگہ بھی عالم تھا۔ ۵

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو   یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

نگاہ غلط انداز کی ترکیب غالب کے سوا دوسرے کا کام نہیں ۵

رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں   نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے ہم کو

شعر میں پہلے مصرع کی بندش سے کس قدر فارسیت کا زور ٹپکتا ہے کہ سننے
والے محو حیرت ہوگئے ہونگے۔ ۵

سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا   ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

جہاں اتنے نازک مضامین باندھے تھے ایک صاف شعر کہکے زبان کا
مزہ دکھا دیا۔ ۵

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار   پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو

بندش کا یہ طرز غالب کی خصوصیات سے ہے ولیکن کیا کریں۔
"ناچار ہیں" سب کہنا جانتے ہیں۔ مگر فعل کو حذف کرکے "ولیکن ناچار"
کہہ دینا عجب حسن ایجاز رکھتا ہے۔ ۵

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو   ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

اس طرح دونوں مصرعوں کی ترکیب کا متشابہ ہونا اردو میں غالب کا اختراع ہے

۵ لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنے   ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

۵ مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر   عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

۵ لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب   جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

اس زمانہ میں شبستان صفدر جنگ و برہان الملک کے آخری چراغ واجد علی
شاہ شمع سحری کی طرح جھلملا رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ غالب سے اور آخری
بادشاہ لکھنؤ سے ملاقات بھی ہوئی یا محروم پھرے۔ مگر مرزا اپنے بعض
مکاتبات میں خود لکھتے ہیں اور بدقسمتی کی شکایت کرتے ہیں کہ میں نے
والئی اودھ کی مدح کی تو اس کا تخت و تاج برباد ہوگیا۔ سلطنت جاتی رہی
والئی حیدر آباد کے لئے مجھ سے نہ کہو کہ قصیدہ لکھوں یعنے میری شومئی
طالع کا اثر اجازت نہیں دیتا کہ دکن کی سلطنت کو بھی مدح کرکے ضرر پہونچاؤں
اوس زمانہ کی شاعری میں معشوق کے جتنے نام تھے صنم و قمر و پری رو
دلبر و گلرو وائے جان وائے ماہ وائے گل وائے بت و جانان و رشک
مسیحا و غیرت گل و رشک پری و رہ کش حور وغیرہ غالب نے سب ترک
کردئے انھیں گوارا نہ ہوا کہ وہ الفاظ جو مبتذل ہوچکے ہیں اون کے قلم
سے بھی نکلیں۔ اسی طرح ہر ایک معمولی و مبتذل ترکیب جو فارسی سے
اردو میں شعرائے قدیم نے لے لی تھی انھوں نے ترک کردی گویا شعر
کی زبان ہی نئی بنالی۔ ہر لفظ میں جدت اور ہر ترکیب میں ندرت
پیدا کردی۔ اس کے علاوہ معنی کی نزاکتیں مرزا بیدل کے رنگ میں
ڈوب کر فارسی ترکیبوں کے ساتھ دست و گریبان کردیں کہ اردو
میں کبھی کسی نے نہ سنی ہونگی۔ پھر زبان کے مزہ کو بھی نہ چھوڑا۔ جہاں
صاف کہا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ مثلاً

؎ پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی۔ اب کسی بات پر نہیں آتی۔

؎ نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

؎ میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

؎ نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

؎ بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

؎ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا۔ اور اٹھکے قدم میں نے پاسبان کیلئے

رشک کا مضمون اس سے بہتر نہیں سننے میں آیا۔ ؎

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں جسکے شانہ پر تری زلفیں پریشان ہو گئیں

حق یہ ہے کہ نازک خیالی میں بیدل سے یہ بڑھ گئے اور بیدل جلال اسیر کا جواب دینے پر زہر کھائے ہوئے تھے اسیر کا یہ مطلع مشہور ہے۔ ؎

جنون مستی و ہوشیاری آزمود مرا زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا۔

اس مطلع کا جواب اگر دیا تو غالب نے دیا اور مضمون کو بہت بلند کر دیا۔ کہتے ہیں۔ ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

ان کے نازک اشعار میں یہ مطلع مجھے نہیں بھولتا۔ ؎

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اور یہ شعر بھی نہایت نازک ہے۔ ؎

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

گو مرزا کا کلام اردو شعرا کے کلام سے الگ ہے اور اس کا رنگ اردو کے کسی شاعر کے کلام سے نہیں ملتا۔ مگر غور کیا جائے تو بعض شعرائے فارسی کے کلام کی بو مرزا کے کلام میں ضرور پائی جاتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل و جلال اسیر و ناصر علی و شوکت بخاری کی خیال بندی و معنی آفرینی کی کمی کو مرزا کے کلام نے پورا کر دیا ہے جو اردو میں ناپید تھی۔ اگرچہ اس قسم کی معنی آفرینی و خیال بندی میں مومن نے بھی حصہ لیا

مگر حضرت غالب کی طرز غالب ہے۔ مرزا مرحوم کی طبیعت تصریح کی جگہ کنایہ استعمال کرنے اور خبر کو انشا کی صورت میں ادا کرنے اور تشبیہ غیر متحرک بہ متحرک کو کلام میں لانے کی طرف راغب تھی۔ اس پر بندش او طرز ادا کے کمال سے مرحوم کے کلام کو اردو شاعری کے دربار میں ممتاز جگہ مل گئی۔

حضرت غالب کا بھی ایک مختصر و منتخب دیوان اردو نہیں ہے بلکہ فارسی میں نظم و نثر کا ضخیم کلام نیز اردو میں نثر اردوے معلیٰ و عود ہندی ایسی کتابیں ہیں جو فارسی و اردو کے خزاین ہیں گرانمایہ گوہر کہلانے کے مستحق ہیں اور ہر ایک کتاب اپنی جگہ لاجواب ہے زبان اردو فارسی دونوں کو حضرت غالب کے تصانیف سے مدد ملی اور مل رہی ہے

چونکہ غالب مرحوم کو زبان فارسی سے خاص دلچسپی تھی اس لئے ان کا فارسی کلام بھی اہل زبان کی طرح شیرین و دلکش ہے اور کیا نثر کیا نظم زبان کی خوبی کے ساتھ معانی و بیان کی خوبی سے بھی مزین ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جیسا ادق کلام اون کا اردو کا ہے ویسا فارسی کا نہیں ہے نثر اردو تو اس قدر سہل و آسان ہے جس کو سہل ممتنع کہنا بجا ہے۔ اور یہی حال اردو دیوان کے بعض سلیس اشعار کا ہے کہ الفاظ تو عام فہم ہیں لیکن معانی کی خوبی جو اُن میں ہے وہ عام لوگ تو کیا خاص لوگ بھی نہیں پا سکتے چنانچہ یہ شعر ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

جن لوگوں نے حضرت غالب کا کلام نظم و نثر اردو و فارسی بالاستیعاب دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ غالب مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان کہنے پر قادر تھے نہ یہ کہ اُن کے دیوان اردو کے بعض اشعار کو دیکھ کر اون کو ادق گو کہہ دینا سہل ہے اور کلام کو بے معنی کہنا قصور فہم جب حضرت غالب کے سلیس اشعار کی معنوی و لفظی صنعتوں ہی کو نہیں سمجھ سکتے تو دقیق اشعار کو کیا سمجھیں گے اور نہ سمجھنے پر اشعار ہی کو بے معنی کہہ دینا آسان ہے۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ۔ زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

اس شعر میں کوئی لفظ دقیق نہیں ہے مگر اس کا کیا علاج کہ معمولی فہم اس کے حسن بیان کے سمجھنے سے قاصر ہے یہ شعر اون کا کس قدر صاف ہے کہ

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ۔ ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

ایک صاحب کسی بزرگ کی شرح میرے پاس لیکر آئے کہ دیکھئے عجیب معنی اس شعر کے حضرت شارح نے بیان کئے ہیں یعنے اے ساقی ہم جو آج نشہ میں گر پڑے ہیں۔ تو ہمارے اس گرنے کی شرم کرو۔ شرح میں یہ دیکھکر مجھے حیرت ہوی کہ جب صاف شعروں کا مطلب یہ بزرگ نہیں سمجھ سکتے تو نازک اشعار کو کیا خاک سمجھے ہونگے۔ مگر میں نے یہ تاویل کرلی کہ لوگوں کا امتحان کرنے کے لئے عمداً ایسا کیا ہوگا۔ آیندہ چلکر اصلی معنی بتادینگے

چند اشعار زبان کی بے تکلفی اور مضامین عالیہ کے درج ذیل کیے جاتے ہیں

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے ۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۔ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں ۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

چھوڑونگا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا ۔ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا ۔ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ۔ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے ۔ کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں ۔ کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ۔ سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب ۔ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ۔ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں ۔ پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

یہ اشعار کتنے صاف ہیں لیکن ان کی خوبیوں کو وہ شعرا سمجھنے سے قاصر ہیں جو محض نام کے شاعر ہیں اور علم بیان و معانی سے ناواقف الفاظ کی ظاہری خوبی پر داد تو دینگے مگر معنوی خوبیوں کے نہ جاننے سے اون کی داد تحسین ناشناس اور بیداد ہوگی۔

ان اشعار کی بلاغت اور جدت قابل غور ہے:۔

مجھے اب دیکھکر ابر شفق آلودہ یاد آیا ۔ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

لیتا۔ نہ اگر دل تمھیں دیتا۔ کوئی دم چین ۔ کرتا۔ جو نہ مرتا۔ کوئی دن آہ و فغاں اور

مرگیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے ۔ بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا ۔ آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۔ میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۔ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو ۔ وہ سنکے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا ۔ کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۔ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی۔

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں ۔ شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

جو لوگ فصاحت و بلاغت سے کورے ہیں وہ ان اشعار کے معنی سمجھتے تو خاک نہیں مگر اپنے مذاق کم فہمی کے موافق اپنے دل میں اشعار کے عیوب ٹھہرا لیا کرتے ہیں۔

حضرت غالب مبتذل مضامین کو باندھتے نہیں اور جب باندھتے ہیں تو اس طرح باندھتے ہیں:۔

وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا ۔ لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے ۔ شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

دیکھئے مبتذل مضمون میں کتنی خوبی بڑھادی ہے ناواقف شعرا ان کو

کو کیا جانیں سخن کی خوبی جبھی سے ہے کہ موقع سے خبر کو انشاء اور حقیقت کو
مجاز اور تصریح کو کنایہ کی صورت میں ادا کیا جائے مرزا مرحوم کے کلام
میں کثرت سے ایسی خوبیاں ہیں۔ اور زیادہ تر خوبی اُن اشعار میں ہے
جس میں مرحوم نے تشبیہ متحرک بہ متحرک دی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

؎ نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے ؛ لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

اس میں وجہ شبہ حرکت ہے۔

؎ جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا ؛ تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اس شعر میں وجہ شبہ حرکت و سکون سے مرکب ہے۔

؎ اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور ؛ دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

حرکت وجہ شبہ میں داخل ہے۔

؎ باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے ؛ سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

کیا خوب تشبیہ ہے۔

؎ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ؛ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

بالکل نئی تشبیہ ہے۔

لفظی رعایت یا ضلع کی صنعت ایک رکیک صنعت ہے مگر حضرت غالب
کے کلام میں بے ساختہ بندھ گئی ہے تو مزہ دے جاتی ہے۔

؎ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا ؛ دی ہے جائے دہن اُس کو دم ایجاد نہیں

؎ دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ؛ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

میں نے خیال کیا تھا کہ اشعار مرزا غالب کے متعلق جواب تک لکھے
گئے ہیں تشریح بھی کر دی جائے مگر پھر اس خیال نے کہ مبتدیوں کے لئے
وہ تشریح غیر مفید ہوگی کہ وہ انتہائی باتیں یکایک سمجھنے سے قاصر ہونگے
اور منتہیوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں صرف ان کی توجہ غالب مرحوم
کی خوبی اشعار کی طرف منعطف کرنے کے لئے میں نے اختصار سے کام لیا ہے
اور وہ لوگ جو مرزا مرحوم کے اشعار کی خوبی کو نہ سمجھکر اشعار کو مہمل و
بے معنی کہتے ہیں ان کے لئے یہ مختصر سے نوٹ اشعار کے بامعنی و فصیح
و بلیغ ہونے کے لئے بس ہیں۔

یہ خیال بھی لوگوں کا غلط ہے کہ غالب کے کلام میں تصنع بالکل نہیں یا
انتہا کی بناوٹ کرتے ہیں مگر وہ جو کسی کو نہ سوجھی تھی مثلاً

؎ کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ؛ ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

؎ نہیں تعلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا ؛ کہ پشت چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

؎ جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ؛ تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

حضرت غالب کے تصانیف نظم و نثر اردو و فارسی میں دیوان اردو اور نثر کا
حصہ ایسا ہے جو سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہے دیوان اردو تو اپنی فصاحت
و بلاغت کی دقت کی وجہ سے اور نثر غالب (فارسی) طبع کی بے حد غلطیوں
کے سبب سے۔ مدارس کے کورس میں اردو اشعار اور فارسی خطوط کا
انتخاب شریک تو ہوتا ہے لیکن معلم جب خود ہی نہ سمجھتے ہوں اور
اصلاح اغلاط کی لیاقت نہ رکھتے ہوں تو متعلم ایسے زبردست شاعر کے
کلام نظم و نثر کی خوبیوں سے کیا استفادہ کر سکیں گے اور عام بے قدری
کی یہ حالت ہے کہ کلیات نثر غالب کو کسی نے صحیح کر کے خوشخط اب تک
نہیں چھپوایا۔ اگرچہ دیوان اردو کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں مگر عام تو اکثر فن شاعری
کی بے قدری و بدشوقی کا یہ عالم ہے کہ اشعار غالب کی خوبیوں کو معلوم کر کے حظ
روحانی حاصل کرنے کی طرف رغبت ہی نہیں کرتے۔ یوں تو اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ
بہت سے گزرے مگر جو فائدہ مرزا کے تصانیف سے عام و خاص کو پہونچ رہا ہے
اور جیسی قدر اس واجب القدر شاعر کی کرنے کی ضرورت ہے اس کا
لوگوں کو ہنوز کما حقہ احساس نہیں ہوا ہے ورنہ کیا معنی کہ معمولی شعرا کا کلام
تو لکھائی چھپائی کے خاص اہتمام سے نکلے اور اوس زبردست شاعر کا
کلام جس سے مستفید ہو کر لوگ نثر و نظم کی خوبی سے واقف ہوں اپنے
حالت ابتدائی میں ہے۔ یہ سنکر اور دیکھکر کہ ان شعرا کے کلام جو چھپنے پر
محض زینت کتب خانہ ہوتے ہیں خوبی کے ساتھ چھپتے جائیں اور جن سے
فیض عام ہوتا ہے وہ بے قدری کے ہاتھوں بحض معنوی خوبی اور ظاہری

بداسلوبی میں رہیں۔ نہایت افسوس ہوتا ہے کہ کیا خوب ہو اگر صیغہ دائرۃ الادب حضرت غالب کے کل تصانیف کو ظاہری حیثیت سے بھی آراستہ وپیراستہ کرنے کی طرف عملاً توجہ کرے۔

سید غلام مصطفیٰ ذہین

نفس جسم وجسمانی کیوں نہیں؟

جو جسم ہوگا مرکب ہوگا۔ اور انقسام پذیر ہوگا چنانچہ جس جسم کو ہم فرض کریں خواہ وہ کتنا ہی خفیف حتیٰ کہ بال کی نوک کا سوان حصہ ہی کیوں نہ ہو انقسام پذیر ہے انقسام پذیر ہونا اس طرح ثابت ہے کہ اوس جسم کو جس کو کہ ہم نے فرض کیا ہے جب دو اوس جیسے جسموں کے درمیان فرض کریں تو اوس کے کنارہ کے دو جسم اوس کے ایک ایک کنارہ سے مس ہونگے جو جسم کہ ایک کنارہ سے مس ہوگا وہ دوسرے کنارے سے مس نہ ہوگا مثلاً ایک نقطہ ہے جسکو ہم نقطۂ (بے) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس نقطۂ بے کے سیدھے طرف ایک نقطۂ لگائیں گے جس کو نقطۂ (الف) کے نام سے نامزد کرینگے اور اس نقطۂ بے کے بائیں طرف ایک نقطہ رکھیں گے جسکو نقطۂ (جیم) کے نام سے موسوم کیا جائیگا بایں شکل جو نقطۂ (الف) کے نام سے موسوم ہے وہ نقطہ (بے) کے سیدھے کنارہ کو مس کرتا ہے اور جو نقطہ جیم کے نام سے موسوم ہے وہ نقطہ (بے) کے بائیں کنارہ سے مس کرتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ نقطہ الف سیدھے اور بائیں کنارہ سے مس کرے اور نقطہ (جیم) بائیں اور سیدھے یعنے دونوں کناروں سے مماس ہو یا یہ کہ نقطۂ الف بائیں کنارہ سے مماس ہو اور نقطہ جیم سیدھے کنارہ سے اجب اس طرح مان لیا جائیگا تو نقطۂ (بے) جو درمیان میں واسطہ مفروض کیا گیا ہے، واسطہ نہ رہیگا اور یہ بھی خلاف مفروض ہوگا۔ علاوہ ازیں تداخل اجسام لازم آئیگا! جو ازروئے فلسفہ ناممکن ہے۔ تداخل اجسام اس کو کہتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز میں مل جائے اور اس چیز کے جسم اور وزن میں زیادتی نہ ہو۔ پس جب ایسا نہیں ہوسکتا تو نقطۂ (بے) درمیانی رہا اور نقطۂ (الف) سیدھے جانب مماس ہوا اور نقطۂ (جیم) بائیں جانب کو جس سے درمیانی نقطہ کے دو جانب نکل آئے جس کو کہ ہم سیدھا اور بایاں کہہ رہے ہیں اور جو سیدھا جانب ہے وہ بایاں نہیں اور جو بایاں جانب ہے وہ سیدھا نہیں درحالیکہ دو سمتیں قایم ہوگئیں (نقطۂ بے) دو جانبوں میں تقسیم پایا اس کے انقسام پذیر ہونے کو ثابت کرتا ہے پس تمام جسم والی حتیٰ کہ جزو لایتجزیٰ جو مادہ کی پہلی حالت یا مادہ کا میدار یا صورت اولیٰ ہے جس سے کہ تمام مادیات ترکیب پائے ہیں اون کی تقسیم بھی ممکن ہوگئی جزو لایتجزیٰ کیوں تقسیم پذیر نہ ہو...... فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ جو کل میں ہوگا وہی اوس کے جزو میں ہوگا جبکہ مادہ قابل قسمت ہے تو اجزائے لایتجزیٰ جو مادہ کے جزو ہیں وہ بھی قابل قسمت ہونا چاہئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جزو لایتجزیٰ کے بھی جزو ہوتے ہیں تو پھر اس کو جزو لایتجزیٰ کیوں کہتے ہیں؟ ہر ایک علم کے حدود ہیں! اصطلاح میں جزو لایتجزیٰ کو لایتجزیٰ اس لئے کہتے ہیں کہ اوس کی تقسیم عملی ہم سے ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ ہمارے پاس اس قدر باریک سے باریک وجود کے تقسیم کے لئے کوئی آلہ موجود نہیں ہے مگر قدرت نے خود ہم میں ایک

ایسا آلہ رکھا ہے جس کو ہم قیاس سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس سے اس کی تقسیم ہو جاتی ہے! لیکن آلہ قیاسی سے تقسیم بھی قیاسی ہوتی ہے چونکہ قیاس صرف قیاس ہی رہتا ہے مشاہدہ کے حد میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ جزو لایتجزی ہے (بہ لحاظ ہمارے مشاہدے کے) اور قیاس ہمارا یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر ایک جسم کا جب تجزیہ کیا جائے تو اوس کے اجزا نکلتے جائیں گے۔ پھر اس اجزا کے جزو اور جزو کے اجزا اسی طرح جزو در جزو سلسلہ چلا جائیگا۔ آخر چلکر کسی ایسے جزو پر انتہا کرنا ہوگا اور ماننا پڑیگا کہ قابل تجزیہ نہیں ہے۔ ورنہ تسلسل قایم ہو جائیگا اور یہ سلسلہ تا قیامت بھی ختم نہ ہوگا۔ اس صورت میں علم کو آگے قدم بڑھانے کی فرصت نہ ہوگی وہ صرف تقسیم در تقسیم تجزیہ در تجزیہ ہی میں لگا رہیگا تو دوسرے مسایل ذیلی کی نوبت کہاں آئیگی۔ اس لئے معقول میں تسلسل معیوب ہے۔ جزو کرتے کرتے تجزیہ کرنے والے ایک ایسے جزو تک تجزیہ کو پہونچا کر رہیں گے جس کے جزو بہ لحاظ عمل و مشاہدہ ہونا ناممکن تھا پس ان لوگوں نے اسی کو مادہ کی صورت اولی مانا۔ اور مادہ کا اطلاق اس حد سے لیکر تمام ذیلی حدوں و مرتبوں تک کیا اور اوس کے اوپر کے مراتب کو مادہ سے خارج کرکے اس کا نام قوت رکھا (یعنے قوت وہ وجود ہے جس کے اجزا قیاسی و عملی طور پر بھی ناممکن ہیں) بعض فلاسفر جدید کی تحقیق سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پہلے خدا نے قوت پیدا کی۔ اس قوت وجود نے حالت لطیف سے تنزل کرتے کرتے وہ درجہ اختیار کیا کہ اس کے وجود میں اجزاء لایتجزی کی شان نمایاں ہوی۔ یعنے اس درجہ کی کسافت اس میں آگئی کہ اس کے جزو کو گو ہم عملی طور پر نہ نکال سکیں۔ مگر قیاسی طور پر اس کے وجود کے اجزا کو جزو لایتجزی کہہ سکیں۔ یعنے جزویت تو اس میں مقیس ہے مگر اس جزو میں تقسیم عملی ناممکن ہے۔ پس جب ان لوگوں نے ایک ایسا وجود پایا کہ جس میں جزو پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ کہ وہ لایتجزی ہی کیوں نہ ہوں اوس وجود کو مادہ کی حد میں داخل کر لیا۔ اور اسی حالت کو مادہ کی صورت اولی مانا۔ اور اسی مقام سے تسلیم کیا گیا۔ اور اس کے اوپر کے مراتب پر مادہ کا اطلاق نہ ہو سکا کیونکہ مادہ کی تعریف فلسفہ میں یہ ہے کہ مادہ وہ شئے ہے جو قابل قبول صورت ہو یعنے اس کے لئے کوئی نہ کوئی شکل قایم ہو جائے جب شکل قایم ہوی تو آپ یہ سمجھیں کہ تقسیم بھی ہو گئی۔ شکل کا اطلاق ہر سطح ہر معرض اور ہر طول شئے پر بھی ہوگا پس ایسے وجود کو جس پر قیاسی عرض و طول و سطح قایم ہو اوس کو مادہ کی حد میں داخل کرنا بیجا نہیں کیونکہ مادیت کی تعریف کا اطلاق اس پر بھی ثابت ہے۔ اور جسم وہی ہوگا جو مادہ سے مرکب ہو۔ جسم کا اطلاق اسی جزو پر ہوگا جس پر کہ مادہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ اطلاق جسمی فلسفہ کا اصطلاحی اطلاق ہے۔ یعنے فلسفہ میں جسمانیات انہیں اجزا کو کہتے ہیں جو مادہ سے مرکب ہیں یا مادیت کا اون پر اطلاق ہوتا ہے اور اون اجزا کو جو مرکب نہیں ہیں اور جن پر مادہ کا اطلاق نہیں ہوتا اون کو جسمانیات یا جسمانی نہیں کہتے بلکہ اون پر وجود کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً وجود باری وجود روح۔ آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ جسم باری یا جسم روح کہتے ہوں! اگر کوئی روح کو یا خدا کو جسم کے ساتھ تعبیر کرے تو وہ اس کی اصطلاح فلسفیانہ سے محض ناواقفیت ہے پس روح جو ایک وجود قوی ہے اس کے متعلق کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جسم یا جسمانی ہے اب رہا یہ امر کہ روح کو وجود قوی کس طرح مانیں۔ سائنس و طبعیات کے مسایل کی طرف غور کرنے سے طبیعین علمائے سائنس اس بات کے مقر ہیں کہ مادہ جبکہ صورت اولی میں تھا یعنے جزو لایتجزی کی شکل تھی اور ابھی شکل و شبیہ اختیار نہیں کیا تھا تو ان اجزاء لایتجزی میں کوئی قوت ضرور تھی جو ان اجزا کو باہم دیگر ملا کر اجسام بنا رہی تھی خواہ اوس کو کشش کہو یا جذب مگر ان میں قوت کو ضرور ماننا پڑیگا اسی قوی وجود کو روح کیوں نہ کہو۔ کیونکہ دو وجود پائے جا رہے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جس پر مادہ کی حیثیت سے

لفظ جزو لایتجزی کا اطلاق ہو رہا ہے اور دوسرا وہ وجود جس پر صرف لفظ قوت عاید ہے جس کو میٹر (Matter) سے آپ تعبیر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کیلئے اگر وجود قوت یعنے روح تسلیم کر لیا جائے تو وجود روح کے مادہ سے جدا سمجھنے کے لئے سہولت ہوگی۔ گو وجود روح کی حقیقت اس سے بہت اوپر ہے گو اس سے اوپر آپ کی عقل کی رسائی نہیں۔ اسلئے اسی کو روح تسلیم کر لیا جائے تو مادہ کے سوائے ایک وجود الطف آپکے علم میں آموجود ہوگا اور ثابت ہوگا کہ جس کو ہم روح کہتے ہیں وہ مادیت سے بری ایک اور چیز ہے۔ مادیت سے بری ہونا جسم و جسمانی نہونے کے لئے کافی ہے۔

ہم اصل مقدمہ کو چھوڑ کر کہاں سے کہاں نکل گئے انقسام جسم کو ثابت کرتے کرتے چوکہ مقدمہ قبضہ غیر جسمانی روح تھا! روح کا غیر جسمانی ہونا ثابت کر بیٹھے۔ حالانکہ ابھی اخلاق ناصری کا ادعا و ثبوت مع دلایل و براہان کچھ بھی بیان نہیں ہوا۔ لاحول ولا قوۃ۔

مصنف صاحب اخلاق ناصری فرماتے ہیں کہ جب اس طرح پر جسم تقسیم پذیر ہوتا ہے تو جو چیز جسمانی ہوگی وہ محمول و مقبول جسم کی ہوگی اور اگر نفس کو جسمانی مان لیا جائے تو نفس بھی قسمت پذیر ہوگا کیونکہ انقسام محل سے انقسام حال لازم آتا ہے درحالیکہ نفس کی بساطت ثابت ہو چکی ہے تو پھر اس کی تقسیم کیونکر ممکن ہے جب تقسیم ممکن نہیں تو وہ جسم و جسمانی بھی نہیں۔

(۲) دوسری دلیل روح یا نفس کے جسمانی ہونے پر یہ ہے کہ کوئی جسم کسی صورت کو قبول نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ پہلی صورت کو نہ چھوڑ دے۔ مثلاً جو جسم کہ شکل مثلث رکھتا ہوگا جس وقت وہ شکل مربع اختیار کریگا تو شکل مثلث چھوٹ جائیگی! موجودگی صورت اولی صورت ثانی اوس پر طاری نہ ہوسکیگی۔ یہ بات تمام اجسام کے لئے لازمی ہے۔ برخلاف اسکے ہم دیکھتے ہیں کہ نفس مختلف صورتوں کا تصور کرتا ہے اور ہزاروں چیزوں کا نقش متفرق اس میں منقش ہوتا ہے مگر پہلی صورتیں اور پہلے نقوش اس سے محو نہیں ہوتے! بدیں لحاظ یہ خاصیت خواص اجسام کی ضد ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ نفس جسمانی نہیں ہے!

(۳) تیسری دلیل نفس یا روح کے جسمانی نہ ہونے پر یہ ہے کہ کوئی جسم دو متضاد کیفیتوں کو ایک حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ جیسا کہ کوئی جسم کبھی ایک ہی وقت میں سپیدی و سیاہی کو قبول نہیں کر سکتا اور جسم کی یہ بھی خاصیت ہے کہ جس کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اوس سے متکیف بھی ہوتا ہے جیسا کہ حرارت سے حار اور سواد سے اسود۔ برعکس اس کے ہم نفس کو دیکھتے ہیں کہ نفس وقت واحد میں سردی، گرمی، سپیدی، اور سیاہی کا ادراک کرتا ہے لیکن سردی کے ادراک سے سرد اور گرمی کے ادراک سے گرم نہیں ہوتا یہ خاصیت زد ہی خاصیت اجسام کی ہے پس ثابت ہوا کہ نفس جسمانی نہیں ہے ورنہ اسکی بھی یہی خاصیت ضرور ہوتی

(۴) چوتھی دلیل نفس کے جسمانی نہ ہونے پر یہ ہے کہ تمام قوائے جسمانی و مدرکات جسمانی لذائذ جسمانی کی طرف مایل ہیں اور اون سے حظ پاتے ہیں۔ اور اون کے حظوظ سے اون کو قوت حاصل ہوتی ہے مثلاً باصرہ سبزہ زار میدانوں اور عمدہ منظروں کے دیکھنے سے راحت پاتی ہے اور بصارت میں تازگی آتی ہے۔ برخلاف اس کے نفس ان قوائے جسمانی کے حظائظ و لذائذ سے ناتوان ہو جاتا ہے بلکہ ترک خواہشات قوائے نفسانی کے اس میں قوت پائی جاتی ہے اور اس کا کمال ہوتا ہے مثلاً ترک غذا و ترک سمع و ترک بصر سے یا روزہ گوشہ گیری کہ جس سے ترک سمع و ترک غذا و ترک بصر ہوتا ہے تیز حبس دم وغیرہ سے کہ اس میں تمام حواس معطل کئے جاتے ہیں بدرجہ کمال ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نفس جسمانی نہیں ہے۔

(۵) پانچویں دلیل یہ کہ تمام حواس جسمانی اپنے محسوس کے سوا

دوسری چیز کو دریافت نہیں کرسکتے۔ نہ خود کو نہ اپنے آلہ کو جیسے
آنکھ سوائے اپنے مبصرات کے دوسرے چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے
نہ خود کو جان سکتی ہے نہ اپنے آلہ حدقہ چشم کو اسی طرح کان
سوائے مسموعات کے دوسری چیزوں کا ادراک نہیں کرسکتے ہیں
اور نہ خود کو پہچان سکتے ہیں نہ اپنے آلہ کو۔ اور حواس کو اپنے محسوسات
کے احساس میں جو غلطی واقع ہوتی ہے انھیں اس کا بھی علم نہیں
ہوتا مثلاً آنکھ چشمہ آفتاب کو بقدر ایک بالشت کے دیکھتی ہے
حالانکہ وہ زمین سے کئی کروڑ درجہ بڑھا ہوا ہے مگر اس کو اپنے اس
احساس کی غلطی کا علم بطور خود نہیں ہوتا اس سے ظاہر ہوا کہ ان
حواس جسمانی کے سوائے کوئی ایسی چیز بھی ہے جو ان کے غلطیوں سے
واقف ہوتی اور بتلاتی ہے کہ فلاں حس نے احساس میں یہ غلطی کی اور
غلطی کی وجہ یہ ہے اور اوس کو یہ بھی معلوم ہے کہ فلاں حس کا یہ خاصہ
ہے اور فلاں کا یہ آلہ ہے۔

جب ہم تمامی حواس عشرہ کے افعال اور خواص پر غور کرتے ہیں تو معلوم
ہوتا ہے کہ حواس جسمانی کا کام یا قوائے جسمانی کا فعل خود اون کے
لئے نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دوسرے ہی کے لئے ہے۔ جیسے آنکھ جو دیکھتی
ہے تو اوس دیکھنے کا فائدہ خود ذات چشم کو کیا حاصل ہے۔ یا
کان سنتے ہیں تو خود قوت سامعت اس سے کیا حظ و فائدہ پاتی ہے
بلکہ یہ سب ایک دوسرے ہی چیز کے فایدے اور حظائظ کے لئے بطور
آلہ کے کام کرتے ہیں، جو اون کے افعال سے مستفید ہوتی ہے جیساکہ
قلم جو کاتب کے کتابت کا آلہ ہے خود ذات قلم کو اوس کے فعل تحریر سے
کیا فائدہ ہے البتہ کاتب کے لئے اوس کا فعل فایدہ بخش ہوتا ہے
یا قوت دافعہ جو بول و براز کو خارج کرتی ہے اوس کے اس اخراج سے
قوت دافعہ کے لئے کیا فایدہ ہے؟ بلکہ ان تمام قوا و حواس کا فائدہ
نفس کے لئے ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ تمام جسمانی قوا و حواس کی حقیقت
ایک آلہ سے زیادہ نہیں ہے جو چیز جسمانی ہوگی وہ بھی آلہ سے زیادہ
حقیقت نہیں رکھتی اگر ہم نفس کو بھی جسمانی مانیں تو نفس بھی ایک آلہ
سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ خلاف مشاہدہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ
نفس ان تمامی حواس و قوا سے مستفید ہوتا ہے اور تمام آلات کے
ذات اور صفات کو جانتا ہے اور اون کے اغلاط سے آگاہ ہوتا ہے"
یہ خاصیت منافی خاصیت آلہ ہے" پس حاصل اس قدر ہے کہ تمام
قوا جسمانی و حواس او جسم جو مجموعہ ہے قوا و حواس کا وہ ایک آلہ ہے
جس کا استعمال کرنے والا نفس ہے اگر نفس کو بھی منجملہ قوا و حواس
جسمانی کے مان لیا جاے تو پھر اس مشین کا چلانے والا کوئی اور ہی
ہوگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نفس کے سوا اون کا استعمال کرنے
والا اور اون سے مستفید ہونے والا۔ اون کا مالک اور اون کا
مختار دوسرا کوئی نہیں ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفس
منجملہ جسم یا جسمانیات کے نہیں ہے بلکہ اوس کا وجود جسم کے سوائے
کوئی اور ہی شئے ہے!!!

خواجہ معین الدین

موجودات عالم میں انسان جس کو اشرف المخلوقات بنایا وہ اس کا خمیر یا اوس کا نفس ہے جو عجیب و غریب قوتوں کا منبع اور حیرت انگیز ملکات کا مجمع ہے۔ نفس انسانی ہستی کا وہ حصہ ہے جو غور و فکر کرتا ہے۔ یاد رکھتا ہے استقلال کرتا اور حواس ظاہری کے ذریعہ سے خارجی اشیاء کے ساتھ علاقہ رکھتا ہے اور اون سے متاثر ہوتا رہتا ہے آج تک کامل طور پر یہ تحقیق نہیں ہوا کہ ان کا نفس پر کیونکر عمل ہوتا ہے لیکن مشاہدہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ واقعات فی الحقیقت صحیح ہیں اور نفس کی ماہیت ان ہی واقعات پر غور کرنے سے منکشف ہوتی ہے۔

نفس کے فواید

نفس کا علم جو مشاہدہ ذات انسانی سے حاصل ہوتا ہے بہت مفید اور بکار آمد ہے بغیر اس علم کے دیگر علوم سے پورا پورا فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک انسان کے نفس کا پورا علم نہ ہو زبان اچھی طرح نہیں سمجھی جا سکتی علم ادب و فنون لطیفہ کی خوبیوں کی پوری طرح قدر نہیں ہوتی کیونکہ تمام علوم نفس انسانی ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعلیم۔ دیوانوں کا علاج۔ مجرموں کی اصلاح کے طریقے علم النفس ہی کے مطالعہ سے متحقق ہوئے ہیں۔

نفس و مادہ کا تعلق

نفس اگرچہ فی الاصل مادی شئے نہیں ہے لیکن انسان کی ہستی جسم اور نفس سے مرکب ہے اور ان دونوں میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ایک کا وجود بغیر دوسرے کے قایم نہیں رہ سکتا۔ دل خوش ہو تو لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے ذرا تکلیف ہو تو چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے استعجاب کی حالت میں آنکھیں حیرت سے تکنے لگتی ہیں۔ خوف سے سارا بدن کانپ اٹھتا ہے محبت میں آواز اور لہجہ میں انس و شفقت پیدا ہو جاتی ہے اور غصہ میں تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں غرض ہر قسم کی کیفیات طبیعی کا اظہار خود بخود جسمانی اعضا سے ہوتا ہے اور اگر انسان زبردستی سے چھپانے کی کوشش نہ کرے تو دوسروں کو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ نفسانی تاثرات کس درجہ پر ہیں اس کے علاوہ اگر جسمانی قوا میں کوئی تغیر ہو تو ساتھ ہی نفسانی قوتوں میں فرق آجاتا ہے اور اسی طرح نفسانی قوا کا تغیر جسمانی حالت میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً جسمانی تکالیف اخلاقی حالت کو بالکلیہ بدل دیتی ہیں۔ بھوک۔ تکان۔ صاف و مکدر ہوا۔ سردی۔ گرمی نشئی اشیا جسمانی صدمات۔ بیماری۔ خواب اور بڑھاپا تاثرات و جذبات نفسانی پر بے انتہا اثر ڈالتے ہیں جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ قوت حافظہ گھٹتی یا بڑھتی جاتی ہے۔ عمدہ صحت کی حالت میں قوت حافظہ تیز اور تکان و علالت کی حالت میں کمزور ہوتی ہے اس طرح سے جذبات نفسانی جسمانی حالت پر اثر ڈالتے ہیں رنج و خوف کی حالت میں بھوک پیاس بند ہو جاتی ہے نیند اڑ جاتی ہے۔ غور و فکر اگر حد سے زیادہ کیا جائے تو جسم بھی ضعیف و بیمار ہو جاتا ہے غرض انسان کا ہر فعل جسم و نفس کی مشترک کوشش سے ظاہر ہوتا ہے اور یہی حالت اوس کی صحت و حیات کی ہے۔

مادہ پر نفس کا انحصار نہیں ہے

حواس ظاہرہ۔ خارجی اشیا کے عمل کے بغیر اپنا کام نہیں کر سکتے۔ مثلاً اگر روشنی اور کوئی منعکس شئے موجود نہ ہو تو آنکھ نہیں دیکھ سکتی اگر ہوا کی وساطت نہ ہو تو کان نہیں سن سکتے۔ لیکن نفس کا انحصار خارجی اشیا پر اس قدر

نہیں ہے کہ بغیر ان کے وہ کام ہی نہ کر سکے۔ اوس کو صرف ایک دفعہ کسی شئے کا علم ہونا کافی ہے۔ جب یہ علم ایک دفعہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ہمیشہ قایم رہتا ہے اور جب چاہیں ذہن میں آسکتا ہے اس کے علاوہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ نفس کرتا ہے لیکن کسی آدمی یا خارجی شئے کا اسمیں لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ جو چیزیں مدت سے ناپید ہو گئی ہیں۔ ذہن میں اسی طرح قایم رہتی ہیں بھولے ہوے واقعات جب یاد کرتے ہیں تو ذہن میں ہو بہو تصویریں پھر جاتی ہیں ایسے اشیا اور منظر تصور میں پیدا ہوتے ہیں جو کبھی دیکھے بھی نہ تھے۔ نفس یاد کرتا ہے۔ غور و فکر کرتا ہے اور مقدمات قایم کرتا ہے اور استدلال کرنا نتیجہ نکالنا محبت یا نفرت کرنا۔ خوف و امید کرتا ہے اور ان افعال پر محسوسات خارجی کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔

دماغ نفس ناطقہ کا مسکن ہے دماغ نفس ناطقہ کا مسکن اور احساسات کا مرکز ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ دماغ خود نفس ہے بلکہ نفس ایک روحانی جوہر ہے جو مادہ کے فنا کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور جس میں عجیب و غریب قوتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً نفس ان اشیا کی تصویریں پیش کرتا ہے جو خارج میں موجود نہ ہوں اور اون میں ایسے اوصاف کا خیال کرتا ہے جو اس دنیا کے حسن اور عمدگی سے بالاتر ہوں۔

نفس میں یہ بھی خاصیت ہے کہ مختلف اشیاء اور واقعات جو ہمارے سامنے آتے ہیں اُن سے متاثر ہوتا ہے اور روزانہ زندگی میں ہمارے اعمال اوس کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

نفس اگرچہ ایک لحاظ سے بسیط اور ناقابل تجزیہ ہے لیکن اوس میں گوناگوں قواء و صفات ہیں اور یہ قوتیں اور یہ صفات ایک دوسرے سے بالکل مختلف درجہ پر ہوتے ہیں۔ اس سبب سے ہر شخص کی طبیعت عادت قابلیت و مزاج مختلف ہوتے ہیں۔

قواء نفسانی نفس کی قوتوں کے دو بڑے حصے ہیں قوت عقلی اور قوت ارادی۔ اس میں سے پہلے علم حاصل کرنے سے متعلق ہے اور دوسرے انسانی خصلت اور ارادہ سے تعلق رکھتی ہے انسان کے نفس میں سب سے پہلے جو قواء عقلی ظاہر ہوتے ہیں وہ زیادہ تر وہ ہیں جن کا تعلق حصول علم سے ہے اور اس سبب سے ان کو قواء علمیہ بھی کہتے ہیں یہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) قوت نطق یا زبان

(۲) اشیاء خارجی کو مشاہدہ کرنے کی قوت۔

(۳) اشیاء خارجی کے خواص و اعراض کو مشاہدہ کرنے کی قوت جیسے ہیئت وزن رنگ وغیرہ

(۴) اشیاء خارجی کے باہم تعلقات مشاہدہ کرنے کی قوت جیسے اشیا کے مقام تعداد ترتیب زمانہ وغیرہ موسیقی میں آوازوں کی ترتیب۔

قواء متفکرہ قواء عقلی کی دوسری قسم وہ ہے جو اوایل میں پیدا نہیں ہوتی اوس کو قواء متفکرہ کہتے ہیں اس کی دو قسمیں ہیں ایک کو واہمہ کہتے ہیں یہ قوت مختلف اشیا اور مختلف واقعات کو تخیل میں جمع کرتی اور اون کی مشابہت یا فرق ظاہر کرتی ہے یہ قوت شاعروں اور خطیبوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

دوسری قوت استدلال ہے یعنے وہ قوت جو واقعات کی توجیہ کرتی اور نتایج استنباط کرتی ہے یہ تمام قواء عقلی میں زیادہ شریف اور اعلیٰ ہے اور ادنیٰ حیوانات سے اس ہی نے انسان کو ممیز و ممتاز کیا ہے اس قوت کے ذریعہ سے انسان نتایج و معلول کو دیکھ کر اسباب و علت کا صحیح صحیح پتہ چلاتا ہے یا نتایج کو دیکھکر اوس کے اسباب و وجوہات معلوم کر لیتا ہے۔ اور اس طرح بہت سے فائدے حاصل کرتا یا بہت سے نقصانات سے بچ جاتا ہے جس شخص میں یہ قوت بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے اور جو علت و معلول کے پیچیدہ اور دقیق سلسلوں کا پتہ چلا سکتا ہے وہ فلسفی اور محقق کہلاتا ہے اس قوت کے ذریعہ سے انسان بہت نازک اوقات میں مستعدی اور دانشمندی سے کام کر سکتا ہے۔

قواء شہوانی وغضبی | قواء شہوانی وغضبی نفس کی وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعہ سے انسان بعض جذبات کو حصول لذات جسمانی واخذ نفع ودفع ضرر کے کام میں لاتا ہے ان میں سے بعض جذبات اخلاق حسنہ میں داخل ہیں کیونکہ وہ انسان کو نیک کام کرنے کے لئے ابھارتے ہیں بعض اخلاق ذمیمہ ہیں کیونکہ انسان اون میں کسی ذاتی نفع کے حاصل کرنے کے لئے ناجائز طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اخلاق حسنہ میں سب سے پہلے خدا تعالی اور بزرگوں کی تعظیم داخل ہے۔ دوسرے درجہ میں حسن معاشرت وتمدن ہے کہ ابناء جنس کے ساتھ عمدہ سلوک اور راستبازی سے معاملات کریں اور تمام گروہ کے آرام وخوشی اور سکون وراحت کو ترقی دیں۔ عدالت بھی اس میں داخل ہے کیونکہ اوس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے حقوق اور دوسرے کے حقوق کی یکساں پاسداری کرے۔

ہر ایک قوت خواہ عقلی ہو یا شہوی یا غضبی مشق سے بڑھ جاتی ہے۔

ان میں سے ہر ایک کو انسان کی اون اعمال سے جو وہ زندگی میں انجام دیتا ہے۔ یا اون حالتوں سے جو زندگی میں اوس پر گزرتی ہیں بہت تعلق ہے۔ علم اور فکر کی قوت کو جب صحیح اصول پر کام میں لایا جائے تو انسان دانشمند بن جاتا ہے۔ اخلاقی قواء کو جب اعتدال پر رکھا جائے تو انسان سے ایسے اعمال حسنہ کا ظہور ہوتا ہے جو اوس کو اس دنیا میں خوش وخرم رکھتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ قواء ذہنی کے علم اور اون کے مختلف میلانوں اور قوتوں کے جاننے سے انسان کو بہت بڑے استعداد اور قابلیت حاصل ہوی ہے اور اس سے ہر شخص وہ خوشی اور وہ رتبہ حاصل کر سکتا ہے جو انسان کے لئے افضل انعامات ہے لیکن اس مرتبہ کے حصول کے لئے ضرور ہے کہ انسان قواء عقلی کو مناسب طور پر کام میں لائے اور قدرت کے کاموں کو غور سے دیکھے اپنے جذبات پر قابو رکھے اور اصول اخلاق کا پابند رہے تا کہ بے اعتدالی گناہ اور مصیبت میں مبتلا نہ ہونے پاوے۔

حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

کلام شاد

(ہز اکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی۔ آئی۔ ای۔ شاد بالقابہم)

جب اوس کے ناز کو دیکھا صدائے مرحبا نکلی
نظر آیا جو حسن اوس کا مرے دل سے دعا نکلی

مجھے فوراً ہی یاد آیا ترا سرو قد بالا
گلستاں سے جب اٹھلاتی ہوی باد صبا نکلی

دم حسرت نہ آیا کام کوئی بھی انیسوں نے
فقط میری مصیبت ایک میری آشنا نکلی

ہزاروں یوں تو ہیں مشتاق تیرے اے ستم پرور
میری الفت ہی آخر تیرے حق میں باوفا نکلی

وہی تھا ظاہر و باطن وہی تھا واجب وممکن
اوسی کی ابتدا نکلی اوسی کی انتہا نکلی

ہوا کچھ بھی نہ چارہ درد دل کا چارہ سازوں نے
مرض کی میرے پاس اونکی نہ کوئی بھی دوا نکلی

ہماری رہنمائی خضر سے ممکن نہ تھی لیکن
تیری الفت طریق عاشقی کی رہنما نکلی

تری مشکل کشائی سے تری ہی رہنمائی سے
گھڑی مشکل کی میری لے مرے مشکل کشا نکلی

خدا کا شکر دل سے ہر گھڑی اے شاد تم کرلو
کہ ہر اک میری حسرت میرے حسب التجا نکلی

اِنقلاب

(۱)

یہ سچ ہے کہ میں "پٹ رانی" کے شکم سے نہیں لیکن آخر میں راجہ کا فرزند ہوں اگرچہ بعض لوگ اس میں بھی شک کرتے ہیں خصوصًا راجہ کے خاندان کے ممبر۔ لیکن یہ تمام پیش بندیاں مجھے حکومت سے محروم رکھنے کے لیے ہیں مگر فضول! میں راج کنواروں سے کس بات میں کم ہوں؟ علم میں زور بازو میں، فنونِ جنگ میں، لیاقت میں، ذہانت میں غرض میں ان سے کسی بات میں ہٹیا نہیں اگر کبھی امتحان کا موقع آیا اور مقابلہ ہوا تو میدان میرے ہی ہاتھ رہیگا ہاں راج گدی میرا ہی حق ہے اور صرف میرا۔ لیکن فی الحال یہ منصوبہ مجھے اپنے دل ہی میں رکھنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ کوئی صاحب تدبیر وہمت اور یک رنگ دوست مجھے مل جائے اور اوسکی امداد سے یہ ارادہ قوت سے فعل میں لایا جائے ورنہ میرے لئے خطرہ ہے!

یہ جذبات وخیالات تھے جو نوجوان چندر گپت کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ جب وہ ان کو ضبط نہ کر سکا تو بے اختیار اُس کی زبان سے نکل گئے ع شیشۂ دل سے چھلک جاتی ہے ایسی مے ہے

خیریت یہ ہوی کہ اس ویران جنگل میں کوئی سننے والا نہ تھا حتیٰ کہ "دیوار ہم گوش دارد" والا مقولہ بھی یہاں غلط تھا کیونکہ نہ دیوار تھی نہ گوشس۔

نوجوان چندر گپت اپنے خیالات میں محو۔ جنگل کے اندر چلا جا رہا تھا وہ شہر سے تقریبًا دو میل کے فاصلہ پر تھا جب وہ ایک میل اور آگے نکل گیا تو اتفاقًا اس کی نظر ایک اجنبی شخص پر پڑی جو کچھ فاصلہ بیٹھا ہوا شاید زمین کھود رہا تھا شہزادہ اوس کے قریب گیا بظاہر یہ شخص غریب اور ادنیٰ طبقہ کا معلوم ہوتا تھا۔ چندر گپت نے دیکھا کہ وہ شخص ایک جلے کٹے سرکنڈے کی جڑ کو جس کی کھونٹی زمین سے کسی قدر ابھری ہوی ہے کھود رہا ہے شہزادہ نے پوچھا تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ "اس سرکنڈے کی جڑ نکالنا چاہتا ہوں"۔ چندر گپت نے اس کا یہ جواب بہ استعجاب سنا اور اوس شخص کا نام دریافت کیا جس کے جواب میں اوس نے اپنا نام چانکیہ بتایا۔

چندر گپت دوست چانکیہ غالبًا تمھیں معلوم ہوگا کہ سرکنڈے کی جڑ بڑی گہری اور مضبوط ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ کاٹنے اور جلادینے کے باوجود، سرکنڈے کا پودہ برسات میں پھوٹ آتا ہے پس تم کو اس کام میں سخت محنت کرنی پڑیگی۔ لیکن ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ آخر تمھارا مقصد کیا ہے اور تمھیں کس بات نے اس محنت شاقہ پر آمادہ کیا۔

چانکیہ وہ بات یہ ہے کہ میں اس جنگل میں چلا آرہا تھا اس سرکنڈے کی کھونٹی زمین سے ابھری ہوی تھی میرے پاؤں میں دفعتًا اسکی ٹھوکر لگی۔ پس اب میں اس کو بالکل نیست ونابود ہی کر کے دم لونگا!

چندر گپت (حیران ہوکر) اتنی ذری سی بات کے لئے اسقدر تکلیف؟ تم بڑے عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو!

چانکیہ ۔ بغیر تکلیف برداشت کئے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

چندر گپت "سچ کہتے ہو"۔

راج کنوار [illegible] سے بہت خوش ہو۔ اس نے دل [illegible] ہے اس سے زیادہ جفاکش۔

صاحب عزم دوست مجھے اور کہاں مل سکتا ہے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے میری کاربرآری ہوگی اور دلی مقصد برآئیگا۔

چندر گپت (چانکیہ سے) میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ میری خواہش ہے کہ تم میری رفاقت میں رہو تمھارے اخراجات کا کفیل میں ہونگا بتاؤ تمھاری اس میں کیا مرضی ہے۔

چانکیہ۔ آپ کی مہربانی۔ لیکن بات غور طلب ہے اس قدر جلد اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

چندر گپت کیا تم مجھے جانتے ہو۔

چانکیہ۔ کیوں نہیں۔ راج کنوار چندر گپت سے کون ناواقف ہے۔

چندر گپت۔ پھر تمھیں میری رفاقت میں کیا عذر ہے۔

چانکیہ۔ مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔ یہ تو میرے لئے باعث فخر ہے

چندر گپت۔ اچھا چلو تو شہر چلیں۔

چانکیہ۔ میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے میں اسے ختم کرکے چلونگا آپ تشریف لے چلیں میں حاضر ہو جاؤنگا۔

چندر گپت۔ نہیں میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تم اپنا کام ختم کرلو۔

چانکیہ کو سرکنڈے کی جڑ کھودتے کھودتے شام ہوگئی۔ تب کہیں جاکر وہ دونوں شہر کو واپس ہوے۔

(۲)

سکندر اعظم یونانی دنیا کے مشہور فاتح حکمرانوں میں سے ہے۔ بیس سال کی عمر میں اپنے باپ فیلقوس کا جانشین ہوا۔ اور ۳۳۴ء (قبل مسیح) میں ایک یونانی دیوتا کی خیالی مہمات کی تقلید میں تسخیر مشرق کے لئے اٹھا اور چلتے چلتے (۳۲۷۔ ق۔م) موسم گرما میں ہندوستان آپہونچا۔

سکندر نے کوہ ہندوکش کو پیچھے چھوڑ کر دریائے کابل سے عبور کیا اس موقع پر ایک ہندو راجہ "ٹکسیلز" اسکی خدمت میں بہ طریق نیازمندانہ حاضر ہوا۔ اور پچیس ہاتھیوں کی نذر گزرانی۔

اب سکندر نے اپنی فوج کے دو حصے کرکے ایک حصہ براہ درہ خیبر دریائے اٹک پر بھیجا کہ آگے جاکر فوج کے عبور کا اہتمام کرے۔ اس ہراول فوج نے پل تیار کیا۔ خود سکندر باقی فوج کے ساتھ سرحدی کوہستانی افواج کی سرکوبی کرتا ہوا آگے بڑھا۔

سکندری افواج (دریائے) اٹک کو عبور کرنے کے بعد دریائے جہلم تک بے روک ٹوک آپہنچی لیکن جہلم کو عبور کرنے کے بعد راجہ پورس کی فوجوں نے ان کا راستہ روکا۔

سکندر نے اپنے سواروں کو حکم دیا کہ وہ ہندوستانی فوج پر عقب سے حملہ کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو فوج کے پاؤں اٹھ گئے۔ تاہم معرکہ خونریز اور عظیم الشان تھا راجہ پورس کے ہاتھی یونانیوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ بلکہ زخم کھا کھا کر ایسے بے تحاشا بھاگے کہ دوست دشمن سبھی کو کچل ڈالا۔ راجہ کی تقریبًا تمام سپاہ میدان میں کام آئی۔ پورس گرفتار ہوکر سکندر کے روبرو پیش ہوا۔

فاتح سکندر۔ اپنے مغلوب حریف سے نہایت شرافت کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ وہ راجہ کی آمد آمد سن کر مع اپنے چند مصاحبوں کے گھوڑا بڑھا کر اپنے بہادروں کی صفوں سے باہر نکلا۔ اور پورس کی جانب غور سے دیکھا راجہ پورس کا جسم خوبصورت، شاندار، اور قد کشیدہ پانچ ہاتھ سے زیادہ بلند تھا اس وقت سکندر نے راجہ کے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ لیکن اسے خائف خجل یا دل شکستہ نہ پایا اور یہ امور اس کے لئے کچھ کم حیرت انگیز نہ تھے۔

سکندر ملاقات کے لئے راجہ کی جانب بڑھا راجہ نے بھی قدم آگے رکھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک بہادر ایک ایسے بہادر سے ملنے کو بڑھتا ہے جس نے اپنے ملک و ملت اور حقوق کی حفاظت خاطر خواہ کی ہو۔ سکندر نے گفتگو میں سبقت کی۔ چنانچہ اس نے راجہ سے خطاب کیا۔ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

راجہ پورس نے بلا تامل جواب دیا۔

"مجھ سے وہی سلوک کیجئے جو بادشاہوں کے شایان شان ہو۔"

سکندر۔ راجہ کے اس جواب سے پھڑک اٹھا اوس کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اس نے پھر کہا۔ بیشک میں تم سے اسی قسم کا سلوک کرونگا لیکن تم بھی جس مہربانی کی مجھ سے توقع رکھتے ہو اوس کا اظہار کرو۔

راجہ۔ میرے پہلے ہی جواب میں یہ سب کچھ آگیا ہے۔

سکندر راجہ کے اس جواب سے اور بھی خوش ہوا اوس نے راجہ کا ملک واپس دیدینے کے علاوہ کچھ اور علاقہ بھی اُسے عطا کیا۔

اب سکندر نے کوچ کرکے دریائے چناب کو عبور کیا۔

سنگلا والوں نے اوس کا مقابلہ کیا۔ لیکن سکندری فوج نے اُن کے شہر کو تاخت و تاراج اور مسمار کرکے دم لیا۔ یونانی فوجیں دریائے بیاس تک بڑھتی چلی گئیں لیکن اب فوج بوجہ خستگی آگے بڑھنا نہیں چاہتی تھی لہذا اسکندر کو بادل ناخواستہ اسی مقام سے لوٹ جانا پڑا۔

سکندر کا عزم تھا کہ وہ وسط ہند تک جائے اور مگدہ دیش کی حکومت کو مطیع و منقاد کرے لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔

اس وقت مگدھ دیش (وسط ہند) میں ایک مشہور اور طاقتور خاندان نند کی حکومت تھی اس خاندان میں یکے بعد دیگرے نو راجہ گدی نشین ہوے اس واسطے وہ نو نند کے نام سے مشہور ہیں۔

خاندان نند کو شُدر (غیر آریا پنچ ذات) بتایا جاتا ہے اس خاندان کا آخری راجہ مہانند ہوا۔ یہی حملہ سکندری کے وقت مگدہ دیش میں حکومت کرتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بوجوہ مذکورہ بالا راجہ مہانند اور اوس کا ملک یونانیوں کی زد سے بچ گیا۔ لیکن افسوس کہ اس خاندان کی تباہی کا اس سے زیادہ خطرناک ایک اور سبب اندرون ملک ہی سے پیدا ہو گیا جس نے اس قدیم شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

کہتے ہیں کہ راجہ مہانند کے محل میں متعدد رانیاں تھیں۔ علاوہ ازیں راجہ نے ایک نائن (شُدری) کو بھی شرف زوجیت بخشا۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ حکمائے ہند کا قول ہے کہ عورت رتن جواہر ہے اس لئے وہ جہاں ہو وہیں سے لی جاسکتی ہے عورت بہرحال اور اس تعلق کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ یہ بات تاریکی میں ہے ناٹک حسن و عشق کی نیرنگیوں نے کام کیا ہوگا اس افسانہ کے ہیرو پنڈت چانکیہ کا قول مشہور ہے کہ۔

"مرد کیسا ہی عاقل کیوں نہ ہو۔ میدان جنگ میں خواہ کتنا ہی بہادر ثابت ہو۔ لیکن عورت کے سامنے نہایت ذلیل بن جایا کرتا ہے"!

اس نائن کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام چندر گپت رکھا گیا۔ بعض مورخوں نے اسے راجہ مہانند کا ناجائز فرزند لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ راجہ کا صلبی فرزند نہ تھا۔

راجہ نند کے نو فرزند اور تھے۔ دسواں چندر گپت اس کی بھی تعلیم و تربیت مثل دیگر راج کنواروں کے ہوی تھی اور اب وہ بالغ و جوان ہو کر مثل شہزادوں کے اختیار و اقتدار رکھتا تھا علاوہ ازیں وہ اپنے باقی بھائیوں سے زیادہ ذہین ہونہار اور صاحب عزم تھا۔

چندر گپت کو خیال ہوا کہ حکومت صرف میرا حق ہے اور وہ مجھے ہی ملنی چاہیئے یہ خیال رفتہ رفتہ عزم بالجزم کی صورت پکڑ گیا لیکن بات ایسی نازک تھی کہ عمل تو عمل وہ اپنے خیال کا اظہار بھی کسی انسان پر نہیں کرسکتا تھا تاہم وہ اکثر تنہائی کے وقت اس بارہ میں غور کیا کرتا تھا آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ کسی ہوشیار اور باہمت شخص کو اپنا دوست اور ہمراز بنا کر اس کی مدد سے اس مہم کو سر کرنا چاہیئے۔

دو دل یک شود بشکند کوہ را پراگندگی آرد انبوہ را

جونیدہ یابندہ، چندر گپت کی ملاقات آخر کار پنڈت چانکیہ
سے ہو گئی جو قنوج کا رہنے والا ایک غریب شخص تھا۔
ان دونوں میں ربط ضبط روز بروز بڑھتا گیا۔ امتداد زمانہ کے
ساتھ رشتۂ دوستی مضبوط ہو گیا۔ باہمی اعتماد نے جڑ پکڑی نوبت
بہ ایں جا رسید کہ چندر گپت نے اپنا کلیجہ نکال کر پنڈت کے روبرو
رکھدیا۔ اپنا راز اگل دیا۔ اپنا دلی منصوبہ کہدیا۔ حتیٰ کہ یہ دونوں
دوست پوری قوت کے ساتھ خاندان نند کے بیخ کنی اور اپنے
لئے حکومت حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہو گئے۔

(۳)

چندر گپت۔ یہ شخص نہایت چالاک ہے۔
راجہ۔ مجھے تو بڑا نیک معلوم ہوتا ہے اور غریب۔
چندر گپت۔ جی ہاں وہ گربہ مسکیں ہے۔ مہاراج کو اس کے گنوں
کی کیا خبر۔ مجھے اوس کے دلی منصوبے اور اندرونی حالات معلوم کرنے
کے مواقع ملے ہیں یہ واقعی بڑا خطرناک آدمی ہے۔
راجہ۔ میں تو اس کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ عالم فاضل
پنڈت ہے اور بس۔
چندر گپت۔ اوس کے عالم و فاضل ہونے میں تو کلام نہیں لیکن
میرا دل یہ کہتا ہے کہ اس کا وجود شاہی خاندان کے لئے خطرناک ہے!
راوی۔ اس کی تصدیق ہم بھی کرتے ہیں لیکن خود چندر گپت کی ذات
راجہ۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا خیال کرنے کے لئے تمھارے پاس
کیا وجوہ ہیں دیکھو کہیں میرے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون میں آلودہ
نہ کرا دینا۔
چندر گپت۔ مہاراج میرے پاس یہ خیال کرنے کے معقول وجوہ
اور کافی ثبوت موجود ہے۔ میں کسی دوست دشمن کی سنی سنائی بات
پر یقین کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں جب تک کہ کسی امر
کی خود ذاتی طریق پر تحقیقات نہ کر لوں۔
میں عرصہ سے چانکیہ کے حالات کی خفیہ طور پر تحقیقات کر رہا ہوں۔
اول میں نے اُسے اپنا دوست بنایا۔ رفتہ رفتہ اس سے ربط و ضبط
بڑھایا۔ اور دوستی بڑھاتے بڑھاتے گویا میں نے اپنے آپ کو اوس کا
حقیقی دوست محرم راز، سچا ہمدرد، اور معاون و مددگار ثابت کر دیا
پس اب کیا تھا اس نے بھی اپنا دل چیر کر میرے آگے رکھ دیا۔ چانکیہ
نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ یہاں جاسوس کی حیثیت میں
راجہ قنوج کا بھیجا ہوا آیا ہے تاکہ یہاں کے حالات اور شہروں،
پلوں، قلعوں اور گڑھیوں کے نقشہ جات حاصل کر کے اپنے راجہ کے
پاس بھیجے تاکہ وہ بوقت مناسب مگدھ دیش پر کامیاب حملہ کر سکے۔
اب راجہ کو چانکیہ کے خطرناک جاسوس ہونے میں بالکل شک و شبہہ
نہیں رہا۔ اور راوس نے تیور بدل کر کہا "اچھا" میں اس کا انتظام
کرتا ہوں۔

(۴)

آدھی رات ادھر، آدھی رات اُدھر کل شب تاریک گھُپ اندھیرا
اس وقت دو آدمی ایک بند مکان کے اندر رازدارانہ طریق پر
آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہیں۔ ہم ان دونوں سے واقف ہیں
اِن میں سے ایک، راج کنوار چندر گپت ہے اور دوسرا چانکیہ پنڈت۔
راج کنوار۔ اب تمھارا یہاں گھڑی بھر بھی ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں
چانکیہ۔ آخر اس کی وجہ۔ سبب! !
راج کنوار۔ یہی کہ راجہ تمھاری جان کا خواہاں اور تمھارے خون
کا پیاسا ہے۔
چانکیہ۔ مگر میں نے راجہ کا کیا بگاڑا ہے۔
راج کنوار۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تم نے راجہ کا کچھ نقصان نہیں کیا
لیکن خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ الزام پیدا کرتے کچھ دیر لگتی ہے

راج ہٹ مشہور ہے۔ راجہ یا بادشاہ جب کوئی کام کرنے پر آجائے تو کوئی قوت اُسے اُس کے عزم سے باز نہیں رکھ سکتی پھر راجہ نے الزام ایسا زبردست پیدا کیا ہے جس کی سزا کم از کم سولی ہے یا پھانسی۔

چانکیہ۔ (زہرخندہ کرکے) اور زیادہ سے زیادہ سزا۔

راج کنوار۔ متانت اور خوف سے یہ ہنسی مذاق اور تمسخر کا وقت نہیں ہے بلکہ نہایت نازک اور قیمتی موقع ہے۔ اسے ضایع نہ کرو۔ ورنہ افسوس کرنا پڑیگا۔ پس اب تم جان بچانے کی تدبیر کرو۔ مجھے تم سے دلی تعلق ہے اس لئے تمھاری بہبودی کے خیال سے میں نے مطلع ہوتے ہی تمھیں اس امر کی اطلاع دی۔

چانکیہ۔ لیکن راج کنوار تم نے یہ نہ بتایا کہ آخر مجھ پر الزام کیا ہے۔ اور میں راجہ کے نزدیک کیوں سوختنی اور گردن زدنی ہوں۔

راج کنوار۔ راجہ کو معلوم ہوا ہے اور یقین ہے کہ تم راجہ قنوج کے بھیجے ہوے جاسوس ہو۔ اور یہاں کے راجہ کے خلاف سازش کرتے ہو یہاں کی خبریں اور قلعہ جات کے نقشے وغیرہ قنوج بھیجتے رہتے ہو تاکہ راجہ قنوج یہاں کامیاب حملہ کر سکے۔

چانکیہ۔ یا ایشور اس قدر بہتان یہ طوفان لیکن یہ تقدیری معاملہ ہے یا قسمت یا نصیب۔ قسمت نے ہماری پیشانی پر ایک سطر چند حرفوں کی لکھی ہے جس کو بڑا عالم سے عالم شخص اپنے علم سے مٹا نہیں سکتا۔

راج کنوار۔ اب قسمت کو رونے اور اوس پر فلسفیانہ بحث کرنے کا وقت نہیں ہے سوچنا یہ چاہیئے کہ ہم کس قسم کا طرز عمل اختیار کریں سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو لیکن یہاں رہتے ہوے تمھاری جان نہیں بچ سکتی۔ اس لئے تمھیں یہاں سے فوراً کسی دور دراز ملک میں چلا جانا چاہیئے بہتر ہو کہ تم پنجاب چلے جاؤ۔ میں تم جیسے ایک رنگ دوست کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ پس میں بھی تمھارے لئے وطن اور شاہانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر تمھاری رفاقت پر آمادہ ہوں۔ جہاں تم جاؤ تمھارے ساتھ ہوں۔

چانکیہ۔ راج کنوار۔ میں تمھارے دوستانہ مشورہ کا مشکور ہوں فی الحقیقت ہمارے حق میں یہی بہتر ہے جو تم نے تجویز کیا ہے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یوں تو آپ کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں لیکن میں ایسے نازک وقت میں آپ کی رفاقت کا تہ دل سے ممنون ہوں اور اسی وقت حلف اٹھاتا ہوں کہ اگر دم میں دم ہے تو مگدہ دیش کی گدی پر تم کو بٹھا کر دم لونگا۔ مہانند نے مجھے سمجھا یا ہے اوس کے خیال میں باغی اور سازشی تو ہوں ہی اب کیوں نہ ایسا بن کر ہی دکھایا جائے

(۵)

پنڈت چانکیہ سے رشتہ اتحاد و مودت راسخ ہو جانے پر راج کنوار چندر گپت کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے راجہ مہانند کو غریب پنڈت سے بدظن کر دیا۔ حتی کہ راجہ اوس کے خون کا پیاسا ہو گیا ادھر چانکیہ سے اسی قسم کی باتیں بنا کر اُسے راجہ کی طرف سے بھڑکا دیا۔ یہاں تک کہ اُس کے ذہن نشین کر دیا کہ یہاں رہنے میں اُس کی جان کی خیر نہیں۔ نتیجہ ان باتوں کا یہ نکلا کہ چانکیہ راجہ مہانند اور اوس کے خاندان کا جانی دشمن ہو گیا اور اوس نے قسم کھائی کہ اس خاندان کو نیست و نابود کر کے ہی دم لونگا۔ اور اس کارروائی سے چندر گپت کا مطلب بھی یہی تھا۔

چانکیہ اور چندر گپت نے اسی شب مگدہ دیش کو خیرباد کہا اور کوچ و مقام کرتے ریگستان کی خاک اڑاتے۔ پہاڑوں کی ٹھوکریں کھاتے انواع و اقسام کی مصیبتیں جھیلتے لاہور (پنجاب) جا پہنچے۔ طرح اقامت ڈالی۔ پھر دربار سے رجوع کیا حتی کہ یہاں گہرا رسوخ کرکے راجہ لاہور سے رسائی پیدا کر لی۔ اور اوس کے دل میں جگہ کرکے آخر اوسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مگدہ دیش پر چڑھائی کرے۔ پنڈت نے اس مہم کی ذمہ واری اپنے سر لی سے

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے۔

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

مگدھ دیش پر فوج کشی کی گئی۔ چنانچہ افواج غالب آئیں راجہ مہانند کو شکست فاش ہوئی۔ اور وہ اسیر کر کے پنجاب لایا گیا۔ اس زمانہ میں دشوار تھا کہ راجہ پنجاب مگدھ دیش کے بھی انتظام قایم رکھ سکے پس وہ تو بعد فتح اپنے ملک کو واپس ہوا اور یہ ملک چندر گپت کے لئے چھوڑ گیا۔

ابھی ایک مہم اور باقی تھی۔ راجہ کے شجاع فرزند، دیگر عزیز و اقارب، اور اوس کے ہواخواہ اراکین سلطنت چندر گپت کے سد راہ تھے لیکن پنڈت چانکیہ کی تدابیر اور حکمت عملی نے اس تمام خارزار کو صاف کر کے رکھ دیا۔ حتیٰ کہ میدان بالکل خالی ہو گیا بہت سے امرا چندر گپت کے ہواخواہ ہو گئے۔ اور پنڈت چانکیہ کا قول پورا ہوا کہ۔

آگ جو جنگل کو جلا دیتی ہے ہوا اوس کا ساتھ دیتی ہے لیکن چراغ کو گل کر دیتی ہے کمزور کا کون دوست۔

خاندان نند کے قلع قمع کے بعد (سنہ ۳۱۵ ق۔م) چندر گپت۔ مگدھ دیش کی راج گدی پر بیٹھا اور چوبیس سال حکومت کر کے تمام ہندوستان پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا۔ اوس کے بعد اوس کے فرزند بندوسار نے ۲۸ سال حکومت کی پھر چندر گپت کا پوتا۔ راجہ اشوک (سنہ ۲۶۳ ق م) مگدھ دیش کا راجہ ہوا۔ اور نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔

راجہ چندر گپت، اور راجہ اشوک کے نام تاریخ ہند میں بخط جلی مرقوم ہیں خصوصاً آخر الذکر راجہ اپنی تعمیر کردہ لاٹھوں کی وجہ سے ہندوستان میں خاص طور پر مشہور ہے۔

اس افسانہ کے ناظر سے یہ امر مخفی نہیں کہ چندر گپت کو درجہ سلطنت تک پہنچانے والا شخص قنوج کا ایک غریب اور گمنام برہمن تھا۔

لیکن آج پنڈت چانکیہ کوئی غیر مشہور شخص نہیں بلکہ وہ اپنی مشہور تصنیف "پنچ تنتر" کی وجہ سے کم از کم ہندوستان میں مشہور ہے۔

کتاب "پنچ تنتر" بقول ایک مورخ کے "من جملہ اون چند کتابوں کے ہے کہ اگر اوس کا وجود نہ ہوتا تو ہند و قوم کو ہرگز اون قوموں کی صف میں جگہ نہ ملتی جو اپنے بزرگوں کے علمی و اخلاقی کارناموں پر بجا طور پر فخر کرتی ہیں"

یہ بات کہ کیا یہ کتاب اسی پایہ کی ہے، جس پایہ کی عام طور پر سمجھی جاتی ہے ایک مستقل بحث ہے اور طویل فرصت چاہتی ہے مگر اس سے ہمارے فسانہ کو تعلق نہیں۔

مظفر حسین اظہر دہلوی

دلچسپ اعداد

نیویارک میں ہر تین منٹ کے بعد ایک مجرم کسی نہ کسی جرم میں گرفتار ہوتا ہے ہر چھ منٹ کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے ہر سات منٹ میں ایک انسان کی موت واقع ہوتی ہے ہر سترہ منٹ میں ایک شادی ہوتی ہے ہر چالیس منٹ میں ایک مسافر آتا ہے، ہر ۴۸ منٹ میں آتشزدگی واقع ہوتی ہے۔ ہر دو گھنٹہ میں ایک قیدی رہا ہوتا ہے ہر سات گھنٹہ میں ایک شخص مفلس اور دیوالیہ ہو جاتا ہے ہر آٹھ گھنٹہ میں ایک شخص مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے اور ہر روز ایک آدمی قتل ہوتا ہے،

اثر و شوق

مولوی حالی مرحوم و مغفور کا مقدمہ دیوان دیکھکر مجھے خواجہ
اثر کی مثنوی خواب و خیال کے دیکھنے کا کمال شوق تھا حالی کو
ایک ہی شعر اوس مثنوی کا معلوم تھا مگر قیامت کا شعر ہے

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا   کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

دوسرا مصرع عجب لطف زبان رکھتا ہے کہ حد تعریف سے
باہر ہے مگر نواب مرزا شوق کی بے سلیقگی کو دیکھیے کہ چرایا تو
پہلا مصرع چرایا اور جو شعر کی جان تھی وہی چھوڑ دی یعنی کہتے ہیں

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا   چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

چھوٹے کپڑوں میں وہ لطف ہرگز نہیں جو کھلتے جانے میں ہے
چرانا تھا تو دوسرے مصرع کو چرایا ہوتا۔ یہ قرینہ اس بات کا ہے کہ
نواب مرزا نے ہرگز اس مثنوی کو نہیں دیکھا اور جو لوگ اس فن کے
ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک ہی حال کو ایک ہی بحر میں جب دو
شخص کہیں گے تو ضرور ہی توارد ہوجاتا ہے۔ ایک حال کو بھی
جانے دیجیے ایک زمین طرح کی جاتی ہے مشاعرہ میں کتنے ہی
مصرعے لڑجاتے ہیں یہ سب لوگوں کی دیکھی ہوئی بات ہے اگر
مثنوی خواب و خیال نواب مرزا نے دیکھی ہوتی تو ضرور ذکر
کرتے کہ فلاں استاد کے جواب میں میں نے بھی قلم اٹھایا ہے
اور اون کے طرز بیان سے مستفید ہوا ہوں۔ کیا یہ کہہ دینے
سے
شوق کی مثنویوں کا رنگ پھیکا پڑجاتا خمسہ نظامی کا جواب
کتنے لوگوں نے کہا پہلے نظامی کی ستایش گری ضرور کی اور اس
سے ان کے کلام کی قدر و قیمت کچھ زیادہ ہی ہوگئی۔ نواب مرزا نے
اس سنت شعرا کو کیوں چھوڑ دیا؟ نواب مرزا کو علم غیب تھا کہ اثر کی
مثنوی جس کے مصرعے میں چرا رہا ہوں دنیا سے مفقود ہوجائیگی
حقیقت امر یہ ہے کہ وہ پہلے ہی مفقود ہوچکی تھی۔

غرض اثر کی مثنوی کا جسے مولوی حالی مرحوم نے خود بھی نہیں دیکھا
تھا اور اس ایک شعر کے سوا کوئی شعر بھی اس کا نہیں سنا تھا۔ ان
کے تعریف کرنے سے اور اس شعر کے دوسرے مصرعہ کا لطف اٹھانے
سے میں کمال مشتاق تھا کہ مرزا علی لطف کا تذکرہ حیدرآباد میں چھپا
یہ خواجہ اثر کے معاصر ہیں انہوں نے اثر کے تذکرہ میں جہاں
اون کے اور اشعار لکھے ہیں مثنوی کے بھی تیرہ شعر لکھدئے ہیں
افسوس یہ رہ گیا کہ سراپا کے یہ شعر ہیں جس سے شاعر کی واقعہ
نگاری کا سلیقہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اگلے زمانے والے سراپا کو معرکہ
فکر سمجھتے تھے۔ میر انیس مرحوم کو رزمیہ مرثیوں میں سراپا کہنے
کا التزام رہا۔ مگر میں نے دیکھا جہاں سراپا شروع ہوا مرثیہ
بے لطف ہوگیا۔ آخر میر نفیس مرحوم وغیرہ نے قطعاً مرثیہ
سے سراپا کو نکال ڈالا۔ مرزا علی لطف نے رسم زمانہ کے موافق

اسی کو معرکہ کا مضمون سمجھا۔ یہ تذکرہ مولوی شبلی مرحوم کی تصحیح سے چھپا ہے اور انھوں نے یہہ حاشیہ بھی اُس پر لکھدیا ہے۔

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنو سے ایسی فصاحت وسلاست کی توقع نہیں ہوسکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اوس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اوسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہوسکتی ہے"

اثر کی ساری مثنوی اگر مل جاتی تو بیشک مقابلہ کا لطف تھا اور جن لوگوں کو زبان اردو کی تحقیق کا ذوق ہے اون کو اس زبان کی تاریخ کے بہت سے نکات معلوم ہوتے کہ مقابلہ کا لطف ملتا۔ مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ شوق کے کلام میں سے سراپا کے اشعار نکال کر اون کا مقابلہ کروں اوس سے بھی دونوں طبیعتوں کا کچھ تو حال معلوم ہوجائیگا۔

مرزا علی لطف نے خواب وخیال میں سے سراپا کے اشعار میں تیرہ شعر انتخاب کرکے لکھے ہیں۔ شروع کے چار شعروں میں خطاب ہے اس کے بعد والے شعروں میں غائب کی ضمیریں ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقاموں سے یہ اشعار انتخاب کئے ہیں سہ

ناک تیری عجب سجیلی ہے | پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہی یا کرا ایک توتا ہے | چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
نتھنے ایسے ترے پھڑکتے ہیں | جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں | شہد وشربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں | دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں ابدار کو یہاں | لوٹ جاتا ہے گوہر غلطاں
گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے | مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے | رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے
جب خیال آئینہ ہے ہو گردن کا | یہاں ڈہلک جائے ہے مرا منکا
گو کہ شفاف ہے تن مینا | یہاں تو جھکتی ہے گردن مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپکو دور | جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں | ہاتھ پاؤں اپنے بھول جاتے ہیں
کیا خوش آئندہ یہ کلائی ہے | اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

چھٹے شعر میں کچھ کاتب کا تصرف معلوم ہوتا ہے شاید پہلا مصرع یوں ہوگا ع دیکھ کر آبدار وہ دنداں۔ یا آبداری دنداں۔ سب شعروں میں غرور والا شعر بے ساختہ ہے باقی شعر تکلف وتصنع سے خالی نہیں۔

نواب مرزا نے سراپا میں جو اشعار لکھے ہیں اوس میں سے یہ تیرہ شعر میں نے انتخاب کئے ہیں۔

کچھ گندہے کچھ کھلے وہ سر کے بال | سارے معشوقوں سے نرالی چال
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں | بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
گوری رنگت یہ گرمی صورت میں | اچپلا پن بھرا طبیعت میں
ناک میں نیم کا فقط تنکا | شوخی چالاکی مقتضی سن کا
قد میں آثار سب قیامت کے | گوری گردن میں طوق منت کے

نور حسن و جمال سے اس کے — لو نکلتی ہے گال سے اس کے
ہنس کے جس سمت آنکھ پھرتی ہے — جان عاشق پہ برق گرتی ہے
لب وہ نازک کہ جان دیدیجے — دہن ایسا کہ ...... لیجے
بے مسی کہ وہ دانت رشک گہر — جان عاشق نثار ہو جس پر
نوک چوک اک جمال سے پیدا — بانکپن چال ڈھال سے پیدا
گل سے رخسار گول گول بدن — گات جس طرح قمقمے روشن
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی — جسم میں وہ شباب کی بھرتی
پائچے ہاتھ سے جو اس نے اٹھائے — میں پکارا خدا کمر کو بچائے

دونوں شخصوں کی زبان میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اثر کی زبان وہ زبان ہے جو خان۔ آرزو۔ میر و سودا و منت و ممنون و تابان وغیرہ لکھنؤ میں لیکر آئے تھے نواب مرزا شوق جب پیدا بھی نہ ہوئے ہونگے یہ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردوں میں ہیں اُن کے زمانہ میں لکھنؤ کی زبان ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ یہ زبان واجد علی شاہ طاب ثراہ کے آخری زمانہ کی ہے کہتے ہیں ؎

نہ سمجھنا زمانہ اور رہے یہ — شاہ واجد علی کا دور رہے یہ

بادشاہ کی مثنوی دریائے تعشق بھی اُسی زمانہ کی تصنیف ہے اسی بحر میں اور اسی زبان میں ہے اسکو بھی پچاس ساٹھ برس کا عرصہ ہو گیا اب زبان نے کچھ اور ہی رنگ بدلا۔ مگر اثر و شوق کی زبان میں جس قدر کھلا کھلا فرق ہے شوق و داغ کی زبان میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ گو داغ و شوق ایک ہی طبقہ کے لوگوں میں ہیں مگر نواب مرزا شوق کے مرجانے کے بعد نواب مرزا داغ کوئی چالیس برس اور جیے اور زبان کی اصلاح کرتے رہے مرحوم خود بیان کرتے تھے کہ میرے ابتدا کے کلام میں پرے کا لفظ تھا اب چھوڑ دیا۔ یہ مصرع بھی اپنا انھوں نے پڑھا تھا ع

جو سر میں چھوڑوں تو پتھر پرے سرک جائے

یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے زوال دولت کے بعد زبان میں بہت کم تغیر ہوا کچھ اخبار والوں کی تحریر کا طرز جسمیں انگریزی کی چھاؤں پائی جاتی ہے اکثر لوگوں کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے جو اب کم ہوتا جاتا ہے اور کچھ نئی نئی چیزیں ایجاد ہوی ہیں اور اون کے نئے نئے نام بھی اردو کا جزو ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے زبان میں تغیر نہیں ہو سکتا نیا لفظ جبھی تک برا معلوم ہوتا ہے جب تک زبان زد نہ ہو جائے۔ جب ایک عالم اُسے بولنے لگے تو پھر اُسے اردو کا لفظ سمجھنا چاہیئے۔ تمام دنیا کی زبانوں کو نئے الفاظ سے چارہ نہیں۔

مجھے نواب مرزا شوق و نواب مرزا داغ کی زبان ایک ہی معلوم ہوتی ہے مرحوم عبدالرحیم خاں صاحب بیدل دہلوی جس زمانہ میں حیدر آباد میں تھے اس کو تیس برس کا عرصہ ہوا مجھ سے بیان کرتے تھے کہ داغ ہماری زبان میں شعر نہیں کہتے اس زمانہ میں داغ بھی حیدر آباد میں موجود تھے اور مشاعروں میں آیا کرتے تھے یہ فرمانا ان کا بے جا نہ تھا میرا مطلب یہ ہے کہ شوق کی زبان آج تک مروج و مانوس ہے اور خواجہ اثر کی زبان کہنہ و متروک۔

ہاں دیکھنا یہ ہے کہ روانی و برجستگی کس کے کلام میں پائی جاتی ہے اور تصنع و آورد کس کے اشعار ہیں۔ اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ سراپا کا مضمون اگر سست مضمون ہے تو دونوں شخصوں کے کلام پر اس کا یکساں اثر پڑتا مگر ایسا نہیں ہے۔ نواب مرزا کے شعر بہت ہی پھڑکتے ہوے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردہ مضمون میں اُس نے جان ڈالدی۔ تصویر ایسی کھینچی جو باتیں کررہی ہے ناک میں نیم کا منکا ہے مسی کے ہونٹ گلے میں کرتی یہ کہہ رہی ہے کہ بن بیاہے پن کا زمانہ ہے۔ کرتی کا پھنس جانا بالوں کا گندھا ہوا اور پریشان ہونا دونوں باتیں دل کش ہیں۔ شوق نے دونوں کا حسن ایک ہی مصرع میں دکھایا ہے اور ایک ہی وقت میں ع

کچھ گندھے کچھ کھلے وہ سر کے بال۔ حالی مرحوم نے اس بات پر تعجب کیا ہے کہ شوق اپنے اسکول کے خلاف دوسرے راستہ پر کیوں چلے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ ضلع بولنا اور ہنوٹ کرنا اہل لکھنو کے سوا اور کسی کے کلام میں پایا ہی نہیں جاتا تو انصاف سے بعید ہے۔ خواجہ اثر مرحوم کے انھیں تیرہ شعروں میں دیکھ لیجئے کہ کتنی جگہ ضلع بول گئے ہیں گردن کا خیال آنے سے منکا ڈھل گیا۔ مینا کی گردن جھک گئی بازو کا دھیان آیا تو ہاتھ پاوں پھول گئے۔ کلائی کو دل لینے کی کل آئی ہنوٹ دیکھئے کہ ناک کو اوس توتے سے تشبیہ دی ہے جو شہد میں چونچ ڈبویا چاہتا ہے اور شہد کا استعارہ دہن سے کیا ہے میں شاہ نصیر وغیرہ کا نام کیوں لوں غریب اگلے زمانے والے ضلع بولنے کو کلام کی جان سمجھتے تھے اوس زمانہ کا رنگ بھی یہی تھا اونھیں کیا خبر تھی کہ جسے وہ صنعت سمجھے ہوئے ہیں ایک زمانہ میں اوسی کو عیب سمجھیں گے۔ میں تو خود مولوی حالی کو دیکھکر تعجب کرتا ہوں کہ آپ بھی کہیں کہیں ضلع بولجاتے ہیں۔

علی حیدر طباطبائی

کرۂ ارض کی عمر

اس سیارے کی عمر کے متعلق بروے علم طبقات الارض معلوم ہوا ہے کہ اوس زمانہ سے لیکر جب سے کہ چٹانوں کی پرت بننی شروع ہوی آج تک دس کروڑ سال سے کسی قدر زیادہ زمانہ گزر گیا ہے از روے وید تیس کروڑ سال کی ہے جس میں سے (۸۰۹۴۹۳۹۷۲۹۱) برس گزر چکے ہیں اور (۴۸۹۰۵۰۷۴۳۲۲) سال اور باقی ہیں چینی قرآنی موسوی وغیرہ مذہبی کتابیں موجودہ دنیا کی عمر ۶ ہزار سال کے اندر اندر بتاتی ہیں۔ ریویو آف ریویوز میں ایک فاضل جیالوجسٹ (عالم طبقات الارض) نے زمانۂ حال کی تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ شایع کیا تھا کہ موجودہ زمین کی عمر ایک ارب سال سے کسی صورت میں کم نہیں ہے۔

محروم تمنا

یوں تو شعراء نازک خیال کے دیوانوں نا ثران بلند پرواز کے مضمونوں اور جادو نگاروں کے افسانوں میں صدہا وحشت خیز سین نظر سے گزرے ہونگے مگر میں اپنے عالم تنہائی اور اوس فراق کی بے چین گھڑیوں کی حالت جو مجھ پر گذری اور گذر رہی ہے مختصر الفاظ میں حوالہ قلم کرنا چاہتا ہوں۔ میرا قلم ایک مصور ہے جو میرے جانفرسا مصائب کی ٹوٹی پھوٹی تصویر کھینچکر پیش کر سکتا ہے۔

یوں تو تنہائی دنیا کی مصیبتوں میں سب سے زیادہ خوفناک اور الم انگیز مصیبت ہے مگر جب مکروہات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر پیارے محبوب کے ساتھ تنہائی میں زندگی بسر ہو تو اس سے زیادہ مسرت بخش اور پر راحت کوئی چیز دنیا میں نہیں مل سکتی۔

نیند اوسکی ہے دماغ اوس کا ہے راتیں اوسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہوگئیں

لیکن جب جان سے پیارا عزیز آنکھوں کے روبرو نہ ہو اور سینکڑوں راحت و آرام کی چیزیں میسر بھی ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک تیرہ و تار حجرہ میں قید کر دیا گیا ہے اور چاروں طرف سے اوسکی تنگ دیواریں غم و الم وحشت و پریشانی بنکر دبا رہی ہیں میری حالت ایسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ ایک تو محبوب سے جدائی اور دوسرے عالم تنہائی جدہر آنکھ اٹھاکر دیکھتا ہوں نہ کوئی مونس نظر آتا ہے نہ غمخوار میں ہوں یا میری نا امیدیوں کا ایک متلاطم اور ڈراونا دریائے ناپید اکنار

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

جب طبیعت گھبراتی ہے گھر سے باہر نکل جاتا ہوں اور جنگل کا رخ کرتا ہوں تاکہ جھاڑ پہاڑ اور سبزہ زار سے جی بہلاؤں اور کسی کے تصور کو تھوڑی دیر کے لئے دل سے بھلا دوں لیکن وہاں تو کچھ اور ہی منظر نظر آتا ہے ہرے ہرے سبزہ زار دور تک پھیلے ہوے دکھائی دیتے ہیں اور لہلہاتا ہوا سبزہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک نیلا سمندر اپنی دھیمی رفتار سے بہہ رہا ہے کہیں کہیں گھانس میں خوشرنگ رنگا رنگ پھول نظر آجاتے ہیں اور دہوپ میں ایسے دکھائی دیتے ہیں گویا قدرت نے رنگ برنگ کے قمقمے چھوڑ رکھے ہیں جنکی جگمگاہٹ قوس قزح کیطرح مختلف رنگوں میں نمودار ہو رہی ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

جب ادہر سے نظر اوٹھتی ہے تو آس پاس کی شاداب پہاڑیوں پر پڑہ جاتی ہے جنکے دامن میں صاف و شفاف چشمے پیچ کھاتے ہوے اس انداز سے بہہ رہے ہیں کہ کسی کا اٹھکیلیاں کرتے ہوے چلنا یاد آجاتا ہے چشموں کے کنارے سایہ دار درختوں کی شاخوں پر انواع واقسام کے طیور زمزمہ سنجی کرتے اور اپنی کامیابیوں پر مبارکباد کے ترانے گاتے نظر آتے ہیں۔ غرض خدا کی مخلوق اوسکی عطا کی ہوئی نعمتوں سے بہرہ اندوز دکھائی دیتی ہے اور سب کے سب پُر ترنم نغموں میں

اوس کے شکرانِ نعمت اور حمد و ثنا کا راگ الاپتے سنائی دیتے ہیں
لیکن آہ ـــــ کیا یہ دلکش و دلفریب نظارے اور یہ خوشنما
مناظر میرے دل کو شگفتگی بخش سکتے ہیں نہیں ہرگز نہیں۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائیے

مجھے بھی وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جبکہ صحبت حبیب میں میرا دل بھی
اس مسرت و انبساط سے بہرہ اندوز تھا جیسا کہ ان ذرا ذرا سی چڑیوں
کا ہے۔ آہ ـــــ کوئل کی کوک اور پپیہا کی پی کہاں دل میں
ٹیس اور جگر میں درد پیدا کر دیتی ہے بلبل کی نغمہ سرائی اور فاختہ
کی کوکو سے دل حسرت و الم سے امنڈ آتا ہے اور چڑیوں کا چہچہانا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے مصائب و آلام کے ارغنون پر ہاتھ
رکھکر ایک دردیلا سُر چھیڑ دیا ہے۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش رشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

جب وحشت کا دورہ اور غم کی فراوانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو سینہ
میں جلن اور دل میں سوزش ہونے لگتی ہے اور نالہائے
جگر خراش آگ کے پرکالے بنکر منہ سے نکلنے لگتے ہیں جب کسی طرح
چین نہیں آتا تو کسی سبزۂ نودمیدہ پر گر کر لوٹنے لگتا ہوں
تاکہ اوس کی ٹھنڈک سے دل کو آرام ملے اور یہ شعر پڑھکر رو دیتا ہوں

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

وہ شبنم کے نازک نازک قطرے جو اس پر بکھرے نظر آتے ہیں۔
بجائے تسکین دینے کے میرے تپش دل کی حرارت سے بخار بنکر
اڑجاتے ہیں اور ہری ہری گھانس کا خوش بستر سوزان بن جاتا
ہے جب اوبھن اور بڑھتی ہے تو دیوانہ وار پہاڑوں سے ٹکرانے
کو جی چاہتا ہے تاکہ اس سودائے محبت سے سبکدوش ہو جاؤں
لیکن تجھ سے ملنے کی امید سدِّ راہ بنکر روک دیتی ہے۔

بیشک امید زندگی کی تاریکی کا چراغ ہے جو غم و الم کی ناہموار
گھاٹیوں میں خضرِ راہ بنکر منزل مقصود تک پہونچاتا ہے۔ مگر
میرے لئے نہیں۔ میرے لئے تو امید ایک سراب ہے جو دور سے
نظر کو دہوکہ دیتا ہے۔ میرے لئے امید ایک کشتی ہے جس کا
ملاح ہوا کے تیز و تند جھونکے اور طوفان خیز موجیں ہیں جو زندگی
کے ذخار سمندر میں جھکولے دے رہی ہیں جس سے کبھی ڈوبتا
کبھی ابھرتا ہوں۔

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

فراق کی گھڑیاں جھیلنے سے تو یہی بہتر ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے
ناامیدی کی گہرائیوں میں دل ڈوب رہا ہے جب کسی طرح بھی
ظالم نہیں بہلتا تو پنسل کاغذ لیکر اپنے جذبات نکالنا چاہتا ہوں
مگر اوس میں کیا خاک جی لگے پنسل ہاتھ میں کاغذ سامنے مگر خیال
کسی کے قدموں سے لپٹا ہوا ہے شدت غم سے قلم روتا ہے اور حروف
ماتمی لباس پہن لیتے ہیں ایک گونہ تسکین تو ہو جاتی ہے کہ میرے
حال زار پر رونے والے اور غم میں میرا ساتھ دینے والے تو موجود
ہیں سب پھینک پھانک کر بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور جان
دیدینے کو جی چاہتا ہے مگر

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

بیچاری شمع میرے سرہانے ٹمٹما کر جلتی ہوئی میرے حال زار پر آنسو
بہانے لگتی ہے رات کے سناٹے میں جب پپیہے کی دردبھری آواز
کسی طرف سے آجاتی ہے تو بے اختیار یہ مصرعے زبان سے نکل جاتے ہیں

اے پپیہا بس خدا کے واسطے چپ ہو ذرا رات آدھی آ گئی ظالم تجھے کیا ہو گیا
تیرے پی پی کہنے سے وہ بیوفا یاد آتے ہے،

جب چاند نکلتا ہے تو اوس کی صاف اور شفاف روشنی تاریکی کا پردہ عالم سے اٹھا دیتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ چاند کی روشنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو تازگی بخشتی ہے مگر آہ ——— وہ مجھے خوش نہیں کر سکتی اوس کی ٹھنڈی اور دھیمی روشنی میرے دل کو تسکین نہیں دے سکتی اوس کا وجود گو دنیا کے لئے باعث فرحت و مسرت ہوا اور اوس کی ضیا گو قوت بصارت کی مد و مؤید ہو مگر میرے لئے ایک شرارۂ آتش افشاں ہے جس کے شعلے دل و جگر میں آگ لگا دیتے ہیں وہ ایک کرۂ نار ہے جسکی لو سے تن بدن جھلس جاتا ہے۔ مگر کسی کے عارض پر نور کے آگے اوس کا وجود بے وجود ہے کیونکہ اس میں لاکھوں داغ موجود ہیں لیکن اوس کا سینہ کیوں داغدار ہے شاید کسی کے مصفا اور نورانی چہرہ کی یاد نے جسکے ہم دیوانے ہیں ہجر و فراق کے انگاروں پر لٹایا ہے اگر واقعی ایسا ہے تو وہ میرا رقیب ہے میں اوس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

خدا عالم و دانا ہے کہ جب کسی پہلو کسی کروٹ چین نہیں آتا تو گھبرا کر باہر باغ کے نکل جاتا ہوں پھر تھم جاتا ہوں رات کا سناٹا سنسان مناظر کی بھیانک تاریکی آ کر مجھے گھیر لیتی ہے۔ درندوں کی مہیب آوازیں دور ہی سے ڈرا ڈرا کر روک دیتی ہیں کہ خدا کے لئے اس طرف کا قصد نہ کرنا کیا کہوں اس وقت دل پر کیسی وحشت طاری ہو جاتی ہے دم لبوں تک آ کر رہ جاتا ہے مگر اس کرب و سخت جانی سے نجات نہیں ملتی۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

گو دنیا کے بوقلموں مرقع میں بہتیرے ایسے دلکش و دلفریب سین نظر آتے ہیں جس کو دیکھ کر دل میں مسرت و انبساط کا دریا لہریں مارتا ہوا نظر آتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا دوسرا رخ ایسے کریہ منظر ہیبت ناک اور درد انگیز سین پیش کرتا ہے کہ وہ تمام فرحت و مسرت جو دلچسپ مناظر سے حاصل ہونی چاہیئے حزن و ملال سے مبدل ہو جاتی ہے

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

آہ میں ایسا خوش ہوں جسکے پردہ میں ناخوشی جلوہ گر ہے آہ ——— میں وہ خوش ہوں جسکے پہلو میں نیش آرام کر رہا ہے اور میں ایسا ناکام ہوں جس طرح کسی شخص کا دل گلاب کے ایک شاداب و خوشنما پھول کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھول جاتا ہے اور جب وہ اسکے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تو یکایک ایک تیز کانٹا اوس کی انگلی میں پھنس جاتا ہے اور وہ ایک چیخ مار کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اپنی انگلی دبائے ہوئے درد سے کراہتا ہوا چلدیتا ہے یہی حالت میری خوشیوں کی ہے جو ایک پھول کے نظارے سے پیدا ہوتی مگر اوس کے کانٹے کی خلش سے فوراً فنا ہو جاتی ہے۔

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

گو دنیا دار المحن کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے کیونکہ اوسکی مسرتیں سریع الفنا ہیں اور اوس کے غم و الم قایم رہنے والے ہیں جس طرح تیرہ و تار بادلوں میں ایک لمحہ کے لئے بجلی کوند کر غائب ہو جاتی ہے اور بجز آسمان کی بے پایاں تاریکی کے اور کچھ باقی نہیں رہتا اسی طرح ایک ناکام عاشق کی زندگی کے مصائب و آلام کے گہرے بادلوں میں کبھی کبھی خوشی کی بجلی چمک جاتی ہے اور پھر وہی غم کا سیاہ منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

آہ اپنے ــــ وہ کے درد فراق سے کبھی روتا ہوں اور کبھی
ہنستا ہوں ۔ روتا اس وجہ سے ہوں کہ میری ہنسی بے فائدہ ہے اور
ہنستا اس وجہ سے ہوں کہ میری قسمت میں رونا ہے گو تنہا ہوں
اور ایسا تنہا کہ مرجاؤں تو میری نعش پر کوئی دو قطرے اشک بہانے والا نہیں
ہے اس کا مطلق غم بھی نہیں ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے ــــ
وہ کا خیال میرے ساتھ ہے اور وہ اخیر دم تک ڈھارس دیگا اور قبر
تک مجھے پہونچائیگا میں کیونکر تنہا ہوسکتا ہوں کیا میری حسرتوں کا ہجوم
میرے سر پر رونے کے لئے کافی نہیں ہے ۔

عالم تنہائی کیا ہے ایک ہو کا میدان ہے یا میری مردہ حسرتوں کا قبرستان
جس پر خاموشی نے ایک پردہ ڈال رکھا ہے اور جس پر کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ
کی چادر پڑی ہوئی ہے ۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے ۔ کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

میں ایک چراغ مردہ ہوں جو اپنے ہی مردہ حسرتوں کے مدفن پر جلایا گیا
ہو آپ انجمن کامرانی کی وہ شمع روشن ہیں جس پر پروانے ہر طرف سے اپنی
جانیں قربان کر رہے ہیں ۔ میں ایک بیمار ہوں جو اپنی موت کی آخری منزل
پر پہونچکر تھک گیا ہوں ۔ اور آپ وہ مسیحا ہیں جو شربت دیدار کے ایک
جرعہ سے اسکو جلا سکتے اور قبر سے لوٹا سکتے ہیں میری مصیبتوں کی کہانی
میری ناکام امیدوں سے بھی زیادہ طویل ہے خدا ہی جانتا ہے کہ دن کیونکر گزر
جاتا ہے مگر رات کاٹنا دشوار ہوجاتا ہے ۔

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشکال ۔ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

باوجود گوناگوں آلام و مصائب کے خدا گواہ ہے کہ مجھے اپنے پیاری رات دن اپنی جان
سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ دن کسی کے روئے پرتنویر کی یاد دلاتا ہے اور رات انکی
جعد مشکین کا نمونہ ہے میرا بیقرار دل پارے کی ایک بھری ہوئی شیشی ہے جسکو کسی
طرح قرار نہیں ظالم جب تڑپتا ہے اسکے تڑپنے پر میں بھی بے اختیار تڑپ جاتا ہوں
خدا جانے زبان قلم سے عالم بیخودی میں کیا کیا نکل گیا ہے یہ قلم ازل کا زبان دراز مشہور ہے
اسکے کہنے کا کچھ برا نہ ماننا اگر کچھ خاطر پر بار گزرا ہو تو ضرور گزرا ہوگا تو میں اسکی بابت
عالم خیال ہی کاٹے دیتا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ ہم دونوں قابل معافی ہیں

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

"تمنا" ر۔ب۔ک۔ا

مقالات حیدر

(مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی)

اُسی پہ حضرتِ اعظا کو کچھ اصرار ہوتا ہے ۔ جو افسانہ بعید از عقل و از کار ہوتا ہے
جہاں کی کامیابی ہے کرشمہ جوشش ہمت کا ۔ اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے
خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا ۔ نجانے کس کی چٹکی میں لب سوفار ہوتا ہے
جہانِ بیوفا سے دل لگاؤنگا نہ میں ہرگز ۔ محبت یہ بڑھا کر درپے آزار ہوتا ہے
زوال آمادہ ہے پیری میں لوگوں کی سفیدی بھی ۔ کہ جیسے دن لب بام و سر دیوار ہوتا ہے
ذرا اے خانقہ کے جانیوالو یہ بھی سن رکھو ۔ کہ پیر میکدہ بھی واقف اسرار ہوتا ہے
مقامِ اہل نظر کا وادیِ ایمن سے آگے ہے ۔ یہاں شبنم کا ہر قطرہ تجلی زار ہوتا ہے
بیانِ غم اک افسوں ہے شکستِ رنگ تمکیں کا ۔ فغان شیشہ کی سن کر مضطرب کہسار ہوتا ہے
قضا کس آئنہ خانہ میں دوچار آتی ہے لاکھوں ۔ بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے
نہ رکھو اے چارہ گر اُس ناتواں پر تہمت گریہ ۔ گرانا ایک آنسو کا بھی جسکو بار ہوتا ہے
اگر دنیا سے استغنا ہو مرنا بھی ہے آساں ۔ ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
گذرگاہ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں ۔ کہ تھم جاتا ہے گر دریا رواں کہسار ہوتا ہے
کھلا یہ مہر تاباں آفتاب و شبنمستاں سے ۔ ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب دیدار ہوتا ہے
ہوا و ابر و بحر و بر یہ سب ہیں سیر خزانے میں ۔ وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے
گواہی دے رہی ہے چہرہ کی سرخی تیری اے ساقی ۔ ترے احساں سے شرمندہ بہت میخوار ہوتا ہے
تڑپنے لوٹنے کا تھا مزہ عہد جوانی کا ۔ گئی فصل جوانی اب دل بیکار ہوتا ہے
مزہ اس سستی پر بھی ہے کرتی ہے رنج مجھ سے ۔ شکایت اس کی کیا اب تو ہمیں خمار ہوتا ہے
متاع صبر لٹ جاتی ہے کیونکر کوئی کیا جانے ۔ نگہ کرتی ہے چوری غمزہ پہرہ دار ہوتا ہے
سنا ہوگا نہ تونے ایسا نغمہ عمر بھر ہوگا ۔ شکست توبہ آہنگ موسیقار ہوتا ہے
رسائی چاہتا ہو نظم اپنے خانہ دل تک ۔ تو پہلے سدرہ بت خانہ بیدار ہوتا ہے

اسراف

اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْن

اسراف یا دوسرے الفاظ میں فضول خرچی وہ غذا ہے جو پہلے میٹھی اور بانجام کار میں کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ چند روزہ راحت ہے جس کا سلسلہ تکلیف و رنج کی سرحد سے ملتا ہے اسراف وہ نمائشی عمارت ہے جس کا موسم بہار میں منہدم ہونا مسلمہ ہے یہ وہ بد پرہیزی ہے جس سے انسان طرح طرح کے امراض روحانی میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ وہ نسیم دلربا ہے جسکے ابتدائی جھونکے تو خوشگوار معلوم ہوتے ہیں مگر آخر میں بادسموم ہو جاتے ہیں یہ وہ چمکتا ہوا ملمع ہے جو چند روز میں اتر جاتا ہے غرضکہ اسراف وہ مقدمہ ہے جو ہمیشہ خرابی و بربادی کا منتج ہوتا ہے۔

مسرف آدمی باوجود صاحب بصیرت ہونے کے اندھا کہا جاسکتا ہے یہ ایسا مست ہوتا ہے کہ باوجود عقل و شعور رکھنے کے اپنی حالت کی مطلق پروا نہیں کرتا بلکہ اس نشۂ مستی میں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے حالانکہ اوس میں نیک و بد حسن و قبح کا مادہ موجود ہوتا ہے اور ان ساعات میں جبکہ وہ ذی ہوش ہوتا ہے اپنے افعال و کردار کا موازنہ اور اون پر نظر واپسین ڈالنے کی قابلیت اوس میں موجود ہوتی ہے منشاء فطرت کے لحاظ سے ہر شخص کو دور اندیش ہونا چاہیئے اسکو اپنی موجودہ حالت اور آیندہ پیش آنے والے واقعات کا پورے طور سے خیال رکھنا ضرور ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ آج سب کچھ ہے مگر کل کی ذرا بھی خبر نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ زندگی اور موت، نیکنامی و بدنامی، خوشی و غمی، اور عروج و زوال غرض کوئی شئے اعتبار کے قابل نہیں۔ اگر اوس کے ذہن میں یہ خیال خام سما گیا کہ یہی دولت و شوکت مدۃ العمر میرے جلیس و انیس رہینگے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی حالت قابل رحم ہوگئی ہے۔

روزمرہ کے واقعات اور مشاہدات ہمارے لئے کچھ کم ادب آموز نہیں ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ غربت کی بلا بڑے بڑے امیروں پر نازل ہوگئی۔ جن کے گھروں میں سونے چاندی کی شب و روز ریل پیل رہتی تھی۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ گھر میں چراغ کا تیل بھی میسر نہ ہوا ذی وقار خاندان تباہ ہوگئے۔ زمانہ نے اپنی محشر انگیز رفتار سے جن لوگوں کو دوسروں کا محتاج کر دیا اون کی حالت پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے جنکی بدولت ہزاروں بندگان خدا پرورش پاتے تھے آج وہ دوسروں کے دست نگر ہیں۔ دولت کسی کی ہو کر نہیں رہتی۔ یہ ایک وقت معلوم تک اپنی لذتوں سے خوش رکھتی ہے اس کے قیام پر بھروسہ کرنا محض نادانی ہے اگر آج ہم دولتمند ہیں تو ہم کو خدا کی درگاہ میں شکر بجا لانا چاہیئے اور اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ ہماری حیثیت کن ضروریات کی مقتضی ہے اور کن شرایط کی بجا آوری کے بعد ہم اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کر سکیں گے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں انسان کو میسر ہوتی ہیں وہ سب امانت ہیں جن میں بیجا تصرف لایق مواخذہ و بازپرس ہے۔

ہم کو دولت اس غرض سے نہیں دی گئی ہے کہ واہیات باتوں اور بے نتیجہ کاموں میں صرف کر دی جائے بلکہ اس کا مصرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اوس سے اپنی اور مستحقین کی حاجت براری

کریں۔ بقول حضرت نظم طبا طبائی :۔

اک ادائے اسراف ہے اک رہگزر فیض ۔۔ ساتھوں پہ یہ جو راہ تو آنکھوں پہ یہ رستہ
ہم کو سر فیض اور نہ انھیں دردِ سر فیض ۔۔ کیا اہلِ قناعت کو غرض اہلِ غنی سے

نیک کاموں میں صرف کریں، غربا اور قابلِ رحم لوگوں کی مدد کریں یا محتاجوں۔ بیواؤں یتیموں کی اس سے خبر گیری کریں۔ ان کی ضروریات پر بھی نظر رکھیں۔ ناپسندیدہ کاموں میں روپیہ کو برباد نہ کریں۔

فی زمانا اسراف باعث تمکین اور دوسروں پر اپنا سکہ جانے کا ایک بہترین وسیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہم نشینوں کی اچھائی یا برائی اس بارہ میں خاص طور پر موثر ثابت ہوتی ہے۔ خود غرض اور مطلبی لوگ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مسرف کو از خود رفتہ کر دیتے ہیں کہ اس کو محاسن و ذمایم میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ اکثر صحبتوں میں خوشامدیوں کا ہجوم اور خوشامد کی بھر مار ہو جاتی ہے اور یہ بالفرض سنتے سنتے طبیعت خودستائی کی عادی ہو جاتی ہے وہ لوگ جو کچھ خود غرضی سے کہتے ہیں اوس کو وہ من و عن درست و صحیح باور کرنے لگتے ہیں کسی خوشامدی نے جو یوں کہنا شروع کیا کہ فی زمانا فیاضی کا خاتمہ آپ کی ذات پر ہے۔ آج ساری خدائی آپ کی عقلمندی و سیر چشمی و عالی حوصلگی کا دم بھرتی ہے، چاروں طرف آپ ہی کا نام ورد زبان ہے تو پھر کیا کہنا ان کی حالت دگرگوں ہو گئی اور سمجھنے لگے کہ "ہمچو من دیگرے نیست" خوشامدیوں کو اپنا حقیقی ہمدرد، سچا خیر خواہ دلی دوست تصور کر لیا۔ عقل خداداد سے کام لینے کی قسم کھائی تھی علم کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے ایک تو معلومات کی کمی، دوسرے ناتجربہ کاری، تیسرے صحبت کی خرابی، ایسے حالات میں بیوقوفی اور نادانی کے جو کام نہ کر بیٹھیں کم ہے، بے وجہ اظہار شان و شوکت میں سو کی جگہ دو سو خرچ کر دینا بڑی حماقت کی دلیل ہے جب یہ ہوگا تو قرض کی نوبت پہونچ جائے گی گنج قارون بھی ایسی حالت میں کفایت نہیں کر سکتا۔ انسان اسی اسراف کی بدولت قرضہ کی بلائے بے درمان میں پھنستا ہے اور جائداد کا زوال و انتقال اس کا ایک معمولی کرشمہ ہے آخر کار ان افعال سے دولت نے تو بتدریج کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس بے رخی سے نگاہیں پھیر لیں جیسے شام کے وقت دھوپ اب حضرت مسرف کا کوئی پرسان حال نہیں۔ پاس آنے تک کا کوئی روادار نہیں ہوتا۔ اگر کہیں راستہ گلی میں صحبت دیرینہ کے کسی آشنا سے سامنا ہو گیا تو یہ وہ دونوں نظر بچا کر کترا جاتے ہیں جو ہمدردی اور جان نثاری کا دم بھرتے تھے۔ پسینہ کی جگہ خون بہانے پر تیار تھے طرفۃ العین میں اون میں حیرت خیز قلب ماہیت ہو گئی۔ یہ یہ حضرت ہیں کہ ایک ایک کوڑی کو محتاج دربدر خاک پھانکتے ہیں یہ وقت اور زمانہ کے تغیرات ہیں۔ کاش یہ پہلے ہی عقل سے کام لیتے۔ اون مکاروں کی خوشامد پر بھروسہ نہ کرتے تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوتا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؏

کوئی کسی کا نہیں دوست سب کہانی ہے

انسان کو ہر وقت اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے اور اپنے اوس آنے والے زمانہ کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے جس کے نزول کے وقت سے وہ محض ناواقف و بے بہرہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس خیال کے بھی دلدادہ پائے جاتے ہیں کہ ہم تو اپنی زندگی عیش و آرام سے گزاریں اولاد خود اپنی فکر کر لیگی اولاد پر والدین کا اثر اچھا خاصہ پڑتا ہے اور وہ بھی انہیں عادتوں کے شکار ہو جاتے ہیں جو وہ ایک مدت سے اون میں دیکھا کرتے ہیں ایسی صورت میں اولاد کے پاس بجز کاسۂ گدائی کے اور کونسی دولت باقی رہ سکتی ہے علم و ہنر نہ تو خود سیکھا نہ اولاد کو سکھلایا۔ روپیہ جس حد تک کہ اپنے اور دوسروں کے ضروریات زندگی کی فراہمی پر صرف ہو سکے۔ بلاتامل صرف کرنا

چاہیئے البتہ اون غیر ضروری مصارف سے احتراز لازم ہے جو اسراف کی تعریف میں داخل ہوتے ہیں۔ اخراجات کی تقسیم تین طریقوں پر کی جاسکتی ہے۔

(۱) وہ خرچ جو اعتدال اور سمجھ بوجھ کے کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے خرچ سے ہم کو ہر طرح کا آرام و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور دولت بھی جائز اصول سے صرف ہوتی ہے ہر شخص کو تونگری کی حالت میں بھی اپنے ضروری اخراجات میں جادۂ اعتدال کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔

(۲) خِسّت۔ خسیس وہ ہے جو روپیہ پیسہ کو اکٹھا کرتے رہنے کی حالت میں دنیا سے کوچ کر جاتا ہے اور آخری وقت تک بھی اس کی یہی حسرت رہتی ہے کہ اوس کو اور جمع کرلوں۔ وہ اپنی دولت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ دوسرے اوس سے منتفع ہوسکتے ہیں۔ اوس کا نصب العین صرف حصول دولت ہوتا ہے اور اپنی اصلی مسرت کو وہ اجتماع دولت میں مضمر سمجھتا ہے خسیس ہونا نہایت معیوب ہے اس لئے کہ جب ہم نے اپنے سرمایہ سے نہ اپنا کوئی کام کیا اور نہ اُس سے دوسروں کو فائدہ پہونچایا تو ایسی دولت کا عدم وجود برابر ہے دولت اس واسطے نہیں دی گئی ہے کہ اوس کو زیر زمین پنہاں کرکے گاہے ماہے ہم اُس پر حسرت و خوشی کی نظر ڈال لیا کریں۔ روپیہ کے موجود ہوتے ہوے عزیز و اقارب، دوست و احباب، اور بندگان خدا کو تکلیف کی حالت میں مبتلا رکھنا بھی ایک اخلاقی جرم ہے وہ اس لئے بھی نہیں ہے کہ ہم بیکار فضول باتوں میں اُس کو لٹادیں اور پھر محتاج بنکر دوسروں کے دست نگر ہو جائیں اور نہ اسلئے ہے کہ تفوق و خود نمائی کا اوس کو ذریعہ قرار دیا جائے

ع گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

(۳) اسراف ہے جس کا بہت کچھ ذکر آچکا ہے۔ اگرچہ ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ خسیس ہونا بھی بُرا ہے مگر خسیس کی زندگی مسرف کے مقابلہ میں اچھی حالت میں گزرتی ہے کیونکہ اُس کی زندگی یکساں اور اطمینان بخش ہوتی ہے اور روپیہ کی حفاظت کا خیال اس کو ہر وقت بندھا رہتا ہے۔ حالانکہ اس خست کی حالت میں اُس کو اور بہت سی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ خوگر ہو جانے کی وجہ سے ایسی تکلیفوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ برخلاف اُس شخص کے جو چند روزہ عیش و عشرت کے بعد پھر اون مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے اوس کی زندگی کے دن پورے ہونا دوبھر ہو جاتے ہیں ہر قسم کی تکالیف جھیلنا پڑتی ہیں۔ عادتیں بگڑی ہوی ہوتی ہیں اور خیالات اونچے۔ محنت سے پیدا کرنا معلوم۔ اب تک تو امیرانہ ٹھاٹھ سے گزری۔ کوئی فن جانتے نہیں۔ کام سے جی چراتے ہیں لڑکپن میں اگر کچھ سیکھا بھی تھا تو عیش و آرام نے اوس کو ذہن سے اتار دیا۔ بہر حال خسیس کو فضول خرچ پر ہر طرح سے ترجیح دی جاسکتی ہے۔ اگرچہ خسیس ہونا مذموم ہے مگر فضول خرچ سے اس کی حالت یقینی بہتر ہوتی ہے۔ انسان کو وہ روش اختیار کرنی چاہیئے جو ان دونوں کے بین بین ہو یعنی درجہ اوسط جس کو اعتدال کہتے ہیں۔ اعتدال ہر حالت میں اچھا و موثر ہے جس کی ہر شخص کو لازمی طور پر پابندی کرنا چاہیئے فقط

ہوش بلگرامی

ایڈیٹر ذخیرہ

رُباعیاتِ عدیل

ملک زر شاہ و لاو سے مسرور رہیں
دنیا کی خوشی ہو رنج و غم دور رہیں
روشن جب تک ہے شمع قندیل فلک
یارب قایم حضور پر نور رہیں

جو دوست ہیں سب کے سب وہ آباد رہیں
دشمن جو ہیں دوستوں کے برباد رہیں
خالق سے ہے یہ دعا کہ محسن میرے
آباد رہیں خلق میں اور شاد رہیں

ہو رنج کہ تکلیف سہا کرتا ہوں
کچھ منہہ سے کہونگا نہ کہا کرتا ہوں
اک آن نہیں قرار دل کو میرے
گردش میں زمانہ کے رہا کرتا ہوں

مخلوق کی کشتی کو وہی کہتا ہے
بندہ بندے کی کب خبر لیتا ہے
ہے عالم اسباب بظاہر دنیا
جو ضامن رزق ہے وہی دیتا ہے

پارس جو ملے کسی کو تقدیر ہے یہ
مجکو نہ ہوس نہ میری تدبیر ہے یہ
اپنا تو خیال ہے کہ اس عالم میں
راحت جو ملے سمجھ لے اکسیر ہے یہ

عاصی ہوں سیہ کار و خطاوار ہوں میں
اس واسطے رحمت کا سزاوار ہوں میں
محشر میں کہونگا کہ زیادہ سب سے
یارب تیرے بندوں میں گنہگار ہوں میں

آزاد تھا نوبت اسیری آئی
خود دل میں ہوائے گوشہ گیری آئی
باور نہ ہو ہم سنو سے پوچھ پیر
کیونکر مجبور کر کے پیری آئی

نہ کہو شباب کہ ہے عہد شیب کی آمد
تقصیر یہ وقت کار وہ ہنگام دستگیری ہے
نکر غرور جوانی یہ اپنی اے غافل
شباب خواب ہے تعبیر اسکی پیری ہے

طفلی و پیری و جوانی سب ہے
اس کی تفصیل اک کہانی ہے
ختم اب ہو چکا ہے ہر موسم
آخر اب فصل زندگانی ہے

عدیل بلگرامی

آئینہ سحر

مہر انور کا بیاض صبح لیکر آئینہ
کرتی ہے اسرار قدرت روبرو سب آئینہ

جلوہ ہائے بیحجاب روئے شاہد شرق سے
طارم افلاک بنتا ہے چمک کر آئینہ

نور پھیلا ہو گیا عالم کا عالم پر ضیا
کر دئے سورج نے سب پر آبجو بر آئینہ

اس سہانے وقت کی تھی چھوٹی اُفق پر نور
تا کمال صنعت صانع ہو سب پر آئینہ

کر چکی اے طبع۔ روشن حالت ارض و سما
ہاں ذرا اب حال بزم حسن بھی کر آئینہ

جب اُٹھا انگڑائیاں لیتا ہوا وہ محو ناز
پھر دید یار لائی صبح انور آئینہ

فکر آرایش ہوئی مدنظر اس شوخ کو
شوق خود بینی میں رکھا زانو دل پر آئینہ

یاں دل سوزاں پہ اپنے قہر کی بجلی گری
اُس نے دیکھا شوق سے اُن مسکرا کر آئینہ

قدرت حق وقت آرایش بھی آتی ہے نظر
آئینہ میں آئینہ ہے آئینہ پر آئینہ

حسن خود بیں کو سکھائے اپنے آئین غرور
تو نے آخر کیوں بنایا اے سکندر آئینہ

حد ہی آرایش کی کچھ کب تک کریگا وہ سنگار
ہاتھ سے چھٹتا نہیں ہے اب تو دم بھر آئینہ

آئینہ کیونکر نہ ہو مجھ پر نتیجہ عشق کا
تشنۂ الفت کو ہے قاتل کا خنجر آئینہ

قدسی جالسی

یادش بخیر

اے تغافل مشق اے شعبدہ کار اے پرفن
یاد ہے تجھکو کسی باغ کی گلگشت چمن

ساتھ چلنے سے گریز اور کبھی چلنا بھی
بھول جانے سے دامن کے وہ بیتاب حسن

آئینہ خانہ میں چلنے پہ جو اقرار ہوا
غور سے دیکھ کے مجھکو وہ جبین ابرو پہ شکن

عاجزی کرنے سے آیا جو خیال خاطر
میرے چہرہ پہ نظر دیکھ کے خود وا بھی جبین

نگہ شوق کے ارمان نہ نکلنے کیلئے
صرف کرتی تھیں وہ چشمک تھیں سیاہ افن

وہ خود آرائی کے اصرار سے رنگین ہے گیا
وہ قبائے دکنی ہائے وہ پیچیدہ دامن

میری للچائی نگاہوں کی شرارت سے
وہ تک اٹھتی تھی پسینہ سے جبین روشن

پان دینے میں تکلف کبھی خود دیدنیا
کبھی اظہار محبت کبھی ہنستا دشمن

ہائے وہ پرسش پنہاں وہ تجسس وہ نگاہ
دیکھنے سے وہ میرے چہرہ کا رنگ غم و بد

میں فقط میں تھا تیری بزم میں منظور نظر
میرے ہی واسطے مخصوص تھے انداز سخن

میری ہی واسطے بنتی تھیں وہ اُمیں قاتل
صرف میرے لئے تھا حسن کا سارا جوبن

ہائے کیوں عرض ان کیا تو نے وفا کا میری / تجھکو اف تجھکو لکھے میرا قلم عہد شکن

اس پہ بھی دل سے نہیں جاتی ہے الفت تیری / میں نے چاہا تو بہت پر نہ مٹے نقش کہن

میں کبھی دل سے کیا کرتا ہوں باتیں تیری / میں بیاں کرتا ہوں تفصیل سے تیرے سب فن

لیکن اے بانیٔ جور و جفا سچ یہ ہے / تو نہ بھولا مجھے گو میں نے کیے لاکھ جتن

مسکراتی ہوئی تصویر تری سامنے ہے / میری حالت پہ وہ ظالم ہے ابھی خندہ زن

جب جنوں بڑھتا ہے تصویر سے تیری بسمل / درد آمیز طریقہ سے یہ کرتا ہے سخن

بتکلم نہ خموشی نہ تبسم نہ نگاہ
میتوان بردن بہر شیوہ دل آسان از من (نظیری)

بسمل مولانی

ایک جوانامرگ کی یاد میں

اے شبستانِ محبت کے چراغِ اولیں / اے نشاطِ زیست، اے راحت دہ جانِ حزیں

عالمِ اسباب میں تو تھا تو سب کچھ تھا مگر / اب نہیں ہے تو تو دنیا ہے فقط اک دردِ سر

آہ وہ دن جب نہ تھا کچھ تو مگر اک انتظار / تھی پریشانی سکوں اور بے قراری تھا قرار

چشم سوئے راہ بھی اور گوشہ بر آواز بھی / نالہ ہائے جاں گسل بھی سوز بھی اور ساز بھی

نشترِ غم سے تھا وابستہ رگِ جاں کا مذاق / وصل سے محبوب تر تھے مجھ کو ایامِ فراق

تھے تصور میں مزے تصدیق کے حاصل مجھے / لطف دے جاتی تھی مری سعیِ لاحاصل مجھے

اب کہاں آنکھوں میں وہ جوئے خوں جو ہو طوفاں خروش / اب کہاں زخموں کی وہ صورت جو ہو لالہ فروش

پھول ہیں زخمِ کہن کے تیری تربت کے لیے / اشکِ خونیں کی ہے چادر تیری میت کے لیے

یوں متاعِ خانہ کو برباد کرتا ہے کوئی / وقت سے پہلے بھی پیارے آہ مرتا ہے کوئی

علم کا مامن تھا تو تحقیق کا معدن تھا تو / عزم کا مخزن تھا تو اقبال کا مسکن تھا تو

اے جوانامرگ کیوں خاموش ہے کچھ تو بتا / آنکھ کیوں کی بند تو نے کیوں ہوا مجھ سے خفا

دور تجھ سے کیوں ہوا صبحِ بہارِ سن کا مذاق / کیوں نہیں شامِ اودہ کا تجھکو باقی اشتیاق

تیرے مرنے نے تو عقبیٰ کو نکما کر دیا / کہنے کو زندہ ہے لیکن اسکو مردہ کر دیا

ڈھونڈتا ہے یہ بھی مرقد کیلئے دو گز زمیں
یہ بھی جی کر کیا کریگا تو ہی جب زندہ نہیں

سید ظفر احسن علوی

بچے کا پہلا احساسِ غم

بچہ

تنہا تو کھیل کود میں لگتا نہیں ہے دل / اب جلد میرے بھائی کو واپس بلائیے

پھر بھونرے محوِ رقص ہیں پھولوں کے متصل / بھائی کدھر گیا مرا مجھکو بتائیے

کیا کیا چمک دکھاتی ہے اڑ اڑ کے تیتری / ہوتی شعاعِ مہر میں جب پرفشاں ہے وہ

بھائی بغیر اس سے بھی لگتا نہیں ہے جی / واپس بلائیے اسے اماں کہاں ہے وہ؟

پھولوں پہ دیکھ آئی ہوئی کیا بہار ہے / جو پھول ہم نے بوئے تھے اماں کنارِ باغ

انگور کی جو بیل ہے سو بار دار ہے / بھائی مرا کہاں ہے کہ لوٹیں بہارِ باغ

ماں

سنتا نہیں ہے وہ مرے پیارے تیری صدا / افسوس! اب نہ وہ رخِ خنداں دکھائیگا

چہرہ کبھی جو روکشِ صبحِ بہار تھا / روئے زمیں پہ تجھکو نظر اب نہ آئیگا

سرمایۂ نشاط و خوشی اور مختصر / خالق نے دی تھی اسکو گلِ تر کی زندگی

تنہا ہی اب تو کھیلو گے اے لختِ جگر! / ہے دوسرے جہاں میں برادر کی زندگی

بچہ

پھولوں سے اور پرندوں سے منہ اپنا موڑ کے / ایسا گیا کہ منہ نہ ہمیں پھر دکھائیگا

دن گرمیوں کے ہوتے ہیں اماں بہت بڑے / کیا میں اسے بلاؤنگا اور وہ نہ آئیگا

اب ہم کرینگے مل کے نہ جنگل کی سیر کیا؟ / جاؤنگا اس کے ساتھ نہ دریا کنارے میں

یہ جانتا اگر تو وہ جب میرے ساتھ تھا / کر لیتا اس سے کاشکے جی بھر کے پیار میں

ترجمہ از انگریزی
فلیشیا ہیمنز

تلوک چند محروم

چاند

اے نوگلِ باغِ دلربائی / اے شمعِ بساطِ خوش ادائی

زیور ہے تو عروسِ شب کا / ہے دیدۂ چرخ کا تو تارا

سانچے میں نور کے ڈھلا ہے | سورج کی گود میں پلا ہے
تو بزم فروزِ اختران ہے | پرتو ترے رخ کا کہکشان ہے
افشان ہیں تری جبیں کے تارے | ہیں تجھ پہ فدا چکور سارے
اونچا سب سے ہے بام تیرا | ہے چرخ بریں مقام تیرا
حاصل ہے فلک کو تجھ سے رفعت | روشن ہے زمیں تری بدولت
ہے تو ہی رفیق شام غربت | ہے تو ہی انیس درد فرقت
عالم پہ محیط ہے ترا فیض | کس درجہ بسیط ہے تیرا فیض
چھا جاتا ہے غم کا جب اندھیرا | ہے مشعل راہ نور تیرا
ہے دل میں ترے یہ داغ کیسا | دامن میں ہے یہ چراغ کیسا
بتلا تو وہ کون شمع رو ہے | شب بھر تجھے جس کی جستجو ہے
میرا ہی کہیں نہ مہ لقا ہو | تو بھی نہ اوسی کا مبتلا ہو
یہ سچ ہے اگر تو غم ہے اس کا | تو بھی میرا رقیب نکلا
پھر بھی میں قدرداں ہوں تیرا | بھایا ہے تجھے بھی حسن اُسی کا
ہے تیری پسند قابل داد | کرتا ہوں تری نظر پہ میں صاد
ہمدرد ہے ہم طریق ہے تو | میرا شب غم رفیق ہے تو
بیجا ہے غبار تجھ سے رکھنا | وصل اوس کا کسے ہوا کہ ہوگا
یاد اوس کی بہت ہے عاشقوں کو | بھولے نہ اوسے ہزار غم ہو
تجھ سے مجھے انس ہے بہرحال | مرغوب ہے دل کو یہ تری چال

سینے سے لگا لوں تجھ کو آجا
آنکھوں پہ بٹھا لوں تجھ کو آجا

ذاکر بازید پوری

ہے رخ پر نور پر چھائی ہوئی زلف دراز | یا قمر ہے ابر کے آغوش میں اے جان ناز
خانۂ آسائش و راحت ہے تیری خوابگاہ
حور تو ہے گلشن جنت ہے تیری خوابگاہ
یہ نمو یہ بانکپن یہ تیری مستانہ ادا | پھول سے عارض ترے سنبل سی یہ زلف دوتا
غیرت گلشن ہے تو او نازنین دلربا | کیوں نہ لوٹے دیکھکر تجھکو دل شیدا مرا
نقش حیرت کر دیا ہے تیری الفت نے مجھے
واہ کیا صورت دکھائی دست قدرت نے مجھے
کیوں نہ بڑھ جائے دل بیتاب کا پھر اضطراب | اس طرح دیکھے کوئی تجھکو جو سوتے بے حجاب
کروٹیں تیرا بدلنا ناز سے ہنگام خواب | روئے محشر سے کوئی گویا الٹتا ہے نقاب
یہ جوانی یہ ادا یہ حسن آفت کیوں نہ ہو
عاشقوں کیواسطے برپا قیامت کیوں نہ ہو
شرمگیں آنکھیں جھکی ہیں ہائے کس انداز سے | دل لئے لیتی ہیں دونوں عاشق جانباز سے
کھول آنکھیں دیکھ لے او سونے والے ناز سے | زندہ کر دے کشتۂ غم کو لب اعجاز سے
یہ تیری بے مہری اے نازک بدن اچھی نہیں
عادت بیداد اے غنچہ دہن اچھی نہیں
کچھ خبر تجھکو نہیں ہے او بت غماز آہ | کر رہی ہے دل کو بسمل یہ ادائے ناز آہ
پھنس گیا ہے زلف شبگوں میں دل ناز آشنا | آفتیں ڈھاتا ہے اس پر تیرا ہر انداز آہ
تو شراب خواب پیکر آہ غافل ہو گیا
عاشق جانباز تیرا نیم بسمل ہو گیا

ا - د - ضبط

خواب ناز

مرحبا جوش جوانی حبذا یہ خواب ناز | غیرت نرگس بنی ہے تیری چشم نیم باز

کتاب

اے کتاب اے رنج و تنہائی میں میری غمگسار | جان تجھ پر ہے فدا دل سے تجھے کرتا ہوں پیار
کرتی ہو تو رنج و راحت میں مری شرکت سدا | تیری دلداری و غمخواری کی ہو توصیف کیا

ہے تیرا ہر حرف غنچہ اور تیرا لفظ پھول
دیکھکر تجھکو شگفتہ ہو جو ہو کوئی ملول

لوح و جدول تیرے ہو کیوں نہ میرا دل نثار
یہ ہیں خط و خال تیرے اور تو زیبا نگار

بات جو تیری ہے وہ کیسی مسرت خیز ہے
مصحف رخسار کا جلوہ نشاط انگیز ہے

تو ہی ہے سرچشمہ ہدایت اور ارشادات کا
نیکی و پاکیزگی جوہر ہے تیری ذات کا

علم کی تو کان اور اخلاق کا معدن ہے تو
فرع و اصل و نقل کا اک پر فضا گلشن ہے تو

جام جمشیدی ہے یا اسکندری آئینہ ہے
جو ورق ہے نقد معلومات کا گنجینہ ہے

تیرے ہی دم سے جلا ہے آدمیت کا چراغ
تو ہی نے روشن کئے انسانکے عقل و دماغ

تو ہی ہے اسرار کی مخزن ہماری رازدار
تو ہی ہے اگلوں کی تصنیفوں کی بہتر یادگار

مظہر قدرت کا منبع ہے تو اے پیاری کتاب
اور نیرنگئ عالم کا مرقع لاجواب

راز قوموں کی ترقی و تنزل کا کہا
طرفہ آئینہ ہے تو ماضی و استقبال کا

کس طرح اشراف ہو جاتے ہیں عالم میں ذلیل
کس طرح بڑھتی ہے عزت ہوتے ہیں کیونکر نبیل

کس طرح یک دل تھے جو فرقہ وہ ابتر ہو گئے
فاتحان ملک پھر مفتوح کیونکر ہو گئے

تو لگا دیتی ہے آنکھوں پر ہماری دوربین
جس سے آجاتی ہے کھنچ کر ہند میں ایران زمیں

عہد ماضی سے نتیجہ تو نکالے حال کا
حال کو پھر تو کرے آئینہ استقبال کا

تجھ میں جو لکھا ہے ہو سکتا نہیں اسکو فنا
ابتدا تیری ازل ہے اور ابد ہے انتہا

ہے تو ہی یزداں شناسی کا ذریعہ بالیقین
معرفت کا راز کرتی ہے ہمارے دلنشین

نفس انسان کی حقیقت تو بتاتی ہے ہمیں
حق پرستی و خدا ترسی سکھاتی ہے ہمیں

کارسازی خدا کا بھید بتلایا ہمیں
اور طریق گلشن جاوید بتلایا ہمیں

عالم دانا جہاں کے کیوں نہ ہوں تجھ پر فدا
عرصۂ ہستی کا ہے تکوین دیباچہ ترا

محفل دنیا کی زینت ہے اگر تو تجھ سے ہے
علم و دین کی بادشاہت ہے اگر تو تجھ سے ہے

تو اگر کہتی نہ اوسکی سلطنت کی داستاں
کس کو تھا معلوم یہ کیا چیز تھا نوشیرواں

تو ہمارے واسطے ہوتی نہ گر آئینہ دار
جام جم کے راز سے واقف نہ ہوتے زینہار

حال کھلتا ہے بدولت تیری اگلے وقت کا
ورنہ کہتا کون اسکندر نے ہے کیا کیا کیا

پر لگا کر تو ہمیں لیجاتی ہے یونان میں
ایک کر دیتی ہے شرق و غرب کو اک آن میں

تو ہی دیتی ہے خبر دارا و کیکاؤس کی
داستاں تو نے کہی گودرز و زال و طوس کی

فلسفہ میں تو نہ کرتی گر ہماری رہبری
خواب میں بھی ہم نہ سنتے باتیں افلاطون کی

کسلئے چاہیں نہ ہر دم تجھکو دل سے جان سے
کرتے ہیں تیری بدولت باتیں ہم لقمان سے

جانتے بو نصر فارابی کا کیونکر ہم کمال
کس طرح معلوم ہوتا بو علی سینا کا حال

تو ہی ہے اللہ کی شان جلالت کی دلیل
اور دکھلاتی ہے تو ہی اوسکی رحمت کی سبیل

ہے رسالت کیلئے برہان قاطع تیری ذات
اور نبوت کیلئے ہے نور ساطع تیری ذات

جان سب دیتے ہیں تجھ پر اپنے مطلب کیلئے
تو خدا کا بیش قیمت تحفہ ہے سب کیلئے

رہبری کرنی ہماری ہی نہیں ہے تیری خو
ہادی برحق کی بھی اک قوت بازو ہے تو

برگزیدہ وہ امانت ہے تو ہی بس بالیقین
کرتے تھے جسکی حفاظت آپ ختم المرسلین

اپنی امت سے وصیت کر گئے وقت وصال
رکھیں وہ ہر دم نظر تجھ پر نہ آئے تا زوال

تو سپہر علم ہے تو آفتاب برج دین
مملکت دنیا کی ہے انگشتری تو ہے نگیں

غلغلہ عالم میں ہے جانی ہوئی یہ بات ہے
زینۂ بام ترقی ہے تو تیری ذات ہے

الغرض راہیں بھلائی کی بتاتی ہے سدا
غافلوں کو ہوش میں تو ہی تو لاتی ہے سدا

ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ

غزلیات

(جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل)

کہے بغیر ہے سب کیفیت عیاں میری
یہ حال ہے کہ خموشی ہے خود زباں میری

مجھے وہ غش میں ہوا دے رہے ہیں دامن کی
بھڑک اٹھے نہ کہیں سوزش نہاں میری

فغاں کی طرز اگر سیکھ لی تو کیا حاصل
کہاں سے لائینگے مرغ چمن فغاں میری

جو رات بھر تری محفل میں شمع جلتی ہے
زبان حال سے کہتی ہے داستاں میری

ترانہ سنجی بلبل پہ وجد کرتا ہے
سنی نہیں ابھی صیاد نے فغاں میری

مجھے ہجوم تمنا سے خوف رہتا ہے
کہ پس نہ جائے کہیں جان ناتواں میری

ستم سے میں نہیں ڈرنے کا او کمان ابرو
ہزار تیر کا ہے توڑ اک فغاں میری

جا رہا ہوں تصور کسی کا مدت سے — خدا کرے کہ نہ محنت ہو رائیگاں میری

یہ میکدے کی کرامت نہیں تو پھر کیا ہے — مئے کہن سے طبیعت ہوئی جواں میری

اگرچہ دشت نوردی کو اک زمانہ ہوا — زبان خار پہ اب تک ہے داستاں میری

جلیل ناز ہے اس بات پر میرے دل کو

نگاہ ناز کسی کی ہے قدرداں میری

(تازہ غزل سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے [illegible])

غم زمانہ سے دل کو فراغ باقی ہے — ہنوز ان کی محبت کا داغ باقی ہے

نہ عیش کا نہ کچھ ارباب عیش کا ہے پتہ — نہ خانہ باغ نہ تفریح باغ باقی ہے

عبث ہیں سب یہ تقاضے نسیم بہار — یہاں کسے ہوس باغ و راغ باقی ہے

نہیں جو قدر زمانے میں لحن بلبل کی — ہنوز غلغلۂ بوم و زاغ باقی ہے

دل فسردۂ حسرت میں اب وہ جوش کہاں

شراب جوش کا خالی ایاغ باقی ہے

(منشی محمد صدیق خان رعد جونپوری)

گردش چشم نے دیوانہ بنایا مجھ کو — آسماں بنکے حسینوں نے ستایا مجھکو

نیند نے بھی تیرے مانند بھلایا مجھکو — آنکھ جب ان سے لگی خواب آیا مجھکو

جل کے کہتی ہے یہ پروانوں سے شمع محفل — خاک کردونگی اگر ہاتھ لگایا مجھکو

ہاتھ ملتے ہیں مسیحا بھی میری بالیں پر — کونسا روگ لگا ہے یہ خدایا مجھکو

کردیا تیری محبت نے زمانے سے جدا — پوچھتا ہے کوئی اپنا نہ پرایا مجھکو

چھاؤں طوبیٰ کی جو گلزار جناں میں دیکھی — یاد آیا تیری دیوار کا سایا مجھکو

نہ کیا وعدہ وفا رعد پری رویوں نے

عمر بھر باتوں ہی باتوں میں اڑایا مجھکو

(ماسٹر محمد باسط صاحب باسط بسوانی)

ہو خوشی کیونکر جو تو گھر پہ میرے آتا رہا — غم یہ کیا کم ہے شکایت کا مزا جاتا رہا

صبح وصلت کیا ہوئیں اس شوخ کی بیباکیاں — آئینہ کو دیکھکر پھر وہ شرماتا رہا

وہ چلے پہلو سے اٹھکر جان پر بن گئی — ہائے میں سمجھا تھا میرا درد دل جاتا رہا

بے خطا اس واسطے روٹھے ہیں مجھ سے روز عید — اک بہانہ تھا گلے ملنے کا وہ جاتا رہا

اشک پر خوں آنکھ سے نکلا جو باسط ہجر میں

الفت صادق کا میری رنگ دکھلاتا رہا

(مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

قابو میں اگر دل ہے شوریدہ سری کیوں ہے — کیوں جوش ہے وحشت کا یہ جامہ دری کیوں ہے

توبہ پہ گری بجلی وہ گھر کے گھٹا چھائی — اب پیر مغاں بوتل کونے میں دھری کیوں ہے

شاید کہ ہوا سودا اس زلف پریشاں کا — آوارہ بیاباں میں باد سحری کیوں ہے

یہ خشکی لب کیا ہے یہ زردی رخ کیسی — جب درد نہیں دل میں آنکھوں میں تری کیوں ہے

لے جلد خبر ظالم مرجائینگے فرقت میں — ہم ہجر کے ماروں سے یہ بے خبری کیوں ہے

جب تم نے جفاؤں سے یوں مار ڈالا ہمکو — میت پہ مری آکر اب نوحہ گری کیوں ہے

پرہیز تجھے پہلے تھا قتل سے عاشق کے — تلوار تیری ظالم اب خوں میں بھری کیوں ہے

کس غیرت گلشن کا سودا ہے تجھے او گل — اس فصل بہاری میں یہ جامہ دری کیوں ہے

کس پردہ نشیں سے ہے الفت تجھے اے خنجر

تنہائی میں راتوں کو یہ نوحہ گری کیوں ہے

(منشی عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی)

سمجھے عاشق ہو مجھکو جس جس کا — دیکھوں لیتے ہو نام کس کس کا

تم نے لاکھوں ستم کئے مجھ پر — ایک عالم گواہ ہے اس کا

چشم میگوں کو دیکھ کر تیری — رنگ جمتا نہیں ہے نرگس کا

شکوۂ چرخ اس قدر کیوں ہے — یہ بتادو وہ یار ہے کس کا

گو کہ بوچھار ہر طرف سے رہی — بزم اغیار سے نہ میں کھسکا

مضطرب اور کردیا ناصح — نام یہ تو نے لے دیا کس کا

دل کی قیمت لگائی کیا تم نے — مال مردے کا ہے کہ مفلس کا

ہاں بھروسا نہیں ہمیں ناصح — کسی غمخوار کا نہ مونس کا

جو نہیں نام عشق سے واقف — ہائے عاشق ہوا ہوں میں کس کا

عارض و چشم ہیں کہ رکھا ہے — گل کے نزدیک پھول نرگس کا

قطعہ بر تضمین مصرع

جل رہا ہے مگر اندھیرا ہے "دل ہے گویا چراغ مفلس کا"
دعوئ خون عاشقاں تو نہیں حکم لکھا ہے جس پہ ڈس مس کا
میرا خط اون کو کس طرح پہونچے غیر مالک ہے پوسٹ آفس کا
ایک دل ہے ہزار گاہک ہیں
ناز اٹھائے خلیق کس کس کا

(سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی ایڈیٹر رسالۂ ذخیرہ)

کسی عاشق کا دل سفاک نے زیر پا گر رکھا کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا
نہ آنا تھا اونھیں میری عیادت کو نہ آئے وہ تڑپتا رات بھر کیوں تونے اے درد جگر رکھا
وہ اس انداز سے آیا تھا کل کے قتل کرنے کو کہ تھا خنجر کمر میں نیمچہ تھا دوش پر رکھا
معاذ اللہ کچھ حد بھی ہے اسکی بے نیازی کی کہ اک ٹھوکر لگا دی اس نے جب قدموں پہ سر رکھا
بلا کا آکے آدمی ور رہ جانا غنیمت ہے خدا نے خیر کی زلفوں کو اس نے تا کمر رکھا
پسند آیا نہ ان میں ایک بھی اُس نازک گلو کو کبھی دل روبرو رکھا کبھی ہم نے جگر رکھا
تجھے دھوکا ہوا کیا اے سپہر افشاں کے تارہ کا دل پرداغ زلفوں میں جو از رشک قمر رکھا
جو سنتے ہیں تو ہوتے ہیں حسینوں کے فریبی دل خدا جانے یہ کس نے آہ عاشق میں اثر رکھا
کسی کے حسن کا جلوہ نہ دیکھا بھول کر ہم نے تیری صورت کا نقشہ عمر بھر پیش نظر رکھا
لب جو آئینہ کے سامنے کیسا اکڑتا ہے خدا نے سرو گلشن کو اسی سے بے ثمر رکھا
جلا دیتے جو بڑھ کر آسمانِ شعلہ پرور کو ہماری آہ سوزاں میں کہاں کا تھا اثر رکھا
شبِ غم شامِ غربت صبحِ قیامت تھی تو یوں گزری
کبھی تڑپے، کبھی روئے کبھی زانو پہ سر رکھا

قطعہ تاریخ

دیکھ کر ہٹتی نہیں جلدی نگاہ کہتی ہے دیکھیں گے اوسکو حسب خواہ
سال اجرا دل یہ کہتا ہے شریف کیا ذخیرہ ہوش کا اچھا ہے واہ
۱۹۱۵ء

شذرات

انسان کے دماغ کا وزن

ڈاکٹروں نے انسان کے بھیجے کا وزن (۶۸) اونس (تقریباً دو سیر) تک لکھا ہے مگر متوسط انسان میں مرد کے لئے قریب (۵۰) اونس اور عورت کیلئے قریب (۴۵) اونس کا وزن مقرر ہے عقلمند انسان کا دماغ چالیس برس یا اس سے زیادہ عمر تک باعتبار حجامت و وزن بڑھتا ہے اور پچاس برس کے بعد گھٹنے لگتا ہے اور اوس کے ساتھ ہی تمام دماغی قویٰ کمزور ہونے لگتے ہیں تندرست آدمی کے دماغ کا وزن کم سے کم (۳۱) اونس ہے ایسے دماغ والا شخص اگرچہ کسی قسم کی قابلیت نہ رکھتا ہو تاہم وہ زندگی کے معمولی کاموں کو انجام دینے کے قابل ہوگا اوس کے کسی کارروائی میں اولوالعزمی یا نمود کا اظہار نہ ہوگا بلکہ اوس کا ہر ایک کام سادے اور معمولی طور کا ہوگا جس شخص کا دماغ (۳۱) اونس یا اس سے کم وزن ہو اوس کے دماغ میں کمزوری اور کاموں میں حماقت پائی جائیگی اور اس سے کم وزن کا دماغ باولے یا لایعقل کا ہوتا ہے جو وزن میں (۲۵) اونس سے زیادہ نہیں ہوتا اور اوس کے سر کا دور (۱۴) گرہ سے کم ہوتا ہے۔

پانی کے عجائبات

(۱) اوپل (چمکدار پتھر جو آسٹریلیا میں نکلتا ہے اور عموماً انگریزی مذاق والوں میں بطور جواہر استعمال ہوتا ہے) پانی اور کانچ سے مرکب ہے
(۲) پیرس پلاسٹر کی مورتیں جو اہل اٹلی بنا کر فروخت کرتے ہیں ان میں ہر چار پونڈ پلاستر کے ساتھ ایک پونڈ پانی ملا ہوتا ہے۔
(۳) ہوا کے ہر ایک فٹ مکعب میں پانچ گرین پانی ہوتا ہے۔

(۴) آلو میں (۷۵) فیصدی اور شلجم میں (۹۰) فیصدی پانی موجود ہے
(۵) اگر کسی آدمی کا وزن (۱۰) اسٹون (اسٹون = ۷ سیر) ہو اور اوس کو چت لٹا کر شکنجہ میں دبایا جائے تو خشک حصہ صرف (۱/۲ ۷) اسٹون باقی رہیگا۔ کیمیاوی طور پر انسان میں (۵۴) پونڈ کاربن اور نائٹروجن ہے۔
(۶) گیہوں کا پودا (۱/۲ ۲) دنوں میں (۱۰۰۰۰) گرین پانی جذب کرتا ہے اس حساب سے ایک ایکڑ رقبہ کے گیہوں میں (۱۰) ٹن پانی روزانہ جذب ہوتا ہے۔

سب سے بڑی مقدس کتاب

دنیا کی مقدس کتابوں میں سب سے بڑے تبتیوں کی کتاب ہے جس کی ہزار ہزار صفحہ کی (۸۰) جلدیں ہیں ہر جلد کا وزن تقریباً (۵) سیر ہے طول وعرض (۸×۲۶) انچہ اور حجم (۸) انچہ ہے ایک مرتبہ اس کا ایک نسخہ (۷) ہزار بیلوں کے عوض میں خریدا گیا۔ اصل کتاب کے ساتھ (۲۲۵) جلدیں تفسیر کی ہیں۔

انگریزی رایج الوقت سکے اور جسم انسان کی ہڈیاں

انگریزی پونڈ کے دوسو چالیس پنس ہوتے ہیں اور ہمارے بدن کی ہڈیاں بھی دوسو چالیس ہیں سر اور دھڑ میں ایک سو بیس ہڈیاں ہیں نصف ساورن میں بھی ایک سو بیس پنس ہوتے ہیں ہر عضو میں بتیس ہڈیاں ہوتی ہیں۔ نصف کراؤن میں بھی بتیس پنس ہوتے ہیں۔ ایڑہ کی ہڈی میں چوبیس ہڈیاں ہوتی ہیں ایک فلارن میں چوبیس پنس ہوتے ہیں۔ ہمارے دونوں جانب کی پسلیاں بارہ ہیں۔ شلنگ بھی بارہ پنس کا ہوتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ انگریزی تجارت کی ترقی کا راز اسی سکہ میں پوشیدہ ہو۔

اہل تبت کی زبان

تبت والے عموماً ناک میں بولتے ہیں۔ لفظ چھوٹے چھوٹے سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں طرز تحریر کے لئے چار قسم کے حروف رائج ہیں (۱) بڑے حروف مقدس کتاب کے لئے (۲) چھوٹے حروف تجارتی کاروبار کیلئے (۳) حروف معمولی کتابوں کیلئے (۴) عام حروف عام کاروبار کے لئے۔ تبت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہی زبان ہے کہتے ہیں کہ ۶۳۲ء میں تبت کے پہلے بادشاہ نے اپنے وزیر کو ہندوستان اس لئے بھیجا تھا کہ وہ سنسکرت طرز تحریر حاصل کرے چنانچہ اس میں چھے نئے حروف ملا کر تبت کی تحریر ایجاد کی گئی ہے۔

فصلی پرند

تمام دنیا میں دو قسم کے پرند پائے جاتے ہیں ایک فصلی دوسرے مقامی۔ مقامی پرند اپنے وطن میں ہر موسم میں پائے جاتے ہیں لیکن فصلی پرند کسی خاص فصل میں نقل مکان کرکے خاص غرض کے لئے سیاحت کرکے آتے ہیں مثلاً جب گیہوں پکنے پر آتے ہیں تو ہزاروں بٹیر پہاڑوں سے اتر کر میدانی ملکوں میں صرف گیہوں اور کنگنی چگنے کے لئے آتے ہیں۔ اسی طرح ایر شہتوت اور بمبدانہ یا گولر اور برگد کا پھل کھانے کے لئے آتے ہیں۔ جاڑوں کے شروع میں کونج جو کابل کے سرحدی علاقوں اور پہاڑوں کا پرندہ ہے۔ ہر سال ہندوستان کے میدانوں میں دہان اور دیگر پیداوار کھانے کے لئے آتے ہیں۔ فصلی جانور فصل کے ختم ہونے پر اپنے اصلی وطن کو واپس چلے جاتے ہیں۔ فصلی پرندوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو جاڑوں میں آتے ہیں دوسرے وہ جو گرمیوں میں۔ تلیر اور بٹیر اون پرندوں میں ہیں جو گرمیوں میں آتے ہیں لیکن کونج سردیوں میں آنے والا جانور ہے۔ سردیوں میں آنے والے جانور اس غرض سے نقل مکان کرتے ہیں کہ اون کے اصل وطن کی شدت کی سردی زمین کو یخ بستہ کردیتی ہے جسکی وجہ سے وہاں غذا کا میسر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن گرمیوں میں آنے

والے پرند اون خشک پہاڑوں کے رہنے والے ہوتے ہیں جہاں پر پانی اور سبزی کم پائی جاتی ہے اور شدت گرما اون خشک پہاڑوں کی گرمی کو اور زیادہ بڑھا کر اون پرندوں کے لئے نا قابل برداشت ہو جاتی ہے اس لئے گرمی کی شدت کے ساتھ ساتھ یہ جانور بھی اپنے وطن سے سرک کر میدانوں کی طرف ہٹتے جاتے ہیں۔ پرند تو اپنی غرض سے نقل مکان کرتے ہیں لیکن شکاریوں کے حق میں یہ وقت شکار کا ایک عمدہ موسم بن جاتا ہے کیونکہ چھروں کی بوچھار لئے ایک فیر میں کئی جانور مارے جاتے ہیں۔

بہت بڑا انڈہ اور گھونسلا

موا پرند کے انڈہ کا قطر (۹) انچ تک ہوتا ہے مدغاسکر کا ایک انڈہ جو ۱۸۵۱ء میں فرنچ رکارڈی میں پیش کیا گیا تھا اوس کا قطر ایک فٹ سے زیادہ تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ایک فرانسیسی سوداگر نے اتنا بڑا انڈہ پایا کہ اُس کی سفیدی سے (۱۳) بوتلیں بھر گئیں کپتان کک نے نیو ہالینڈ کے شمال مشرق کے ایک جزیرہ میں ایک گھونسلا دیکھا جو (۹) گز گولائی میں اور گز بھر لانبا تھا۔

ابوالہول

اہرام مصر کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے جس کو ابوالہول کہتے ہیں اس کا سارا دھڑ زیر زمین ہے صرف گردن۔ سر اور دونوں ہاتھ اوپر کو نظر آتے ہیں اس کے چہرہ پر کسی قسم کا روغن ملا ہوا ہے جس کی آب اس وقت تک قایم ہے اس کے اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہ ہوگا باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضاء کے باہمی تناسب میں بال برابر فرق نہیں ہے اور اسی وجہ سے علمائے پیشین کا خیال تھا کہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں اس میں ایسا تناسب پیدا کرنا آدمی کا کام نہیں در اصل یہ مصریوں کے ایک دیبی کی شکل ہے جس کا نام اسفنکس (Sphinx) ہے عموماً اس دیبی کا سینہ اور سر تو انسانوں کا سا اور باقی جسم شیر کی طرح ہوتا تھا چنانچہ اس قسم کی بہت سی مورتیں مصر میں جا بجا پائی جاتی ہیں مگر سب سے بڑی مورت یہی ہے جو ابوالہول کہلاتی ہے۔

انسانی خلقت کے متعلق معلومات

یہ امر مسلمہ ہے کہ دونوں ہاتھ اور پاؤں شاذونادر ہی ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں تقریباً ہر شخص کو معلوم ہوگا یا کم از کم لوگ بہ مقابلہ اس بات کا علم رکھنے کے کہ انسان کے دونوں رخسارے کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ ہاتھ پاؤں کی غیر مناسبت سے زیادہ واقف ہونگے۔

سائنس کا یہ ایک اصول ہے کہ پانچ میں سے دو آدمیوں کی آنکھیں یقیناً ایک خط مستقیم میں نہ ہوں گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بالاوسط دس میں سے سات آدمیوں کی ایک آنکھ دوسری آنکھ سے قوی تر ہوتی ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ داہنا کان بائیں کان سے کسی قدر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔

جن لوگوں کا رنگ بہت صاف اور سرخ و سفید ہوتا ہے اون میں سے اکثر کو ضعف بصارت کی شکایت رہتی ہے اور اون کی نگاہ میں کوئی نہ کوئی قصور ضرور رہتا ہے۔

جہاں تک دیکھا گیا ہے پندرہ میں سے ایک شخص کی بینائی پوری اور مکمل ہوتی ہے دونوں کانوں کی قوت سامعہ میں فرق ہوتا ہے ایک کان دوسرے کان کے مقابلہ میں جلد اور زیادہ صاف طور سے آواز کو سن سکتا ہے۔

ہاتھ کی درمیانی تین انگلیوں کے ناخن بہت سرعت کے ساتھ بڑھتے ہیں مگر انگوٹھے کا ناخن تمام انگلیوں کے ناخنوں سے آہستہ۔ اسکے علاوہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ کسی دو انگلیوں کے ناخنوں کے

بڑھنے کی رفتار بالکل یکساں نہیں ہوتی۔ پچاس فیصدی سے زیادہ آدمیوں کی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ سے بڑی ہوتی ہے اوسط درجہ کے مردوں کے جسم کی تمام ہڈیاں تقریباً دس سیر وزنی ہوتی ہیں۔ لیکن اوسط درجہ کے عورتوں کی ہڈیاں صرف سات سیر کی ہوتی ہیں

روٹی میں صابون

یورپ کے نان بائی خمیر میں صابون کی آمیزش کرتے ہیں تاکہ روٹیاں اور مٹھائیاں ہلکی اور عمدہ ہوں۔ بہ نسبت روٹیوں کے مٹھائیوں کے عمدہ اقسام میں کثرت سے صابون کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے صابون کو تھوڑے سے پانی میں گھلاتے ہیں پھر اسی میں تھوڑا سا روغن ڈال کر خوب پھینٹ لیتے ہیں اس کے بعد خمیر میں ڈالتے ہیں تب روٹی کے میدے یا مٹھائی کے ٹکیوں میں ملاتے ہیں اس طرح جو روٹی یا مٹھائی تیار کی جاتی ہے وہ بہت ہلکی سبک اور بالکل اسپنج کی سی ہو جاتی ہے۔

مختلف ممالک میں ماتمی رنگ

مختلف ممالک میں اظہار ماتم کے لئے مختلف رنگ استعمال کئے جاتے ہیں اور ان رنگوں کے انتخاب کے وجوہ بھی مختلف ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں اظہار ماتم کے لئے سیاہ رنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ سیاہ کپڑے پہنتے ہیں اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ روشنی نے ہماری طرف سے منہ پھیر لیا اور اب ہم تاریکی میں ہیں۔

مصر اور برہما میں زرد رنگ سے ماتم ظاہر کیا جاتا ہے اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہم درختوں کے پتوں کی طرح بالکل مضمحل اور زرد ہو گئے ہیں۔

برطانیہ میں کاشتکاروں کی بیوہ عورتوں کی ٹوپیاں بھی زرد رنگ کی ہوتی ہیں۔ رومن کیتھلک مذہب کے پادریوں اور شاہان فرانس کے ماتم میں ارغوانی اور بنفشی رنگ استعمال کئے جاتے ہیں ان رنگوں سے محض اون کی معصومیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ ٹرکی میں بھی ماتم کے موقعوں پر بنفشی کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ چین میں سفید بجائے میں گہرا نیلا۔ ایران میں زردی مائل بھورا۔ اور حبش میں خاکی بھورا رنگ ماتم میں مستعمل ہوتا ہے۔

سینکڑوں میل پیدل چلنا

کپتان جرین جو ایشیائے روس کے وسط کی سیر کے لئے سنہ ۱۸۵۵ء کو سینٹ پیٹرزبرگ سے چلا تھا۔ (۱۲۳) دن تک برابر لگاتار چلتا رہا اور اوسط رفتار روزانہ (۳۴) میل تھی۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی ترقی سنہ ۱۹۱۳ء سنہ ۱۹۱۴ء

لڑکیوں کی ابتدائی

تعلیم کے اعداد و شمار	تعداد طالبات	تعداد اسکول
صوبہ متحدہ	۴۶۶۹۳	۱۰۶۷
صوبہ بنگال	۲۱۰۱۳۷	۷۰۵۸
صوبہ بمبئی	۴۶۲۱۰	۱۲۷۱
بہار اڑیسہ	۹۱۵۶۷	۱۸۴۵
پنجاب	۳۷۷۱۵	۸۰۳

زنانہ ہائی اسکولوں کے اعداد و شمار	تعداد طالبات	تعداد اسکول
صوبہ متحدہ	۸۲۹۰	۸۵
صوبہ بنگال	۱۰۶۱۴	۸۶
صوبہ بمبئی	۸۷۶۱	۸۷
صوبہ مدراس	۱۰۲۰۱	۶۹
صوبہ پنجاب	۸۳۴۵	۶۴

زنانہ کالجوں کے اعداد و شمار		تعداد طالبات	
صوبہ متحدہ	(۶۶)	صوبہ مدراس	(۹۹)
صوبہ بنگال	(۱۴۰)	صوبہ بمبئی	(۱۳۶)
صوبہ پنجاب	(۵۰)		

ایک نظر ادھر بھی

تمدن ہند مجلد و با تصویر مترجمہ شمس العلماء ڈاکٹر سید علی صاحب
بلگرامی مرحوم ایم اے ڈی لٹ قیمت (صہ) علاوہ محصول

فلسفہ ازدواج مولفہ سید علی اصغر صاحب بلگرامی ایم
اے ایس قیمت (عصہ) علاوہ محصول۔

تعلقات ایران مترجمہ سید محمد حسن صاحب بلگرامی گورنمنٹ
اڈیٹر ریلوے و معدنیات سرکار نظام کی نسبت علامہ شبلی نعمانی کی رائے
"کتاب اکثر جگہ سے دیکھی دلچسپ اور پر اثر ہے خصوصاً عورتوں
کے جلسہ پارلیمنٹ میں جانے اور ممبروں کے مقابلہ میں پستول چلانے
کا بیان ذکر جیسے آنکھ کے سامنے آ جائے بہر حال دلچسپ کتاب ہے
اور ہندوستانی مخدرات کے کارناموں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے"
ہر جلد میں (۱۲) نایاب عکسی تصویریں ہیں شایقین جلد طلب فرمائیں
ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا ہوگا قیمت مجلد للعہ علاوہ محصول ڈاک

دبدبہ امیری مترجمہ مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی گورنمنٹ
اڈیٹر ریلوے و معدنیات سرکار نظام یعنی سوانح ضیاء الملت والدین
امیر عبدالرحمن خان غازی مرحوم والی خداداد افغانستان کے صرف چند
نسخے باقی رہ گئے ہیں اس کی مقبولیت کا صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے
کہ پہلا اڈیشن ایک ہزار چھپا تھا جن میں سے اب صرف چند جلدیں باقی
رہ گئی ہیں اگر ناظرین جلد طلب فرمائینگے تو طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا
مجلد و با تصویر قیمت (للعہ) علاوہ محصول ڈاک۔

پریم پچیسی حصہ اول مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کے بہترین

تعلیم یا مجموعہ مرتبہ اڈیٹر صاحب آزاد کانپور قیمت فی جلد ۱۲ر کلدار علاوہ محصول

سوانح عمری پیغمبر عالم عہ کلدار علاوہ محصول ڈاک

حیات سرور کائنات (۱۲ر) کلدار

علمی کہانیاں مولفہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی ۸ر کلدار علاوہ محصول

عطر سخن یا جذبات مسلم مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر
دہلوی قومی نظموں کا بہترین مجموعہ ضخامت صفحہ قیمت عہ کلدار

تاریخی جواہر مولانا شبلی حضرت اقبال اظہر دہلوی کی تاریخی نظموں
کا مختصر دلکش مجموعہ قیمت فی جلد ۳ر کلدار علاوہ محصول۔

انتخاب روح مصنفہ کے ایف بیگم صاحبہ قیمت ۳ر کلدار علاوہ محصول

تہذیب الاسلام قیمت ۸ر کلدار علاوہ محصول

ایک شاعر کا انجام مصنفہ نیاز فتحپوری ۱۲ر کلدار علاوہ محصول

جذبات بھاشا ایضاً ایضاً ایضاً

مسدس حالی ۸ر کلدار علاوہ محصول ڈاک

لسان الغیب (۳ر)

شکوہ، جواب شکوہ } مصنفہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب لاہور قیمت ہر دو جلد (۵ر) علاوہ محصول

عذر شکوہ مصنفہ پیرزادہ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز مخدومی
امرتسری قیمت فی جلد ار علاوہ محصول

علمی تماشہ } مرتبہ حکیم مظفر حسین صاحب اظہر دہلوی ۸ر کلدار علاوہ محصول ڈاک

جلد درخواستیں بنام منیجر بک ڈپو اندرون دروازہ چادر گھاٹ حیدرآباد دکن آنی چاہییں

(نظام دکن پریس واقع بازار عیسی میں چھپا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلطنتوں کے عروج وزوال کی داستان میں سرور و دلربائی اور حسرت وافسردگی کی ایسی مختلف النوع شان پنہاں ہوتی ہے کہ اس سرحد میں قدم رکھتے ہی حیرت وخوشی اور درد وبیتابی کی ایک عجیب مجموعی کیفیت دل پر طاری ہوجاتی ہے اور انسان کے اقبال وادبار کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرجاتی ہے گزرے ہوئے حوادث وتغیرات، افکار وعبر اور آثار وعلایم میں بڑے پیغام اور عظیم نشانیاں موجود ہیں۔ یہ مٹے ہوئے کھنڈروں، ٹوٹی پھوٹی عمارتوں، ملکوں اور قوموں کے تجربوں، نوع بشری کی بداقبالیوں، اور خوش حالیوں غرض اُمم ماضیہ کے انقلاب آمیز تاریخ کو ہمارے پیش نظر کردیتے ہیں اور زمانہ گزراں کی نسبت صحیح نتایج مستنبط کرنے کی جانب ہماری توجہ مایل ہوجاتی ہے۔ المختصر جنھیں ہستی غلط نما کا گھمنڈ ہو تذکرۂ رفتگان اون کے لئے مرقعۂ عبرت ہے دنیوی حشمت و اعزاز پر ناز کرنے والے ساحل آب پر آئیں اور حباب کے بقا وفنا کا تماشا دیکھیں۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَار

دکن کے عہد عتیق کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور اس ابر تیرہ حقیقت کے سراغ لگانے میں اشہب فکر کو سخت ناکامی ہوتی ہے کہ یہ خطہ پانڈیہ[1] چولا[2] اور چیرا (سنگم قدیم) کے پہلے کن جدید راجاؤں

---

[1] ان کا ذکر مہابھارت اور راجہ اشوک کے حکم ناموں اور میگستھنیز کے مسودات میں پایا جاتا ہے، ان کا دارالحکومت مدورا اور زبان تامل تھی ۱۲۔

[2] انکے دارالحکومت کے ساحل کو چولومنڈل کہتے تھے جسکو یورپینوں نے کورومنڈل کرلیا ۱۲

کا آماجگاہ رہا ہے۔ شمالی ہند میں پندرہ سو سال قبل مسیح، ایک قدیم تمدن کی مٹی ہوئی نشانیاں ملتی ہیں، وہ بھی کسی یادگار یا کھنڈر کی صورت میں نہیں بلکہ اس کے تذکرے مذہبی تحریرات میں پائے جاتے ہیں، مگر اس ڈیڑھ ہزار سال کے گرد آلود مطلع سے ہم اوس زمانہ کے تمدن کی کوئی صحیح تصویر کھینچ نہیں سکتے۔ علاوہ بریں دکن کی تاریخ کو شمالی ہند کی تاریخ سے کوئی اہم تعلق نہیں ہے بلکہ پانچویں[1] اور آٹھویں[2] صدی عیسوی کے ماقبل دکن کی تاریخ، تاریخ شمالی ہند سے زیادہ تیرہ و تاریک ہے یہاں وید یا مہابھارت کی سی تصانیف سے ہم کو کوئی مدد نہیں ملتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطہ شمالی ہند کے بعد متمدن ہوا سنہ ۱۳۱ قبل مسیح سے سنہ ۲۳۶ء تک دکن اندھرا خاندان کا مرکز حکومت رہا۔ ان کا مذہب بودھ تھا امراوتی میں سنگ مرمر کا اسٹوپا (گول گنبد) انہی کا بنایا ہوا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں چالکیہ خاندان شمال سے نقل مکان کرکے مغربی دکن میں نمودار ہوا تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تین عظیم الشان سلطنتیں یہاں فرمانگزار تھیں۔ چولا پانڈیہ اور ہلال لو اول الذکر دو سلطنتیں ضعیف ہوتی جاتی تھیں اور تیسری سلطنت جلد جلد قوت پکڑتی جاتی تھی کہ دکن میں مسلمانوں کی قوت کا ظہور ہوا جس نے ہندوؤں کی تمام سلطنتوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کر دیا۔

دیوگڈھ (دیوگری) میں رام دیو حکومت کر رہا تھا کہ سنہ ۱۲۹۴ء میں سلطان جلال الدین خلجی کے بھتیجے علاء الدین نے دکن پر تاخت کی، یہ پہلا مسلمان شہزادہ تھا جو سرزمین دکن اور اوس کے مستحکم ترین قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ رام دیو قلعہ دیوگیری (دولت آباد) میں بھاگ گیا اور صلح کر لی۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۰۶ء میں رام دیو نے عمال ان خلجی کو خراج دینے سے انکار کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ خود سلطان علاء الدین خلجی دہلی میں سریر سلطنت پر جلوہ فرما تھا اس نے اپنے خواجہ سرا ملک کافور کو فوج کثیر دیکر دکن کی جانب روانہ کیا۔ جس پر رام دیو نے اطاعت اختیار کی اور بذات خود دہلی جا کر عفو تقصیرات کا خواستگار ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رام دیو کا ملک پھر اوس کو واپس دیا گیا۔ سنہ ۱۳۱۲ء میں ہرپال دیو نے پھر علم بغاوت بلند کیا جس کی پاداش میں قلعہ دیوگیری سلطنت دہلی میں بالاستقلال شامل کر لیا گیا اس کے بعد سنہ ۱۳۲۳ء میں بعہد سلطان غیاث الدین تغلق ورنگل فتح ہوا۔ سنہ ۱۳۳۹ء میں سلطان محمد تغلق نے اپنے دار الحکومت کو دہلی سے دیوگیری میں منتقل کر کے اس کا نام دولت آباد رکھا یہ بادشاہ سخت گیر واقع ہوا تھا اس کے طرز عمل سے مسلمان سپاہی اور امرائے صدہ اس قدر خوف زدہ ہوے کہ آپس میں اتفاق کر کے سلطنت دہلی کے غاشیۂ اطاعت کو اپنے دوش سے پھینکدیا۔ اس سازش میں ہندو راجاؤں نے بھی مسلمانوں کی اعانت کی مختصر یہ کہ دکن سلطنت دہلی سے نکل گیا۔ اس بغاوت میں حسن گنگوئی بہمنی کامیاب رہا اور یہ سب سے پہلے دکن کا مطلق العنان بادشاہ ہوا حسن آباد (گلبرگہ) اس کا پایۂ تخت تھا۔ سنہ ۱۳۴۷ء سے سنہ ۱۵۱۸ء تک ایک سو اکہتر برس اسکی تیرہ پشتیں دکن پر حکمراں رہیں۔

خاندان بہمنیہ کو جس فوج کی بدولت سلطنت ہاتھ آئی تھی اوس میں مغل، ایرانی، ترکی، اہل جارجیا و سیریشیا شامل تھے ان کے بعد تاتاری داخل ہوئے۔ آخر الذکر جو

[1] یہ دکن کے قدیم عمارات یا کتبوں کا زمانہ ہے ۱۲۔

[2] یہ اردوی زبان کی قدیم کتاب کا زمانہ ہے ۱۲۔

بہت دیر میں آئے اس لئے اون کو پردیسی (غیر ملکی) کہتے تھے، ان دیسی اور پردیسی فوجوں میں امتیاز باہمی کی وجہ سے ہمیشہ عداوت رہا کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں آثار انحطاط نمایاں ہوگئے۔ سنہ ۱۵۱۲ء میں محمود شاہ بہمنی کی وفات پر امرائے صوبہ نے متعلق العنانی اختیار کی اور سلطنت بہمنیہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ بیجاپور میں عادل شاہیوں[1] کی احمد نگر میں نظام شاہیوں[2] کی گولکنڈہ میں قطب شاہیوں[3] کی محمد آباد[4] بیدر میں برید شاہیوں[5] کی اور برار میں عماد شاہیوں[6] کی سلطنتیں جدا جدا پیدا ہوگئیں مگر باآلآخر یہ سب یکے بعد دیگرے سلطنت تیموریہ میں داخل ہوگئیں۔

سلطان قلی ہمدانی، بانیٔ خاندان قطب شاہیہ محمود شاہ بہمنی کا نہایت درجہ خیر خواہ اور معتمد علیہ تھا ایک رات محل شاہی میں محفل سرود آراستہ تھی کہ حبشیوں اور دکھنیوں کی جماعت نے پادشاہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اتفاقاً اوس وقت سلطان قلی مع دس پردیسیوں کے بادشاہ کا محافظ تھا اوس نے باہر آکر رات بھر معرکۂ کارزار گرم رکھا اور صبح ہوتے ہوتے حملہ آوروں کو بھگا کر پادشاہ کو بحفاظت قلعہ میں پہونچا دیا اس ہمت مردانہ کے صلہ میں سلطان قلی کو قطب الملک کا خطاب عنایت کرکے محمود شاہ بہمنی نے اپنا وزیر مقرر کرلیا اس کے بعد ملک تلنگانہ کی حکومت سرفراز کی۔ محمود شاہ کی وفات کے بعد راجگان دکن کے اصرار اور شاہان معصر کے تقاضوں کے بعد سلطان قلی قطب الملک نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے قطب شاہ کا لقب اختیار کیا اور گولکنڈہ کو اپنا دارالقرار بنایا۔ اپنے محسن محمد شاہ بہمنی کے نام پر اس نے موضع گولکنڈہ کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام محمد نگر رکھا۔ ساٹھ برس حکومت کی اور بعمر نود سالگی سنہ ۹۵۰ء میں شہید ہوا اس سلسلہ میں حسب تفصیل ذیل آٹھ پادشاہ ہوے اور سنہ ۱۵۱۲ء سے سنہ ۱۶۸۷ء تک ایک سو پچہتر سال یہ سلطنت قایم رہی۔

شجرۂ سلاطین قطب شاہیۂ گولکنڈہ

سنہ ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء — سنہ ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء

سلطان قلی قطب الملک
سنہ ۱۵۱۲ء — سنہ ۱۵۴۳ء

سلطان جمشید قلی قطب شاہ
سنہ ۱۵۴۳ء — سنہ ۱۵۵۰ء

سلطان سبحان قلی قطب شاہ
سنہ ۱۵۵۰ء — سنہ ۱۵۵۰ء چند ماہ

سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ
سنہ ۱۵۵۰ء — سنہ ۱۵۸۰ء

سلطان محمد قلی قطب شاہ
سنہ ۱۵۸۰ء — سنہ ۱۶۱۱ء

سلطان محمد قطب شاہ
سنہ ۱۶۱۱ء — سنہ ۱۶۲۵ء

سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ
سنہ ۱۶۲۵ء — سنہ ۱۶۷۲ء

سلطان ابوالحسن تاناشاہ
سنہ ۱۶۷۲ء — سنہ ۱۶۸۷ء

اس سلسلہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن قطب الملک المعروف بہ تاناشاہ

[1] سنہ ۱۴۸۹ء اسمعیل عادل شاہ [2] سنہ ۱۴۹۰ء ملک احمد نظام شاہ [3] سلطان قلی قطب شاہ سنہ ۱۵۱۲ء [4] پہلے اس کا نام ظفر آباد و احمد آباد تھا [5] ملک قاسم برید سنہ ۱۴۹۲ء [6] علاء الدین عماد الملک سنہ ۱۴۸۴ء

جس کے سوانح زندگی پر روشنی ڈالنی ہمارے مطمح نظر ہے عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا یہ باون برس فرمانروائی کرکے ۱۶۷۲ء میں فوت ہوا۔ اوس کی اولاد میں صرف تین لڑکیاں تھیں از انجملہ دختر اولین کی شادی شہزادہ محمد پسر عالمگیر سے ہوی دوسری لڑکی کا عقد میر احمد میر نظام الدین احمد پدر سید علی معصوم مدنی سے ہوا جو سادات اور فضلائے عرب سے تھا اس کے بعد سید سلطان ایران سے آیا جو میر احمد کے باپ کا شاگرد مگر حسب و نسب میں خاندان میر احمد پر شرف رکھتا تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے تیسری لڑکی کو اس سے نامزد کرکے محفل شادی کو آراستہ کیا جس پر میر احمد کو رشک ہوا جب جشن عقد کا وقت قریب آیا تو میر احمد نے قسم شرعی کھا کے قطب شاہ کو پیغام دیا کہ سید سلطان سے دختر ثالث کا عقد کرنا ہو تو مجھے رخصت کیجئے اہل حرم بھی میر احمد کے جانبدار ہوکر آمادہ فساد ہوے۔ قطب شاہ کو میر احمد اور اپنی بڑی لڑکی کی خاطر منظور تھی۔ ناچار اہل دربار کی صلاح سے زوجیت کے لئے ابوالحسن کا انتخاب کیا جو سلسلہ مادری میں عبداللہ قطب شاہ سے قرابت بعیدہ رکھتا تھا تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ابوالحسن سن تمیز کو پہونچنے کے بعد خانقاہ سید شاہ راجو رح؎ میں اون کی خدمت گزاری کیا کرتا تھا اور اس بات کا امیدوار تھا کہ عبداللہ قطب شاہ کی لڑکی سے اس کی شادی ہوجائے شاہ صاحب نے بھی اوس کو قطب شاہ کی دامادی کا مژدہ دیدیا تھا جس وقت

سید سلطان سے وہ لڑکی منسوب ہوی اور رسم سانچق کا آغاز ہوا تو ابوالحسن نے شاہ صاحب سے عرض کیا، شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ وہ بھی مٹی کے آبخوروں میں نقل و بادام بھر کر اوس پر سرخ کاغذ لگائیں اور صحن خانقاہ میں گشت کرائیں اور کہیں کہ ابوالحسن کی سانچق ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے ہاں جاتی ہے۔ علی ہذا جس روز سید سلطان کی حنابندی ہوی تو شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے ابوالحسن کے ہاتھ میں مہندی لگائی اور مبارکباد دی۔ اس طرف میر احمد اور اہل حرم نے کہا کہ سید سلطان سے عقد ہوگا تو ہم خودکشی کرلینگے، امرا کی رائے یہ ہوی کہ اس قدر ہنگامہ و فساد کے بعد سید سلطان سے عقد کرنا بے سود ہے بادشاہ نے پوچھا پھر اس محفل کو کس طرح برخواست کیا جائے سب نے متفق اللفظ ہوکر ابوالحسن کی سفارش کی۔ ادھر شاہ صاحب کی توجہ باطنی نے بادشاہ کے دل پر اثر کیا خانقاہ سے فوراً ابوالحسن کی طلبی ہوی اور قطب شاہ کی لڑکی کا نکاح اوسی ساعت عقد میں کہ سید سلطان سے قرار پایا تھا ابوالحسن کے ساتھ ہوگیا سید سلطان ناکام اورنگ آباد چلا گیا اور وہاں میر جملہ کی لڑکی سے اوس کی شادی ہوی۔

میر احمد اپنے تکبر کی وجہ سے امرا و ارکان دولت کی وقعت نہیں کرتا تھا اس کے برخلاف ابوالحسن سب سے بہ رفق و مدارا سلوک ہوتا تھا عبداللہ قطب شاہ کے واقعہ ارتحال کے بعد تعین سلطنت میں اختلاف ہوا اور گفتگو کو یہاں تک طول ہوا کہ باہر میر احمد اپنے سپاہ کے ساتھ مستعد پیکار ہوا اور اندر میر احمد کی بیوی شمشیر بکف کنیزان ترک و حبش کے ساتھ آمادہ فتنہ و فساد ہوی بالآخر

؎ آپ حسین شاہ ولی کے پیرزادہ تھے جنھوں نے حسین ساگر بنایا تھا سلسلہ نسب سید محمد یوسف گیسودراز قدس سرہ سے ملتا ہے ۱۰۹۶ھ آپ کا سنہ وصال ہے اور مزار فتح دروازہ کے باہر واقع ہے۔

سید مظفر و موسیٰ خان محلدار و مادنّا و اکنّا کی سعی سے امرائے دربار
اور ملازمین معتمد ابوالحسن کے طرفدار ہوگئے، میر احمد مغلوب ہوا
اور ابوالحسن نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا، سید مظفر
کو عہدۂ وزارت ملا، ابوالحسن نے تخت نشین ہو کر خزانۂ عامرہ
کی فرد موجودات طلب کی، اور یہ حکم صادر کیا کہ خزانہ کو چار
مساوی حصوں میں تقسیم کرکے پہلا حصہ راہ خدا میں مستحقین کو
دیں حصۂ دوم فوج پر تقسیم کریں حصۂ سوم شاہی عیش و نوش
کے لئے علیحدہ کریں اور حصۂ چہارم خزانہ ہی میں رکھیں تاکہ
خزانہ خالی نہ رہے۔ سید مظفر نے عرض کیا کہ دکن میں بادشاہوں
کو ہمیشہ دشمن سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اگر خزانہ اس طرح خالی رہے گا
تو انتظام جنگ اور دفاع دشمن میں دقت ہوگی۔ ابوالحسن نے
جواب دیا کہ شاہان سلف خزانہ جمع کرکے چھوڑ گئے مگر میں چاہتا
ہوں کہ اس کا کچھ حصہ آگے روانہ کردوں۔

ایشیائی درباروں میں یہ بات اکثر مشاہدہ میں آئی ہے کہ جو امیر
بادشاہ کے جلوس سلطنت میں سعی بلیغ کرکے فروغ پاتا ہے تو اوسکی
خواہش طبعی یہ ہوا کرتی ہے کہ جملہ مقدمات جزئی و کلی میں بادشاہ
پر تسلط و اقتدار حاصل کرے، مگر حصول سلطنت کے بعد سلاطین
ایسے امرا کی نازبرداری کا کمتر خیال رکھتے ہیں اور وہ اس تسلط
کو گوارا نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے
استیصال کے درپئے ہوجاتا ہے، انہی وجوہ کی بناء پر سید مظفر
اور ابوالحسن میں ان بن ہوگئی ابوالحسن کو یہ فکر دامنگیر ہوئی
کہ امور مملکت میں سید مظفر کے دست اقتدار کو کوتاہ کرے
مگر بغیر ہنگامہ و فساد کے کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی آخر الامر مادنّا
جو سید مظفر کا پیشکار تھا ابوالحسن کا ہمراز ہوگیا اور ایسی
چال چلا کہ سید مظفر سے قلمدان وزارت چھین کر اس کو محبوس
کرادیا اور خود وزیر بن بیٹھا اور اپنا منصب اکنّا کو دلوادیا
نتیجہ یہ ہوا کہ مادنّا و اکنّا سلطنت کے مالک و مختار ہوگئے وزارتی
کے عہدے مسلمانوں سے لیکر اپنے وابستگان کو دیتے تھے
جس سے معاملات ملکی میں بدنظمی پیدا ہوگئی، علاوہ بریں
ابوالحسن نے سنبھاجی کو قلعوں کی تسخیر میں امداد کی تھی اور
ایک لاکھ ہن بھی اس کو بھیجے تھے ان باتوں سے ابوالحسن بدنام
ہو رہا تھا کہ اسی اثنا میں میر ہاشم پسر سید مظفر نے دہلی پہونچکر
مقربان بارگاہ عالمگیری کے وسیلہ سے اپنے باپ کی خلاصی
چاہی اور تسخیر حیدرآباد کی تحریک کی اس زمانہ میں سلاطین
قطب شاہیہ کا پایۂ تخت بجائے گولکنڈہ کے حیدرآباد میں
منتقل ہوچکا تھا اس کا واقعہ یوں ہے کہ سلطان محمد قلی
قطب شاہ نے سنہ ۹۹۵ء میں اپنے دارالسلطنت کو گولکنڈہ

---

[1] سلاطین مازندران سے کچھ قرابت رکھتا تھا اور امرائے حیدرآباد میں
صاحب فوج و معزز تھا۔

[2] ڈچ جنرل ہیورٹ (Havart) جہاں سے ابوالحسن قطب شاہ اور
مادنّا و اکنّا کی تصاویر حاصل کی گئی ہیں لکھتا ہے کہ یہ دونوں بھائی نہایت غریب خاندان سے
تعلق رکھتے تھے سنہ ۱۶۶۶ء میں مادنّا و اکنّا میر جملہ کی سفارش سے دس گلڈر (فی
گلڈر ایک شلنگ چھ پنس یعنے عہ) ماہوار پر سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ملازمت میں
داخل ہوئے مادنّا متین اور سنجیدہ شخص تھا مگر اکنّا مکار اور بدطینت تھا میر جملہ
کو انہی بھائیوں کی سازش سے دکن چھوڑنا پڑا جس کے بعد ان کو خوب عروج
حاصل ہوا۔ مادنّا فارسی اردو اور ملکی زبانوں میں مہارت تام رکھتا تھا۔
اور شاہانہ بسر کیا کرتا تھا رفتہ رفتہ اس کو امور سلطنت میں اس قدر اقتدار حاصل
ہوگیا کہ ابوالحسن قطب شاہ کی گزراوقات کیلئے اسنے ۵ ہزار ڈالر (فی ڈالر چار شلنگ
دو پنس یعنے ہے) وظیفہ مقرر کردیا تھا وہ اسی میں خوش تھا مادنّا ولندیزیوں (یعنے
اہل ہالینڈ ڈچ) پر بہت مہربان تھا ہیورٹ کا مصنف لکھتا ہے کہ اسکو مادنّا سے ملاقات کرنے کا اکثر اتفاق ہوا

سے اس لئے بدل دیا کہ وہاں پانی نکیاب تھا اور اکثر امراض
شایع رہتے تھے وہاں سے پانچ کوس پر رود موسی کے کنارے
اوس نے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام اپنی محبوبہ
"بھاگ متی" کے نام پر "بھاگ نگر" رکھا جو بھاگ متی کی
وفات کے بعد حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوا یہاں امرائے
بڑے بڑے باغ اور محل تعمیر کرائے تھا اور محمد قلی قطب شاہ نے
علاوہ کوچہ و بازار کے چار کمان، حمام، دار الشفا، گلزار حوض
اور چار منار بنوایا تھا جس سے اس کی خوب رونق ہوی۔
۱۰۹۶ھ میں جبکہ بیجاپور سلطنت تیموریہ میں شامل ہوگیا تو دکن
میں بجز قطب شاہیہ کے کوئی سلطنت باقی نہ رہی تھی اور عالمگیر
کو ایک عرصہ سے تسخیر حیدرآباد کی دھن تھی اس نے استیصال
ابوالحسن کا مصمم قصد کرکے ابتداءً خانجہاں کو کلتاش کو روانہ
کیا اور شہزادہ معظم کو فوج گران دیکر ملک تلنگانہ کی تسخیر کیلئے
بھیجا۔ انہی ایام میں عالمگیر نے مرزا محمد کے ذریعہ سے ابوالحسن
کے پاس پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس جو دو الماس مرصع
بوزن ایک سو پچاس سرخ ہیں اون کو بادشاہ کے پیش کش
کرے اور خلوت میں مرزا محمد سے یہ کہا کہ ہم کو ان سنگریزوں
کی مطلق احتیاج نہیں ہے بلکہ تیری روانگی اور اس امر کی
شہرت سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابوالحسن کے افعال کی تحقیقات
کرکے مفصل حال عرض کرے اور یہ بھی ارشاد کیا کہ ابوالحسن سے
گفتگو میں درشتی اور گستاخی سے کام لے تا کہ وہ بھی تیرے ساتھ
درشتی کرے اور اس کی تنبیہ و استیصال کے لئے ہم کو ایک حجت ہاتھ
آئے۔ مرزا محمد نے حیدرآباد آکر الماس طلب کئے ابوالحسن نے
قسمیں کھا کر اون کے وجود سے انکار کیا۔ مرزا محمد گفتگو میں بے ادبی
اور بے باکی کرتا تھا ایک دن گفتگو میں ابوالحسن نے کہا کہ اس
مختصر ملک میں ہم بھی بادشاہ ہیں اس پر مرزا محمد نے آشفتہ ہوکر
کہا کہ لقب شاہی اختیار کرنا تم کو نازیبا ہے ابوالحسن نے
جواب دیا جب تک ہم بادشاہ نہ کہلائیں، عالمگیر بادشاہ بادشاہ
نہیں ہوسکتا اس معقول جواب سے مرزا لاجواب ہوا اور
عالمگیر کے پاس مراجعت کی اسی اثنا میں یہ خبر آئی کہ افواج
شاہی بسرداری شاہزادہ معظم و خانجہاں کو کلتاش بعزم
تسخیر حیدرآباد آرہی ہے ابوالحسن نے خلیل اللہ خاں (عرف
محمد ابراہیم) سپہ سالار، شیخ منہاج، اور رستم راؤ کو کہ صاحب السیف
والقلم اور ابوالحسن کا مشیر اور مادنا کا برادر عزیز تھا چالیس ہزار
سپاہ کے ساتھ روانہ کیا سرحد بیجاپور و حیدرآباد پر طرفین کی
فوجوں کا مقابلہ ہوا شاہزادہ معظم چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ
نہ ہو اس لئے اوس نے چند شرایط صلح خلیل اللہ خاں کے پاس
پیش کئے (۱) ابوالحسن اپنی ندامت کا اظہار کرے، عفو تقصیرات
کا خواستگار ہو اور مادنا و اکنا کو معزول کرے (۲) پرگنات سیرم
و راگیر وغیرہ جو یہ کہکر غصب کئے گئے ہیں کہ وہ پہلے بیجاپور سے
متعلق تھے اون کی گزاشت منصوبان شاہی کے حوالہ کرے
(۳) پیشکش سابق کا بقایا اور پیشکش لاحقہ بلا توقف بادشاہ
کی خدمت میں روانہ کرے تو ان شرایط پر عفو تقصیرات کے لئے
بادشاہ سے سفارش کی جائیگی۔
امرائے دکن نے ان شرایط پر التفات نہ کی اور طرفین سے معرکہ

---

(۱) قلعہ گولکنڈہ کے نیچے جو حضرت اقدس و اعلیٰ کے ہرن اور بارہ سنگوں کا چراگاہ ہے
اس کے مغربی سمت میں ایک میل کے فاصلہ پر بھاگ متی اور تارہ متی کی بارہ دری
اور مسجد بنی ہوی ہے یہ دونوں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی حرم تھیں چنانچہ اس
عمارت کے کتبہ پر سنہ تعمیر ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) کندہ ہے اور یہی سلطان محمد
قلی کا سنہ وفات ہے۔

(۱) منتخب اللباب خافی خاں (۱۲)

کارزار شعلہ فروز رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افواج عالمگیری پر عرصۂ
کارزار تنگ ہوا قریب تھا کہ خانجہاں کی فوج کو ہزیمت ہو کہ
ایک فیل مست کے منہ میں تین چار من کی زنجیر ڈال کر افواج
دکن کی طرف دوڑایا جس سے لشکر میں ہل چل مچ گئی اس ترکیب
سے ۱۶۸۳ء میں افواج دکن کو شکست ہوی اس کے بعد
دو تین مقابلے اور ہوے مگر اون میں بھی لشکر ابوالحسن کے
پانوں نہ جم سکے۔ فوج شاہی شادیانے بجاتی ہوی حیدرآباد
کی جانب روانہ ہوی۔ جب لشکر شاہی کے قریب آنے کی
خبر مشہور ہوی تو مادنا اور اوس کے ہم صفیروں نے ابوالحسن
کے یہ ذہن نشین کرایا کہ خلیل اللہ خاں شاہزادہ معظم کی طرف
مایل ہوگیا ہے اس پر ابوالحسن نے اوس کے قتل کا ارادہ
کیا جب یہ خبر خلیل اللہ خاں کو پہونچی تو وہ شاہزادہ کے
پاس جاکر مورد عنایت ہوا اس واقعہ سے کہ سپہ سالار دکن
افواج شاہی سے مل گیا ہے ابوالحسن نہایت پریشان
ہوا اور ارکان دولت سے مشورہ کئے بغیر وہ اپنی
جواہر اور اموال و عیال کو لیکر شبا شب گولکنڈہ چلا گیا
بادشاہ کی اس حرکت سے شہر میں کہرام مچ گیا۔ کئی ہزار
اشراف شہر اپنے زن و فرزند کا ہاتھ پکڑ کر قلعہ کی
سمت روانہ ہوگئے۔ بیاض صبح کے نمودار ہونے کے قبل
لشکر شاہی نے حیدرآباد پر تاخت کر دی لاکھوں کا زر نقد
اور تجار کے اموال تاراج ہوگئے۔ ابوالحسن کے فرستادے
نہایت عجز سے جرایم ناکردہ کے عفو کے لئے پیغام لائے تو
شہزادہ معظم کو اس برگشتہ بخت اور باشندگان شہر کی
حالت پر رحم آیا۔ التماس ابوالحسن کو ان شرائط پر قبول
کیا کہ بطور پیشکش ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ ادا کرے
مادنا و اکنا کو امور سلطنت سے بے دخل کر دے اور محالات
مفتوحہ سے جو تصرف شاہی میں آئے ہیں۔ دست برداری قبول کرے
ابوالحسن نے ان شرائط کو قبول کر لئے اور سید مظفر کو بھی
قید سے رہائی دیدی مگر مادنا و اکنا کے عزل میں متامل ہوا
اس پر بعض عمدہ سرداروں اور خدمۂ محل نے ان دونوں
بھائیوں کو ۱۶۸۵ء میں قتل کر کے اون کے سر شاہزادے
کے پاس بھیجدئے۔

جب ابوالحسن کے ساتھ صلح کی عرضداشت عالمگیر کے یہاں
گزری تو اگرچہ بحسب ظاہر منظور ہوی۔ مگر خفیہ طور پر
خانجہاں کو مغضوب کیا اور سعادت خاں کو جو خانجہاں
کی فوج کا دیوان تھا حاجب بنا کر زر پیشکش کے وصول کے لئے روانہ
حیدرآباد کیا اور اوس سے کہدیا کہ مابدولت کا عزم تسخیر حیدرآباد
کا ہے۔ سعادت خاں نے ابوالحسن کو عنایات بادشاہی
کا امیدوار کر کے زر پیشکش کا تقاضا کیا اس عرصہ میں کہ
۱۶۸۶ء تھا عالمگیر کے گلبرگہ میں آنے کی خبر مشہور ہوی ابوالحسن
پر عالم خوف و رجا طاری تھا۔ سعادت خاں کے آدمیوں
کو طلب کر کے جواہر و زیور مرصع قیمتی دس لاکھ کے نو عدد
خوانچوں پر اپنی مہر لگا کر اوس کے پاس روانہ کئے اور یہ
کہلا بھیجا کہ ایک عرضداشت جو میری فرمانبرداری کے اظہار
اور عفو جرایم کے التماس پر مشتمل ہو، حضور شاہی میں روانہ
کرے۔ اس کے بعد جب یہ خبر آئی کہ عالمگیر بعزم تسخیر گولکنڈہ
آرہا ہے تو ابوالحسن نے سعادت خاں کے پاس کہلا بھیجا
کہ خوانہائے جواہر کے ارسال کا مدعا یہ تھا کہ التفات شاہی
میرے حال پر مبذول ہو اب جبکہ بادشاہ مجھسے لڑنے آرہا ہے

لہ ڈچ جنرل آف ہیورٹ ۱۲۔

تواون خوانچوں کو واپس کرو۔ سعادت خاں نے جواب دیا کہ
وہ خوانچے حضور میں جاچکے ہیں جب عالمگیر کا پیش خیمہ حیدرآباد
پہونچا تو ابوالحسن نے سخن فہم لوگوں کے توسط سے اطاعت و
عفو جرایم کے عرائض اور تحایف روانہ کئے، بادشاہ نے اُس
کے معروضات جواب زبان شمشیر کے حوالہ کیا اور سعادت خاں
کے پاس یہ فرمان بھیجا۔

"اس بد عاقبت (ابوالحسن) کے افعال قبیح احاطۂ تحریر سے
باہر ہیں از انجملہ سو میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے
شمار کئے جاتے ہیں اول ملک و سلطنت کا اختیار کافر فاجر
ظالم کو دینا اور سادات، فضلاء و مشایخین کو ذلیل و رسوا
کرنا اور فسق و فجور کا افراط سے علانیہ رواج دینے میں کوشش
کرنا، اور خود ریاست کی بادہ پرستی، دولت کی بدمستی اور
انواع کبائر میں شب و روز مستغرق رہنا بلکہ کفر و اسلام
ظلم و عدل اور فسق و عبادات میں فرق نہ کرنا کفار حربی
کی اعانت میں اصرار کرنا عدم اطاعت اوامر و مناہی آلہی
میں دقیقہ اٹھا نہ رکھنا خصوصاً منع معاونت کفار حربی
میں کہ نص جلی کلام مجید میں وارد ہے خود کو مطعون کرنا چنانچہ
مکرر اس باب میں ہم نے فرامین نصیحت آمیز بھیجے، اس پر بھی
پنبۂ غفلت گوش سے نہ نکالا بلکہ اس پر طرہ یہ ہوا کہ سینہا
کو لاکھ ہن بھیجے جس کا حال ہم نے سنا، باوجود اس غرور و مستی
بادۂ ناکامی کے اپنے افعال اور زشتی اعمال پر نظر نہ کرنا اور ذوبنو
جہاں میں رستگاری کا امیدوار رہنا ؎

زہے تصور باطل زہے خیال محال"

جب ابوالحسن بالکل مایوس ہوا تو لشکر شاہی سے لڑنے کیلئے
شیخ منہاج۔ شرزہ خاں و مصطفےٰ خاں لاری وغیرہ کو بھیجا
۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۷ھ کو عالمگیر قلعہ گولکنڈہ سے ایک
کوس پر خیمہ زن ہوا طرفین سے صف جنگ آراستہ ہوئی
نواب قلیچ خاں بہادر جد حضرت مغفرت مآب نواب
آصف جاہ اولیٰ اسی معرکہ میں کام آئے بالآخر لشکر شاہی
کی کشش و کوشش سے دکنی فرار ہوئے۔ شیخ منہاج اور
اکثر ملازمین ابوالحسن عالمگیر کی طرف چلے آئے اور خطاب و منصب
سے سرفراز ہوئے صرف مصطفےٰ خاں عرف عبدالرزاق لاری اول
سے آخر تک ابوالحسن کا خیر خواہ رہا۔

فوج شاہی میں کمیابی رسد کی وجہ سے بہت سی جانیں تلف
ہوئیں اور قلعہ گولکنڈہ کے استحکام نے عالمگیر کو آٹھ مہینہ
دس روز تک مساعیٔ موفورہ کے باوجود قریب نہ آنے
دیا، جب جرات و استقلال سے کچھ بن نہ پڑا تو سازشوں سے
کام لیا گیا اور روپیہ اور اقراروں سے امرائے قطب شاہیہ کو
رشوتیں دی گئیں۔ اواخر ذی القعدہ ۱۰۹۸ھ کو روح اللہ
خاں نے بوساطت رمست خاں عبداللہ خاں سے پیام
سلام شروع کئے یہ ابوالحسن کا بڑا معتبر ملازم اور اس دروازۂ
قلعہ پر متعین تھا جس کو "کھڑکی" کہتے ہیں ایک پہر رات
باقی تھی کہ روح اللہ خاں، و رمست خاں، و خواجہ مکارم
دمدمہ کے اوپر سے اور ان راستوں سے جو توپوں کی ضرب
سے شکستہ ہوگئی تھیں بابائے عبداللہ خاں حصار قلعہ

---

۵۳ ابوالحسن کی عرضداشت بخیال طوالت قلم انداز کردی گئی ہے ملاحظہ ہو۔ منتخب اللباب صفحہ ۳۴۹، مطبوعہ کلکتہ ۱۲
۵۴ حدیقۃ العالم ۱۲۔

۵۱ آپ کا مزار بنام مقبرہ قلیچ خاں متصل میدان قلعہ گولکنڈہ واقع ہے
۵۲ اسکی نسبت عالمگیر کا قول تھا کہ "اگر ابوالحسن مثل عبدالرزاق لاری یک نوکر دیگر نمک حلال می داشت تسخیر قلعہ زیادہ بر این فرصت مے خواست" ۔ تاریخ قطب شاہی ۱۲

میں داخل ہوے شہزادہ محمد اعظم اپنی فوج کے ہمراہ قلعہ کے
صدر دروازہ کی سمت آکر فتح الباب کا منتظر رہا۔ ان
لوگوں نے جاکر قلعہ کا دروازہ کھولدیا، جب یہ اطلاع اہل
قلعہ کو ملی تو ایک تہلکۂ عظیم برپا ہوا۔ ابوالحسن محلات کی
دلدہی کرکے اون سے رخصت ہوا۔ دربار میں آکر مسند
پر بیٹھا۔ اور مہمان ہائے ناخواندہ کا منتظر رہا۔ چونکہ یہ وقت
اوس کے خاصہ کا تھا اس لئے بکاول کو دسترخوان بچھانے
کا حکم دیا۔ جب روح اللہ خاں وغیرہ آئے تو ابوالحسن
نے سلام میں سبقت کی گو وقار سلطنت کو ہاتھ سے نہ جانے
دیا اور سب کے مجرے کا جواب خودداری وشان سے
دیکر ہر ایک سے گرم جوشی وفصاحت سے گفتگو کی۔

جب کسی شریف صاحب ثروت کا اختر اقبال برگشتہ ہوتا ہے
تو وہ حوصلہ وبردباری کو ہاتھ سے نہیں دیتا بلکہ رضا وتسلیم اختیار
کرتا ہے، اُس وقت ابوالحسن کا یہی حال ہوا۔ بکاول نے دسترخوان
بچھایا اُس نے اُمرا کو اپنے ہمراہ شریک طعام کیا۔ روح اللہ خاں نے
عرض کیا مجھے سخت تعجب ہے کہ آپ سے اس تشویش میں
کھانا کس طرح کھایا جاتا ہے ابوالحسن نے جواب دیا کہ:۔

"تم نے جو بات کہی یہ طریقہ جمہور کا ہے، لیکن میرا اعتقاد اوس
خدا پر ہے جس نے تجھے اور شاہ وگدا کو پیدا کیا۔ وہ کسی وقت
و حالت میں اپنے نظر لطف کو بندہ سے باز نہیں رکھتا اور
رزق مقسوم اوس کو پہونچاتا ہے، اگرچہ میرے اجداد پدری
و مادری نے ہمیشہ رفاہ وآبرو کے ساتھ زندگی بسر کی مگر مجھے
دنوں مصلحت پروردگار کا اقتضا یہ تھا کہ پندرہ سولہ برس
تک میں لباس فقیری میں رہوں پھر خدا نے مجھ عاجز پر
وہ فضل وکرم کیا جس کا مجھے یا دوسرے کو شان وگمان نہ
تھا ایک آن واحد میں میرے لئے سامان شاہی درست ہوگیا
الحمدللہ کہ میرے دل میں اب کوئی ہوس وآرزو باقی نہیں ہے
لاکھوں روپے بخشے اور کروڑوں خرچ کئے اب مجھ سے
بعض اعمال ناشایستہ ایسے سرزد ہوے جس کے مکافات
میں خداوند عالم نے نظر لطف کو مجھ سے اٹھا لیا پھر بھی میں
شکر کرتا ہوں کہ میری باقی ماندہ حیات مستعار عالمگیر زندہ دار
کے عنان اختیار میں دی ہے ؎

سر ارادتِ ما و آستانِ حضرتِ دوست — کہ ہرچہ بر سرِ ما میرود ارادتِ اوست

اس کے بعد مالہائے مروارید زیب بدن فرماکر امرا کے ہمراہ
گھوڑے پر سوار ہوا اور شاہزادہ اعظم کے پاس جو دروازۂ قلعہ پر
ایک چھوٹے سے خیمے میں اوترا ہوا تھا گیا اور باظہار دوستی
مالائے مروارید کو اوتار کر شاہزادہ کو پہنا دیا شہزادہ نے
اوس کو قبول کیا اور ابوالحسن کی پیٹھ پر ہاتھ رکھکر بہت تسلی دی
اسی موقع پر ابوالحسن شہزادے کے گھوڑے کی گردن پر سہارا دیکر باتیں
کر رہا تھا جس پر چوبدار نے باادب رہنے کے لئے للکارا۔
شاہزادہ نے نسقچی کی طرف غضب آلود نگاہ سے دیکھکر فرمایا کہ
اے بدبخت تجھے غضب الٰہی کا کچھ خوف نہیں آتا یہ شخص سلطان
ہے جس طرح چاہے کھڑا ہو اختیار ہے اس کے بعد عالمگیر
کی خدمت میں حاضر کیا! وشاہ نے بھی ابوالحسن کا احترام کیا
اور کہا کہ "یہ بہادری جو مدافعت قلعہ میں ظہور میں آئی۔
پیشتر کی عیاشی کا معاوضہ ہوگئی"

اس کے بعد متصدیان شاہی ابوالحسن اور اوس کے امرا کے
زر ومال کے ضبط وتصرف میں مصروف ہوے ابوالحسن
کا جو مال ضبط ہوا اس کی تفصیل یہ ہے:۔

ا؎ وقایع گولکنڈہ نعمت خان عالی ۱۲۔

(۱) ۶۸ لاکھ ۱۵ ہزار ہن[1]

(۲) دو کروڑ ۵۳ ہزار روپیہ

(۳) جواہر و آلات مرصع و ظروف طلا و نقرہ ایک ارب پندرہ کروڑ تیرہ لاکھ دام[2] اس ملک میں (۲۰) سرکاریں تھیں جو (۳۵۵) پرگنوں پر منقسم تھیں اور اوس وقت ریاست حیدرآباد کا سالانہ محاصل ایک کروڑ ۶۵ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ تھا۔ تاریخ فتح عبدالکریم نے "فتح قلعہ گولکنڈہ مبارک باد" سنہ ۱۰۹۸ھ کہی اور نعمت خاں عالی نے صنعت تعمیہ و تخرجہ میں یہ قطعہ کہہ کر حضور عالمگیر میں گزرانا ؎

ابوالحسن[3] داشت جا بہ چار محل — بدرش کرد زامیاں تقدیر
چوں بروں رفت او بجائش نشست — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

رستم دل خاں کو صوبہ داری دکن پر مقرر کر کے عالمگیر مع ابوالحسن حیدرآباد[4] سے روانہ بیدر ہوا ایک کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ابوالحسن محمد نگر میں آیا تو چونکہ صعوبات سفر سے ناآشنا تھا اس لئے بادشاہ سے گوشہ گیری کے لئے عرض کرایا جس پر پچاس ہزار روپیہ سالانہ مقرر کر کے جان سپار خاں کو حکم ہوا کہ مع محلات قلعۂ دولت آباد میں پہونچا دیں اور اوس کے لائق خوراک و پوشاک و خوشبو فراہم کریں اثنا راہ میں طفل چار سالہ کو جو پالکی میں ابوالحسن کے ہمراہ تھا پیاس معلوم ہوئی ابوالحسن نے پانی مانگا اس وقت آبدار خاصہ کہاں تھے ساتھیوں نے سقۂ بازار سے جام آب لیکر پالکی میں دیا اوس وقت ابوالحسن کے پاس کچھ نہ تھا لڑکے کے کان میں سے آویزۂ الماس اوتار کر پیالہ میں ڈال دیا اوس کی قیمت پچاس ہزار روپیہ بیان کی جاتی ہے جب اورنگ زیب کو یہ حال معلوم ہوا تو سقہ کو دو ہزار روپیہ دیکر آویزۂ الماس واپس لے لیا۔

الغرض سنہ ۱۰۹۸ھ میں دولت قطب شاہیہ سلطنت تیموریہ میں منتقل ہوئی اور ربیع الاول سنہ ۱۰۹۹ھ میں ابوالحسن چینی محل[1] واقع قلعۂ دولت آباد میں محبوس کیا گیا۔ ابوالحسن تانا شاہ کے عمر کی تقسیم عجائبات میں سے ہے چودہ سال بلوغ طفولیت کی سیر میں گزرے چودہ سال اپنے پیر طریقت سید شاہ راجو رہ کی خدمت گزاری میں بسر کئے چودہ سال سلطنت کی اور چودہ برس عالمگیر کی قید میں رہا۔ سنہ ۱۰۵۶ھ میں پیدا ہوا چھپن برس کی عمر پائی اور ۱۲ ربیع الثانی سنہ ۱۱۱۲ھ میں رحلت کی۔ اس کے واقعہ ارتحال سے قبل قلعدار دولت آباد کو عالم رؤیا میں یہ حکم ہوا کہ ابوالحسن پنجشنبہ کے روز وفات پائیگا اس کی تجہیز و تکفین میں اہتمام لائقہ کیا جائے اور نعش کو قلعہ سے باہر لاکر شاہ راجو قتال[2] رہ کے مرقد کے پاس دفن کیا جائے علی الصباح کہ روز پنجشنبہ تھا قلعدار نے ابوالحسن کے پاس عرض کرایا کہ مجھے کچھ ضروری حکم پہونچانا ہے ابوالحسن نے اندر سے کہلا بھیجا کہ جو حکم تم کو بحالت خواب دیا گیا ہے وہی مجھکو بیداری کی حالت میں ملا ہے حسب حکم کی تعمیل پنجشنبہ آئندہ کو کرنا جب دوسرا پنجشنبہ آیا علی الصباح ابوالحسن نے بعارضہ اسہال کبدی رحلت کی۔ باوجودیکہ

---

[1] سکہ طلائی ۱۲ [2] ایک روپیہ کا چالیسواں حصہ [3] اول اعداد ابوالحسن (۱۵۷) اور چار محل (۲۸۲) کو لیں اوس کے بعد اعداد چار محل کو ابوالحسن میں سے منہا کریں (۲۸۲ - ۱۵۷) = ۱۲۵ کو اعداد شاہ اورنگ زیب عالمگیر (۹۷۳) میں جمع کریں سنہ ۱۰۹۸ھ برآمد ہوگا ۱۲ [4] تسخیر گولکنڈہ کے بعد عالمگیر نے اس شہر کا نام "دارالجہاد حیدرآباد" رکھا مگر عہد شاہ عالم میں "فرخندہ بنیاد" کے نام سے دفاتر میں ثبت ہوا ۱۲

[1] چینی محل کی عمارت فی زمانہ بالکل کھنڈر ہوگئی ہے مگر اس میں جو اعلیٰ درجہ کا کاشی کار تھا اس کے علامات موجود ہیں ۱۲

[2] آپ سید محمد یوسف گیسو دراز خواجہ بندہ نواز رح کے پدر بزرگوار ہیں ۱۲

مجوسین کو بے اجازت شاہی قلعہ سے باہر نہیں لاتے ہیں۔ مگر
قلعدار نے نعش ابوالحسن کو قلعہ کے باہر لاکر درگاہ شاہ راجو
قتال رہ واقع خلدآباد میں دفن کیا اور اسی کے ساتھ سلاطین
قطب شاہیہ کا جاہ و حشم بھی ہمیشہ کے لئے مفقود ہوگیا۔ ابوالحسن
کا ناتمام مقبرہ گولکنڈہ میں اب تک موجود ہے جسے یہ اپنے زوال
کے پیشتر بنوارہا تھا۔ یہ ناتمام گنبد اس وقت تصویر عبرت ہے
مَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۔ خلدآباد میں ابوالحسن
کی قبر چونہ اور اینٹ کی بنی ہوی ہے اور چونکہ اس کے قرب
جوار میں اور بھی قبور ہیں اس لئے یہ سادہ مزار اس آخری
بادشاہ قطب شاہیہ کے شایان شان نہیں ہے اب تک کوئی
کتبہ بھی اس قبر پر نہ تھا مگر عہد وزارت مہاراجہ سرکشن پرشاد
بہادر یمین السلطنۃ میں ایک کتابہ بخط طغرا اس کی قبر کے سرہانے
رکھا گیا ہے امید ہے کہ محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد، صاحب مزار
کی عظمت و شان کے مناسب قبر اور کتبہ کی زیبایش میں اہتمام کریگا
ابوالحسن جب عروس سلطنت سے ہم آغوش ہوا تو ایک روز
شاہ راجو رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فقیر خانقاہ کے ہاتھ سے ایک
انار ابوالحسن کے پاس بھیجکر تاکید کی کہ یہ پورا انار اپنے سامنے
اس کو کھلادے فقیر انار لیکر پہونچا تو وہ سو رہا تھا جب بیدار
کیا گیا تو انار کو فقیر کے ہاتھ سے لیکر توڑا اس میں سے اتفاقاً
چودہ دانے نکلے جن کو ابوالحسن نے نوش کیا۔ اور فقیر سے
کہا عرض کردینا کہ حسب الحکم دانہاے انار میں نے کھالئے باقی
انار اٹھ کر کھالونگا۔ فقیر نے ہر چند مسلم انار کھانے پر اصرار کیا
مگر ابوالحسن نے اس کو انعام و اکرام سے مالامال کر کے شاہ صاحب
کے پاس روانہ کردیا۔ فقیر نے واپس ہوکر شاہ صاحب سے
مفصل ماجرا بیان کیا جس پر حضرت متاسف ہوئے اور
فرمایا کہ میں چاہتا تھا جس قدر دانے اس انار میں تھے اوتنی
مدت تک اس خاندان میں سلطنت رہے مگر تقدیر الٰہی یہی
معلوم ہوتی ہے کہ چودہ برس سے زیادہ مدت سلطنت[1] نہ ہو۔
تسخیر گولکنڈہ کے وقت ابوالحسن کی چار لڑکیاں ناکتخدا
تھیں بڑی لڑکی نے شادی سے انکار کیا اور یہ درخواست کی
کہ میں بادشاہ عالمگیر کو وضو کے لئے پانی دینے پر متعین ہوجاوں
مجھے اسی پر فخر ہوگا ورنہ باقی لذات دنیوی سے مجھے اجتناب
ہے، بادشاہ نے اوس کا یومیہ مقرر کرکے ابوالحسن ہی کے پاس
رہنے دیا۔ دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ بیجاپور
سے کرکے اوس کو محبس میں اوس کا ہمدم بنایا۔ تیسری لڑکی کا
عنایت خاں پسر اسد خاں سے عقد باندھا اور چوتھی لڑکی کو
خاندان نقشبندیہ میں بیاہ دیا جو ابوالحسن کے ناگوار خاطر ہوا
حالت قید میں ابوالحسن کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اوس
نے "بندہ سلطان" رکھا سن تمیز کو پہونچنے کے بعد عالمگیر نے
اس لڑکے کو اپنے دربار میں طلب کیا آمد و رفت کے وقت
اہل دربار جن میں بعض امراے ابوالحسن بھی تھے اس کے اجداد
کے پاس نمک کے لحاظ سے اس کی تعظیم کرتے تھے یہ بادشاہ
کو ناگوار ہوا اور عالمگیر نے اس بدبخت لڑکے کو بھی نظر بند
کرادیا اس کے بعد بندہ سلطان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔
صاحب تذکرۂ گلشن ہند ابوالحسن کی نفاست پسندی اور
عالی دماغی کا یوں ذکر کرتا ہے کہ اس بادشاہ کو حقہ کا بہت
شوق تھا۔ ہر چلم کے بعد ایک شیشۂ گلاب سے حقہ تازہ
کیا جاتا تھا، سینکڑوں شیشے گلاب و بید مشک کے شب
و روز خرچ ہوتے تھے۔ عالمگیر نے اسراف کا عذر کر کے عرق

[1] گلزار آصفیہ۔

گلاب و بید مشک بند کردیا۔ ابوالحسن نے اس روز سے
پھر حقہ نہ پیا۔ مطلع ذیل بھی اوسی سے منسوب کیا جاتا ہے

کس ورکھوں، جاوں کہاں مجھ دل پہ بھل جھراٹ ہے
اک بات کے ہونگے سجن۔ یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

اپنے اسلاف کی طرح ابوالحسن بھی تعمیرات کا شوق رکھتا تھا
چنانچہ ۱۰۸۳ھ میں بصرف آٹھ لاکھ روپیہ اس نے چار محل
کے نام سے رود موسی کے ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت
تعمیر کرائی تھی جو ۱۱۵۵ھ میں بارودخانۂ متعلقہ کی آگ سے
جلکر شکستہ ہوگئی اس کے بعد اسی نام سے ایک محلہ آباد تھا
جو ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں برباد ہوگیا

اشک آن ہم صبر و طاقت از دل بیتاب برد
پارۂ او سوخت آتش پارۂ او آب برد

مکہ مسجد کے تعمیر جاریہ کی تکمیل پر ابوالحسن کے عہد میں آٹھ
لاکھ روپیہ صرف کیا گیا اس کا نام اولاً بیت العتیق
تھا، مگر ۱۰۹۰ھ میں مکہ مسجد کے نام سے مشہور ہوی۔
حوض گوشہ محل کی عمارت بھی اپنی رفعت و وسعت میں بے نظیر
تھی۔ مگر اب یہ بھی خستہ حالت میں ہے، اس حوض کی تیاری
میں بارہ ہزار دھمس والیاں مصروف بکار تھیں، ان کا
معمول ہے کہ کام کرتے وقت گیت گایا کرتی ہیں ایک روز
ابوالحسن نے حکم دیا کہ ہم آج شب کو دھمس والیوں کا کام
اور اون کا گانا ملاحظہ کرینگے اس لئے ان سب کو تاش
کی ایک ایک ساری اور طلائی و نقرئی تاش کی چولیاں
توشک خانہ شاہی سے عنایت ہوئیں۔ حوض کے اطراف
تختہ بندی کرکے چراغاں کیا گیا اور آتشبازی چھوڑی گئی
رات کے وقت ابوالحسن نے حوض گوشہ محل کے قصر رفیع الشان
پر برآمد ہوکر یہہ تماشا ملاحظہ کیا اور سب کو انعام و اکرام دیا
گو ہندوستان کے اور بادشاہوں کی طرح ابوالحسن تاناشاہ
بھی عشرت دوست واقع ہوا تھا اور اس کے وقت میں امور
سلطنت کا مدار بدقسمتی سے ایک ایسے شخص پر ہوگیا تھا جو اس
کا مطلق اہل نہ تھا مگر ان کمزوریوں کے ساتھ ابوالحسن میں بہت
سے محاسن بھی موجود تھے بے درد واقعہ نگاروں نے یہ وطیرہ
اختیار کرلیا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ذکر خیر کے ساتھ اون
کی عیش پسندی اور آرام طلبی کی مبالغہ آمیز داستانیں بھی ضرور
سنا دیا کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اہل یورپ ان امور
کو سلاطین اسلام کی خصوصیات ذاتی میں شمار کرنے لگے مثلاً جہانگیر
جس کی نصفت پسندی اور بیدار مغزی کی شہادت توزک
جہانگیری کے بالاستیعاب مطالعہ سے ہوسکتی ہے یورپین مورخ
اوس کو مست خرابات بتاتے ہیں لیکن اس خصوص میں
ابوالحسن خاص طور پر مورد عنایات رہا ہے بہت سے بے سر و پا
افسانے اس کی جانب منسوب کردئے گئے ہیں جس سے عیش و نشاط
ایک ایسا اسم خیال کیا جاتا ہے جس کا مسمی سوائے ابوالحسن تاناشاہ
کے اور کوئی نہیں حالانکہ ان تفریحی اشغال کا اوس کے دیگر
مشاغل سے مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ وہ نشۂ غفلت
میں اس قدر بدمست نہ رہتا تھا جیسا کہ مشہور کیا جاتا ہے
ابوالحسن امیر گھرانہ کا چشم و چراغ تھا مگر چودہ برس فقر و استغنا
کی مصاحبت میں رہا اوس کی زندگی کے بغور مطالعہ سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثر مدت العمر اس پر غالب رہا بادشاہ
ہونے کے بعد خزانہ کا صرف ایک حصہ محفوظ رکھکر باقی تین حصص
اس نے صرف کردئے اور توجیہہ یہ کی کہ داد و دہش توشۂ

لہ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲۔

آخرت ہے اوس کے مزاج میں ضبط و بردباری کی صفت بھی
بدرجہ اتم موجود تھی، ورنہ بادشاہ ہوکر مرزا محمدؐ کی سخت کلامی
کی برداشت مشکل تھی۔ ابوالحسن نے سیلاب عالمگیری کے روکنے
میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا نرم و گرم دونوں پالیسیاں اس آفت
کے ٹالنے کے لئے اوس نے اختیار کیں موقعہ پر حکمت عملی سے بھی
کام لیا۔ سنبھا کو ایک لاکھ ہُن اس لئے بھیجے تھے کہ وقت بیوقت
کام آئے گا۔ ضرورت کے وقت مستعدی اور جلادت بھی اوس
سے ظاہر ہوئی۔ ہزاروں کے لشکر سے شاہی فوج کا مقابلہ کیا
مدافعت قلعہ گولکنڈہ میں اس کا عزم صمیم اور استقلال راسخ
بہت نمایاں رہا۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداء
حیدرآباد سے گولکنڈہ تک عار فرار اختیار کرنے پر اعتراض
وارد ہوسکتا ہے۔ مگر یہ ایک ناگزیر امر تھا، شہر اوس وقت
بالکل غیر محفوظ حالت میں تھا یہاں کوئی قلعہ نہ تھا۔ فصیل
شہر تک موجود نہ تھی اوس وقت کی لڑائیاں تسخیر قلاع پر
منحصر تھیں قلعہ لے لیا تو ملک لے لیا۔ اودھر سے افواج شاہی
نشۂ کامیابی میں مست امنڈی چلی آتی تھی، سرحد بیجاپور پر
افواج دکن کے پیر اوکھڑ چکے تھے، ایسا نہ ہوتا تو مقابلہ کی
حسرت باقی رہ جاتی اور چشم زدن میں ملک مسخر ہوجاتا مگر وہ
سکندر بیجاپور پر عالمگیر کی دست درازیاں ابوالحسن سے
دیکھی نہ گئیں، اوس نے عالمگیر کو غیرت دلائی۔ جو سمند ناز
پر تازیانہ کا کام دے گئی ورنہ شاہزادہ سے قیام صلح و اظہار
اطاعت و طلب عفو کے بعد آٹھ ماہ تک صرف اوقات گرامی
کی ضرورت نہ تھی تسخیر قلعہ اور انجام کے پیش نظر ہونے کے
بعد ابوالحسن کے صبر و ثبات اور اطمینان قلب کی کیفیت
عدیم النظیر تھی اور یہ اوس کے روایات زندگی کا ایک قابل
فراموش نظارہ تھا۔ الغرض ابوالحسن رحم دلی و خدا ترسی
استغناء اور ہردلعزیزی میں ممتاز درجہ رکھتا تھا، اور
جوانمرد و مستقل مزاج بادشاہوں کے صف اولین میں اوس
کا شمار کیا جاسکتا ہے، اس وقت تک اوس کے نیکیوں
اور فیاضیوں کی داستانیں دکن میں زبان زد خلائق ہیں
انقراض سلطنت بیجاپور و قطب شاہیہ کے خواہ کچھ ہی وجوہ
کیوں نہ ہوں مگر مابعد کی تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی
ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی یہ حرکت، سیاسی نقطۂ
نظر سے سلطنت تیموریہ کے استحکام میں مفید و موثر ثابت
نہ ہوئی اس لئے کہ ان سلطنتوں کے وجود سے دکن میں مسلمانوں
کی سطوت و حشمت برقرار تھی اور جنوبی ہند میں ان حکومتوں
کی بدولت امن و اماں اور انتظام قائم تھا۔ مرہٹوں پر
اسلام کا رعب و داب تھا، سیواجی سردار مرہٹہ سلاطین
بیجاپور کے ادنیٰ چاکروں میں تھا۔ ان کی بربادی کے
بعد خواص و عام پراگندہ و منتشر ہوگئے، دکن فساد اور
ہنگاموں کا مسکن بن گیا۔ مرہٹوں اور چھوٹے چھوٹے
زمینداروں نے بغاوت اور مطلق العنانی اختیار کی،
جنگی شورشوں کے فرو کرنے کے واسطے عالمگیر کو خود جانا پڑتا
تھا چنانچہ سنہ ۱۶۸۲ء میں عالمگیر تسخیر دکن کے ارادے سے نکلا تھا
مگر تاریخ وفات (۱۷۰۷ء) تک اوس کو دہلی واپس جاکر
چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور خونریز معرکوں ہی میں اوسکی
عمر تمام ہوگئی۔ اورنگ زیب نے اپنی حدود سلطنت کی توسیع
ضرور کی تھی مگر اوسکی بنیادوں کو مستحکم اصول پر قائم نہ کیا تھا
غرض یہ ایسا موضوع ہے جسکے اہم نقاط بحث ایک مستقل مضمون
چاہتے ہیں ؎ شب آخر گشتہ، و افسانہ از افسانہ می خیزد

سید علی اصغر بلگرامی

غذائے نباتات

نباتات کو دو طرح سے غذا پہونچتی ہے۔ اول زمین سے جڑوں کے ذریعے دوم ہوا سے پتوں کے ذریعے۔ اگر زمین سے کافی تقویت پہونچے اور ہوا بقدر وافی اعانت کرے تو درخت شاداب اور پھول پھل پتوں سے ہرا بھرا ہوگا اگر زمین اور ہوا ناموافق ہو یا بقدر حاجت زور نہ پہونچانے تو درخت پژمردہ ہوگا۔ جن عروق یعنے رگوں کے وسیلے سے درختوں کو غذا پہونچتی ہے وہ نہایت درجہ باریک اور نازک ریشوں سے بنے ہوے ہوتے ہیں پس ظاہر ہے کہ ایسی باریک اور نازک راہوں سے جو غذا پہونچتی ہو اوس کے اجزا بیشتر مائع چیزوں پر مشتمل ہونگے۔ مگر چونکہ زمین سخت چیز ہے اس واسطے ضرور ہوا کہ اوسے رطوبت پہونچے۔ تاکہ اوس کے اجزا گھل کر مائعیت پیدا کریں۔ پس زمین کی شادابی اوس کی قابلیت جذب رطوبات پر موقوف ہے۔ زمین اکثر اجزائے ذیل سے مرکب ہوا کرتی ہے۔

(۱) مادۂ ریگی یعنے بالو اور اوس کے اقسام۔
(۲) مادہ گلی یعنے چکنی مٹی اور اوس کے اقسام۔
(۳) مادۂ آہکی یعنے چونے اور کھریا مٹی کی قسمیں۔
(۴) مادۂ آہنی یعنے خبث الحدید کے اقسام
(۵) مادۂ حیوانی۔
(۶) مادۂ نباتی۔

انھیں اجزا کی آمیزش سے زمین پیدا ہوتی ہے مگر کسی زمین میں کوئی جزو زیادہ اور کسی میں کوئی جز و کم ہوتا ہے۔ اگر مادۂ ریگی و گلی و آہکی بہ مقدار مساوی کسی زمین کا جزو اعظم ہو تو وہ زمین نہایت سیر حاصل ہوتی ہے اگر کوئی جز غالب ہو تو اوسی قدر زمین کمزور ہوتی ہے ان اجزاء ستہ میں سے کوئی جزو واحد نباتات کو غذائے کافی پہونچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ کسی مدت تک ایسی زمین میں کوئی درخت سرسبز رہ سکتا ہے کوئی زمین ایسی نہیں پائی گئی ہے جس میں کسی قدر مادۂ ریگی نہ شریک ہو ریگ کی یہ خاصیت ہے کہ زمین کو سبک کردیتی ہے جس سے جڑ کی باریک باریک اونئی نئی رگیں بہ آسانی زمین کے اندر نفوذ کرسکتی ہیں اور نشو و نما پا سکتی ہیں مگر جب یہ جزو بکثرت ملا ہوا ہو تو زمین کم زور ہوجاتی ہے اور جذب و حفظ رطوبت کی صلاحیت اوس میں کم ہوجاتی ہے یعنے ایسی زمین میں پانی بخوبی جذب نہیں ہوتا۔ اور جو جذب بھی ہوتا ہے تو بہت جلد نکل جاتا ہے۔

اجزائے ستہ میں ریگ کی قوت جاذبہ سب سے کم ہے یہ اپنے ربع وزن تک بھی رطوبت جذب نہیں کرسکتی آہکی مادہ اپنے وزن کے برابر جذب کرتا ہے اور اوس کی آمیزش سے زمین کی قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی کثرت سے بھی زمین کو نقصان پہونچتا ہے اور زور گھٹ جاتا ہے

مادۂ گلی ان دونوں سے زیادہ جاذب ہے اپنے وزن سے
ڈھائی گنا پانی جذب کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ سخت مٹی کی
زمین سے جس میں ہل بدقت چلتا ہے اور بڑی محنت اور
بہت کھاد یا پانس کے صرف سے کھیت تیار ہوتا ہے باوجود
ان مشکلوں کے ریگی یا آہکی زمین کی نسبت زیادہ پیداوار حاصل
ہو سکتی ہے کیونکہ ریگی اور آہکی کھیتوں کو ہمیشہ پانس
اور پانی پہونچانا ضرور پڑتا ہے برخلاف اس کے ریتیلی
زمین اگر بخوبی کمائی جائے اور اوس میں کھاد دی جائے تو
اوس کا زور اوس میں بہت زمانہ تک باقی رہتا ہے آہنی مادہ
کما بیش تمام روئے زمین پر منتشر ہے اور ہر قسم
کے کھیت میں تھوڑا بہت پایا جاتا ہے
حیوانی و نباتی مادّہ سب سے زیادہ
جاذب اور حافظِ رطوبات ہے زمین کی سیر حاصل
ہونے کے لئے فقط یہی امر کافی نہیں ہے کہ اجزائے ستہ اوس میں
بمقدار مناسب موجود ہوں بلکہ اون کا باہم ملا ہوا ہونا بھی
ضرور ہے اس کے بغیر زمین میں صلاحیت اس امر کی نہیں
پیدا ہوتی کہ درخت کو قوت پہونچائے اور کسی مدت تک
سرسبز اور شاداب رکھے پس ان اجزا کی آمیزش کی ترکیب
کو بھی کھیتوں کی برائی بھلائی میں بڑا دخل ہے ۔ مٹی کی ڈلی جس قدر
زیادہ باریک اور مجزّا ہوں اوسی قدر قوت جاذبہ زمین کی زیادہ
ہوگی اور اسی قدر زور زیادہ ہوگا کھیت جس قدر کمایا جائے
اور بورا کیا جائے اوسی قدر جڑیں درخت میں سے زیادہ
پھوٹیں گی ۔ رطوبات غذائی کے ذریعہ سے جذب جس قدر
زیادہ ہوگا اسی قدر شبنم کی نمی سے درخت زیادہ فایدہ اٹھا سکیگا
کھیت کتنا ہی زوردار کیوں نہ ہو تھوڑے دنوں کے
متصل جوتنے بونے سے اوس کا زور رہا سہا رہتا ہے اس لئے
پھر اسے پانس ڈال کر زور پہونچانا پڑتا ہے ۔ کس قسم کی
پانس کس وقت کس کھیت میں ڈالنی چاہئے اس کے جاننے
کے واسطے علم فلاحت سے بخوبی ماہر ہونا ضرور ہے سب سے
عمدہ اور ہر جگہ عموماً کام دینے والی وہ پانس ہے جس میں
حیوانی اور نباتی دونوں قسم کے مادے بمقدار
مناسب ملے ہوئے ہوں ۔ انگلستان کے کسان اس قسم
کی پانس بہت تیار رکھتے ہیں پانس سے غرض جبرِ نقصان ہے
یعنے جو جزو ضروری کسی خاص زمین میں نہ ہو یا صرف
ہو گیا ہو اوسے دوبارہ زمین میں ملا دینا تاکہ اوسکی قوت
اصلی عود کر آئے اور چونکہ ہر قسم کے نباتات کی غذا خاص ہے
اس واسطے پانس ڈالنے کے قبل دو باتوں کا دریافت ہونا ضرور
ہے اول یہ کہ وہ خاص زمین کن اجزا سے مرکب ہے اور دوم
یہ کہ اوس میں جس غلہ یا درخت کا بونا منظور ہے اوس کو کس
قسم کی غذا کی ضرورت ہے جب یہ دونوں باتیں معلوم ہو جائیں
اوس وقت کھیت میں پانس ڈالنا یعنے جن اجزا کی اون
میں قلت ہے انھیں بمقدار مناسب پہونچانا آسان اور
حصول منفعت یقینی ہے ۔ اشیائے ذیل سے پانس کا کام لیا
جا سکتا ہے ۔ ریگ ۔ چکنی مٹی ۔ دریا کی مٹی ۔ چونا ۔ ہڈی ۔ کھریا
مٹی ۔ گچ کا کوڑا ۔ مویشی کا فضلہ ۔ مچھلی ۔ کھلی ۔ بوسیدہ
پتے ۔ ہری گھانس ۔ کھیت ۔ مکانات اور کارخانہ جات ۔
اور شہر کے گلیوں وغیرہ کا کوڑا ۔

ریگ یعنے بالو کی قدر و قیمت کسانوں اور باغبانوں کو
بخوبی معلوم نہیں ہے زوردار زمین ایسی کم نکلیگی جس میں ثلث
سے کم ریگ ہو اور بہتیری زمینیں ایسی ہیں جن میں تین

بلکہ ریگ ہوتی ہے سخت اور لس دار زمینوں میں یا ایسی
زمینوں میں جن میں چکنی مٹی یا کھریا مٹی یا مواد نباتی کثرت
ہو تھوڑی سی بالو ملا دینا بہت مفید ہوتا ہے۔ باریک ریگ
چھوٹے اور نازک درختوں کے کاشت کے واسطے خصوصاً
چھوٹے درختوں کی قلمیں لگانے کے واسطے نہایت ضروری ہے
چکنی مٹی اگر ریگی یا کنکریلی زمین یا ایسی زمین میں جس میں
کھریا مٹی زیادہ ہو ملادی جائے تو پانس کا کام دیتی ہے
لیکن چکنی مٹی اگر بہت گہرا گڑھا کھود کر نکالی گئی ہو تو ضرور
ہے کہ قبل کھیت میں ملانے کے کچھ دنوں دھوپ میں پڑی
رہے۔ دریائی مٹی جو تالابوں میں سے یا دریا
کے کناروں سے کھود کر لائی جاتی ہے بہت عمدہ اجزائے
سطح زمین و ریگ باریک و نباتات بوسیدہ سے مرکب ہوتی
ہے جو سیلاب یا بارش سے بہہ کر مجتمع ہو جاتی ہے۔ اپریل
یا مئی کے مہینوں میں اس قسم کی مٹی جس قدر چاہو مل سکتی
ہے۔ کھریا مٹی یا گلی کھیت میں دریائی مٹی فوراً ملادی جاسکتی
ہے مگر پھولوں کی پرورش کے واسطے کونڈوں یا روشوں
میں اور میوہ دار درختوں کی پرورش کے واسطے باغوں میں
ڈالنے کے لئے ضرور ہے کہ یہ مٹی کھدنے کے بعد چند مہینے تک
دھوپ میں پڑی رہے۔ سخت مٹی کی زمینوں کے واسطے
چونا خاص طور پر بہت مفید ہے مگر نرم زمینوں کے واسطے
مفید نہیں ہے آہکی مادہ اس سرزمین میں اس قدر کم ہوتا
ہے کہ چونہ بہ منفعت تمام کھیتوں میں بحساب ۲۰ من فی بیگہ
ڈالا جاسکتا ہے ترکیب اس کے استعمال کی یہ ہے کہ خالص
چونا کھیت کے اوپر پھیلا دیا جائے اور بعد اس کے کھود کر
ہل چلا کر ملا دیا جائے یا اینکہ چونا اول کسی اور پانس کے
ساتھ ملا لیا جائے اور بعد اوس کے کھیت میں ڈالا جائے
دریائی مٹی میں اگر چونا ملا لیا جائے (یعنے من بھر چونے کو
ایک گز مکعب مٹی دی جائے) تو ریگی زمینوں کے واسطے
بہت اچھی پانس تیار ہوتی ہے۔ جس کسی کھیت میں چونا
ڈالنا ہو تو چاہئے کہ اوس کے پڑتے ہی بطریق متذکرہ
کھود کر ملا دیا جائے۔ ہڈیاں چونے اور روغن سے مرکب
ہیں اور بہت عمدہ پانس ہیں۔ کھریا مٹی اور پرانے مکانات
کو کوڑا سخت چکنی زمینوں میں ملایا جائے تو نفع بخشتا ہے
مویشی کا فضلہ یعنے مینگنی گوبر وغیرہ ترکاریوں کی پرورش
میں بہت کام آتا ہے اور گھوڑے کی لید پر اوس کو ترجیح ہے
اس واسطے کہ گھوڑے کی لید کو پہلے سڑانا پڑتا ہے اور مویشی
کا فضلہ فوراً کام میں آسکتا ہے تازی لید ڈالی جائے تو چاہئے
کہ فوراً کھیت کھود کر اوسے ملا دیں اگر سڑا کر ڈالی جائے تو اوسمیں
گھانس اور پیال اور پتے وغیرہ ملا کر سڑانا چاہئے اور تھوڑی
سی تازی مٹی اوس میں ڈالکر سب کو خوب سا ملا کر موٹی
موٹی سی ایک تہ اوس کے کھیت پر پھیلا دینی چاہئے اور
بعد اوس کے کھود کر کھیت میں ملا دینا چاہئے اس ترکیب
سے مقدار پانس کی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ لید کے ملنے
سے اس مرکب کے باقی اجزا میں بھی قوت زیادہ ہو جاتی ہے
مگر یاد رہے کہ گوبر اور مینگنی کا کھیت میں پڑنے سے پیشتر
سڑا لیا جانا کچھ ضروری امر نہیں ہے۔ مچھلی بھی بہت عمدہ
پانس ہے اور ہر قسم کی زمین میں کام آتی ہے۔ مچھلی کو
دریا سے نکلنے کے ساتھ ہی کھیت میں ڈال دینا چاہئے۔
السی کی کھلی بھی خوب چیز ہے یہ نرم مٹی کی زمین میں فی بیگہ
چار من کے حساب سے ڈالی جائے تو بہت فائدہ بخشتی ہے

کھلی کو کوٹ کر بورا کر لیتے ہیں اور کھیت پر پھیلا کر مٹی میں ملا دیتے ہیں۔ یا مثل بیج کے بکھیر کر اوپر سے دانہ بو دیتے ہیں بوسیدہ پتوں سے بہت عمدہ پانس بنتی ہے اس کا مصرف یہ ہے کہ اسے اور قسم کی پانسوں میں ملا کر ایسے کھیتوں میں ڈالتے ہیں کہ جن میں ریگ یا گل یا کھریا مٹی کثرت سے ہو بوسیدہ پتے ریگ کے ساتھ ملانے کے لئے خوب چیز ہیں اور علیٰ ہذا نازک پودھوں کی پرورش کے واسطے زمین کو نرم اور ہلکا کرنے کے لئے بھی نہایت مناسب ہیں۔ پتوں کو جمع کر کے انبار لگا دینا چاہئے کہ پڑے ہوئے سڑا کریں جلانا کبھی نہیں چاہیے۔ جلانے سے نباتات کے وہ خواص بالکل مفقود ہو جاتے ہیں جس پر پانس کا بننا منحصر ہے۔ گھانس بھی سڑنے کے بعد ریگی زمین کے واسطے بہت مفید ہوتی ہے۔ ہری زراعت اگر عین پھولنے کے وقت کاٹ کر کھیت میں ملا دی جائے تو ریگ یا کھریا مٹی کی زمینوں کو بہت فائدہ پہونچاتی ہے کوئی مغز دار کھیتی خوب گھنی بڑھی ہوئی نمو کی حالت میں اچھی طرح کھود کر کھیت میں ملا دی جائے تو زمین کو تقویت بخشتی ہے اگر کھیت مویشی سے چروا دیا جائے تو جو کچھ گوبر یا مینگنی مویشی کی کھیت میں پڑ جاتی ہے اوسمیں قوت بہت زیادہ ہوتی ہے تالاب کی سوار وغیرہ اور دریائے شور کی نباتات سے بھی نہایت زوردار پانس بنتی ہے اس کو کھیت میں کھود کر ملا دیتے ہیں یا پہلے مٹی میں ملا کر کھیت میں ڈالتے ہیں بعد بونے کے جب درخت نمو کی حالت میں ہوں اوس وقت اوسے اوپر اوپر بچھا دیتے ہیں دریائی نباتات خصوصاً پیاز اور پھول گوبھی اور آلو کے واسطے بہت مفید ہے سڑک اور گلی اور بدررو وغیرہ کا کوڑا اور ہر قسم کی جھاڑن بھوڑن جو کسی جا جمع کی جائے اکثر اوقات پانس کے مصرف میں آتی ہے اور بہت قوت دار ہوتی ہے اور ہر قسم کے کھیت میں ڈالی جاتی ہے۔

عماد الملک

عنترہ بن شداد

عنترہ یا ترخیم کر کے عنتر کہو عمرو بن شداؔد کا بیٹا ہے۔ باپ کی طرف سے بنی عبس میں سے ہے ماں اس کی زبیبہ ایک حبشن تھی ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

یقدمہ فتےّ من خیر عبس ابوہ و امّہ من آل حام

گھوڑے کو وہ جوان بڑھا رہا ہے جس کا باپ بہترین بنی عبس میں سے ہے اور ماں آل حام میں سے ہے" عرب میں دستور تھا کہ کنیز کے پیٹ سے جو اولاد ہوتی تھی اُسے غلام بنا لیتے تھے بڑے ہونے کے بعد شجاعت و شرافت کے جوہر اُس میں دیکھے تو فرزند ہونے کا اعتراف کیا نہیں تو وہ غلام کا غلام رہا۔

عنترہ بھی پہلے غلاموں میں شامل تھا اور اس سبب سے طول رہتا تھا۔ ابن کلبی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ بعض قبائل نے بنی عبس کے اونٹ پکڑ لئے۔ ہنکا کر لے چلے تھے کہ بنی عبس تعاقب کرتے ہوے آپہونچے ان لوگوں میں عنترہ بھی تھا دشمنوں نے ایسا سخت مقابلہ کیا کہ مشکل کا سامنا ہو گیا باپ نے پکار کر کہا کرّ یا عنترہ یعنے حملہ کر۔ عنترہ نے جواب دیا العبد لایحسن الکرّ انما یحسن الحلاب والصرّ۔ یعنے غلاموں کا کام اونٹنیوں کا دوہنا اور

اون کے تھنوں کا باندھنا ہے وہ لڑنا کیا جانیں۔
اس کے باپ نے کہا کرّ وانت حُرٌ حملہ کر تو تو آزاد ہے
اُس دن عنترہ کی جنگ آزمائی باپ کو بہت پسند آئی اُس کے
فرزند ہونے کا اعتراف کیا اور اپنے خاندان میں شریک کرلیا۔
بعض مورخ لکھتے ہیں کہ بنی طے بنی عبس کو لوٹنے آئے تھے بہت
سے مردوں کو قتل عورتوں کو اسیر کرچکے تھے عنترہ اپنے اونٹوں
کے قریب گھوڑے پر سوار الگ کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا
اوس کا باپ اُدھر سے گزرا اور حملہ کرنے کو اس سے کہا اُس نے
وہی جواب دیا باپ نے کہا غلام تو نہیں ہے شریف ہے یہ
سنتے ہی دشمنوں پر اکیلا جا پڑا۔ اُسے دیکھکر اور لوگوں کو بھی
جراَت ہوی بنی طے کو شکست دی اور تمام مال غنیمت
اون سے واپس لیا اس سبب سے بنی عبس میں اُس کا شمار ہوا
بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ بنی عبس نے بنی طے کے اونٹ پکڑ لئے
تھے آپس میں تقسیم کرنے بیٹھے تو عنترہ سے کہا تو غلام ہے تیرا
حصہ ہم لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا۔ یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ
بنی طے کے لوگ آکر ٹوٹ پڑے اور عنترہ یہ کہکر الگ ہوگیا کہ
تم شمار میں اون سے کم نہیں ہو اب خود ہی سمجھ لو۔
جب یہاں تک نوبت پہونچی کہ انھوں نے تلواریں مار مار کر تمام
اونٹ اپنے پھر چھین لئے تو باپ نے پکار کر کہا کہ عنترہ کیا دیکھتا
ہے حملہ کر۔ اُس نے جواب دیا کہیں غلام بھی جنگ آزمائی کرسکتے
ہیں اوس نے کہا غلام کوئی اور ہوگا تو اپنا کام کر یہ سنکر عنترہ
نے حملہ کیا۔ جن اونٹوں کے لئے یہ کشت وخون ہو رہا تھا پھر بنی
عبس کے قبضہ میں آگئے۔
شیبانی ذکر کرتے ہیں کہ داحس وغبرا والی لڑائیوں میں ایک بار
بنو عبس شکست کھا کر بھاگے اور بنی تمیم نے تعاقب کیا عنترہ
نے میدان سے پشت نہ پھیری تعاقب کرنے والوں سے لڑتا ہی
رہا۔ قیس ابن زہیر رئیس بنی عبس نے میدان سے واپس آکر یہ کلمہ
کہا کہ خدا کی قسم اسی حبشن والے نے تو آج سب کو بچا لیا اپنے
عنترہ نے بہت برا مانا اور وہ سارا زہر اشعار میں اگل
دیا۔ قیس میں بھی ایک عیب تھا کہ کھانے کا بہت حریص تھا
اس بات پر بھی عنترہ نے طعن کی ہے ؎

انی امرؤ من خیر عبس منصبًا   شطری واحمی سائری بالمنصل

میں ایک طرف سے خاندان بنی عبس کے طبقۂ اعلیٰ میں سے ہوں
اور باقی احوال کو میرے پوچھو تو اس کا جواب میں تلوار سے دیتا ہوں

واذا الکتیبۃ احجمت وتلاحظت   الفیت خیرا من معم مخول

جس وقت سواروں کا قدم نہ اٹھ سکتا تھا اور ایک دوسرے
کی طرف دیکھ رہا تھا تو چچاؤں اور ماموں والے خاندانی
لوگوں سے میں ہی بڑھکر نکلا۔

والخیل تعلم والفوارس انّنی   فرقت جمعہم بضربۃ فیصل

گھوڑے بھی اور سب سوار بھی خوب جانتے ہیں کہ اون کے
مجمع کو میری ضرب فیصل نے متفرق کردیا۔

عین النزول یکون غایۃ مثلنا   ویفر کل مضلل مستوہل

مجھ سے دلیر کے لئے میدان میں اُترنا ہی غایۃ مقصود ہے اور جو
بہکے ہوے ڈرپوک ہیں وہ بھاگ جاتے ہیں۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ   حتی انال بہ کریم الماکل

میں رات رات بھر اور سارے سارے دن فاقہ سے رہتا ہوں
کہ کریمانہ طور سے کچھ کھانے کو ملے تو کھاؤں"
اسی قصیدہ کا یہ شعر خلفا کی محفلوں میں گایا جاتا تھا۔

احذر محل السوء لا تحلل بہ   واذا نبا بک منزل فتحول

بُری جگہ سے حذر کر وہاں قدم ہی نہ رکھ جو مقام تیرے مناسب نہ ہو

اُسے بدل دے"۔

ابن عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عنترہ کا یہ شعر پڑھا "ولقد ابیت علی الطوی الخ" اور فرمایا کہ عنترہ کے سوا کسی بدوی کا ذکر سنکر اس کے دیکھنے کا شوق مجھے کبھی نہیں ہوا۔

خاندان عبس میں داخل ہونے کے بعد اپنے چچا کی بیٹی عبلہ بنت مالک پر فریفتہ ہوگیا۔ اکثر قصیدوں کی تشبیب اسی کے عشق میں ہے، کہتا ہے ؎

ودموع فی الخدود لہا مسیل — وعین نومہا ابداً قلیل

آنسو رخساروں پر بہہ رہے ہیں۔ آنکھ میں نیند بہت ہی کم آتی ہے

فکم ابلیٰ بابعاد وبین — وتشجینی المنازل والطلول

میں کب تک دوری و فراق کے صدمہ میں مبتلا ہونگا مجھے کب تک اس کا مکان اور یہ ویرانہ رنج دیتا رہیگا۔

تلاقینا فما اطفی التلاقی — لہیبا لاولا برد الغلیل

ملاقات ہوئی بھی تو ایسی جس سے شعلۂ غم نہ بجھ سکا اور سوزش دل میں ٹھنڈک نہ پڑ سکی۔

طلبت من الزمان صفاء عیش — وحسبک قدر ما یعطی البخیل

تو فلک سے، اور عیش کا طالب ہے ارے بخیل سے جو کچھ مل جائے وہی بس ہے"

راتوں کو عبلہ کے مکان کی طرف حسرت سے دیکھا کرتا تھا اسی عالم میں یہ اشعار کہے ہیں ؎

ہذہ نار عبلۃ یا ندیمی — قد جلت ظلمۃ الظلام البہیم

ہمنشیں دیکھ وہ عبلہ کے باورچی خانہ کی آگ جس نے اندھیری رات کی اندھیاری کو دفع کر دیا ہے

تتلظی ومثلہا فی فوادی — نار شوق تزداد بالتضریم

کیسی دہک رہی ہے۔ بس اسیطرح میرے دل میں عشق کی آگ ہے کہ کسی کے سلگانے سے سُلگتی چلی جاتی ہے۔

عبلہ جس محلہ میں رہتی تھی اس مقام کو شربہ کہتے تھے۔

ارض الشربۃ تربہا کالعنبر — ونسیمہا یسری بمسک اذفر

زمین شربہ کی خاک ایسی ہی جیسے عنبر ہوا رات کو وہاں چلتی ہے مشک میں بسی ہوئی۔

یا عبل دونک کل حی فاسئلی — ان کان عندک شبہۃ فی عنتر

اے عبلہ تیرے دل میں عنترہ کی طرف سے کچھ شبہہ ہو تو ساری برادری موجود ہے ان سے پوچھ لے۔

یا عبل ہل بلغت یوما اننی — ولیت منہزما بہزیمۃ مدبر

اے عبلہ تونے کبھی سنا ہے کہ شکست اٹھا کر بھاگنے والوں کی طرح میں نے کبھی میدان جنگ سے منہ پھیرا ہے۔

عبلہ ایک صورت دار عورت تھی۔ عمارہ بن زیاد عبسی کا اس پر دل آگیا اس نے بھی عبلہ سے شادی کرنے کا پیام دیا مالک نے اوس کی دولت اور شہرت پر نظر کرکے منظور کر لیا تھا عنترہ کو ناگوار ہوا۔ ایک قصیدہ میں عمارہ سے خطاب کرکے کہتا ہے۔

لقد عادیت یا ابن العم لیثا — شجاعا لایمل من الطراد

اے ابن عم تونے اس شیر ہیجا سے عداوت باندھی ہے جو کبھی لڑائی میں تھکنے والا نہیں"

آخر آپس میں فساد برپا ہونے کے اندیشہ سے یہ نسبت موقوف رہی مگر عنترہ اپنی ماں کی طرح سیاہ فام تھا مالک کو اس حبشی کے ساتھ بیٹی کی شادی کرکے چاند کو گھن لگا دینا منظور نہ تھا اور خود عبلہ اسے جس نگاہ سے دیکھتی تھی اس کا حال بھی عنترہ کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔

ضحکت عبیلۃ اذ رأتنی عاریا — خلق القمیص وساعدی تخدش

میرا پھٹا ہوا قمیص اور ننگی کلائی میں زخموں کا نشان دیکھکر

تب اسکو تو ہنسی آگئی۔

لا تضحکی منی عُبیلۃ و اعجبی　　منی اذا التفّت علیّ جیوش

عبلہ مجھ پر ہنس نہیں تجھے تو مجھ پر تعجب کرنا چاہئے جبکہ تو فوجوں کے نرغہ میں مجھے دیکھے۔

انی لاعجب کیف ینظر صورتی　　یوم القتال مبارزٌ فیعیش

مجھے تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ لڑائی کے وقت میری صورت دیکھ کر حریف زندہ کیونکر رہتا ہے؛

پھر کہتا ہے :- ؎

عجبت عبیلۃ من فتیً متبذل　　عاری الاشاجع شاحبٍ کالمنصل

عبلہ کو تعجب ہوتا ہے اس جوان سے جو مفلس ہے انگلیاں اسکی ننگی بدن اس کا تلوار کی طرح چھریرا۔

شعث المفارق منہج سربالہ　　لم یدّھن حولاً ولم یترجّل

بال پریشان، پیراہن کہنہ، برس دن سے نہ تیل ڈالا ہے، نہ کنگھی کی ہے"

لا یکتسی الّا الحدید اذا کتسیٰ　　وکذاک کلّ مغاورٍ مستبسل

پہنتا ہے تو لباس آہنیں ہی پہنتا ہے ہاں جانبازی و غارتگری جس کا شیوہ ہو وہ انہیں حالوں رہیگا۔

صاحب آغانی لکھتے ہیں عرب کے تین کالے کوّے مشہور ہیں یعنی سبیبہ کا بیٹا عنترہ۔ ندبہ کا بیٹا خفاف سلکہ کا بیٹا سلیک کہ یہ تینوں اغربۃ العرب کہلاتے ہیں۔ کوے نے ایسی کاؤں کاؤں مچائی کہ مالک عبلہ کو لیکر بنی شیبان میں بھاگ گیا یہاں ایک اور رقیب پیدا ہوا۔ رئیس بنی شیبان کا بیٹا بسطام عبلہ کو چاہنے لگا اور عقد کی درخواست کی مالک نے یہ کہہ کر ٹالا کہ پہلے عنترہ کا سر لائے پھر عبلہ کے ساتھ عقد کی درخواست کرے۔ بسطام اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور دیار بنی عبس کی طرف روانہ ہوا ادھر عنترہ بھی قضا کی طرح جا ہی پہونچا راستہ ہی میں تلوار چل گئی، عنترہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جب زمین عبس کو اس نے چھوڑا تو یہ اشعار کہے ؎

فارقت اطلالاً وفیہا عصبتہ　　قد قطعت من صحبتی اطماعہا

میں ان آثار کو چھوڑ کر چلا ہوں جہاں میرے احباب مجھ سے پھر ملنے کی امید قطع کر چکے ہیں

ویلٌ لشیبان اذا صبّحتہا　　وارسلت بیض الظُّبیٰ اشعاعہا

بنی شیبان پر کیا گزرے گی جب میں صبح کو جا کر مزاج پوچھونگا اور تلواروں کی چمکتی ہوئی باڑھیں کوندنے لگیں گی"

پھر بسطام سے کشت و خون ہونے کے بعد ہی شیبان سے خطاب کر کے مالک کی شکایت کرتا ہے ؎

ساق بسطاماً الیٰ مصرعہ　　مالکٌ منہ باذیال الطمع

مالک نے بسطام سے طمع خام کر کے اس کو موت کے منہ میں ڈھکیل دیا

وانا اقصدہ فی ارضکم　　واجازیہ علیٰ ما قد صنع

اب میں تمھاری ہی زمین میں آکر مالک نے جو فتنہ انگیزی کی ہے اوس کا انتقام لونگا"

آخر مالک کو بنی شیبان سے بھی بھاگنا پڑا عبلہ کو ساتھ لیکر بنی کندہ میں چلا آیا یہاں بھی اس کا حسن و شباب اپنا کام کر گیا۔ مسحل بن طراق کندی اس عورت پہ مائل ہوا اور مالک سے شادی کی درخواست کی۔ عنترہ نے جب یہ خبر سنی بسطام کو تو یہیں چھوڑا خود بنی کندہ کی طرف یہ اشعار پڑھتا ہوا روانہ ہوا ؎

الا فاخبر لکندۃ ما تراہُ　　قریباً من قتالٍ مع محاقِ

بنی کندہ کو اس جنگ و تباہی کی خبر کردو جو جلد آنے والی ہے

واوصیہم بما تختار منہم　　فما لک رجعۃٌ بعد التلاقی

اور اونکو جو مناسب سمجھو سمجھا دو کہ مقابلہ ہو جانے کے بعد پھر

گفتگو کی گنجایش نہ رہے گی،،

بنی کندہ کی بستی میں پہنچکر مسحل کو عنترہ نے قتل کیا اور مالک عبلہ کو پھر بنی عبس میں لے آیا۔

عنترہ و عبلہ کے حالات یہاں تک تو مسلسل ہیں لیکن بیروت والوں نے عنترہ کا کلام جمع کرکے جو چھاپا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبلہ کے سبب سے اس میں اور عمرو بن ضمرۃ میں بھی تکرار ہو گئی تھی کہتا ہے ؎

وقد اوعدتنی یا عمرو یوماً — بقول ما لصحتہ دلیل

اے عمرو تو نے مجھے دھمکی دی اور وہ بات منہ سے نکالی جو کسی طرح واقع ہو نہیں سکتی۔

ستعلم اینا یبقی طریحا — تخطفہ الذوابل والنصول

اب تجھے معلوم ہو جائیگا کہ ہم دونوں میں کس کی لاش زمین پر پڑی ہوی ہے اور برچھیاں اور تلواریں ٹکڑے اڑا رہی ہیں،،

ومن تسبی حلیلتہ وتمسی — مفجعۃ لہا دمع تسیل

اور کس کی زوجہ قید کی گئی ہے اور شدت غم سے آنسو بہا رہی ہے

أتذکر عبلۃ وتبیت حیا — ودون خبائہا اسد مہول

تو عبلہ کا نام لیکر زندہ بھی رہ سکتا ہے؟ نہیں جانتا کہ اس کے خیمہ کے قریب ایک ہولناک شیر کا بھی گزر ہے۔

وتطلب ان تلاقینی وسیفی — یدکک لو قعہ الجبل الثقیل

تو مجھے مقابلہ کرنے کو بلاتا ہے اور میری تلوار کو نہیں جانتا کہ اس کی ضرب سے کوہ گران ریزہ ریزہ ہو جائیں۔،،

عبلہ کے عاشقوں میں ایک شخص او روطیفہ بن منیع سعدی اسکے حسن کا شہرہ سنکر اپنے وطن سے بنی عبس میں آیا اور اوس کا خواستگار ہوا ہے عنترہ سے اس سے بھی تلوار چلی ہے کہتا ہے ؎

یا طامعا فی ہلاکی عد بلا طمع — ولا ترد کاس حتف انت شاربہ

اے وہ شخص جسے میرے ہلاک کرنے کی طمع ہے اس طمع کو چھوڑکر پلٹ جا کاسۂ موت کی طرف نہ آ کہ تجھی کو پینا پڑیگا،،

اس کے دیوان میں بعض قصاید کے عنوانوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب مالک نے یہ دیکھا کہ عنترہ سے جان چھڑانا مشکل ہے تو اوس نے کہا کہ اس شرط پر تجھے بیٹی دیتا ہوں کہ اوس کے مہر میں نوق عصافیریہ تو دے سکے یعنے المنذر بادشاہ حیرہ کی سانڈنیاں جو عصافیر المنذر کے لقب سے مشہور ہیں عبلہ کے مہر میں دے۔ عنترہ نے اس شرط کو قبول کرلیا اور عراق کی طرف روانہ ہوا۔ اس سفر کا سارا حال ان اشعار میں بیان کرتا ہے ؎

وخضت بمہجتی بحر المنایا — وسرت الی العراق بلا رفاق

موت کے دریا میں اکیلی جان سے میں اتر پڑا اور عراق کو اس طرح روانہ ہوا کہ کوئی ہمسفر بھی نہ تھا۔

وسقت النوق والرعیان جمعا — وعدت اجد من نار اشتیاقی

میں اکیلا سانڈنیوں کو اور اون کے چرانے والوں کو ہنکالایا اور وطن کی طرف جوش اشتیاق میں مارا مار کرتا ہوا پلٹا۔

وما ابعدت حتی ثار خلفی — غبار سنابک الخیل العتاق

میں ابھی دور نہیں ہوا تھا کہ تازی گھوڑوں کی ٹاپوں سے میرے پیچھے گرد وغبار بلند ہوا۔

وما قصرت حتی کل مہری — وقصر فی السباق وفی اللحاق

میں نے مقابلہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی یہاں تک کہ میرا گھوڑا رہ گیا نہ دوڑ سکتا تھا نہ بھاگ سکتا تھا۔

نزلت عن الجواد وسقت جیشا — بسیفی مثل سوق للنیاق

آخر میں گھوڑے سے اتر پڑا اور جس تلوار سے سانڈنیوں کو ہنکار رہا تھا اسی سے سارے لشکر کو رول لیا۔

وَفِی بَاقِی النَّهَارِ ضَعُفْتُ حَتَّی ‏ ‏ أُسِرْتُ وَقَدْ عَیِیْ عَضُدِیْ وَسَاقِیْ

کچھ دن رہے میری طاقت نے جواب دیا جب ہاتھ پاؤں میں میرے دم نہ رہا تو میں اسیر ہو گیا،،

حیرت ہوتی ہے کہ ایک بدوی جو روکا مہرادا کرنے کے لئے بادشاہ مقتدر کی سانڈنیاں اس طرح تنہا آکر لوٹ لے جائے اور کوئی اُسے روک نہ سکے۔ پھر سیکڑوں سوار اوس کے تعاقب میں یلغار کرتے ہوے جائیں اور تمام دن کے کُشت و خون کے بعد اُسے گرفتار کرکے بادشاہ کے سامنے لائیں۔

المنذر چاہتا تھا کہ اُسے قتل کرکے بنی عبس سے ہمیشہ کی عداوت مول لیتا ہے اس خیال سے عنترہ کو قتل نہ کرسکا۔ زندان میں بھیج دیا یہاں اسے یہ خبر ملی کہ کسی اور شخص نے عبلہ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے ہیں اس صدمۂ دوری و حالت مجبوری کی شکایت قیس بن زہیر سے کرتا ہے اور اُس سے کمک مانگتا ہے

ذَکَرْتُ صَبَابَتِیْ مِنْ بَعْدِ حِیْنٍ ‏ ‏ فَعَادَ لِیَ الْقَدِیْمُ مِنَ الْجُنُوْنِ

ایک زمانہ کے بعد مجھے مشغلۂ عشق یاد آیا اور اگلے جنون نے پھر عود کیا

وَحَنَّ اِلَی الْحِجَازِ الْقَلْبُ مِنِّیْ ‏ ‏ فَهَاجَ غَرَامُهٗ بَعْدَ السُّکُوْنِ

میرے دل میں حجاز کا شوق پیدا ہوا اور تسکین ہو جانے کے بعد اس کا غم پھر تازہ ہو گیا۔

وَنَادَانِیْ عِنَانٌ فِیْ شِمَالِیْ ‏ ‏ وَعَاتَبَنِیْ حُسَامٌ فِیْ یَمِیْنِیْ

عنان فرس جو میرے بائیں ہات میں ہے مجھ سے بیزار ہے اور تلوار جو میرے دہنے ہاتھ میں ہے مجھ سے خفا ہے۔

اَیَاْخُذُ عَبْلَةً وَغْدٌ ذَمِیْمٌ ‏ ‏ وَیَحْظٰی بِالْغِنٰی وَالْمَالِ دُوْنِیْ

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ذلیل نالایق شخص عبلہ کو لے اڑے اور میرے ہوتے مال و منال کا وہ مالک بن بیٹھے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبلہ دولت مند عورت تھی)

وَمَا لِیْ فِی الشَّدَائِدِ مِنْ مُعِیْنٍ ‏ ‏ سِوٰی قَیْسَ الَّذِیْ مِنْهُ یَقِیْنِیْ

اور قیس کے سوا میرا کوئی معین نہیں جس کی ذات پر مجھے بھروسا ہے

اَیَا مَلِکًا حَوٰی رُتَبَ الْمَعَالِیْ ‏ ‏ اِلَیْکَ قَدِ الْتَجَاْتُ فَکُنْ مُعِیْنِیْ

اے بادشاہ بلند مرتبہ تجھی سے میں التجا کرتا ہوں کہ میری کمک کر،،

مجھے یہ نہ معلوم ہوا کہ زندان حیرہ سے یہ خود بھاگ آیا یا بنی عبس نے جاکر چھڑایا مگر یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لشکر عجم سے کئی بار عنترہ سرگرم کارزار ہوا ایک قصیدہ میں کہتا ہے

وَاِذَا الْجُیُوْشُ الْکِسْرَوِیَّةُ بَادَرَتْ ‏ ‏ نَحْوِیْ وَاَبْدَتْ مَا تُکِنُّ ضُلُوْعُهَا

کسریٰ والوں کا لشکر اگر میری طرف بڑھا اور جو عداوت اون کے دلوں میں چھپی ہوی ہے وہ ظاہر کی۔

قَاتَلْتُهَا حَتّٰی تَمَلَّ وَتَشْتَکِیْ ‏ ‏ کَرَبَ الْغُبَارِ رَفِیْعُهَا وَوَضِیْعُهَا

میں بھی اون سے ایسی جنگ کرونگا کہ عاجز آجائیں گے اور ادنیٰ و اعلیٰ گرد و غبار کی کثرت سے چلا اٹھیں گے،،

کسریٰ کے دربار میں بھی ایک اودھ نظم میں عنترہ نے باذخوانی کی ہے۔ آخر تلوار یا زبان کے زور سے منہ مانگی مراد اس نے پائی اور شیریں فرہاد کے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد سے اکثر قصیدے میں یہ لہجہ ہے کہ عبلہ تیرے شوہر نے یہ میدان مارا، تیرے شوہر نے وہ معرکہ سر کیا۔

ایک دن عبلہ نے اس سے کچھ زبان درازی کی۔ یہ بگڑ کر اُس کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا اسی رنج اور غصہ میں یہ اشعار کہے

سَلَا الْقَلْبُ عَمَّا کَانَ یَهْوٰی وَیَطْلُبُ ‏ ‏ وَاَصْبَحَ لَا یَشْکُوْ وَلَا یَتَعَتَّبُ

دل جسے چاہتا تھا اور جس کا طالب تھا اب اس کی طرف سے صبر آگیا اب نہ کچھ گلا ہے نہ خفگی ہے۔

وَقَدْ قُلْتُ اِنِّیْ قَدْ سَلَوْتُ عَنِ الْهَوٰی ‏ ‏ وَمَنْ کَانَ مِثْلِیْ لَا یَقُوْلُ وَیَکْذِبُ

میں زبان سے کہہ چکا کہ میں نے محبت میں صبر کیا اور میں ایسا

شخص نہیں ہوں کہ زبان سے کہوں اور نہ کروں۔

ملقد ذل من امسے علی بنذیل یَنُوحُ علی رَسمِ الدیارِ ویندبُ

ایسے ہی لوگ ذلیل ہوتے ہیں جو عشق کے کوچہ میں دن گزاریں ویران مکانوں کو دیکھکر واویلا کرتے پھریں۔

لقد فاز من بالحرب اصبح حالیاً بطاعن قرناً والغبار مطنبُ

اچھے وہی رہتے ہیں جو میدان جنگ میں حملہ کریں اور جب گرد وغبار بلند ہو تو دشمنوں کو برچھیاں ماریں"۔

ایک معرکہ میں اہل فارس نے عنترہ کو بھی اسیر کر لیا تھا اور عبلہ کو بھی گرفتار کیا۔ عنترہ بیڑیاں پہنے ہوے عبلہ کے تصور میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا اور روتا جاتا تھا۔

یا عبل کم من جحفل فرقتہ والجو اسود والجبال تمید

اے عبلہ میں نے کتنے ہی لشکروں کو پریشان کر دیا جبکہ ہوا تاریک ہو رہی تھی اور پہاڑ جنبش میں تھے۔

فسطا علی الدہر سطوۃ غادر والدہر یبخل تارۃ ویجود

یکایک فلک مجھ سے پھر گیا اور مجھے دغا دی فلک کا یہی حال ہے کہ کبھی دشمن ہو جاتا ہے اور کبھی دوست بن جاتا ہے

لہفی علیک اذا بقیت سبیتہ تدعین عنتر وہو عنک بعید

ہائے افسوس تو اسیر ہو عنترہ کو پکار رہی ہو اور وہ تجھسے دور ہو

فالقتل لی من بعد عبلۃ راحۃ والعیش بعد فراقہا منکود

عبلہ کے بعد قتل ہونے میں مجھے راحت ہے اس سے جدا ہو کر زندگی تلخ ہے"۔

عمرو بن معدی کرب جو صنادید عرب میں بڑا مشہور و معروف شخص گزرا ہے کہا کرتا تھا کہ ہنگام گیرودار کسی شہسوار کی میں کچھ حقیقت نہیں سمجھتا سوا دو آزاد شخصوں کے اور دو غلاموں کے۔ دو آزاد عامر بن طفیل عتیبہ بن الحارث ہیں اور دونوں غلام سلیکہ بن السلکہ اور عنترہ بن شداد ہیں۔

عنترہ سے کسی نے پوچھا کیا تمام عرب میں سب سے زیادہ بہادر تو ہے اس نے کہا ایسا نہیں ہے پوچھا پھر لوگوں میں تیرا نام اس قدر کیوں مشہور ہے۔ اس نے کہا جہاں معرکہ میں بڑھنا ضرور ہوتا تھا وہیں میں بڑھا کرتا تھا اور جہاں رک جانا مناسب ہوتا تھا وہاں میں رک جاتا تھا اور میں کسی ایسے مقام میں نہیں داخل ہوتا تھا جہاں سے نکلنے کی راہ پہلے ہی نہ معلوم کر لی ہو اور میں کمزور و بزدل کو خوب سمجھ لیتا تھا اور ایسا وار اس پر کرتا تھا جسے دیکھکر ایک جیوٹ کا جی چھوٹ جائے پھر دوسری ضرب میں اسے بھی مار لیتا تھا۔

آغانی میں ہے کہ حطیئہ شاعر سے حضرت عمر نے ایک جنگ کے واقعات پوچھے اس نے کہا ہم سب ایک ہزار سوار تھے۔ اور سب کے سب دانا و ہوشیار۔ پوچھا یہ کیونکر ہو سکتا ہے اس نے عرض کی ہم لوگوں میں قیس بن زہیر تھا اور وہ عقلائے روزگار میں سے تھا ہم اس کے خلاف حکم کوئی بات نہ کرتے تھے ہمارے شہسواروں میں عنترہ تھا وہ حملہ کرتا تھا تو ہم بھی اس کے ساتھ حملہ کرتے تھے وہ رک جاتا تھا تو ہم بھی رک جاتے تھے ہم میں صاحب رائے ربیع بن زیاد تھا ہم سب کے سب اس کے مشورہ پر چلتے تھے۔ ہم میں عروہ بن الورد تھا ہم سب اس کے اشعار کی پیروی کرتے تھے۔

عنترہ نے جن جن قبیلوں سے کارزار کی ہے وہ سب یہ ہیں بنی حریقہ۔ بنی عک۔ بنی صباح۔ بنی ضبہ۔ بنی طے۔ بنی جہینہ بنی زبید۔ بنی عامر۔ شعب جبلہ۔ فزارہ۔ خثعم۔ اعاجم۔ ان کے علاوہ مشہور و معروف لڑائیاں یہ ہیں:۔

یوم مصانعہ۔ یوم فروق۔ یوم عراعر۔ یوم اقرن حرب داحس

پھر اس کی تفصیل کوئی دیکھے کہ ہر ہر قبیلہ سے کتنی لڑائیاں
ہوئیں اور ہر ہر لڑائی میں کتنے معرکے پڑے تو اُسے معلوم
ہو جائیگا کہ اس کی ساری عمر جنگ و جدال ہی میں گزری
تلواروں کی چھاؤں میں پلا برچھیوں کے جنگل میں جوان سے
بوڑھا ہو گیا۔ ہزار ہزار آدمی پر تنہا حملہ کرتا تھا جن
میں سیکڑوں نیزہ دار اور قدر انداز بے شمار ہوتے تھے
نہ کوئی برچھی کاری لگی نہ کوئی تیر ترازو ہوا۔ بارہا نرغہ
میں گھرا اور تلوہ نکل آیا۔ نامی پہلوانوں کو چن چن کے
قتل کیا۔ ہزاروں عرب خون کے پیاسے ہی رہے۔"
انتقام کوئی نہ لے سکا۔ ابو عبیدہ اور ابن الکلبی لکھتے
ہیں کہ عنترہ بہت ہی بوڑھا ہو کر مرا کہ حرب و ضرب کی
طاقت اُس سے سلب ہو چکی تھی۔ ضعف پیری سے رعشہ
پیدا ہوا۔ چراغ سحر جھلملانے لگا۔ مگر نہ تیر کی ہوا بجھا سکی
نہ تلوار کی آگ کبھی جلا سکی۔ رات دن موت کا سامنا رہا
خون کے پرنالے چلے۔ زخموں کی بدھیاں پڑ گئیں جتنی
لکھوا کے لایا تھا شیر کے منہ میں اور اژدر کے کلّے میں رہ کر
بسر کر دی۔ نہ اس کی ڈاڑھ گرم ہونے پائی نہ یہ نگل سکا۔
اس کے دل پر جو حالت گزرتی تھی اشعار میں اُس کی
تصویر کھینچ کر دکھا دیتا تھا۔ اس کی مثالیں میں لکھ آیا
قیس رئیس خاندان تھا اُس کی شکر گزاری کی بھی تو کلمۂ
توہیں کے ساتھ اس کو ملال ہوا تو آپ نے دیکھا کہ کیسی
کھری کھری سنائی۔ عبلہ کے عشق میں اضطراب کی حالت
کیونکر بیان کی ہے رشک کے مضامین کیسے شمشیر برہنہ
معلوم ہوتے ہیں۔ عمرو بن ضمرہ سے کیسی جلی کٹی کہی ہے
المنذر کے زندان میں اشتیاق وطن کن لفظوں میں ظاہر
کیا ہے عبلہ سے جب خفا ہو گیا ہے تو خفگی کی تصویر کیا خوب
کھینچی ہے عبلہ کے قید ہو جانے سے دل پر جو قلق گزرا ہے
وہ آنکھوں سے اُس نے دکھا دیا ہے یہ سب مضمون جنکے
طرز بیان کے کچھ نمونے بھی اوپر گزرے اصل میں الگ الگ
ہیں مگر عنترہ نے ان سب کو واقعات لشکر کشی و غارتگری
ولاف زنی کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اس کی ہر نظم سے یہی
معلوم ہوتا ہے کہ جوش شجاعت و شمشیر زنی کا بیان گویا
عرب کی شاعری میں ضروریات شعر سے ہے جس طرح اردو
فارسی میں لکھنے والے مضامین عاشقانہ کو ضروریات غزل
میں سے سمجھتے ہیں۔ زہیر کے قتل ہونے سے اس کو جو قلق ہوا ہے
چند شعر اُس کے مرثیہ میں کہے ہیں۔

ثَوَیٰ زُہَیرٌ وَالمَقَانِبُ حَولَہٗ　　قَتِیلاً وَاَطرَافُ الرِّمَاحِ الشَّوَاجِرِ

زہیر قتل ہو کر چل بسا اور سوار اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ اور
برچھیاں چل رہی تھیں۔

وَکَانَ اَجَلَّ النَّاسِ قَدراً وَّمَغداً　　اَجَلَّ قَتِیلٍ زَارَ اَہلَ المَقَابِرِ

زندوں میں وہ جلیل الشان تھا اور جو گئے کہ بزم خاموشاں
میں پہونچے ہیں اون میں بھی وہ جلیل الشان رہا۔

فَوَا اَسَفَا کَیفَ اشتَفیٰ قَلبُ خَالِدٍ　　بِتَاجِ بَنِی عَبسٍ کِرَامِ العَشَائِرِ

ہائے افسوس خالد نے اپنا دل کیونکر ٹھنڈا کر لیا اُسے قتل
کیا جو بنی عبس بزرگان قبائل کا سر تاج تھا۔

وَکَیفَ اَنَامُ اللَّیلَ مِن دُونِ ثَارِہٖ　　وَقَد کَانَ ذُخرِی فِی الخُطُوبِ الکَبَائِرِ

اس کا انتقام جب تک نہ لوں مجھے راتوں کو کب نیند آ سکتی
ہے وہی تو مشکلوں اور مصیبتوں میں میرا سہارا تھا۔"
جوش انتقام میں خالد کا سر لینے جا رہا ہے اور دن کی تپش
ریتی کا پتنا۔ راتوں کی اندھیاری۔ راہ کی دشواری و درندوں

کا سامنا یہ سب مصیبتیں اُسے لذت انتقام کے آگے ہیچ معلوم ہورہی ہیں ؎

اطوی فیافی الفلا واللیل معتکر　　واقطع البید والرمضاء تستعر

ویرانوں کو میں طے کر رہا ہوں اور رات تاریک ہے اور میدانوں کو قطع کر رہا ہوں اور تپتی ہوئی زمین وہاں اٹھی ہے۔

ولا اری مونسا غیر الحسام وان　　قل الاعادی غداۃ الروع او کثروا

جنگ کے وقت دشمن کم ہوں یا زیادہ تلوار کے سوا تو مجھے کوئی رفیق نہیں دکھائی دیتا۔

فحاذری یا سباع البر من رجل　　اذا انتضی سیفہ لا ینفع الحذر

جنگ کے جانورو اُس شخص سے بچ کر چلو جو تلوار کھینچ لیتا ہے تو پھر بچنا مشکل ہوجاتا ہے۔

ما خالد بعد ما قد سرت طالبہ　　بخالد لا ولا الجید ا ذ تفتخر

میں خالد کی فکر میں نکلا تو خالد اب نہیں بچ سکتا اور جیداء اب نہیں فخر کرسکتی (شاید اُسکی عورت کا نام جیداء ہے)

ولا دیارہم بالاھل آنسۃ　　یاوی الغراب بہا والذیب والنمر

اُن لوگوں کے گھر اب نہیں آباد رہ سکتے چیل کوے اُس میں بسیں گے اور کُتے لوٹیں گے“

خالد کو جب قتل کرچکا تو جوش سرور میں کہتا ہے ؎

وخالد قد ترکت الطیر عاکفۃ　　علی دماہ وما فی جسمہ رمق

میں خالد کو اس حالت میں چھوڑ آیا ہوں کہ گدھ اور کوے اُس کے گرد جمع تھے اور جسم میں ذرا بھی جان نہ تھی۔

ولی جواد لدی الہیجاء ذو شغب　　یسابق الطیر حتی لیس یلتحق

میرا گھوڑا میدان جنگ میں ہل چل ڈال دیتا ہے پرندے سے شرط بد کر دوڑتا ہے اور وہ اسے نہیں پا سکتا۔

ولی حسام اذا ما سل فی رھج　　یشق ہام الاعادی حین تمتشق

میری تلوار گرد و غبار میں جہاں چمکی پھر چلتی ہے تو دشمنوں ہی کے سروں ہی پر چلتی ہے۔“

ایک زمانہ میں عنترہ بنی عامر میں جا کر رہا تھا اور اپنی قوم والوں سے خفا تھا۔ انھیں دنوں میں ہوازن و جشم نے بنی عبس سے لڑائی چھیڑ دی۔ قیس بن زہیر نے عنترہ کو لاکھ لاکھ بلایا مگر یہ بگڑا ہی رہا نہ آنا تھا نہ آیا۔ ادھر دشمنوں نے حد سے زیادہ دبانا شروع کیا۔ آخر قیس کی بیٹی جا نہ شرفائے بنی عبس کی اور عورتوں کو بھی ساتھ لیکر عنترہ کے پاس آئی اور یہ کہا کہ اگر تو اب بھی الگ رہا تو دیکھ بنی عبس تباہ ہوجائیں گے۔ اُس خاتون کا خود لینے کو آنا اور قوم کی تباہی کا حال اُس کی زبان سے سننا کافی تھا۔ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور دیار بنی عبس کی طرف روانہ ہوا اور کچھ اشعار کہے

سکت فغر اعدائی السکوت　　وظنونی لاھلی قد نسیت

دشمن اس بھلاوے میں تھے کہ میں خاموش ہی رہوں گا سمجھتے تھے کہ میں اپنے عزیزوں کو بھول ہی گیا۔

وکیف انام عن سادات قوم　　انا فی فضل نعمتہم ربیت

میں اُن سادات قوم سے کب غفلت کرسکتا ہوں انھیں کا تو پروردہ نعمت ہوں میں۔

وان دارت بہم خیل الاعادی　　ونادونی اجبت متی دعیت

اگر دشمن اُن پر حملہ کریں اور وہ مجھ سے کمک چاہیں تو جس وقت مجھے پکاریں گے میں حاضر ہوں گا۔

بسیف حدہ موج المنایا　　ورمح صدرہ الحتف المیت

وہ تلوار لئے ہوئے جس کی باڑھ میں موت کی لہر ہے اور وہ برچھی جس کا پھل مارہی ڈالتا ہے۔“

ایک زمانہ میں بنی عبس ذبیان کا ساتھ چھوڑ کر بنی سعد کے

جوار میں چلے گئے تھے اُن سے دوستی و اعانت کا عہد و پیمان
بھی ہو گیا تھا عبس کے پاس اونٹ اور گھوڑے بہت ہی نایاب
تھے انھیں دیکھکر بنی سعد کا جی للچایا چاہتے تھے کہ دغا کریں
اور اون سے سب اونٹ اور گھوڑے اور عورتیں چھین
لیں قیس بن زہیر اُن کی بدنیتی کو تاڑ گیا پھر اور لوگوں سے
بھی کچھ خبر معلوم ہوی آخر بنی عبس میں تشویش پھیل گئی قریب
تھا کہ اُن کے اضطراب سے کام بگڑ جائے یہ دیکھکر قیس نے حکم
دیا کہ ابھی سب خاموش رہیں رات جب ہوی تو اُس نے دیگوں
میں آگ سلگوادی اور کچھ برتنوں میں پانی بھروایا اور ٹہنیوں
میں لٹکوادیا پھر سارے قبیلے کو ساتھ لئے ہوے راتوں رات
وہاں سے نکل گیا۔ بنی سعد آگ کے دہکنے کی روشنی دیکھ رہے
تھے پانی کے ٹپکنے اور شعلوں کے لپکنے کی آوازیں سن رہے تھے
انھیں اطمینان تھا کہ سب لوگ موجود ہیں کھانا پک رہا ہے
صبح ہوی تو معلوم ہوا کہ شکار جال سے آکر نکل گیا فوراً گھوڑے
کسوائے ہتیار لگائے اور تعاقب میں روانہ ہوے عبس
والے وادی فروق تک پہنچے تھے کہ سعد کے سواروں نے
راستہ روکا اب لڑنے کے سوا کیا چارہ تھا بنی عبس بھی اُن سے
دست و گریباں ہو گئے۔ دونوں طرف سے آگ بھڑک اٹھی
تلواروں کے شعلے ابھی لپک رہے تھے۔ سنانوں کی چنگاریاں
اڑ رہی تھیں کہ لڑتے لڑتے رات ہو گئی آخر بنی عبس غالب
آئے اور حریف شکست اٹھا کر شب تاریک میں ٹھوکریں کھاتے
ہوے بھاگے اس جنگ میں عنترہ نے بڑا نام کیا اور چند
اشعار بھی کہے ؎

اَلَا قَاتَلَ اللهُ الطُّلُولَ الْبَوَالِيَا   وَقَاتَلَ ذِكْرَاكَ السِّنِينَ الْخَوَالِيَا

خدا غارت کرے کوچۂ عشق کی راہوں کو اور گزرے ہوے
زمانہ کی یاد کو۔

وَقَوْلَكَ لِلشَّيْءِ الَّذِي لَا تَنَالُهُ   إِذَا مَا هُوَ احْلَوْلَى أَلَا لَيْتَ ذَا لِيَا

میٹھی چیز دیکھکر جو نہ مل سکتی ہو آفت پڑے تیرے کہنے پر کہ کاش
مجھے مل جائے۔

وَنَحْنُ مَنَعْنَا بِالْفَرُوقِ نِسَاءَنَا   نُطَرِّفُ عَنْهَا مُشْعِلَاتٍ غَوَاشِيَا

اُن فوجوں کو جو چاروں طرف پھیلی ہوی حملے کر رہی تھیں ہم نے
پسپا کر کے اپنی عورتوں کو میدان فروق میں بچا لیا۔

تاریخ میں ہے کہ عنترہ نے جنگ فروق میں معاویہ بن نزال کو قتل
کیا اور اس کے قتل کا حال معلقہ میں نظم کیا ہے۔ مگر معلقہ میں
اُس نے کئی شخصوں کے قتل کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

وَحَلِيلِ غَانِيَةٍ تَرَكْتُ مُجَدَّلًا   تَمْكُو فَرِيصَتُهُ كَشِدْقِ الْأَعْلَمِ

کسی سہاگ والی عورت کے شوہر کو پھڑکتا ہوا میں نے چھوڑا
اُس کے پہلوؤں کے زخموں سے اس طرح ہوا نکل رہی تھی
جیسے کسی ہونٹ کٹے کی باچھوں سے نکلتی ہے۔

وَمُدَجَّجٍ كَرِهَ الْكُمَاةُ نِزَالَهُ   لَا مُمْعِنٍ هَرَبًا وَلَا مُسْتَسْلِمِ

کوئی شخص اوپچی بنا ہوا جس کے مقابلہ میں دلیر جی چرائیں جو بھاگتا
بھی زیادہ نہیں اور دبنے والا بھی نہیں۔

جَادَتْ لَهُ كَفِّي بِعَاجِلِ طَعْنَةٍ   بِمُثَقَّفٍ صَدْقِ الْكُعُوبِ مُقَوَّمِ

میں نے جلدی سے ایک وار اس کی نذر کر دیا اُس نیزہ کا وار
جسکی پوریں سخت، جس کے بل نکلے ہوے جو سدھا کیا ہوا تھا

فَتَرَكْتُهُ جَزَرَ السِّبَاعِ يَنُشْنَهُ   يَقْضِمْنَ حُسْنَ بَنَانِهِ وَالْمِعْصَمِ

آخر درندوں کا طعمہ بنا کر میں نے اُسے چھوڑا جانور اس کی طرف
بڑھ رہے تھے کہ انگلیاں اور کلائی اُس کی نوچ لیں۔

وَمِشَكِّ سَابِغَةٍ هَتَكْتُ فُرُوجَهَا   بِالسَّيْفِ عَنْ حَامِي الْحَقِيقَةِ مُعْلِمِ

ایک مشہور حامی قوم کی جیبت دامن وار زرہ کے حلقوں کو

تلوار سے میں نے چاک چاک کر دیا۔

لما رآنی قد نزلت اریدہ ابدی نواجدہ لغیر تبسم

جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے ارادے سے گھوڑے پر سے اترا ہوں تو دانت نکوس دئے اور ہنسی کا وہ محل نہ تھا۔

فطعنتہ بالرمح ثم علوتہ بمہند صافی الحدیدۃ مخذم

پہلے میں نے ایک برچھی اسے ماری پھر شمشیر ہندی کھینچے ہوئے اس پر جا پڑا۔

لما رأیت القوم اقبل جمعہم یتذامرون کررت غیر مذمم

جب میں نے دیکھا کہ دشمن للکار رہے ہیں تو ایسا حملہ کیا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

یدعون عنتر والرماح کانہا اشطان بیر فی لبان الادہم

لوگ عنترہ عنترہ کہہ کر پکار رہے تھے اور میرے گھوڑے کے سینہ میں برچھیاں اس طرح اتر رہی تھیں جیسے کنوئیں میں رسی جاتی ہے

ولقد شفی نفسی واذہب سقمہا قیل الفوارس ویک عنتر اقدم

شہسواروں کے پکارنے سے کہ اے عنترہ حملہ کر میرا دل خوش ہو گیا اور ساری کوفت جاتی رہی۔"

ہم نے عبلہ کو زندان فارس میں چھوڑا تھا اس کے بعد پھر کچھ اس کا حال نہ معلوم ہوا ہاں عنترہ کے دیوان میں چند اشعار شکایت پیری کے عنوان سے پائے گئے اس میں عبلہ کا ذکر ہے ؎

ذنبی لعبلۃ ذنب غیر مغتفر لما تبلج صبح الشیب فی شعری

عبلہ میرا گناہ کبھی نہ معاف کریگی کہ پیری کی صبح میرے بالوں میں نمودار ہو رہی ہے۔"

خدا جانے یہ خود کیونکر قید سے چھوٹا اور کیا آفتیں برپا کر کے عبلہ کو چھڑایا اس شعر سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک دونوں کی نبھ گئی۔

اس کے قتل کا سبب صاحب آغانی نے یہ لکھا ہے کہ عہد پیرانہ سالی میں بنی نبہان کو لوٹنے گیا تھا۔ کسی نے ایک تیر ایسا مارا جو اس کے فقرات پشت پر پڑا اور پکار کر کہا کہ میرا نام ابن سلمی ہے استخوان پشت ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے بنی عبس میں پہونچا۔ اکثر شاعروں کا ذکر سنا ہے کہ مرتے وقت بھی دو ایک شعر انھوں نے کہے ہیں۔ عنترہ جب زخمی ہو کر اردٹی الوں میں پہنچا تو یہ تین شعر پڑھے ؎

وان ابن سلمی عندہ فاعلموا دمی وہیہات لا یرجی ابن سلمی ولا دمی

سن رکھو کہ میرا خون ابن سلمی پر ہے۔ ہیہات نہ ابن سلمی کے ملنے کی امید ہے نہ انتقام کی۔

اذا ما تمشی بین اجبال طیء مکان الثریا لیس بالمتہضم

جب وہ کوہستان بنی طے میں پہاڑوں ہی پہاڑوں آسمان تک پہونچ جائیگا تو پھر اترنے والا نہیں۔

رمانی ولم یدہش بازرق لہذم عشیۃ حلوا بین نعف ومخرم

جس دن شام کے وقت دامن کوہ و درۂ کوہ کے درمیان لوگ اترے مجھے اس نے تیر مارا اور برچھی کے پھل سے کام نہیں لیا"

ابن الکلبی نے قاتل عنترہ کا نام اسد رہیص لکھا ہے۔ شیبانی لکھتے ہیں جنگ میں وہ گھوڑے سے گر پڑا تھا ضعیفی کے سبب سے پھر اٹھ کر سوار نہ ہو سکا۔ دشمن کو اس کے گرفتار کرنے کی تو جرات نہ ہوی دور سے تیر مار کر اسے قتل کر ڈالا۔ ابو عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ شرج و ناظرہ کے درمیان جو میدان ہے وہاں اسے لو لگ گئی تھی اسی سے مر گیا۔

عنترہ بن شداد کی داستان چھ دفتروں میں شیخ یوسف مصری نے عربی میں لکھی ہے مگر داستان حضرت حمزہ کی طرح وہ سب کہانیاں ہیں جو قابل اعتنا نہیں۔ تاریخ

میں اُس کے سوانح عمری بہت کم پائے جاتے ہیں۔ آغانی میں دو ورق سے زیادہ اُس کے حالات نہیں ہیں۔ اکثر واقعات جو میں نے لکھے ہیں وہ اُس کے دیوان کے مطالعہ سے اور قصائد کے عنوانوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں اور اس میں بھی جو واقعات مجھے دلچسپ معلوم ہوئے وہی چُن لئے ہیں اسکے ضمن میں اس کے کلام کی سادگی اور جوش طبع کی تحریک سے شعر لکھنے کا انداز بھی اہل ہند کو دکھانا مجھے مقصود تھا کہ اونکو اسکی بہت ضرورت ہے اور آج کل اسی طرز سخن کی طرف اکثر اہل قلم متوجہ ہیں فقط

علی حیدر طباطبائی

چین کی عورتیں

(لیڈی بلیک کے مضمون مطبوعہ نینٹینتھ سنچری کا ترجمہ)

اہل یورپ عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ چین میں عورتوں کی حالت بہ مقابل ان کی مغربی بہنوں کے بہت ادنیٰ ہے بسا اوقات ہم لوگ مطابقت اور مساوات میں امتیاز نہیں کرتے حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک چینی خاتون اور اسی درجہ کی ایک یورپی خاتون کے طرز زندگی کے اکثر ابواب میں بیّن فرق ہوتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس باہمی فرق کے باعث چین کی عورتوں کی حالت ادنیٰ و ذلیل ہو حقیقت تو یہ ہے کہ بعض امور میں چینی خواتین کو تفوق حاصل ہے بچوں پر چین کی عورتوں کا اقتدار مقابلۃً بہت زیادہ ہے باپ کے وفات پا جانے کی صورت میں ماں سارے خاندان کی سردار تسلیم کی جاتی ہے چینی فرزند کے اس خیال تک سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ماں کو اُس مکان سے جو سالہا سال تک اُس کا رہا ہے بے دخل کر کے ایک حقیر مکان میں جو جہیز میں اسے ملا ہو بھیجدیں اور پہلے مکان پر اپنی بیوی کے ساتھ خود قابض ہو جائیں مگر عام طور پر یورپی بیواؤں کو اس کا تجربہ ضرور نصیب ہوتا ہے۔ اس قسم کی کوئی حرکت چین میں سخت ناخلفی و نالایقی سمجھی جاتی ہے اور کپوت یا ناخلف کہلانا بڑی رسوائی اور ذلت میں داخل ہے افسروں اور عہدہ داروں کی بیویوں کو اس بات کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے تمام تمغوں اور نشانوں کو جو ان کے عہدوں سے متعلق ہوں خود بھی استعمال کریں۔ ان کی جاکٹوں پر وہی زردوزی امتیازی علامتیں بنی ہوتی ہیں اور ان کے گلوں میں وہ گلوبند ہوتے ہیں جو ان کے شوہروں کی خدمات سے مخصوص ہیں۔ نئے سال کی بڑی تعطیل کے زمانہ میں شاہی مہر ان ہی کی تحویل میں رکھدی جاتی ہے۔

چین میں والدین کی حکومت و اختیار اولاد پر بے انتہا ہوتی ہے خود وہاں کا قانون اس کا بہت بڑا ممد و معاون ہے اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے والدین یا والدین کی شان میں کوئی بدزبانی کرے۔ اور ماں باپ اس کی شکایت کسی عدالتی

عہدہ دار کے پاس کریں اور یہ بیان کریں کہ انھوں نے خود اپنے کانوں وہ بدکلامی سنی ہے تو ایسا مجرم گلا گھونٹ کر مار ڈالے جانے کا سزاوار ہوتا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ چینی رشتہ دار اس قانون کی پناہ لینے سے اسی قدر پیچھے ہٹتے ہیں جتنا کہ کسی اور ملک کے لوگ کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شادی بیاہ کے معاملہ میں لڑکیوں کو اپنے آیندہ شوہر کے انتخاب میں کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ خود لڑکوں کو بھی اپنی بیوی منتخب کرنے میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ جیسا کہ عموماً آئرلینڈ میں ہوتا ہے مشاطہ عورتیں شادی بیاہ کا معاملہ طے کرتی ہیں خدا پر اس کو نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ ماں باپ اپنی لڑکی کا شوہر پسند کرنے میں صرف مال و دولت ہی کا لحاظ نہیں کرتے ہیں یہ نہایت ضروری امر ہے کہ دولہا اور دولہن کے خاندانی نام خواہ ان دونوں میں کوئی خون کا رشتہ نہ ہو بالکل الگ ہونے چاہئیں حساب کیا گیا ہے کہ چین میں چار ہزار چھ سو سے زیادہ خاندانی نام رایج ہیں ایک ہی خاندانی نام کے تمام لوگ کسی نہ کسی طرح باہمی رشتہ دار سمجھے جاتے ہیں لی نامی کسی شخص سے اگر کوئی دوسرا اجنبی جس کا خاندانی نام بھی لی ہو کسی دور دراز کے صوبہ سے مدد کی درخواست کرے تو وہ فوراً اس کے حق کو تسلیم کر لیگا۔ اسی طرح کسی "کانگ" یا "ما" سے کوئی دوسرا "کانگ" یا "ما" جو ایک دوسرے کو نہ جانتا ہو اگر اعانت طلب کرے تو انکار کی گنجایش نہیں ہوتی۔ ایک ہی خاندانی نام رکھنے والوں کے درمیان شادی بیاہ صرف رسم و رواج ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس ملک کا قانون بھی یہ حکم دیتا ہے کہ:-

"جب کبھی ایسے اشخاص جن کی کنیت یا خاندانی نام ایک ہی ہوں آپس"
"میں شادی کریں تو فریقین اور بیاہ کا معاملہ ٹھہرانے والا ہر ایک کو ساٹھ"
"کوڑے لگائے جائیں گے اور نکاح منسوخ ہو جائیگا۔ دولہا دولہن کو"
"الگ کر دیا جائیگا اور شادی کے تحایف وغیرہ سرکار ضبط کر لیگی"

شاذ و نادر ہی اس قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے شادی کے تمام ذمہ داریاں والدین اور پیشہ ور مشاطاؤں سے وابستہ ہوتی ہیں مشاطہ عورتیں ہوتی ہیں اور بہت تعجب کی تو یہ بات ہے کہ ان کا شمار ان نو پیشہ ور عورتوں میں ہوتا ہے۔ جو عام طور پر بدنام ہیں۔ دوسری پیشہ ور عورتیں یہ ہیں بدھ اور تاؤ سٹ پیراگنیں جادوگرنیاں شیاطین کے عمل کرنے والیاں دلالہ عورتیں نقال عورتیں طبابت کا پیشہ کرنے والیاں اور دائیاں۔

یہ سچ ہے کہ جب تک ساس اور سسر زندہ ہیں بہو انکی محکوم ہوتی ہے انگلستان میں بھی عموماً ساس کو کوئی مہربانی و محبت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ دوسری اقوام کی طرح چین کی عورتیں بھی خیالات و جذبات میں انسان ہیں اس لئے بعض دفعہ باوجود تمام سخت آسمانی قوانین و آداب کے ساس اور بہو کے تعلقات بہت خوشگوار نہیں ہوتے۔ ہم سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عادت طبیعت ثانیہ ہوتی ہے جو باتیں ہم کو ناممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں وہی عادت نے چین میں ممکن بنا رکھی ہیں۔ لہذا اکثر و بیشتر چین کی ساسوں اور بہوؤں میں لطف و یگانگت کے تعلقات قایم رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ نہایت محبت کے ساتھ بسر کرتی ہیں دوسرے بعض تعلقات کی طرح ان میں بھی وہی طبیعتیں کامیاب ثابت ہوتی ہیں جن میں تحمل اور رواداری کی صفت موجود ہے

ایک تنک مزاج ترش رو اور مغلوب الغضب عورت ہمیشہ ناپسندیدہ
ساس ہوتی ہے اسی طرح خود غرض سرکش زود رنج اور ہٹیلی
لڑکی اپنی ساس اور سسر کی زندگی تلخ کر دیتی ہے عام طور پر
دلھن کا نہایت کمسن ہونا خود زیادہ تجربہ کار رشتہ داروں
کے ساتھ مل کر رہنے کو ضروری کر دیتا ہے۔ متوسط درجہ کے
لوگوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کی مائیں اپنی بہوؤں
کی اپنے ہی ہاں پرورش اور تربیت کرتی ہیں اور ان کو
گھر کے کاروبار سے واقف بناتی ہیں بعض باتوں میں چین کی
مزدوری پیشہ عورتیں اسی درجہ کی انگریزی عورتوں سے بہتر
حالت میں ہوتی ہیں۔ ہر چینی بھلا آدمی عورت کو لات مارنے
یا اُس پر ہات اٹھانے کو حد سے زیادہ ناشایستہ اور نامعقول
حرکت تصور کرتا ہے کسی نقال یا بازیگر کا اپنی ماں پر جھپٹنا
انگلستان میں دل لگی کا ایک معمولی سوانگ سمجھا جاتا ہے لیکن
چین میں اس قسم کے مذاق و خوش طبعی سے لوگ کانپ اٹھیں گے
اور ایسی گستاخانہ دل لگی کی نقل سے انھیں بے انتہا نفرت
ہو گی۔ یہ سچ ہے کہ چین کی عورتیں کچھ ایسے ادب قاعدہ میں
گرفتار رہتی ہیں کہ بادی النظر میں اہل انگلستان اس کو
ناقابل برداشت خیال کرتے ہیں مگر خود اہل انگلستان بھی
اسی طرح ادب قاعدہ کے پابند ہیں اور اس کی پوری طرح
عادی ہونے کے باعث کسی سختی کو وہ محسوس نہیں کرنے پاتے
لیکن ان آداب سے انحراف پابند و عادی طبیعتوں کو
ضرور صدمہ پہونچاتا ہے اس سے یہ بات بخوبی ذہن نشین
ہو جاتی ہے کہ ایسی پابندی نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے
چین میں از روئے قانون ایک ہی بیوی جائز ہے۔
اس کو "کٹ فیاٹ" کہتے ہیں اور صرف اسی کو سرخ محافہ
میں شوہر کے مکان پر جانے کا حق ہے۔ اسلاف پرستی کی ضرورتوں
کے سبب دو ایک یا اس سے زیادہ بیویوں یا داشتاؤں کا بھی
رواج ہو گیا ہے ہر چینی تو اس پر کاربند نہیں ہے لیکن بالعموم
ایسا ہی ہوتا ہے۔ زوجہ ثانی کی موجودگی۔ خانہ داری کی خوش
نظمی میں کبھی کوئی اضافہ نہیں کرتی بعض لوگ ان عورتوں کو
علیحدہ مکانوں میں رکھتے ہیں جو شوہر اپنی بیویوں کو الگ
الگ رکھنے کا انتظام کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ایک
ہی مکان کے مختلف حصے ان کو دیدیتے ہیں۔ ان تمام دوسری
بیویوں کے بچوں کے بھی وہی مراتب ہوتے ہیں جو "کٹ فیاٹ"
کی اولاد کے ہوتے ہیں یہ سب بچے "کٹ فیاٹ" کو ماں کہہ کر
پکارتے ہیں اور اپنی حقیقی ماؤں اور باپ کی دوسری بیویوں
کو چچی کہتے ہیں جب کوئی لڑکا شادی کرتا ہے تو وہ اور اس کی
دلہن صرف باپ اور "کٹ فیاٹ" ہی کی "کوٹو" کرتے ہیں
اور ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر تمام مراسم ادا کرتے
ہیں یہ کوئی ضروری نہیں کہ "کٹ فیاٹ" اس کی حقیقی ماں
ہو۔ آبا و اجداد کے فاتحہ وغیرہ کے مراسم کی ادائیگی کی
غرض سے "کٹ فیاٹ" کو بھی لڑکے کی اتنی ہی ضرورت ہے
جس قدر کہ اس کے شوہر کو۔ لہٰذا جب پہلی بی بی کے کوئی بچہ
نہیں ہوتا ہے تو بعض دفعہ خود وہ اس بات پر اصرار کرتی
ہے کہ اس کا شوہر ایک دوسری بیوی کرے تاکہ لڑکے کی
آرزو پوری ہو سکے۔

چینی بچوں کی تربیت کی مستند اور منظوم کتاب کی بموجب شیرازہ
تمدن کی مضبوطی و قیام کے لئے تین چیزوں کی سخت ضرورت
ہے جو یہ ہیں:۔

بادشاہ و رعایا میں مہربانی و عقیدت۔ باپ اور اولاد میں

باہمی محبت و الفت اور بیوی اور شوہر میں موافقت زوجہ ثانی کے باعث اس میں شک نہیں کہ میاں بیوی کی باہمی محبت و موافقت میں فرق آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک چینی ضرب المثل میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے جو یہ ہے:۔

"ایک کنجی سے آواز نہیں ہوتی لیکن دو کنجیاں جھنکار پیدا کرتی ہیں"

خاندان کا جو کچھ وقار۔ اہمیت اور منزلت ہوتی ہے وہ سب "کٹ فیاٹ" کا حصہ ہے چونکہ "کٹ فیاٹ" کا انتخاب کرنے میں شوہر کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے اگر وہ اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو وہ عموماً اپنی پسند کی ایک دوسری بیوی کر کے اپنی تشفی کر لیتا ہے۔ از روئے قانون "کٹ فیاٹ" کو ان سات وجوہ پر طلاق دی جاسکتی ہے۔ اگر اس کے کوئی بچہ نہ ہو اگر وہ بد چلن ہو اپنے شوہر کے والدین کی مطیع نہ ہو حد سے زیادہ بکواسی ہو۔ چوری کرتی ہو۔ حاسد ہو اور جذامی ہو۔ یوں تو ان اسباب میں بڑی وسعت ہے لیکن حسب ذیل اشکال میں مندرجہ بالا کسی وجہ سے بھی فائدہ نہیں حاصل کیا جاسکتا اگر بیوی نے اپنی ساس اور سسر کا پورے تین برس تک ماتم کیا ہو۔ شوہر کا خاندان جو شادی کے وقت غریب تھا بعد میں متمول ہو گیا ہو یا یہ کہ بیوی کے والدین جن کے پاس وہ واپس جاسکتی تھی وفات پاچکے ہوں۔ غرض اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کے عوض ایک دوسری بیوی کر لینا ہی زیادہ پسندیدہ اور آسان ہے اسی لئے بہ مقابل اور ممالک کے چین میں طلاق کا بہت کم رواج ہے اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو جدا کرنا چاہے اور بیوی تذکرہ صدر امور میں سے کوئی شکل ثابت کردے تو صرف یہی نہیں کہ طلاق باطل کرکے شوہر کو اپنی بیوی واپس لینے پر مجبور کیا جاتا ہے بلکہ وہ سزا کا مستوجب ہو جاتا ہے۔

جنوبی چین میں دوسری بیوی کرنے کی نہایت مختصر رسم ادا ہوتی ہے۔ لڑکی اپنے چاہنے والے کے لئے اپنے ہاتھ سے پیالی میں چائے ڈالتی ہے جو اس کے جواب میں کچھ روپیہ جو سرخ کاغذ میں لپٹا ہوا ہوتا ہے کشتی میں رکھدیتا ہے لڑکی کا اس روپیہ کو قبول کر لینا معاہدہ کو مکمل کر دیتا ہے ان دوسری بیویوں کی چونکہ کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی لہذا شوہر جب چاہے ان کو علیحدہ کر دے سکتا ہے لیکن ان کے لئے کوئی گزران کی سبیل کئے بغیر بہت کم ان کو جدا کیا جاتا ہے۔

اگر کسی خاندان میں صرف اکلوتی لڑکی ہو تو اس کا بیاہ اس طریقہ سے ہوتا ہے کہ کسی خاص مبارک دن دولہا لڑکی کے گھر جاتا اور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دروازہ اُس وقت بڑی خبرداری سے بند کیا ہوا رہتا ہے۔ دلہن پوچھتی ہے کہ کون ہے؟ اس کے جواب میں دولہا اپنا نام و نشان اور اپنی ضروری حالت بتلاتا ہے اُس پر دولہن دریافت کرتی ہے کہ آیا وہ اس کے مکان پر اٹھ آنے اور اُس کے ساتھ رہنے پر راضی ہے اس کے جواب میں دولہا اُس کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کے گھر چلے آنے اور اُس کی شرکت میں بڑی عمدگی سے رہنے کے لئے آمادہ ہے اس کے بعد دروازہ کھول دیا جاتا ہے دولہا مکان میں داخل ہوتا ہے اور شادی کے تمام معمولی مراسم ادا ہوتے ہیں جس عورت کی اس طرح شادی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کی پرورش کی کفیل ہوتی ہے اور اُسے شوہر کی تمام ضروریات کو پورا کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ سارے گھر بار کی وہی مالک ہوتی ہے اور جو چاہے کرسکتی ہے۔ بچوں کے

نام ماں کے خاندان پر رکھے جاتے ہیں اور ان کا تعلق بالکل
ماں ہی کے کنبہ سے ہوتا ہے اس لئے ان کو پرستش اور فاتحہ
وغیرہ میں اپنی ننھیال کا وابستہ ہونا پڑتا ہے ددھیال
سے انھیں کوئی کام نہیں۔ شوہر کو کاروبار کرنے یا بیوی کا
ہاتھ بٹانے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی شادی کو "عورت کا
مرد سے شادی کرنا" کہتے ہیں۔

چینی بڑے ہی پیار و محبت کرنے والے والدین ہوتے ہیں
بچے عموماً اپنی ماں کو "جاٹزاؤ" کہکر پکارتے ہیں اس کے
معنی ہیں خاندان کی شفیق مہربان۔ بچوں کی تعلیم و تربیت
کے متعلق یہ خیال ہے کہ ان کے پیٹ سے ہی اس کی ابتدا ہو
ایام حمل میں ماں کا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے نہ کسی ناپسندیدہ
چیز کو دیکھے اور نہ کسی ناخوشگوار آواز کو سنے۔ اس کو چاہئے
کہ وہ کوئی برے الفاظ زبان سے نہ نکالے۔ اور نہ کوئی غیر
مانوس چیز کھائے اس پر لازم ہے کہ وفاداری فرزندانہ محبت
سعادت مندی۔ نیک نہادی وغیرہ تمام نیک اور عمدہ باتوں
کے خیالات اپنے دماغ میں رکھے تاکہ ان کا اس کے بچے پر اثر ہو
پیدائش کے بعد پہلے سبق جو بچہ کے ذہن نشین کئے جاتے ہیں
یہ ہیں کہ سیدھے ہاتھ سے کھانا کھائے۔ دبی ہوئی آواز
میں گفتگو کرے اوضاع و اطوار میں باتمیز ہو اور چال چلن ایثار
نفسی اور بے غرضی سے مملو ہو۔ بچے کی عمر جب تک آٹھ برس
کی نہ ہو لے۔ مدرسہ کی تعلیم شروع نہیں کی جاتی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد ایک مہینہ تک ماں کو لازم ہوتا ہے کہ جو چیز
وہ کھائے اس کے ساتھ سرکہ اور ادرک ضرور ہو ان دونوں
چیزوں کو بہت مقوی سمجھا جاتا ہے۔ مقویات کا خیال چین
میں بسا اوقات وبال جان ہے ملک کے بعض حصوں میں
انسانی گوشت تمام مقویات سے زیادہ قوت بخش خیال
کیا جاتا ہے کسی کا اپنی بیمار ماں یا باپ کے لئے اپنے جسم سے
گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس کا شوربہ تیار کرنا انتہا درجہ
کی سعادت مندی میں داخل ہے۔ جو لڑکی ایسا کرتی ہے
وہ اپنی وفات کے بعد ایک یادگاری کمان کی تعمیر کی مستحق
ہوتی ہے۔

جب بچہ ایک مہینہ کا ہوتا ہے تو اس کا سر مُنڈایا جاتا ہے اس
رسم میں کسی قدر اہمیت ہے اور والدین کی مالی حالت
کے مطابق اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

لڑکیوں کی پرورش اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ شادی کو اپنی
زندگی کا منشاء و مقصود سمجھیں۔ لیکن جب یہ مقصد پورا ہونے
کو ہوتا ہے تو آداب و مراسم کی بموجب شادی کے پہلے مسلسل
تین دن تک دلہن کو خوب رونا یا رونے کی صورت بنانا پڑتا ہے
اس سے یہ ظاہر کرنا مطلوب ہوتا ہے کہ اسے والدین کے سایۂ
عاطفت سے جدا ہونا شاق ہے۔ بیوی کے فرائض کی علامت
"جھاڑو" ہے اس لئے دولہن کو شادی کے دوسرے دن
جھاڑو لیکر تمام گھر جھاڑنا پڑتا ہے۔ امیر گھرانوں میں صرف برائے
نام بطور رسم اس کو ادا کرتے ہیں لیکن غریب لوگ پورے
طور سے اس پر عمل کرتے ہیں۔

چینی خواتین کو ورزش کی کوئی پرواہ نہیں وہ عموماً محافہ کے
بغیر بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ باقی امور میں ان کا وقت بھی
کسی قدر یورپی خواتین کی طرح بسر ہوتا ہے کبھی وہ اپنی ملاقاتیوں
کے ہاں چلی جاتی ہیں کبھی ان کی ملنے والیاں ان کے ہاں
چلی آتی ہیں۔ خانہ داری کے معاملات میں بھی ان کا وقت
صرف ہوتا ہے زیور اور سنگار وغیرہ کو تلاش اور درست

کرتی رہتی ہیں۔ تاش اور شطرنج کھیلتی ہیں۔ حقہ پیتی ہیں اور ایک آدہ کش چانڈو کا بھی لگاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغ جو چینی مکانوں میں اکثر نظر آتے ہیں بناتی ہیں۔ غرض اسی طرح کے ونیز نقاشی وغیرہ کے کاموں میں وہ اپنا وقت گزارتی ہیں عید تیوہار کی بدولت روزانہ زندگی کی یکسانیت میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ مالدار عورتیں بعض اوقات کئی کئی ماہ تیرتہہ میں بسر کرتی ہیں عام طور پر عورتیں بدھ مذہب کی پیرو ہوتی ہیں اور اون کے شوہر جو کنفیوشس کا مذہب رکھتے ہیں تیرتہہ وغیرہ کے موقعوں پر متعدد ملازمین کو ساتھہ لئے ان کے ہمراہ رکاب ہوتے ہیں بدھ مذہب والوں کے عظیم الشان مندر نہایت خوشنما اور دلکش وضع سے اونچے پہاڑوں پر واقع ہوتے ہیں۔ جنگل اور ٹیکریوں سے یہ بالکل محصور ہوتے ہیں اور اِدہر اُدھر چٹانوں میں سے پانی ٹپکتا۔ اور اس سے چھوٹی چھوٹی ندیاں بنتی جاتی ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کسی بڑی چٹان پر کوئی چھوٹا سا مندر نظر آتا ہے جس میں رحم کی دیبی کی ہنس مکہہ شکل ایک شیر خوار بچہ گودی میں لئے ہوے دکھائی دیتی ہے یا کہیں بدھ کی مورت ہوتی ہے ان مجسموں کے سامنے خوشبودار لکڑیاں جلتی رہتی ہیں۔ جب کوئی خوش حال خاتون ان میں سے کسی ایک صحرائی آسرم میں پہونچتی ہے تو پجاریوں کی عنایت سے متعدد کمروں میں سے جو مہمانوں کے واسطے مخصوص ہوتے ہیں دو کمرے اس کے ملازمین کے حوالہ کردیئے جاتے ہیں۔ ملازم فوراً پردوں فرش اور شیشہ آلات وغیرہ سے جو ساتھہ ہوتے ہیں ان کمروں کو اپنی مالکہ کیلئے آراستہ اور تیار کردیتے ہیں۔ غرض ان خالی کمروں کو اپنی رہایش کے قابل بنانے کے بعد وہ کئی روز وہاں پوجا پاٹ اور پجاریوں کی عادت وغیرہ میں بسر کرتی ہے۔ خیرات میں بہت کچھہ رقم صرف کرتی ہے

اور غریبوں کو چانول۔ ترکاری۔ روٹی اور میوہ کھلاتی ہے چینی سخاوت و فیاضی میں بڑے دل والے ہوتے ہیں اور عورتیں اس بارہ میں مردوں سے کچھہ پیچھے نہیں ہوتیں ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیان ایک سخت قحط کے باعث چین میں خوفناک تباہی آئی تھی۔ دو سال کے عرصہ میں کرور سوا کرور سے کم جانیں تلف نہیں ہوئیں۔ اس کے کچھہ ہی دنوں بعد ایک انگریز خاتون نے چین کا سفر کیا اس کو بہ کثرت ایسی غریب بیوائیں ملیں جنہوں نے بیان کیا کہ کس طرح تباہی اور قحط کے زمانہ میں ایک معمولی عہدہ دار کی بیوی نے انھیں روزانہ خوب اچھی طرح کھانا کھلا کر ان کی جانیں بچائی تھیں۔ انگریز خاتون نے اس نیک بخت چینی خاتون سے ملاقات کرکے جب اس کا تذکرہ کیا اور اسے مبارکباد دی تو اس نے کہا کہ:۔

"اگر میرے یہ غریب ہمسائے بھوکوں مرتے ہوتے تو میں بھلا کیونکر"
"اپنے کھانے کا لطف حاصل کرسکتی تھی"

چینی خواتین عموماً جب کبھی اپنے کسی تباہ حال دوست کی تکالیف و تنگدستیوں اور اس کی مالی پریشانیوں کا تذکرہ کرتی ہیں تو اون کے آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اکثر عورتیں اپنا فرض سمجھ کر روئی دار کپڑوں کے جوڑے تیار کرتی اور موسم سرما میں ناداروں کو تقسیم کرتی ہیں۔
مشرق کے بڑے مذہبوں کے ذیلی اصول و عقائد میں گو باہمی اختلاف ہوسکتا ہے لیکن بنیادی نیکیاں جو سارے اصول و عقائد کی اصلی محرک ہوتی ہیں سب میں یکساں ہوتی ہیں اور مختلف مذاہب کی باہمی بیرونی مغائرت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
چین کی عورتوں کے اخلاق و اطوار کا معیار بہت اعلیٰ ہے آداب و مراسم کی تعلیم و تربیت اس قدر سختی کے ساتھہ انھیں دیجاتی ہے کہ

بسا اوقات ہماری نظر میں اس پر بناوٹ اور تکلف کا شبہہ ہوتا ہے۔ مردوں کا لباس جس کھونٹی پر آویزاں ہو اسی پر کسی عورت کی پوشاک کا لٹکا دیا جانا قاعدہ کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شوہر حالت سفر میں اپنی بیوی کو خط لکھنا چاہے تو وہ بالراست اوس کو خطاب نہیں کرسکتا۔ اُسے یا تو اپنے والدین کے نام خط بھیجنا پڑتا ہے یا اگر وہ زندہ نہ ہوں تو اپنے لڑکے یا لڑکی کو مخاطب کرنا ہوتا ہے۔ اس قدر انتہا درجہ کے تکلف اور تصنع کی بدولت بعض اوقات اس کے مخالف و متضاد مثالوں کا پیش آجانا بھی ایک ضروری امر ہے۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ چین کے اکثر مرد مغنیہ اور رقاصہ عورتوں کی ہنسی دل لگی کی محبت اور پھولوں سے لدی ہوئی کشتیوں والی حسن فروش لڑکیوں کی بے تکلفی کے بے انتہا شائق ہوجاتے ہیں۔

انسانی فطرت خواہ وہ رسم ورواج اور الفت وعادت سے کتنی ہی متاثر کیوں نہ ہو سارے عالم میں آخر ایک ہی سی ہوتی ہے بڑی صداقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :۔

"باوجود ان تمام مشکلات کے جو چین کی عورتوں کو پیش آتی ہیں"
"وہ بعض اوقات اپنی سطح سے ترقی بھی کر جاتی ہیں اور اپنے"
"راستہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرکے نہ صرف اپنے کنبہ یا حلقہ"
"میں بلکہ علم وادب کے مشکل مقامات میں بھی ایک برتر اور اعلیٰ"
"جگہ اپنے لئے حاصل کرلیتی ہیں"

یہ بات ہمارے لئے واقعی بہت حیرت خیز اور تعجب انگیز ہے کہ چین کی ان عزلت گزیں اور بظاہر ڈرپوک عورتوں نے صرف ان ہی چند امور میں اپنے تئیں ممتاز نہیں ثابت کیا ہے بلکہ وہ اپنی شجاعت اور فوجی قابلیت کا بھی بہت کچھ ثبوت دے چکی ہیں۔ تاریخ میں ہم چھٹی صدی کی ایک بیوہ کا حال یوں پڑھتے ہیں کہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس نے اپنے ملازمین کی ایک فوج مرتب کرکے اصلی باشندوں کے مقابلہ میں اپنے شہنشاہ کی مدد کی۔ وہ موقع جنگ پر برابر اپنی فوج کے ساتھ تھی اور اس نے اپنی ہمت وجرات سے اپنے ساتھیوں کے جوش کو اس قدر ابھار دیا تھا کہ انھوں نے اپنے دلاورانہ حملوں سے دشمن کو بالکل پسپا کردیا۔ ان خدمات کے صلہ میں شہنشاہ نے اسے بیگم ڈیوک وفیوجن کے اعلیٰ خطاب سے سرفرازی بخشی اور اس کے متوفی شوہر کو نواب کا خطاب بعد از مرگ مرحمت فرمایا اس کے بعد اگر قریب کے زمانہ کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تائی پنگ کی بغاوت کے موقع پر نہ صرف عورتوں کی دو رجمنٹیں سرگرم پیکار تھیں بلکہ دو عورتیں بحیثیت جرنیل اس ہنگامہ میں اپنا فرض ادا کررہی تھیں ابھی حال میں ہم نے نوجوان چینی خواتین کی ایک رجمنٹ کا حال پڑھا تھا جو بالکل مردوں کی طرح ہتیاروں سے آراستہ ہوکر مقابلہ کو نکلی تھی اور میدان کارزار میں اپنی بہادری کا عملی ثبوت دیا تھا۔

عورتیں ارادہ کی پکی طبیعت کی مضبوط نہایت ثابت قدم اور مستقل مزاج ہوتی ہیں اگر کسی فرض کی بجا آوری میں وہ خودکشی کا عزم کرلیتی ہیں تو پھر وہ موت سے ذرا نہیں ہچکچاتیں۔ کسی بیوہ کا اپنے شوہر کے ساتھ جان دیدینا بہت مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ بیواؤں کے اس طرح قربان ہوجانے کی رسم اب تک باقی ہے سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک ایسی ہی رسم نہایت تزک واحتشام سے ایموائے میں ادا کی گئی۔ بیوہ کے جسکی عمر صرف پچیس برس کی تھی نہ کوئی اولاد تھی اور نہ اس کے والدین زندہ تھے لہذا اس نے اپنے شوہر سے عالم ارواح میں جاملنے کا مصمم قصد کرلیا مرنے کے

لئے جو دن مقرر ہوا تھا اس کے چند روز قبل اس کا جلوس نکالا گیا اور ایک کھلے ہوئے محافہ میں سارے شہر کا گشت کرایا گیا تاکہ سب لوگ اس کو دیکھ سکیں اس نے تمام لوگوں کی دعوت کی تاکہ وہ اس کو دار فانی سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھیں اس کے ساتھ اسی قسم کی برات بھی جیسی کہ شادی کے موقع پر نکلتی ہے مقررہ روز وہ محافہ میں بیٹھکر بالکل دولہنوں کے لباس میں سرخ ریشم کے بھڑکیلے کارچوبی کپڑے پہنے ہوئے سر پر سنہری ٹوپی جو خاص عروس کے لئے مخصوص ہے دئے ہوئے اس چبوترے پر پہونچی جو پھانسی کے ذریعہ خودکشی کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا وہاں پہونچنے کے بعد وہ محافہ سے نکلی اور بلا کسی جذبہ یا اضطراب کے اظہار کے بڑے اطمینان کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی جو کچھ ناشتہ اس جگہ تیار تھا اس کو چپ چاپ نوش جان کرنے کے بعد اس نے مجمع کو خطاب کرکے ایک تقریر کی۔ اس کے بعد چاولوں کے چند مٹھیاں ایک پیالہ میں سے لیکر جو وہاں میز پر رکھا تھا لوگوں پر پھینکیں۔ لوگ نہایت شوق کے ساتھ ان مقدس چاولوں کو چننے اور سمیٹنے لگے اس کے بعد وہ خاموشی سے پھانسی کے چبوترے پر چڑھ گئی اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کے لٹک گئی چند ہی لحظوں میں اس کا کام تمام ہو گیا اس رسی کو حاصل کرنے کے لئے اب بڑی چھین جھپٹ ہونے لگی اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے گئے اور ان کو بیوہ کے شناساؤں میں تقسیم کیا گیا اس کے بعد لاش محافہ میں رکھکر ایک مندر میں پہونچائی گئی۔ عام چندہ سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جنازہ نکالا گیا۔ بعد میں اوس مرحومہ کے اس احسن فعل کی یادگار قایم کرنے کی غرض سے ایک کمان تعمیر کی گئی۔

۱۸۷۵ء میں ایک دوسری بیوہ کا اسی طرح استقلال دکھانا بھی مگر کم دھوم دھام کے ساتھ خودکشی کر لینا پیکن کے جریدہ میں درج ہے اپنے شوہر کی وفات پر اس نوجوان بیوہ نے زہر کھانے کی کوشش کی لیکن اس کے شوہر کے والدین نے بڑی محنت کے ساتھ اس کو مرنے سے بچایا اور اس کو آسایش و چین سے رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ساس اور سسرے کے بے پایاں الطاف اور مہربانیوں سے متاثر ہوکر بیوہ اس وقت تو اس خیال سے باز رہی لیکن جب متوفی شوہر کی لاش اس کے مقام ولادت میں دفن کئے جانے کے لئے منتقل ہونے لگی تو وہ بڑے اصرار کے ساتھ جنازہ میں شریک ہوئی اس کے بعد کھانا کھانا اس نے مطلق چھوڑ دیا اور چند ہی روز میں اس طرح اپنے تئیں ہلاک کر ڈالا وہ کہا کرتی تھی کہ میرے لئے تو موت متوفی شوہر سے جا ملنے کا ذریعہ ہے پس مجھے اس سے مت روکو۔ عموماً وہ لڑکیاں بھی جنکی منگنی ہو چکتی ہے شادی ہونے کے قبل ہی اگر ان کے منگیتر مرجائیں تو خودکشی کر لیتی ہیں اور اپنے آئندہ ہونے والے شوہر کے ساتھ دفن کی جاتی ہیں۔ آئندہ ایک دوسری زندگی کا پختہ عقیدہ اہل چین کو اس نئی و الہی زندگی میں جا پہونچنے کے درمیانی مصائب کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنے میں بڑی مدد کرتا ہے۔

چین کی صاحبہ خانہ کو اپنی کنیزوں کے لئے شوہر تلاش کرنے کا فرض بھی ادا کرنا پڑتا ہے یہ کام کوئی آسان نہیں ہے سولہ سال کی عمر کو پہونچنے پر لونڈیاں اگر ان کا جی چاہے شادی کر سکتی ہیں۔ چین کی تمام قسم کی عورتوں میں صرف لونڈیوں ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ شوہر کے متعلق ان کی رائے لی جائے اور ان کی خواہشات دریافت کئے جائیں ایک خاتون نے کسی موقع پر کہا تھا کہ :-

"میں جس کسی سے چاہوں اپنے رشتہ داروں کی شادی کر سکتی ہوں"
"اگر مجھے اپنی لونڈیوں سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ"
"آیا وہ ان لوگوں سے شادی کرنے پر راضی ہیں جو میں نے ان"
"کے لئے تجویز کئے ہیں"

چھوٹی کمسن لڑکیوں کو باندیوں کی طرح بیچنے کے لئے چرا لیجانا چین
میں بہت عام ہے۔ حالانکہ بچوں کو چرانے والے اگر گرفتار
ہوجائیں تو نہایت سخت سزا پاتے ہیں۔ بچوں کو ان کے
مکانوں میں سے اڑا لینے کے بعد مجرمین پر جرم کا ثابت ہونا
بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح چرائی ہوئی بدنصیب کمسن لڑکیوں
کی قسمت بڑی خراب ہوتی ہے۔ اگر لڑکی بے رحم یا بہت
مفلس لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ جائے تو پھر اس سے بڑے
سخت مصائب جھیلنے پڑتے ہیں لیکن جو لڑکیاں خوشحال
خاندانوں میں فروخت ہوتی ہیں وہ عموماً بہت لطف اور
مہربانی کے ساتھ رکھی جاتی ہیں اور ان کی اچھی طرح خبرگیری
کی جاتی ہے اپنے بچوں کے لئے جو کچھ تعلیم ضروری سمجھی جاتی
ہے اس میں ان لڑکیوں کو بھی شریک کیا جاتا ہے یہ کمسن
لونڈیاں گھر کی لڑکیوں کے ساتھ ہنسی دل لگی کھیل کود
میں برابر حصہ لیتی ہیں اور جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی
ہے تو ان کنیزوں میں سے دو ایک اس کے ساتھ کر دی
جاتی ہیں بعض اوقات ان لونڈیوں کو اگر وہ اچھی شکل و
شمایل کی ہوں تو نئے مکان میں زوجہ ثانی کا درجہ مل جاتا
ہے۔ بچوں کو چرا لے جانے والوں کی دست برد سے محفوظ
رکھنے کے لئے اکثر کمسن لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس پہنایا
جاتا ہے اسی طرح چھوٹے لڑکوں کو بری ارواحوں کے
اثر سے بچانے کی غرض سے زنانہ لباس پہناتے ہیں روح
کے متعلق چینیوں کا عقیدہ عجیب و غریب ہے۔ جب کبھی کوئی
بچہ بیمار ہوتا ہے تو اس کا سبب ہمیشہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس
کی روح کے ایک حصہ کو بھوت پریت بھٹکا دیتے ہیں بچہ کی صحت یابی
اسی شکل میں ہوسکتی ہے کہ اس کی روح کا بھٹکا ہوا حصہ
پھر اس کے جسم میں واپس آجائے۔ چین میں ایک کہاوت
مشہور ہے کہ ماں کی آواز لاکھوں میل پہونچ جاتی ہے پس
ماں اپنے بیمار بچے کے لباس یا کسی اس کی مرغوب چیز کے ساتھ
ایک قندیل ہاتھ میں لئے ہوئے اس مقام پر جاتی ہے جہاں
بھٹکی ہوئی ارواح کے موجود ہونے کا گمان ہوتا ہے وہاں چاروں
طرف قندیل کو خوب ہلاتی ہے اور روح کو بلاتی ہے کہ گھر آؤ
گھر آؤ۔ بعض اوقات دور سے کوئی عورت بھٹکی ہوئی روح
کی طرف سے جواب دیتی ہے اور ماں مطمئن ہو کر اس یقین کے
ساتھ گھر لوٹتی ہے کہ گم گشتہ روح اس کے پیچھے آرہی ہے۔

چین کے ہر درجہ اور طبقہ کی عورتوں کا سب سے زیادہ عزیز
اور دل پسند تیوہار جلاہن یا چرخہ کاتنے والی دوشیزہ اور
چرواہے کا ہے۔ اس کو تاروں کی عید بھی کہتے ہیں یہ ہر سال
ساتویں مہینے کی ساتویں رات کو منائی جاتی ہے۔ یہ چرخہ کاتنے
والی خاتون آفتاب کی بیٹی تھی وہ ہر وقت کچھ اس طرح اپنے
کام کے پیچھے لگی رہتی تھی کہ باپ کو اس کی یہ انتہا درجہ کی محنت
ناگوار معلوم ہونے لگی آخر باپ نے یہ ارادہ کیا کہ خوبصورت
چرواہے کے ساتھ جو اس کے مویشی آسمان کے نقرئی دریا یعنی
کہکشاں کے کنارے پر چرایا کرتا تھا اس کی شادی کردے۔
اس کا خیال تھا کہ شادی کے بعد لڑکی کا طرز زندگی بدل جائیگا
اور وہ خوشی و خرمی کے ساتھ اپنا وقت بسر کریگی چنانچہ ایسا
ہی ہوا۔ شادی کے بعد لڑکی کی طبیعت بالکل بدل گئی وہ

نہ صرف مسرور و شاداں ہوگئی بلکہ چرخہ وغیرہ کو اس نے بالائے طاق رکھدیا اور اپنا تمام وقت خوش طبعی اور ہنسی دل لگی میں گزارنے لگی۔ بادشاہ آفتاب اس بات پر سخت غصہ ہوا اور نوجوان خاتون کی اس حرکت کا باعث چرواہے کو ٹھہرایا اس کو جلا وطنی کی سزا دی اور نقرئی دریا کی دوسری جانب اس کا رہنا قرار دیکر یہ حکم دیا کہ اس کے بعد میاں بیوی سال میں ایک مرتبہ سے زیادہ نہ ملیں اور یہ سالانہ ملاقات برس کے ساتویں مہینہ کی ساتویں رات کو ہو۔ آفتاب کے حکم سے لاکھوں نیل کنٹھ وہاں جمع ہوگئے اور اپنے پروں کو پھیلا کر نقرئی دریا کے اوپر ایک پل بنا دیا۔ غریب افسردہ خاطر چرواہا نہایت رنج وملال کے ساتھ اپنی نالاں وگریاں بیوی سے رخصت ہوکر پل پرسے گزر کے اس دریا کے کنارے جا پہونچا جو آسمان میں سے نکلتا ہے یکہ و تنہا بیوی پھر اپنے چرخہ کی طرف متوجہ ہوگئی اور آفتاب کو اپنی لڑکی کی محنت و مصروفیت پر خوش ہونے کا موقع حاصل ہوا اسی طرح کامل ایک سال گزر گیا اور آخر ساتویں مہینہ کی ساتویں رات آپہونچی۔ نیل کنٹھ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوے اور اپنے بازوؤں کو پھیلا کر انھوں نے پل بنا دیا۔ اداس وغم رسیدہ چرخہ کاتنے والی خاتون کا دل مارے خوشی کے اچھل رہا تھا جب وہ اس پل کے ذریعہ نقرئی دریا کو عبور کرکے اپنے شوہر سے ملی۔ اگر اس شام کو بارش کا ایک قطرہ بھی برس جاتا تو آسمانی دریا میں طغیانی آتی اور پل بہ جاتا پھر دونوں میاں بیوی اور ایک سال تک ایک دوسرے کو دیکھنے نہ پاتے۔ اسی لئے ہر سال تیوہار کے روز تمام آدمی دعا کرتے ہیں کہ موسم صاف رہے۔ چرخہ کاتنے والی خاتون سے یہ دعا مانگی جاتی ہے کہ سینے پرونے اور کپڑے بننے میں کمال حاصل ہو۔ تیوہار کے موقع پر ہر مکان میں خوب روشنی کی جاتی ہے اور خربزے۔ تربز میوہ پھول مٹھی۔ دٹیاں عود لوبان اور شمع وغیرہ پر کواکب کی نذر و نیاز ہوتی ہے عورتیں اپنی سہیلیوں کی ملاقات کو جاتی ہیں۔ خود اپنے ہاتھ کے تیار کیے ہوے تحائف کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے۔

منحوس اور نامسعود الفاظ سے چین میں بڑا خوف کیا جاتا ہے خصوصًا عورتوں یا بچوں کی زباں سے ایسے الفاظ نکل جائیں تو سخت پریشانی پھیل جاتی ہے۔ اس کے متعلق تعویذ استعمال کئے جاتے ہیں خصوصًا سال کے ابتدا میں تعویذوں کی بڑی کثرت ہوجاتی ہے ان میں نقش یہ ہوتا ہے کہ "عورتوں اور بچوں کے الفاظ بلا خطرہ" غرض برے الفاظ کے بد اثرات کا اس طرح رد کیا جاتا ہے۔ عالم ارواح سے تعلقات قایم کرنے کی کوششیں چین میں مدت سے کی جاتی ہیں۔ گو بعض طریقے اس کے ایسے بھی رائج ہیں جن پر وہاں شبہہ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جادوگرنیوں کا شمار نوذلیل اور بے آبرو زنانہ پیشہ وروں میں ہوتا ہے۔ غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ اور سفید جادو کا امتیاز بھی ہوتا ہے روحوں سے گفتگو کرنے کے لئے شہتوت۔ شفتالو۔ یا بید مجنوں کے درخت کی دو تین فٹ لمبی نوکدار ایک چھڑی ہوتی ہے۔ ایک طشت نما چوبی رکابی میں جو تین چار فٹ مدور ہوتی ہے۔ ریت بھری رہتی ہے اس پر چھڑی رکھ دیتے ہیں۔ کسی مندر میں دیوتا کی مورت کے سامنے ایک میز رکھ کر اس پر اس چوبی طشت کو رکھدیا جاتا ہے۔ اب دلی مرادوں کے بارے میں سوالات کئے جاتے ہیں اور چھڑی سے جس کی ایک انی تو ریت میں ہوتی ہے اور دوسری ارواحوں سے بات کرنے والے کے ہاتھ میں ریت پر حروف

لکھے جانے شروع ہوتے ہیں۔ بید مجنوں کی چھوٹی سی گڑیا کے ذریعہ
روحوں سے بات کرنے کا طریقہ بھی عورتوں کو بہت پسند ہے
گڑیا میں اس اعجازی قوت کے پیدا ہونے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے
کہ اسے کامل انچاس راتیں شبنم میں رکھدیا جائے۔ روحوں
سے بات کرنے والی گڑیا کو اپنے پیٹ سے لگالیتی ہے اور یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں بات چیت کی اور نیز مردہ اشخاص
کی ارواح سے جو سوالات کئے جائیں ان کے جوابات ادا کرنے
کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مردوں کی
روح گڑیا میں داخل ہوتی ہے اور اس ذریعہ سے اپنے اعزا
و اقربا کے ساتھ جو زمین پر بقید حیات موجود ہیں بات چیت
کرلیتی ہے بعض دفعہ گڑیا کو سوال کرنے والوں کے کان سے
لگادیتے ہیں تاکہ جواب بہت صاف طور سے معلوم ہوسکے
مردوں کی ارواح سے بات چیت کرنے کا ایک اور طریقہ
یہ ہے کہ ایک میز پر دو روشن شمعیں رکھدی جاتی ہیں اور
ایک عود دان میں تین عود بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ جو عورت
روح سے بات کرنے والی ہوتی ہے اپنا سر جھکا کر میز پر رکھدیتی
ہے تھوڑی دیر میں ان اشخاص کی روح جن سے گفتگو کرنی
مطلوب ہوتی ہے اس عورت کے جسم میں آجاتی ہے اور جو
سوالات ان ارواح سے کئے جاتے ہیں ان سب کے جواب عورت
کے ذریعہ مل جاتے ہیں گفتگو کے اختتام پر وہ عورت جو درمیانی
ذریعہ بنتی ہے عموماً بیمار ہوجاتی ہے۔ اسے ابکائیاں آنے لگتی
ہیں اور سخت دورے ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ایک چائے کی پیالی
پی لینے سے وہ تندرست ہوجاتی ہے۔

چھوٹی لڑکیوں کے ہلاک کرڈالنے یا انہیں راستہ وغیرہ پر ڈالدینے
کی رسم کو اکثر چین کی عورتوں کی بے قدری کے ثبوت میں
پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت درجہ مفلوک الحال
مفلس لوگوں میں اس کا بڑا رواج ہے کیونکہ لڑکیوں کے جوان
ہوکر شادی کرنے کے وقت جہیز وغیرہ کا انتظام کرنے کی ان میں
سکت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ چین کا یہ قاعدہ بھی دختر
کشی کا بہت بڑا ممد و معاون ہے کہ بیاہی ہوئی لڑکیاں اپنے
مفلس و نادار والدین کی کوئی خبر گیری نہیں کرسکتیں بلکہ ان
کو اپنی ساس اور سسر کی خدمت بجا لانی پڑتی ہے لیکن خوشحال
لوگ کبھی دختر کشی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ عموماً باپ ہی اس بات
کا فیصلہ کرتا ہے کہ آیا نومولود لڑکی کو "پل کے نیچے سے گزرنا"
چاہئے یا نہیں۔ لڑکیوں کے پانی میں ڈبونے کو ان ہی الفاظ سے
تعبیر کرتے ہیں۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی لکڑی کا ایک بڑا پانی سے
بھرا ہوا برتن لایا جاتا ہے۔ جس کے منہ پر ایک دستہ لگا ہوتا ہے
اگر لڑکی کو پرورش کرنا مناسب نہ سمجھا جائے تو فوراً اس کے
تولد ہوتے ہی اسے پانی کے برتن میں غوطہ دیا جاتا ہے اور دستہ
کے نیچے اسے دبایا جاتا ہے۔ غرض اس طریقہ سے بیچاری بے جرم
و بے خطا ننھی سی جان کا خاتمہ کردیا جاتا ہے یہ ایک ایسا واقع
ہے کہ اس میں بمقابل ارادہ اور خواہش کے افلاس و تنگدستی
کا زیادہ تر دخل ہے۔ اگرچہ یہ فعل کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔
لیکن حکومت کی طرف سے اس کی بے قدری ضرور کی جاتی ہے
اس کے خلاف حکام کی جانب سے اعلان شایع ہوتے ہیں اکثر
بڑے شہروں میں لاوارث بچوں کی پرورش و نگہداشت کا
معقول انتظام ہے گلیوں میں اور راستوں پر جو لڑکیاں
پھینکدی جاتی ہیں ان سب کو ان مقامات پر جمع کرکے ان
کی پرورش کی جاتی ہے۔ شادی کے قابل ہونے تک اون کو
رکھا جاتا ہے اور اگر ممکن ہوا تو ان کے لئے شوہر بھی مہیا کردئے

جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی لڑکی کو نہ تو لونڈی بنانے کی اجازت
دی جاتی ہے اور نہ انھیں زوجۂ ثانی بنایا جاسکتا ہے جب
یہ اپنی پرورش کے مقام کو خیرباد کہنے کو ہوتی ہیں تو مقامی
عہدہ دار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح اس بات کا
اطمینان کرلے کہ لڑکی کسی مذموم یا مخرب اخلاق غرض سے
نہیں لی جارہی ہے۔
مختلف قسم کی خیراتی انجمنیں ملک کے ہر گوشہ میں قایم ہیں اگرچہ
ان کے کام کا طرز یوروپی طریقہ سے عموماً مختلف ہوتا ہے لیکن
وہ عمدگی کے ساتھ اپنے اغراض کی تکمیل برابر کرتی رہتی ہیں بیکس
بے نوا بیواؤں کی امداد کے لئے بے شمار انجمنیں قایم ہیں اس
قسم کی ایک انجمن نے جو کینٹن میں قایم ہے دو سو چالیس جھونپڑیاں
تیار کر رکھی ہیں جن میں تین سو چالیس بیواؤں کی رہایش
کا انتظام ہے۔ غریب اور نادار بیواؤں کے لڑکوں کی شادی
کے اخراجات مہیا کرنے کی غرض سے بھی متعدد انجمنیں قایم
ہیں اسی طرح کفن اور دفن اور دوسرے خیراتی کاموں کی
مختلف انجمنیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔
اگر خود عورتیں چاہیں تو انھیں ملک کے عام کاروبار میں عملی
حصہ لینے میں کوئی بات مانع نہیں ہے چین میں پردہ کے
خیال تک سے لوگ ناواقف ہیں۔ محض شان و شوکت اور
رسم و رواج کی بنا پر اعلیٰ طبقہ کی عورتیں مردوں سے کسی قدر
الگ رہتی ہیں۔ مسلمانوں کی طرح کوئی اخلاقی قانون اس رسم
کے وجود کا سبب نہیں ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے چین کی عورتیں
برابر عدالتوں میں شہادت وغیرہ کے لئے حاضر ہوتی ہیں تماشہ
گاہوں میں اپنے خاص مقامات پر بیٹھی ہوئی برابر نظر آتی ہیں
عورتوں کے لئے نقاب کو تو وہ اس درجہ غیر ضروری تصور کرتی
ہیں کہ اگر کوئی انگریزی خاتون کسی چینی دوست کی ملاقات کو
جائے اور اس کے منہ پر نقاب ہو تو فوراً چینی خاتون دریافت
کریگی کہ کیا اس کے چہرے کی جلد پر کوئی مرض ہوگیا ہے محنت
مزدوری کرنے والی چینی عورتیں تو مردوں سے الگ رہتی
ہی نہیں مردوں کے ساتھ ان کا میل جول ویسا ہی ہوتا ہے جیسا
خود مردوں کا مردوں کے ساتھ اس بارے میں تو وہ مغربی
ممالک کی عورتوں سے بھی بڑھی ہوی ہیں اگرچہ اب تک نہایت
سخت رسم و رواج کی بدولت چین کی عورتوں کے لئے میدان
عمل محدود رہا ہے لیکن جب وہ دن آیگا کہ آسمانی سلطنت
کے عجیب و غریب لوگ قدامت کے طوق و زنجیر کو نکال پھینکیں
گے اور اپنے اصلی جوہر کو ہاتھ سے نہ دیکر اسے اور زیادہ مجلی
کرلیں گے تو یہ توقع ہے کہ ملک و قوم کے واجب الاحترام
مغزز مصلحین کی صف میں عورتوں کو ان کی اصلی اور حقیقی
جگہہ مل جائے گی فقط

سید خورشید علی عارفؔ

کلامِ شادؔ

(ہز اکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی سی آئی ای شادؔ بالقابہم)

کیا وہ دن تھے خلق جب تیری تماشائی نہ تھی
عالمِ وحدت میں کثرت کی گھٹا چھائی نہ تھی

دیکھتے ہیں ذرے ذرے میں ترا جلوہ عیاں
یوں نظر اپنی کبھی پہلے تماشائی نہ تھی

خلق کو بدظن کیا منصور خود رُسوا ہوا
اس سے پہلے تو انا الحق کی صدا آئی نہ تھی

ہوش موسیٰ کے اڑائے یا جلایا طور کو
امتحان مدِ نظر تھا جلوہ فرمائی نہ تھی

دیر ہو یا کعبہ تیرا جلوہ تھا پیشِ نظر
بے سبب ونو جگہہ میری جبین سائی نہ تھی

حق شناسی میں مبصر ہو گئے مردم شناس
آنکھ کی پتلی کبھی ایسی تماشائی نہ تھی

صوتِ ناقوس و آذان تھے یہ تو پردے راز کے
کب صدا دیر و حرم سے آپ کی آئی نہ تھی

اپنی صورت کا بشر کو کیوں بنایا آئینہ
گر تجھے منظور خود بینی خود آرائی نہ تھی

یہ تجاہل یہ تغافل کب سے ہے فرمائیے
کیا کبھی واقف نہ تھے مجھسے شناسائی نہ تھی

تھی جو خلوت اس میں بھی آتا تھا لطفِ انجمن
کچھ پریشاں کرنے والی اپنی تنہائی نہ تھی

کعبہ و بت خانہ کیسا ہر جگہ وہ کب نہ تھا
کب طبیعت میرے ہرجائی کی ہرجائی نہ تھی

صورتِ انسان میں حق کو دیکھتا آتا ہوں میں
کون کہتا ہے نظر میری تماشائی نہ تھی

ناشگفتہ کب ہا تھا غنچۂ دلِ شادؔ کا
گلشنِ اجمیر سے کس دن صبا آئی نہ تھی

فنون لطیفہ اور ہم

گزشت قافلۂ قوم تشنہ از لب بحر
عجب کہ من ہوسِ بادۂ سبو دارم

علوم جدیدہ کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ نظام عالم کا ہر جزو زوال پذیر ہے حدوث و تغیر و ہونا پائیدار کی صفت خانہ زاد ہے، قوموں اور سلطنتوں کا عروج و زوال اور وجود و عدم حقیقت میں نظام عالم کا اصول قانون ہے، تاریخ دیکھئے یا سوانح غرض ہر چیز میں یہ کلیہ بہ تبدیل ہیئت جلوہ گر ہوگا۔ یورپ میں جو اس وقت تمدن اور شائستگی معراج پر ہے اس عرب کا پرتو ہے جس کا آفتاب ازمنۂ متوسطہ میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تاباں و درخشاں تھا اور جسکے علوم و فنون اور لٹریچر اپنی نورانی شعاعوں سے ایک بڑے حصۂ زمین کو منوّر اور روشن کر رہے تھے۔ عرب کی ترقی دنیا کی آنکھوں میں کھُب رہی تھی لیکن افسوس! کہ فلک نے جو کسی کے اوج کے دیکھنے کا روادار نہیں ہے خدا جانے اس چمکتے ہوئے آفتاب کو دنیا کے کس پردہ میں چھپایا کہ وہ آج تک پھر نہ ابھر سکا ؎

ماہ من آخر شب رفت پس پردۂ غیب
بین کزیں حاملۂ غیب چہ غم زاد مرا

تواریخ سے ثابت ہے کہ ابتدائے آفرینش سے کوئی ایسی قوم نہیں گزری جسنے تمدن کے ہر شعبہ میں مساوی طور پر ترقی کی ہو، رومیوں کو لیجئے اور اون کے تمدن پر ایک اجمالی نظر ڈالئے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ صرف ایک فاتح قوم تھی دور و نزدیک اپنے ملک کو وسعت دیتی چلی گئی اور ملک گیری میں شہرۂ آفاق ہو گئی لیکن علوم فنون و ادب میں ہمیشہ یونانیوں ہی کی دست نگر رہی۔ فن تعمیر میں اگرچہ یہ قوم جدّت پسند پائی گئی لیکن اُس نے اس فن کو یونانیوں ہی سے اخذ کیا۔ یونانیوں کو لیجئے۔ یہ علمی و فلسفی تحقیق و تدقیق میں منہمک۔ اکتساب علوم و فنون میں چاق چوبند لیکن ملک گیری میں پھسڈی ہے اسی طرح ہندؤں کو دیکھئے انھوں نے ادب کو اس قدر عروج دیا کہ باید و شاید فلسفہ کی انتہا کردی۔ فن تعمیر میں بھی خوب موشگافیاں کیں لیکن تاریخی اور جغرافیائی معلومات بالکل محدود رہے اور جب اس سرزمین میں قدم رکھا چکرانے لگے۔ مصریوں کو لیجئے۔ صنعت میں ماہر۔ تعمیر میں یکّے۔ انکی مومیائیوں کا راز تو آج تک سربستہ رہا۔ لیکن مصوری کا مادّہ ان میں مفقود تھا اور ادب سے بھی محروم تھے غرض کسی قوم کو لیجئے اور اون کے تمدن پر غور کیجئے۔ کسی کو آپ ملک گیری کے بیابان میں گرداں دیکھیں گے تو کسی کو علوم و فنون کے میدان میں قدمزن پائینگے کوئی سرزمین تعمیر میں جادہ پیمائی کر رہا ہوگا تو کوئی صنعت و حرفت میں مشغول ہوگا غرض ہر ایک "بخیال خویش خبطے دارد" کا مصداق ہوگا لیکن ایک قوم اور صرف ایک ہے جو دنیا کے روبرو تمثیلاً پیش کی جاسکتی ہے وہ قوم "عرب" ہے جو فنون لطیفہ کی ایک شاخ مصوری کے علاوہ تمدن کے

ہر ایک شعبہ میں کچھ نہ کچھ کر گزر رہی ہے۔

فنون لطیفہ یا فنون ظریفہ جن سے عموماً مصوری۔ موسیقی شاعری تعمیر اور بت تراشی مراد لی جاتی ہے۔ انسان کی زندگی کے بڑے زبردست آلے ہیں۔ جس طرح چاند سورج صفحہ کائنات پر طرح طرح کی رنگ آمیزی کرتے ہیں اسی طرح فنون لطیفہ بھی انسانی زندگی میں بہار پیدا کرتے ہیں مصوری ہو یا بت تراشی موسیقی ہو یا شاعری یہ وہ قدرتی عطیے ہیں جنکو مبدا فیاض نے عام نہیں کیا ہے ہاں ان کا فیض عام ہے اور ہر ایک مجاز ہے کہ ان سے لطف اور محویت حاصل کرے انسان کو جو پسمسٹ+ (Pessimist) کے نقطۂ خیال سے مجموعہ رنج و آلام ہے یہ عطیے دینے سے قدرت کا یہ منشاء صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہ یہ اس کے بے چین گھنٹوں میں باعث تسکین ثابت ہوں ایک عمدہ تصویر جو اصل کے مشابہ ہو ایک شاعر کا کلام جو ایک جذبات سے لبریز ہو ایک تھکے ماندہ اور مغموم شخص کے لئے اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

ہمارے علمائے ادب شاعری کی تعریف کلام موزوں سے کرتے ہیں لیکن یہ تعریف دائرہ شاعری کو وسیع کر دیتی ہے۔ قدما نے مصوری اور شاعری کو ایک ہی کہا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ "شاعری ایک قسم کی مصوری ہے صرف فرق یہ ہے کہ مُصوّر مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر خیالات اور جذبات کی" کراچی (Carracci) "اگر شاعر اپنی گفتار سے رنگ آمیزی پیدا کرتا ہے تو مصوّر اپنی رنگ آمیزی سے گفتار" لیکن ان دونوں کے فرق کو سمجھنے کے لئے صرف "خیالی پلاؤ" اور "حقیقی پلاؤ" کی نظیر پیش کی جا سکتی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل ہندوستان میں مصوری کا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے بچہ بچہ کا میلان طبع اسکی طرف دیکھا جا رہا ہے اور مصوّری نہایت سرعت کے ساتھ ہر ایک دل و دماغ پر اپنا اثر مترتب کرتی جا رہی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مفید بھی ثابت ہو رہی ہے ایک تصویر کے دیکھنے سے جس قدر خیالات آناً فاناً دماغ میں آسکتے ہیں ایک لمبی چوڑی تحریر ان کا عشر عشیر بھی بہم نہیں پہنچا سکتی مصوری اگرچہ بے زبان ہے لیکن پھر بھی زبان ضرور رکھتی ہے دنیا کا ہر ایک متمدن فرد تصویر کو سمجھ سکتا ہے لیکن غیر زبان کی تحریر سمجھنا تو کجا پڑھ بھی نہیں سکتا۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے فنون لطیفہ کی ترقی کو روکا۔ لیکن یہ خیال غلطی پر مبنی ہے۔ اسلام نے فنون لطیفہ کی ترقی کو نہیں روکا بلکہ اس کی ایک شاخ "مصوری" کو ضرور روکا لیکن کیوں روکا؟ یہ بحث ذرا دقت طلب ہے۔ یہاں صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ بانی اسلام کو یہ خطرہ تھا کہ وہ جس حصن حصین کی بنیاد ڈال رہے ہیں اس کے تابعین کہیں اپنی گرد و پیش کی حالت سے متاثر ہو کر متزلزل نہ ہو جائیں اون کے پیش نظر تھا کہ روم کے بت رومیوں پر کیا اثر ڈال رہے تھے۔ یونان کے دیوتاؤں اور بہادروں کی مورتیں ان میں کیا درجہ رکھتی تھیں اور مصریوں کی بت پرستی اون کے اخلاق پر کیا رنگ جما رہی تھی۔ غرض انھیں امور کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ سنا دیا کہ اسلام مصوری کی اجازت نہیں دیتا اچھا اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ حکم امتناعی قطعی تھا یا قوم کی اخلاقی اور دماغی ترقی کے مطابق اس میں بھی تبدیلی کی

+ پسمسٹ اور آپٹیمسٹ حکما کے دو گروہ ہیں جو علی الترتیب دنیا کو برائی اور بھلائی سے مملو تصور کرتے ہیں۔

گنجایش بھی ہے؛ اس کا ثبوت کہ یہ حکم قطعی نہیں تھا تواریخ سے بھی ملتا ہے کیونکہ ان سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اس ممانعت کی پابندی ایک مدت کے بعد کی ہے اور جب تک وہ اس کو محض ویسی ہی خفیف ممنوعات سمجھتے رہے جیسے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا تو اوں میں اس کے رواج کا پتہ چلتا ہے سب سے پہلے خلفا ہی نے مصوری کی ممانعت کو توڑا کیونکہ ان کے سکوں کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے شبیہ ان پر بے دھڑک مسکوک کراتے تھے محقق مقریزی نے اکثر مسلمان مصورین کی سوانح قلم بند کی ہیں ان کا بیان ہے کہ ۲۶۶ھ میں جب خلیفہ "المنصور" کا قصر لوٹا گیا تھا تو اسی ہزار ٹکڑے مشجر کے نکلے تھے۔ جن پر خلفائے عرب ان کے اراکین اور جنگ آزماؤں کی تصاویر بنی ہوی تھیں محقق موصوف کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری المقدس میں عربوں کی مصوری قاہرہ میں پایۂ اعلیٰ کو پہونچی ہوی تھی علاوہ اس کے بہت سے عربی کتب با تصویر پائی گئی ہیں جو اُن کی مصوری پر دلالت کرتی ہیں "قصر الحمرا" کے بیت الشریعۃ، کی چھت میں جو تصاویر ہیں مثلاً امرائے عرب کی مجلس شوریٰ وغیرہ۔ یہ عربوں کی مصوری پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ان کے ملاحظہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو عربوں نے ذی روح اجسام کی تصویر کھینچنے میں کچھ نہ کچھ کمال ضرور پیدا کیا تھا لیکن یہ کمال مصوری کے اعلیٰ تر درجوں کے حاصل کرنے میں بمنزلہ درمیانی زینوں کے تھا اس درجہ سے اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرنے کے لئے "ایریل پرسپکٹیو" اور "لی نیر پرسپکٹو"* میں تھوڑی سی مہارت پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہونے پایا اور ایک خاص زمانہ کے بعد سے (جس وقت فقہا کی جو احکام مذہبی کی سخت پابندی چاہتے تھے۔ خوب چلتے تھے) ذوی الارواح کی تصاویر اسلامی صنعت سے بالکل خارج ہوگئیں اور وہی حالت آج تک برابر قایم ہے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ عملاً مصوری اور بت تراشی کے ممنوع ہونے سے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا انھیں تقریباً اتنا ہی نقصان پہنچا ہے جتنا اس وقت پہنچتا جبکہ وہ شاعری سے روک دئے جاتے۔ اس ممانعت سے وہ اس وجدانی مسرت سے محروم کر دئے گئے جو "فائیل" کی "میڈونا"* وغیرہ کے ملاحظہ سے پیدا ہوتی ہے مسلمانوں میں وہ انسانیت پیدا کرنے والا اثر مفقود ہے جو مثلاً "میکائیل انجیلو" کی "پائی ٹا" وغیرہ کے دیکھنے سے دل پر مترتب ہوتا ہے۔

فنون لطیفہ فنون حرفتی کی جان ہیں۔ اگرچہ ان دونوں میں نسبتاً فرق ضرور ہے لیکن بلا فنون لطیفہ کی مدد کے صنعت و حرفت کا تکملہ تقریباً محال ہے اور ساری وجہ یہی ہے کہ ہم فنون حرفتی سے بالکل بے بہرہ ہیں ہم نے فنون لطیفہ سے دلچسپی نہ لی اور ان کو بیکار سمجھ کر پس پشت ڈال دیا۔ اور آج غیر اقوام کے دست نگر ہو کر بے عزتی کا جینا جی رہے ہیں۔ الکاسب حبیب اللہ کے معنی خیز مطلب کو سمجھ رہے ہیں لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ قومی ذلت قومی نکبت

---

* (Aerial perspective) مصوری کا وہ فن ہے جسمیں تصویر کا اونچ نیچ گہراؤ۔ ابہراؤ۔ رنگوں کے ہلکا یا گہرا کرنے سے دکھایا جاتا ہے ۱۲

(linear perspective) مصوری کا وہ فن ہے جسمیں کسی چیز کی دوری اسطرح دکھائی جاتی ہو کہ وہ آنکھ سے جس قدر دور ہوتی جاتی ہو اسی قدر چھوٹی نظر آتی ہو ۱۲

* (Madonna) (میڈونا) لاطینی لفظ ہے جو حضرت مریم کی تصاویر پر بولا جاتا ہے ۱۲-

پیش نظر ہے لیکن جہالت کی پٹی آنکھوں سے جدا نہیں ہوتی خدا جانے وہ وقت کب آئیگا کہ ہم خود اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے کے قابل ہو سکیں گے ع

"بکسب کوش کہ کاسب بود حبیب اللہ"

سر ایف۔ لیسٹن نے اپنے اڈریس میں ظاہر کیا تھا کہ "فی زمانا آرٹ مادی ترقی کا ایک جزو اعظم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ہمارے اور ممالک غیر کے صنعتی مقابلہ کا انحصار صرف اعلیٰ یا پائیدار اشیا ہی پر نہیں ہے بلکہ آج کل کسی شئے کی عمدگی کا یہ معیار سمجھا جا رہا ہے کہ وہ بالذات متناسب النقوش اور صنعتی حسن سے لبریز ہو اور یہی ایک ایسی چیز ہے جو مقبولیت عام کا تمغہ حاصل کر سکتی ہے۔"

رسکن کہتا ہے کہ "حقیقی صنعت میں دل۔ دماغ اور ہاتھ کی یکسانگی کی سخت ضرورت ہے" وہ کہتا ہے کہ "آرٹ کوئی آلہ تفنن طبع نہیں کہ اس کا شغل صرف فرصت کے گھنٹوں میں کیا جائے"۔ صنعت کا تعلق جس قدر دل سے ہے ہاتھ اور دماغ سے نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ جس دل میں کسی کا درد نہ ہو وہاں دماغ اور ہاتھ کیا کر سکتے ہیں۔

یہ اعتراض کہ باوجود لاانتہا قدرتی مناظر کے دلچسپیوں کے اور باوجود:۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

کے معنی خیز مطلب کے سمجھتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ انسان ان سے لطف نہ اٹھا کر اپنی صنعت کا تماشا دیکھے۔ بات اصل یہ ہے کہ قدرت نے انسان میں ایک خاص مادہ رکھا ہے کہ اس کو قدرتی اشیاء میں اس قدر لطف نہیں آتا جتنا کہ اسکی نقل میں۔ ایک بچھو یا کیکڑے کو اگر انسان دیکھے تو نفرت کریگا لیکن اگر اس کے ہاتھ میں اس کی بجنسہ نقل دیدی جائے پھر دیکھئے کہ وہ اس کو کس محویت سے دیکھیگا اسکی خواہش ہوگی کہ وہ چیز اسی کے قبضہ قدرت میں آجائے یا وہی اس کا صانع تصور کیا جائے۔ افلاطون کہتا ہے کہ "کسی شخص کا اس کی شبیہہ سے مقابلہ کرو تو شبیہہ کو شخص مذکور سے زیادہ خوبصورت پاؤ گے"، اس توجیہہ سے صاف ظاہر ہے کہ قدرت کا انسان میں ایسے صناعی کی قدرت بخشنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جہاں وہ اور عطیوں سے مالامال ہوا ہے اس سے بھی مستفید ہو۔ کفران نعمت ہوگا جو ہم اس نکتہ کے سمجھنے میں کوتاہی کرینگے جب خلفائے بنوت مآب کے زمانہ کی اس قدر قربت کے بعد اپنے مرز بوم کے سمجھتے ہوئے اس حکم امتناعی (جو فی الحقیقت ایسا تھا جس طرح سمجھا گیا) ضرورت نہ سمجھے تو ہم کو اپنے گرد و پیش کی حالت دیکھتے ہوئے اسکی کیا ضرورت ہے جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس حصن حصین میں باوجود امتداد زمانہ کے وہی استواری قایم ہے اور کوئی زبردست سے زبردست بیرونی خطرہ گزند نہیں پہونچا سکتا تو ایسی پابندی کیسی؟ بہرصورت یہ ضروری مسئلہ قابل غور ضرور ہے اور سخت ضرورت ہے کہ اس کو زیر بحث لاکر اس پر کافی روشنی ڈالی جائے اور جو کچھ فیصلہ ہو اسی کو اپنا دستور العمل بنایا جائے فقط

"ابوبکر" خورجوی

مقالاتِ حیدر

(مولنا سید علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی)

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیٔ ہنگامۂ بازارِ رسوائی نہ تھی

شغل خود بینی تھا۔ شانِ بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اُٹھتا گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھان آیا جوانی کے لئے
منزلوں گرد رم آہوے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم رندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر۔ انگڑائی نہ تھی

ترکِ لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوائے بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا۔ کہ طبعِ یار تھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

کون ہوں میں یاد ہوگا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

ترکِ الفت کرکے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تلووں سے کہیں
یوں کبھی رنگِ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی

ساتھ غیروں کے تھے ہم بھی دورِ ساغر میں شریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی

ہم سے بچکر تختِ پریوں کا نکل جاتا کہاں
اتنی بھی کوتہ کمندِ ناشکیبائی نہ تھی

کشتیٔ مے پر ہے اب تختِ سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر باد پیمائی نہ تھی

قلزمِ مے میں ہیں ہم سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گزری ہے کیونکر پیچ تاب اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو۔ کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں دو دل ملے دیکھے نہیں
اِن میں یک رنگی نہ تھی تو اون میں یکجائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اُس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب۔ کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج
ورنہ کچھ تیری بساط اے چرخ مینائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آجاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

ہم تھے ساقی تھا ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جس زمانہ میں بنائے چرخ مینائی نہ تھی

دیوانِ اردوئے غالب اور حضرت شوکت میرٹھی

ناظرین کو اس بات کی خبر نہیں کہ جب تک حضرت شوکت میرٹھی نے دیوان غالب کی ایک نامکمل سے شرح نہیں چھاپی تھی اُس وقت تک نسخوں میں چنداں اختلاف نہ تھا۔ انھوں نے جن اشعار کی شرح چھاپی اون اشعار میں خاطر خواہ تصرف کئے ہیں اور دو ایک جگہ کے سوا کہیں یہ بھی نہیں ظاہر کرتے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ تھا میں یہاں دوسرا لفظ مناسب سمجھتا ہوں یہ بڑا اخلاقی جرم ہے جو ہرگز قابل عفو نہ تھا اسی سبب سے یہ ہیچمدان بانِ اردو کا بہی خواہ اس امر پر مستعد ہوا کہ مرزا غالب مرحوم کا صحیح کیا ہوا نسخہ جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کے پروف کی کاپیاں سب میری نظر سے گزرے ہیں پیدا کیا اور شوکت صاحب کی شرح بھی منگوائی دونوں کا مقابلہ اول سے آخر تک کیا اُس سے ثابت ہو گیا کہ شوکت صاحب نے جو جو تحریفیں کی ہیں وہ کسی نسخہ میں نہیں پائی جاتیں ان تحریفوں کے جواب دہ قوم کے سامنے حضرت شوکت کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر کئی نسخے دیوان غالب کے موجود ہیں اور وہ سب کے سب باہم دگر مطابق ہیں امید ہے کہ ناظرین ان تحریفوں کو لاحظہ فرما کر محظوظ ہونگے۔ اور مضمون کا مطالعہ لُطف سے خالی نہ جائیگا میں تیس شعر غالب کے یہاں ایسے پیش کرتا ہوں۔ جس میں تحریف کرنے سے مطلب خبط ہو گیا اور جو معنے اوس کے شوکت صاحب نے گھڑے ہیں وہ بھی ملاحظہ میں پیش کئے دیتا ہوں مجھے یہ بھی امید ہے کہ جو لوگ زبان اردو کے ہوا خواہ اور غالب مرحوم کی معتقدین میں ہیں وہ اس مضمون کی قدر کرینگے اور بار بار اسے شایع کر کے عام لوگوں کو دھوکے سے بچائیں گے اور اہل قلم خود خامہ فرسائی فرمائیں گے تاکہ ان تحریفات کا استیصال اچھی طرح ہو جائے۔

اختلافات و تصرفات

(مشہور نسخے اور معنی)	(شوکت صاحب کے تحریفات)
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلی کون ہے	مانعِ وحشت خرابی ہائے لیلی کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا	خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

شوکت صاحب لفظ "وحشت خرامی" کو نہیں سمجھے اسی اردو دیوان میں غالب نے ایک جگہ "آرزو خرامی" بھی آیا ہے اور فتنہ خرامی و محشر خرامی تو مشہور لفظ ہیں۔ مگر حضرت شوکت کو وہم گزرا کہ لیلی تو معشوقہ تھی

شرح میں لکھتے ہیں "اے خرابی ہائے لیلی تمھارے سوا مجنوں کی وحشت کا کوئی مانع نہیں"

شوکت صاحب اس غزل کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حالی نے اس غزل کو

(مشہور نسخے اور معنی)		(شوکت صاحب کے تحریفات)
اُس کی طرف وحشت خرامی کی اضافت کیونکر درست ہوسکتی ہے۔		بالکل بے معنی لکھدیا اون کو شرم نہ آئی کہ اپنے اُستاد کو مہمل قرار دیدیا۔ ہمارے شعراء میں نازک کلام سمجھنے کی لیاقت نہیں۔ اب حالی صاحب کے انتقال کے بعد آپ رسالہ نظارہ میں لکھتے ہیں ہم نے حضرت حالی کو اس غزل کی شرح دکھائی حیرت میں رہ گئے اور عذر و معذرت کرنے لگے۔
نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا	۲	نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے کہ حیرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا
سیدھی بات ہے کہ خط کو کیوں طول دو یہ لکھ دو کہ بیان کی حسرت رہ گئی		شرح میں لکھتے ہیں "اے غالب نامہ کو اس قدر طول نہ دے صرف یہ لکھدے کہ میں متحیر ہوں کس کس ظلم کا بیان کروں" سمجھ میں نہیں آتا کہ نامہ کو طول دینا کس زبان کا محاورہ ہے۔
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا	۳	حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
یعنے بہار ہے بھی تو کیا۔ مہندی کا رنگ ہے جو اُڑ جانے والا ہے۔		شرح کرتے ہیں "اگر بہار یہی ہے جس کو ہم بڑی خوشی سے دیکھ رہے ہیں تو یہ درحقیقت خزاں کے پاؤں کی مہندی ہے"
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا	۴	بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرنے میں کہ لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یعنی ایک جھلک دکھا کر ہٹ گئے تو کیا۔ بات کی ہوتی کہ مجھے اسکی بھی تمنا ہے۔ شوکت صاحب نے جو خت ربود کیا اُس سے شعر کی مٹی خراب ہوگئی۔		"اس قدر ضعف مجھ پہ طاری ہے کہ جب بات کرتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ میرا لب فریاد کا تشنہ ہے اور جب بجلی چمکیگی تو بارش ضرور ہوگی۔"
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا	۵	رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی ہے عذر نہ کرنا گناہ کا
یعنے ہم شرمندگی سے توبہ نہ کریں تو بعید نہیں کہ اُس کی رحمت اسی بات کو پسند کرے۔		"ہم جو عذر نہیں کرتے تو اس کا بڑا باعث شرمندگی ہے" دیکھئے (سے) کی جگہ (ہے) لگا دینے سے معنی شعر کے کیا سے کیا ہوگئے۔
دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہونا	۶	دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام مٹ گیا گھلنے میں اس عقدہ کا وا ہونا

(مشہور نسخے اور معنی)

رنج زحمت کی تدبیروں سے وہ کشمکش ہوئی کہ دل ہی تمام ہوگیا۔ گویا ایک گرہ تھی گھس پس کر فنا ہوگئی اب کھلے گی کیا۔

۷

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

دشنہ و خنجر سے ناز و غمزہ کو تشبیہ دیکر ہم کام نکالتے ہیں یعنے اون کی تاثیر کو سمجھا دیتے ہیں۔

۸

فنا کو سونپ۔ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر اپنی حقیقت کا عارف ہونا چاہتا ہے تو فنا فی اللہ ہوکر فروغ معرفت حاصل کر۔

۹

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز

یعنے داغ عشق اب نہیں ہے تو میں اُس کا تذکرہ ہی کرکے دل خوش کر لیا کرتا ہوں۔ مفلسوں کا قاعدہ ہے کہ پرانے زمانہ کی دولتمندی کو یاد کیا کرتے ہیں کہ ہم بھی کبھی ایسے تھے۔

۱۰

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

یعنے فلک نے آغوش ہلال کو کھولا ہے کہ آفتاب کو وداع کرے ایک جگہ اور غالب نے کہا ہے ؎
چشم وا گردیدہ آغوشِ وداع جلوہ ہے۔

۱۱

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

(شوکت صاحب کے تحریفات)

”سخت گرہ کو جب کھولنا چاہتے ہیں تو دست بدست رہ کر زیادہ سخت ہو جاتی ہے پس کھلنے ہی میں یہ گرہ لاحل ہوگئی“

۷

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں نام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

فرماتے ہیں ”ناز و غمزہ کا نام اُس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک اون کو دشنہ و خنجر نہ کہا جائے“

۸

فنا کو سونپ کر۔ مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

”خاشاک اپنے کو فنا کے ہات میں سونپ کر اپنی حقیقت یعنے فنا ہو جانے کے اور اک کا مشتاق ہے پس اُس کے طالع کا فروغ گلخن پر موقوف ہے“ شوکت صاحب نے (گر) کی جگہ (کر) پڑھا اس سے شعر کے معنے گئے گزرے۔

۹

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
جوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز

”جس طرح گل فروش اپنے پھولوں کی شوخی پر خوش ہوتا ہے اسی طرح مفلس اپنے پرانے داغ حسرت پر خوش ہیں۔“

۱۰

جادہ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ ادا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

”آسمان ماہ نو کو آغوش وداع کی صورت میں ظاہر کرکے رسم معانقہ وداع ادا کرتا ہے“ رسم کا لفظ تو آپ ہی نے بڑھایا یہ کہیے کہ آغوش وداع ادا کرتا ہے۔

۱۱

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

(مشہور نسخے اور معنی)

یعنی تیرے خیال سے روح پھڑکنے لگتی ہے جیسے یہاں شوکت صاحب نے لفظ اہتزاز کو نہیں سمجھے

۱۲

ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

یعنی جو گریباں کہ چاک ہو کر دامن پر نہ آپڑے وہ پیراہن کے لئے باعث ننگ ہے۔

۱۳

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ضعف تو چاروں طرف سے پیسے ڈالتا ہے قد جھکے تو کیونکر جھکے اور کدھر جھکے یعنی ضعیفی میں پشت کے خم نہ ہونے کا سبب ہجوم ضعف ہے

۱۴

تماشا۔ کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں۔

فارسی والے کہتے ہیں - مددے - یعنی مدد کر۔ نگاہے یعنی نگاہ کر تماشائے یعنی تماشا دیکھ۔ اسی محاورہ کے موافق مصنف نے یہاں فعل کو محذوف کیا ہے۔

۱۵

سراغِ تفِ نالہ۔ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

جس طرح صبح کو نقش قدم دیکھ کر شب رو کا سراغ لگ جاتا ہے کہ ادھر سے آیا اور ادھر گیا - اسی طرح داغ دل سے نالۂ شب کی تاب و تب کا پتہ مل سکتا ہے نالہ کو شب رو اس وجہ سے کہا ہے کہ نالہ کشی کا وقت رات کو ہوا کرتا ہے۔

(شوکت صاحب کے تحریفات)

"روح بھی تیرے خیال سے یوں احتراز کرتی ہے جیسے شمع" اہتزاز سے شوق نکلتا ہے اور احتراز سے خوف دیکھئے ذرا سے تصرف میں شعر کی مٹی خراب ہو گئی

ہے گریباں تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں

"اگر پیراہن میں دامن نہیں تو گریباں تنگ ہے۔ یعنی خود دق ہے۔"
شوکت صاحب سے کوئی پوچھے کہ پیراہن جو دامن میں نہیں - یہی معنی کیا رکھتا ہے کہ پیراہن میں دامن نہیں اور پھر بھی شعر مہمل کا مہمل رہا۔

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی آسائش مرے تن میں نہیں

ضعف اتنی بھی مہلت نہیں دیتا کہ قد کے جھکنے ہی سے میرا تن آسائش پا سکے۔

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

"ذرا اس کا بھی تو تماشا کر کہ جیسا تو آئینہ میں محو ہے اسی طرح ہم تیری صورت میں محو ہیں"
شوکت صاحب یہ نہ سمجھے کہ تماشا کرنا محاورہ کے خلاف ہے یہاں تماشا دیکھنا مقصود ہے اور تماشا کرنا دوسری چیز ہے۔

سراغ تف نالہ داغ دل لے
کہ شب رو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

"غالب استفہاماً کہتا ہے کہ ہم داغ دل کے نالہ کی گرمی کا سراغ لگاتے ہیں یا شب رو کا نقش قدم۔ یعنی داغ دل کی گرمی نالہ بن کر اڑ گئی اب اس کا سراغ لگانا گویا شب رو کے نقش قدم کا ڈھونڈنا ہے داغ چونکہ سیاہ ہوتا ہے اس لئے اس کو شب قرار دیا۔ یعنے دونوں باتیں محال ہیں"
شوکت صاحب نے غت ربود کر دیا اور یہ نہ بتایا کہ دلے اس شعر میں کیا ہے - کیا یہ امر نہیں ہے۔

(مشہور نسخے اور معنی)

۱۶ رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے

۱۷ عشق و مزدوری عشرتگہہ خسرو کیا خوب

شوکت صاحب نے عشرتگہ کی جگہ عشرت کدہ چپکے سے بنا دیا ہے اور یہ نہ سمجھے کہ مصرع ناموزوں ہوگیا۔ پھر یہ وزن بھی کوئی مشکل وزن نہیں جس کا ناموزوں ہوجانا چھپا رہے آدمیاں گم شدند۔

۱۸ کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

یعنی گھر بھی مثل صحرا کے ویراں ہے مگر وسعت اتنی کہاں۔

۱۹ بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں

آہ کے بار بار ابھرنے کو اور بار بار ضبط کرنے کو رشتۂ بخیہ گر کی حرکت سے تشبیہ دی ہے۔

۲۰ دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی

کاوش مژگاں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دل میں ہے۔

(شوکت صاحب کے تحریفات)

دو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے

عشق و مزدوری عشرت کدۂ خسرو کیا خوب

"کوہکن نے اپنے رقیب کے عشرت کدہ بنانے کی مزدوری کی تھی۔"

کم نہیں وہ بھی خرابی میں۔ کہ وسعت معلوم
دشت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جنگل بھی ویران ہونے میں گھر سے کم نہیں کیونکہ مجھے اسکی وسعت معلوم ہے"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میری آنکھیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں

شوکت صاحب فرماتے ہیں "معشوق کا سینہ جس قدر ابھرا اسی قدر میری آنکھیں ابھریں بالآخر اس کے چاک گریباں کا بخیہ بن گئیں" شعر سمجھ میں نہ آیا تو آہیں کی جگہ چپکے سے آنکھیں بنا دیا۔ یہ اخلاقی جرم اس لئے کیا گیا کہ بے اس کے شارح ہونے کا فخر نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔

دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روک سی

"دل صف مژگاں کو روکنا چاہتا ہے" دل میں رکاوٹ سی بولتے ہیں روک سی نہ سنا تھا شرح میں آپ لکھتے ہیں تمام نسخوں میں روکشی لکھا ہوا ہے اور چاہئے تھا روک سی۔ پھر ایک مضمون میں نظارہ کے آپ ہی یوں دھوکا دیتے ہیں کہ کسی نسخہ میں روکشی کی جگہ روک سی ہے گر چاہئے تھا روکئے ہرگز کسی نسخہ میں روک سی نہیں آپ اپنی پہلی تحریف سے پشیمان ہوکر جھوٹ موٹ نسخہ کا نام لیتے ہیں غرض پہلے آپ ہی نے یہ تصرف لغو کیا تھا کہ صف مژگاں سے روک سی اب آپ ہی یہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ صف مژگاں کو روکئے لیجئے "سے" کی جگہ "کو" آپ خود ہی بنا رہے ہیں کہ کسی طرح روکئے کی کل ٹھیک بیٹھے غنیمت ہے کہ اس تحریف میں آپ نے اپنے تصرف کا خلاف عادت اقرار و اظہار تو کیا ورنہ انھیں تمام

(مشہور نسخے اور معنی)

(شوکت صاحب کے تحریفات)

اشعار میں جو میں نے آج کے مضمون میں مقابلہ کر کے پیش کئے آپ کا یہ اخلاقی جرم انجمن ترقی اردو کبھی نہیں معاف کرے گی کہ غالب کے اشعار میں چپکے سے لفظ بدل دیتے ہیں اور یہ بھی نہیں بتاتے کہ اصل کیا تھی اور خود کیا تصرف کیا۔

۲۱

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم

کلی جب تک کھلے کھلے سامان برگ عافیت کا حاصل ہونا کہاں سے معلوم ہے یہ معنی غالب نے خود عود ہندی میں بیان کئے ہیں۔

غنچہ نا شگفتنہا برگ عافیت معلوم

"یعنے نہ کھلنے ہی کا نام غنچہ ہے پس سامان آسایش کجا"

۲۲

ساقیگری کی شرم کرو آج الخ

ساقی گری کا لفظ ویسا ہی ہے جیسے نشی گری میلی کہتا ہے ؎

شرمندۂ آدمی گری ہائے تو ام

ظفر کہتا ہے ؎ کند حق صوفیگری را ادار

ولی دکنی کہتا ہے ؎ ترقی ساقی گری کو لالۂ باغ کھڑا ہے منتظر ہو جام لے کر

ساقی گرے کی شرم کرو آج الخ

شوکت صاحب نے غضب کیا ہے فرماتے ہیں "آج ہمارا بدمستی میں گر جانا اتفاقی امر ہے۔ پس ہمارا گر جانا تیرے لئے قابل شرم ہے نہ کہ جائے طعن" ساقی کو منادی بنا کر یہ بھی نہ خیال کیا کہ اے ساقی شرم کرو۔ کہاں کا محاورہ ہے۔

۲۳

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے

نشہ باندازہ خمار نہیں ہے

یعنے حیات دنیا میں جو تکلیفیں ہیں اس کی تلافی جنت میں جانے سے نہیں ہو سکتی پھر اس کی مثال دی ہے کہ جس نے خمار کی تکلیف بہت اٹھائی ہو اسے تھوڑی سی شراب ملے تو کیا نشہ ہوگا۔

دیتے ہیں جنت عبادت دہر کے بدلے

نشہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ساری عمر عبادت کرو تب جنت ملے یہ نشہ تو خمار کے اندازے کے موافق نہیں یعنے بہت کم ہے" شوکت صاحب نے حیات کو سہو کاتب سمجھ کر عبادت کا لفظ بنا تو دیا مگر یہ نہ سمجھے کہ مصرع ناموزون ہو گیا اور معنی یہ ہوئے کہ عبادت کرنے میں بڑی تکلیف ہے اس کے عوض میں جنت کا ملنا بہت ہی ادنیٰ صلہ ہے

۲۴

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی

یعنے غم زمانہ نے سب نشہ اتار دئے۔ کسی بدذات لونڈی غلام کو سزا ملتی ہے تو کہتے ہیں آج اسکی مستی جھڑ گئی یہ زبان اردو کا خاص محاورہ ہے۔

غم زمانہ میں چھائی نشاط عشق کی مستی

"اب زمانہ بھر کے غم میں ہم پر نشاط عشق کی مستی چھا گئی" شوکت صاحب مستی جھاڑنے کے محاورہ کو نہ سمجھے تو تحریف کر دی۔ یہ نہ سمجھے کہ غم سے مستی دور ہوتی ہے یا چھا جاتی ہے۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

کھیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے بنائے نہ بنے

(مشہور نسخے اور معنی)

یعنے کاش یہی ہو کہ بن میرے ستائے انھیں چین نہ آے۔

(شوکت صاحب کے تحریفات)

"خدا ایسا بھی کرے کہ بغیر میرے اون کی بن ہی نہ سکے"

شوکت صاحب یہ تو فرمائیں کہ ستائے میں کیا قباحت تھی جو آپ نے تحریف کردی یہ بھی نہ کہا کہ یوں تھا مگر یوں ہونا چاہئے۔

۲۶

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

اے زاہد قدح شراب کو رد نہ کر۔ یہ ساز نگ مکھی کی قے نہیں ہے (شہد) جسے تو بڑی نعمت سمجھتا ہے۔

کیوں ردو قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی سلے نہیں ہے

فرماتے ہیں "زاہد کی رد و قدح شراب کے مقابلہ میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کم نہیں"

۲۷

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائے

قفس سے رہا ہو کر زندگی از سر نو ہو جانا محتاج ثبوت تھا اُسے بیضہ آسا کہہ کر مصنف نے ثابت کیا یعنے طائر کی نئی زندگی بیضہ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے اسی طرح اس کنج قفس سے یعنے بیضہ فلک سے رہا ہونے کے بعد نئی زندگی عالم ارواح میں شروع ہوگی۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر یہ ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائے

"قفس انڈے کی طرح بال و پر پر تنگ ہو رہا ہے پس از سر نو زندگی پا کر اس قفس (زندگی) سے رہائی پائیں اور اذیت سے نکلیں"

۲۸

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ
کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

یعنے جس دروازہ سے وہ جھانکتا ہے اُس میں روزن نہ سمجھو بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی ایسا گہرا جس میں سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے۔

جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس دینے لگے وہ ضرور مہلک ہوتا ہے۔

نہ پوچھ سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ
کہ زخم روزن در ہے ہوا نکلتی ہے

"عاشق کے سینہ سے آب تیغ مت پوچھ۔ کیونکہ سینے کا زخم گویا دروازہ کا روزن ہے اُس سے ہوا نکل رہی ہے وہ زخم کو خود خشک کردے گی پونچھنے کی حاجت نہیں۔

۲۹

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ

قفس بمعنی سبد ہے یعنے قمری ایک مٹھی بھر خاک اور بلبل ایک ٹوکری بھر رنگ ہے۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفسی رنگ

"قمری کا رنگ خاکستری اور بلبل کا سیاہ آہنی پنجرے کے ہمشکل ہوتا ہے۔"

پھر کہتے ہیں تمام نسخوں میں قفس رنگ غلط طبع ہوا ہے بلکہ قفسی رنگ چاہئے" غنیمت ہے کہ یہاں بھی اپنے تصرف کا اظہار کر دیا ہے"

۳۰

قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

قسمت کھلی ترے قد و رخ کے ظہور کی

(مشہور نسخے اور معنی)

تجلی کو تیرے قد و رخ کا انتظار تھا کہ ایسی شکل ملے تو اس میں ظہور کروں۔

(شوکت صاحب کے تحریفات)

"تیرے قد و رخ کے ظہور کی قسمت کھل گئی - وہ نور - اس شکل میں ظاہر ہوا"

ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ

ناشاد بیوہ

حضرت رعد جونپوری نے "ناشاد بیوہ" میں حسرت و ارمان او بیوہ کی صحیح حالت کا جو دردناک اور موثر فوٹو کھینچا ہے وہ اون کا حصہ ہے نظم کی دلگدازی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ جتنی بار پڑھو دل بے اختیار ہو جاتا ہے اور آنکھیں بھر آتی ہیں۔

ایڈیٹر

اے حسرتو خدارا مجھکو نہ اب ستاؤ
للہ اے امنگو دل میں مرے نہ آؤ
بہر خدا نہ چھیڑو بیوہ ہوں رحم کھاؤ
مجھکو سنگار کی اب رغبت نہ تم دلاؤ
اترا ہوا سا چہرہ کیا آرسی میں دیکھوں
مغموم شکل اپنی میں کس خوشی میں دیکھوں

کس کو سناؤں اپنی حسرت بھری کہانی
سنتا ہے کون میری مجھ سے مری زبانی
یہ روگ وہ ہے جسمیں اکدن ہے جان جانی
برباد ہو رہی ہے اٹھتی ہوئی جوانی
جینے سے تنگ جی ہے بیزار ہو گئی ہوں
جس دن سے وہ مرے ہیں بیمار ہو گئی ہوں

رنگین کوئی کپڑا بھاتا نہیں بدن کو
پان اور مسی کا چرچا بھاتا نہیں ہے دلکو
اب آہ کوئی گہنا بھاتا نہیں بدن کو
آئینہ کا تماشا بھاتا نہیں ہے دل کو
پھولوں میں اب وہ خوشبو آتی نہیں ہے مجھکو
برگ حنا کی رنگت بھاتی نہیں ہے مجھکو

دل میں ہے درد فرقت لب پر ہے آہ و زاری
رہتے ہیں چشم تر سے ہر وقت اشک جاری
سوز غم جدائی ہے اف رے بیقراری
کروٹ بدل بدل کے کٹتی ہے رات ساری
تا صبح ہو کے مضطر دل کو مسوستی ہوں
ہر دم تڑپ تڑپ کے قسمت کو کوستی ہوں

ہمجولیوں میں جاتے آتی ہے شرم مجھکو
ساتھ اونکے گیت گاتے آتی ہے شرم مجھکو
ہنسکر انھیں ہنساتے آتی ہے شرم مجھکو
اب دل کو گدگداتے آتی ہے شرم مجھکو
کاشانۂ الم میں اک گوشہ گیر ہوں میں
کنج قفس میں گویا مرغ اسیر ہوں میں

رعد (جونپوری)

مستزاد اخلاقی

دوست ملتا ہے کہاں دوست کو عنقا سمجھو
ہے اگر عقل رسا
ایک بھی دوست جو مل جائے تو یکتا سمجھو
یہ ہے معنی وفا

تجربہ ہونے پہ کھل جائیگا سارا احوال
نیک یا بد تھا
سمجھے اچھا جو تمھیں تم اسے اچھا سمجھو
دیکھ کر لطف و عطا

لوگ ایسے ہیں بہت جنمیں محبت ہی نہیں
تجربہ دوستی میں
دس میں دو اک کو محبت سے شناسا سمجھو
ہے اگر فہم رسا

نخوت و شر و حسد جسمیں ہو وہ ہے بشر
بلکہ ہے [illegible]
جوہر نیک کو تم گوہر یکتا سمجھو
تم سمجھو تم کو خدا

نفس امارہ ہے اک آفت اس آفت سے بچو
ایسی مصیبت سے بچو
ہے اگر عقل مصیبت کو جدا ہی سمجھو
دور ہوتا ہے بلا

جان دی عقل دی ایمان تمھیں خالق نے دیا
کرو شکر اسکا ادا
بندے کہلاتے ہو جسکے اسے مولا سمجھو
آسمو تو اس کو نہ ذرا

راستی مانع تکلیف و مذلت ہے ذہین ہے یا زندگی
کرو قدر اسکی اسے نعمت عظمیٰ سمجھو یہ تو حق جزا

سید غلام مصطفیٰ (ذہین)

نتیجہ یاس

ابرِ غم ہے آرزوؤں پر مرے چھایا ہوا آہ۔ نومیدی مطلق سے ہوں گھبرایا ہوا
زندگی ہے ہر طرف سے آہ محصورِ الم جان بھی مجبورِ غم ہے دل بھی مجبورِ الم
اب کوئی شئے وجہِ تسکینِ دلِ محزوں نہیں لطف پرور دل فریبیاں گونا گوں نہیں
مستتر ہر منظرِ دلکش میں ہے افسردگی بڑھتی ہی جاتی ہے قلبِ زار کی پژمردگی
اب شعاعِ زندگی روپوش ہو جانے کو ہے سازِ ہستی ہی مرا خاموش ہو جانے کو ہے
ختم ہونے ہی کو ہیں لیل و نہارِ زندگی بجھنے والا ہے کوئی دم میں شرارِ زندگی

موت کہتے ہیں جسے ارشد وہ ہے نامِ سکوں
یا عوض ہے خوابِ اجل مخموری جامِ سکوں

ارشد (تھانوی)

تربتِ لیلیٰ

ایک دن جا نکلا میں گھر سے بیاباں میں کہیں دیکھکر لیلیٰ کی تربت ہل گیا قلبِ حزیں
بیخودی میں رکھدی سجدہ کیلئے اس پر جبیں اور کہا یوں تو وہی ہے لیلیٰ محمل نشیں

جسکی حسرت میں سدا رہتی تھی وا آغوشِ قیس
آج ہے کنجِ لحد وا حسرتا آغوشِ قیس

حسن کی دیوی تھی تو تھی چاند سی صورت تری اب صنم خانوں میں بھی ملتی نہیں مورت تری
قیس پر کیا کیا قیامت کر گئی الفت تری شاق تھی عشاق پر اک لمحہ کو فرقت تری

اب نہ مجنوں کو تری چاہت نہ کوئی پاس ہے
رو رہی ہیں حسرتیں تربت پہ گریاں یاس ہے

وہ تبسم ہے لبِ نازک پہ اب بھی یا نہیں پھول گلشن میں ہوا کرتے تھے جس سے سرنگیں
فرشِ گل آرام کو ہے یا کہ صحرا کی زمیں چاہنے والا ہے اب بھی یا کوئی کوئی بھی نہیں

چادرِ تربت میں کیوں محمل نشیں روپوش ہے
کچھ تو بتلا کیا سبب ہے کس لئے خاموش ہے

آ کے اندر دیکھ لوں تربت میں تیرا حال زار پھول سے رخسار میں باقی رہی ہے کچھ بہار
اب بھی ہے کاکل کے اندر نکہتِ مشکِ تتار سنگِ مدفن تیری چھاتی پر ہے یا پھولوں کے ہار

قیس کی پیاری تری حالت پہ دل غمناک ہے
نرگسیں آنکھوں میں اب تو سرمہ کی جا خاک ہے

یوں ندا تربت سے آئی اور ملا مجھکو جواب موت پر جادو حسینوں کا نہیں چلتا جناب
ہاں لبِ لعلیں کی لالی اور دُرِ دنداں کی آب بہگئی سیلِ فنا میں حسن تھا جھوٹا سا خواب

تیرے ہی عشاق میں مجنوں بھی اک ناشاد تھا
میں وہی لیلیٰ ہوں جس کا حسن بے بنیاد تھا

شمعِ تربت جل رہی ہے وہ بھی یاس ہے حسرتیں بھی جارہی ہیں جسکے پاس ہے
میرا دل صحرا میں گھبرائے نہ کس کی آس ہے آج مجنوں کا جنوں بدلا عجب وسواس ہے

آہ اب تو لحد سے کوئی خبر آتی نہیں
کیوں طبیعت قیس کی فرقت میں گھبراتی نہیں

بے نشاں اُبھرا ہوا سینہ کا جوبن ہو گیا دشتِ مجنوں کی طرح میرا بھی مسکن ہو گیا
ٹوٹ کر تربت عیاں سوراخِ مدفن ہو گیا اُس پہ مکڑی نے تنا جالا تو چلمن ہو گیا

اب کوئی آغوش میں لیتا نہیں ہے پیار سے
گل کی تربت پر ہوئی ہے پاسبانی خار سے

عالمِ فانی کو دیکھا اک تماشا گاہ ہے ہستی موہوم ہی گویا عدم کی راہ ہے
سب فنا ہو جائینگے باقی فقط اللہ ہے بے خبر ہے حسنِ دو روزہ کی جسکو چاہ ہے

سینۂ نازک کہ جس پر بار تھے پھولوں کے ہار
دوستوں نے اب اُسی پر رکھدیا سنگِ مزار

سبزۂ تربت نقابِ روئے زیبا ہو گیا گلِ خوں کا چادرِ مدفن سے پردہ ہو گیا
بن گیا نرگس جو دیدہ یاس کا وا ہو گیا جب کھلا داغِ جگر تربت پہ لالہ ہو گیا

چاند سی صورت پہ اے خورشید مت کھا فریب
لا احب الآفلین پڑھ لے پئے صبر و شکیب

خورشید حسن (خورشید)

سمجھو

اپنی ہر بات کو گنجینۂ گوہر سمجھو
اپنے ہر دم کو مسیحا کے برابر سمجھو

مالداری کی تمنا ہے اگر دل آزار
کوئی اپنا سا نہ دنیا میں تونگر سمجھو

حکمرانی و حکومت ہے اگر مد نظر
اپنے قبضہ سے کسی شے کو نہ باہر سمجھو

دل میں گر حسرت و ارمان شہنشاہی ہے
اپنے تقدیر کا اپنے کو سکندر سمجھو

بادہ پیمائی کا آجائے اگر دل میں خیال
مہ و خورشید کو پیمانہ و ساغر سمجھو

فرس و فیل کو دروازہ پہ حاضر مانو
ان کی رفتار کو غیرت دہ صرصر سمجھو

حور و غلماں کو غلاموں سے بھی کمتر سمجھو
قصر جمشید کو کاشانہ احقر سمجھو

عیش و عشرت کی ہر اک چیز مہیا جانو
سارے ارمانوں کے سامان میسر سمجھو

اور سلاطین گزشتہ کی طرح جیتے جی
اپنے کو آپ کسی قبر کے اندر سمجھو

یہ سمجھنے ہی کی باتیں ہیں نہ سمجھو تو کہو
مقصد سیفی گمنام کو کیونکر سمجھو

سیفی (بیدی)

غزلیات

(جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل)

نہ یہ جنوں تھا نہ اے دل یہ اضطراب مجھے
خراب تو نے کیا خانماں خراب مجھے

وہ کہتے ہیں کہ نہیں حاجت شراب مجھے
شراب سے ہے سوا نشہ شباب مجھے

یہ بانکپن ہے کہ میں جب کوئی سوال کروں
زبان تیغ سے دیتا ہے وہ جواب مجھے

کسی کے بوسۂ لب نے مزا دیا ایسا
کہ رفتہ رفتہ کیا خوگر شراب مجھے

گلے لگا کے اسے خون دل پلایا ہے
کریگا یاد بہت خنجر خوش آب مجھے

محبت ایک طرف سے مزا نہیں دیتی
کچھ اضطراب تجھے ہو کچھ اضطراب مجھے

ہوا جواب کا خواہاں جو انکو خط لکھکر
مری امید نے پہلے دیا جواب مجھے

میں اپنے منہ سے کروں کیا سوال ساقی سے
زبان حال ہے گویا کہ دے شراب مجھے

یہی سبب ہے جو لذت ہے بیقراری میں
ملا ہے یار کی شوخی سے اضطراب مجھے

جلن یہ کب کی نکالی ہے ساقیا تو نے
شراب غیر کو دیکر کیا کباب مجھے

سوال وصل کو ٹالا ہے کس صفائی سے
دیا جواب کہ آتا نہیں حجاب مجھے

مری نگاہ کو محروم دید رکھتی ہے
رقیب جانتی ہے یار کی نقاب مجھے

تجھے تو بھول بھی جاؤں مگر یہ مشکل ہے
کہ بھول جائے ترا حسن لاجواب مجھے

جلیل پیر مغاں کی خصوصیت کیا ہے
مرید ہوں میں اسی کا جو دے شراب مجھے

(تازہ غزل مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے)

میں ہوں کیا میری محبت کی حقیقت کیا ہے
اس نے یہ بھی تو نہ پوچھا تری حالت کیا ہے

ہم کو واعظ یہ خبر ہے کہ جنت کیا ہے
کوچۂ یار سے لیکن اسے نسبت کیا ہے

جسکی ذلت میں بھی عزت ہے سزا میں بھی مزا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت کیا ہے

مجھ سے برگشتہ نہ ہوتے تو تعجب ہوتا
آپ کو عذر تغافل کی ضرورت کیا ہے

کیوں ہے در پردہ لگاوٹ جو بظاہر ہے گریز
نہ کھلا کچھ نگۂ یار کی نیت کیا ہے

شادماں ہو کے ترے درد سے کہتا ہے یہ دل
ہے اذیت جو یہی چیز تو راحت کیا ہے

خوف ہے انکو تو ہو حسن کی بدنامی کا
ہم ہیں عاشق ہمیں پروائے ملامت کیا ہے

تم یہ پھر بھی تو نہ سمجھے کہ کرم ہے کیا شے
ہم نے پھر بھی تو نہ جانا کہ شکایت کیا ہے

رند مے نوش کبھی صوفی صافی ہے کبھی
حسرت آخر یہ ترا رنگ طبیعت کیا ہے

(منشی سید معراج رسول صاحب معراج تعلقدار سندیلہ)

رواں جو میرا سراپا جمال ہوتا ہے
نشان پائے حنائی ہلال ہوتا ہے

جہاں کی راحت و تکلیف سب خیالی ہے
عبث جفائے فلک پر ملال ہوتا ہے

نہ تاب جلوہ نظر کو نہ دل کو تاب وصال
کسے خبر ہے کہ کیا اپنا حال ہوتا ہے

نوید وصل نے ہم کو کیا ہے شادی مرگ
بہت خوشی کا نتیجہ ملال ہوتا ہے

اشارے غیر سے کیا ہیں لگا کے خنجر
کہ لے چھری کوئی ناحق حلال ہوتا ہے

روش سے خاک نہ مانہ کی بچ سکے کوئی
کہ ذرہ ذرہ یہاں پائمال ہوتا ہے

غزلیات

بہار ساتھ نہ دو دن بھی دے گی وحشت کا
دل اس روش پہ عبث پائمال ہوتا ہے

زبانِ حال سے کہتا ہے ہنس کے زخمِ جگر
خوشی کے پردہ میں پنہاں ملال ہوتا ہے

جو پوچھ لیتے ہیں ہنسکر کبھی وہ آکے مزاج
تو بس نہ پوچھئے جو اپنا حال ہوتا ہے

(مولوی سید علی اکبر صاحب بلگرامی۔ کوثر)

عالمِ امکاں میں کچھ اسکے سوا ملتا نہیں
کیا قیامت ہے جو پھر اس کا پتا ملتا نہیں

ہے غلط دعویٰ کہ دل کا مدعا ملتا نہیں
سعی صادق ہو تو پھر انساں کو کیا ملتا نہیں

جذبۂ بے اختیارِ شوق موسیٰ کو نہ تھا
ہم بھی چلکر دیکھ لیں کیونکر خدا ملتا نہیں

درد ہی وہ کیا ہے درماں کی ہو جسکو احتیاج
جس پہ ہم غش ہیں وہ دردِ لادوا ملتا نہیں

آسرا مفقود ساحل دور اور یہ بیکسی
آ گئی کشتی بھنور میں ناخدا ملتا نہیں

عمر گزری ہے لگائے اوس ستمگر کا سراغ
دل میں رہتا ہے مگر اُس کا پتا ملتا نہیں

ڈھونڈ مارا چھان ڈالا رازِ مکان و لامکاں
ہستیِ مطلق ہے کچھ اسکے سوا ملتا نہیں

بوئے گلشن کیا کروں خوشبوئے گیسو چاہئے
کیا تجھے اس کا پتا بادِ صبا ملتا نہیں

درد پہلو میں وہی باقی ہے لیکن ہے کہاں
جستجو میں ہوں مگر درد آشنا ملتا نہیں

جانے والے جا رہے ہیں اندن کے سوئے عدم
ہے فقط بانگِ جرس اور قافلا ملتا نہیں

اس طرف موسیٰ جگر داری کے دعوے سے اٹھے
اُس طرف سے یہ صدا آئی خدا ملتا نہیں

ہستیِ معدومِ انسانی میں کی میں نے تلاش
خود نمائی ہر جگہ پائی خدا ملتا نہیں

اشتیاقِ دیدِ آخر کوچہ گردی تا بکے
ملتے ہیں اپنے ہی نقشِ پا خدا ملتا نہیں

وصل کی شادی نے آخر مجھکو بیخود کر دیا
گم گئے جب آپ تو اپنا پتا ملتا نہیں

یاس و ارماں کی کشاکش میں ہے کوثر جاں نزار
کس طرف ڈھونڈیں کہاں پائیں خدا ملتا نہیں

(مولوی علی اختر صاحب اختر جعفری)

غیروں کے یہاں رہنا غیروں سے وفا کرنا
تم مجھ پہ ستم کرنا تم مجھ پہ جفا کرنا

اپنوں کو برا کہنا غیروں سے وفا کرنا
کہنا ہے تو کیا کہنا کرنا ہے تو کیا کرنا

غور کیجے میں نے تقدیر کے لکھے
محرومیِ قسمت کا کیا تم سے گلا کرنا

تو اور مجھے ہر دم غیروں میں گنا کرنا
میں اور ترے حق میں دن رات دعا کرنا

کچھ غیر نہیں ہیں یہ اسکو بھی سمجھ لینا
پھر شوق سے تم خونِ اربابِ وفا کرنا

غم کس نے اٹھائے ہیں ٹوٹے ہیں ستم کس پر
میں بھی ہوں یہاں تم بھی انصاف ذرا کرنا

ہر حرفِ تمنا ہو اک برق اثر قاصد
وہ سن کے تڑپ جائے اس طرح ادا کرنا

اُس نے تو رہ و رسمِ دیرینہ مٹا ہی دی
کچھ تو ہی بتا قاصد اب چاہیے کیا کرنا

آتا ہے ہمیں بھی تو تھم تھم کے لہو رونا
سیکھا ہے اگر تم نے رک رک کے جفا کرنا

پیماں شکنی کیسی اپنا تو یہ شیوہ ہے
پابندِ وفا رہنا جو منہ سے کہا کرنا

اپنا ہی مقدر ہو جب ہم سے خلاف اختر
کیا ان کی جفاؤں کا پھر اُن سے گلا کرنا

تصحیح

اپریل ۱۹۱۶ء کے ذخیرہ میں نواب عماد الملک بہادر بالقابہ کے مضمون "ابن رشد کے ہمعصر" میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی تھیں ناظرین اس طرح سے صحت فرمالیں۔

صفحہ ۱۱۳ کالم ۲ سطر ۵ مصرعہ ثانی "الحمد" کے بجائے "الحمد"

صفحہ ۱۱۳ کالم ۲ سطر ۶ مصرعہ اولیٰ "یا اللوریے" کے بجائے "باللوری"

صفحہ ۱۱۵ کالم ۲ سطر ۱۲ "تہام" کے بجائے "حمام"

صفحہ ۱۱۶ کالم ۲ سطر ۳ "فی البرس" کے بجائے "فی البرص"

صفحہ ۱۱۷ کالم ۱ سطر ۱۳ مصرعہ ثانی "فیکی" کے بجائے "بیکی"

صفحہ ۱۱۷ کالم ۱ سطر ۱۴ مصرعہ ثانی "الی" کے بجائے "الیّ"

صفحہ ۱۲۰ کالم ۲ سطر ۲۳ "فی التتعال" کے بجائے "فی اتصال"

صفحہ ۱۲۲ کالم ۲ سطر ۱۷ "ترجمہ" کے بجائے "ترجمہ"